باتیں میرے

مُراد کی

مقصود الحسن عظیمیؔ

باتیں میرے

مراد کی

مقصود الحسن عظیمیؔ

اُن

صاحب نظر، زندہ دل

اور روشن فکر دوستوں

کے

نام

جنہیں اپنے مراد کی طرز فکر

حاصل کرنے کی

جُستجو ہے

پیشِ لفظ

انسانی سوچ اور فکر کی بو قلمونی اور تنوع کے مطابق شعور کی مزاحمت کے بھی اُتنے ہی رنگ ہیں اتنے ہی روپ اور جانے کیسے کیسے ڈھنگ ہیں۔ کتنے بچے ہیں جو ڈاکٹر سے نہیں گھبراتے، جب ڈاکٹر اُن کا معائنہ کرتا ہے تو وہ روتے اور چلاتے نہیں۔ اسی طرح بچے کو پہلی بار سکول لے جانے کا مرحلہ ہو یا حجام کا سامنا ہو، بچے کو سنبھالنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ سوائے معدودے چند کے۔۔۔ سبھی ایسا کرتے ہیں۔ بچے تو بچے ہیں بڑوں کا رویہ بھی اس سے کچھ کم مختلف نہیں ہوتا۔ انٹرویو کی گھبراہٹ ہو یا بردکھوے کی بوکھلاہٹ۔ ہر وہ بات جو انسان کے بھلے کی ہو، انسان اُسی سے گھبرانے کا وطیرہ رکھتا ہے۔ صبح کا اُٹھنا انسان کے کتنے فائدے کا سودا کیوں نہ ہو، انسان اسے سے کتراتا ہے اور بہانے تراش کر سحر خیزی کی نعمت سے محرومی کی خلش سے خود کو بچانے اور ضمیر کو مطمئن کرنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ سچ بولنے کے کتنے فائدے ہوں اس کے لئے ہمت مجتمع کرنے میں اسے ہمیشہ دشواری کا سامنا رہتا ہے۔

شعور کی اس مزاحمت کا ایک روپ اس وقت سامنے آتا ہے جب راہِ حیات پہ قدرت کی مہربانی سے وہ شاہراہ بندے کے سامنے آتی ہے جو اُس کو بہتری، بالیدگی اور خیر کثیر کی منزل تک لے جا سکتی ہے۔ اُس وقت بے یقینی اور گھبراہٹ سے اس سوال کا جواب کھوجنے میں لگ جاتا ہے۔ میں اس راہ پہ چلوں یا نہ؟ اگر اس لمحے کوئی اپنے شعور کی مزاحمت کو خاطر میں لائے بغیر اس راہ کو اپنانے اور اُس پہ گامزن ہونے کا فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو قدرت کا فیضان، اللہ کی کرم نوازی، عنایت اور عطا کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک عجیب لمحہ ہوتا ہے، وجدان اُسے پیش آمدہ راہ پہ چل کر منزل مراد پانے کی ترغیب دیتا ہے اور عقل پیش بندی اور احتیاط کی تلقین کی آڑ میں محرومی کا سامان کرنے پر تلی ہوتی ہے۔ اندر سے آواز آ رہی ہوتی ہے کہ یہی تو وہ راہ ہے جس

کے لئے یہاں تک کے سفر کی صعوبتیں اُٹھائی ہیں۔ لیکن شعور میں ایک تلاطم کا سماں ہوتا ہے۔اس کی کیا سند ہے ؟ اگر یہ وہ راہ نہ ہوئی جس کے تم جو ئندہ ہو۔۔ تو پھر کیا ہو گا؟ کہیں یہ کوئی نایا مغالطہ ، کوئی نیا دھو کہ یا بھٹکنے اور بہکانے کا سامان تو نہیں؟ نشانِ راہ کچھ اتنا واضح نہیں، کچھ دور اور آگے چل کر دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں شاید اس بہتر کوئی اور راہ بھی ہو۔

جذبات اور عقل کی آویزش سے بالا تر ہو کر ، اپنی باطنی راہنمائی پہ بھروسہ کرنے والے اس مقام سے اکثر سر خرو ہو گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کشاکش کے فیصلے لمحوں میں ہو جاتے ہیں اور کبھی یہ جھلملاتی کیفیت ہفتوں، مہینوں اور سالوں پر محیط ہونے کے باوجود بندے کو بد نصیبی کے اندھیروں سے نہیں بچا پاتی ہے۔ گومگو کی حالت میں بندے کے اندر طویل اور شدید مباحث ہوتے ہیں اور ہر مناظرے کی طرح فریقین کے دھواں دھار دلائل کے باوجود کوئی بات واضح ہو کر نہیں دیتی۔

جب انسان کسی راہ پہ چلنے کا خواہش مند ہی نہ ہو تو وہ راہ سامنے ہو تو کیا۔۔۔ اور نہ ہو تو کیا۔ لیکن اگر وہ کسی خاص سمت جانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اس کو کسی خاص منزل پہ پہنچنے کی کوئی ضرورت یا آرزو ہو تو وہ کسی راہ نما کی تلاش بھی کرتا ہے اور اُس کی بتائی ہوئی راہ پہ چلتا بھی ہے۔ راہ نما اور راہبر کی ہدایت پہ قائم رہنے اور اس کی بتائی ہوئی راہ کو نہ چھوڑنے والے منزل پہ ضرور پہنچتے ہیں۔ استقامت اور وفاداری کی شرط پوری کرنے والے ہی فلاح اور ہدایت پانے والے ہوتے ہیں اور پھر فکر اور سلوک کی راہ کے مسافروں کے لئے اس توشۂ زادِ راہ کو ساتھ رکھنا تو کچھ اور بھی ضروری ہوتا ہے۔

کہتے ہیں صبح دم ایک سیدھا سادھا بندہ کسی درخت پہ بیٹھا کُلہاڑی چلا رہا تھا۔ جس جگہ بیٹھ کر وہ کُلہاڑی چلا رہا تھا۔۔ شاخ کے کٹنے پر اُس کا گرنا یقینی تھا۔ وہاں سے ایک چور کا گزر ہوا۔ چور نے اُس بھلے مانس کو آواز دی۔ بھائی احتیاط کرو۔ جہاں سے تم کاٹ رہے

ہو۔۔۔شاخ کٹنے پہ اس کے ساتھ ہی تم بھی نیچے گرو گے۔اُس بندے نے سنی ان سنی کر دی اور کہا۔جاؤ بھائی تم اپنی راہ لو،میں جانوں اور میرا کام۔

وہ چور اس کی بات سُن کر آگے چل دیا۔ادھر جونہی وہ شاخ کٹی۔۔۔اُدھر وہ بندہ دھڑام سے نیچے آن گرا۔نیچے گرتے ہی اُس کے ذہن میں پہلی بات یہی آئی کہ وہ صاحب جنہوں نے اُس کو تنبیہ کی تھی وہ ضرور کوئی پہنچے ہوئے بزرگ اور روشن نظر صاحب تھے تب ہی تو اُن کو معلوم تھا کہ وہ نیچے گرے گا۔یہ خیال آتے ہی وہ اُن صاحب کے پیچھے دوڑا اور انہیں جا لیا۔

''رکئے! صاحب میں نے آپ کی بات نہ مان کر بُرا کیا اور مجھے اس کی سزا بھی مل گئی ہے۔میں توبہ کرتا ہوں اور آئندہ آپ کی بات ماننے کی قسم کھاتا ہوں۔آپ مجھے اپنی شفقت سے محروم نہ رکھیں۔آج سے آپ ہی میرے گرو ہیں۔''

چور کو اپنی پڑی تھی اُس نے جان چھڑانے کو کہا۔اچھا ٹھیک ہے۔آج سے تم میرے مرید۔۔۔اب یہاں بیٹھ جاؤ اور یہ ذکر شروع کر دو۔چور اس بندے کو ذکر کرنے کا کہہ کر وہاں سے نکل لیا۔اب وہ بندہ اپنے ''پیر و مرشد'' کے بتائے ہوئے عمل پہ کاربند ہو گیا۔کئی سال اسی طرح کاربند اور قائم رہ کر وہ اپنے مرشد کا تعلیم کردہ ذوق و شوق سے کرتا رہا۔

ذکر کے انوار کا ذخیرہ اتنا بڑھ گیا کہ فرشتے متوجہ ہو گئے۔انہوں نے اُس بندے کی توجہ میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ جس کو وہ اپنا ہادی اور راہبر مانے بیٹھا ہے وہ کوئی روحانی بندہ نہیں بلکہ ایک عام انسان اور چور ہے۔اُس بندے نے اس بات کو اپنے ذہن میں موصول کیا اور سمجھا کہ یہ کوئی شیطانی وسوسہ ہے۔اُس نے لاحول پڑھی اور اپنے کام سے لگا رہا۔جب انوار کا ذخیرہ مزید بڑھا اور نقصان کا امکان پیدا ہونے لگا تو ایک فرشتے کی ڈیوٹی لگی کہ وہ اُس کو سمجھائے۔

فرشتہ انسانی روپ میں سامنے آیا اور کہنے لگا۔ میں ایک فرشتہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے میرے ذمہ یہ کام لگایا ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں کہ آپ جس بندے کو اپنا مرشد مانے بیٹھے ہیں وہ کوئی منزل رسیدہ یا منزل آشنا بندہ نہیں ہے وہ تو ایک معمولی سا بندہ اور چور ہے۔ آپ یہ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ آپ اپنے خالق کے عرفان اور سلوک کی راہ پہ چلنا چاہتے ہیں تو کسی ایسے بندے کی نسبت حاصل کریں جو ان راہوں کا خوگر اور شناسا ہو اور آپ کی رہنمائی کے قابل ہو۔

فرشتے کی بات سُن کر وہ بندہ بولا۔ میرے مرشد کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مجھ عاصی اور گنہگار کو آج محض اُن کے طفیل اللہ کے ایک فرستادہ فرشتے سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ آپ میرا امتحان لے رہے ہیں۔ میں بہت کمزور انسان ہوں۔ میں اتنے بڑے امتحان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ تشریف لے جائیں۔۔۔ اور یہ کہہ کر اُس نے اُن کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور اپنے 'مرشد' کے بتائے ہوئے ذکر میں منہمک ہو گیا۔

کہتے ہیں فرشتے نے پورا ماجرا اوپر جا بتایا اور۔۔۔ پھر اربابِ قضا و قدر کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اُس بندے کی خاطر۔۔۔ اُس کے 'مرشد' کو ایک روحانی بندہ بنا دیا جائے۔ اس طرح ایک بندے کی استقامت، وفاداری اور استواری سے نہ صرف خود اُس کا اپنا نصیب سنورا بلکہ وہ اپنے مرشد کی اصلاح اور بلندی درجات کا بھی سبب بن سکا۔

استقامت اور استواری کے ساتھ ساتھ وفاداری کی شرط کے حوالے سے ایک بات کا بہت تذکرہ ہوتا ہے کہ اگر مرشد سے کوئی سہو ہو جائے، اس سے کوئی غلطی سرزد ہو، وہ دانستہ یا نادانستہ کوئی ایسا کام کرے جو کسی اخلاقی، معاشرتی یا سماجی قانون کے خلاف ہو۔۔۔ تو مرید کو کیا کرنا چاہیے۔ ایسی صورت حال میں اُس کا طرزِ عمل، سوچ اور رویہ کیا ہونا چاہیے ؟

ایک طبقہ فکر کا کہنا ہے کہ خطائے بزرگان گرفتن خطا است کے مصداق ایک کم جاننے والے کا زیادہ جاننے والے کی گرفت کرنا مناسب نہیں۔ایک جاہل کسی عالم کی، بچہ اپنے ماں باپ کی اور شاگرد اپنے استاد کی خطاؤں کی پکڑ کرے۔۔۔ یہ مناسب نہیں اور آدابِ فرزندی کے خلاف ہے۔کچھ اور کہنے والے کہتے ہیں۔۔۔ جو استاد بتائے وہ کرو۔۔۔ جو استاد کرے وہ مت کرو۔۔۔ یعنی استاد کی بات پہ دھیان دو، جو وہ کہے اس کی تعمیل ہونی چاہئے نہ کہ اُس کے عمل کی پیروی کی ضد کرو اور نہ ہی اُس کو سند بنانے کی کوشش کرو کیوں کہ ہمارا شعور اس درجے کی تعمیل کا اہل ہے بھی کہ نہیں۔

تحقیق اور تلاش کا جذبہ انسان کو اس بارے میں طبع آزمائی پہ ابھارتا ہے کہ یہ پوری کائنات کیسے بنی؟۔۔۔

کیوں بنی؟۔۔۔

اللہ تعالیٰ کو کائنات کے اتنے وسیع و عریض بکھیڑے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟

میں خود کیسے وجود میں آیا؟۔۔۔۔

میرے آباؤاجداد کہاں چلے گئے؟۔۔۔۔

اگر وہ فنا ہو گئے تو میں بھی فنا ہو جاؤں گا۔۔۔۔ کیوں؟

ان باتوں کا شافی جواب تلاش کرنے اور اس کھوج میں رہنے والوں کی کمی نہیں۔ان میں سے کچھ ان باتوں کو جان لیتے ہیں۔۔۔ اور جتنا جان لیتے ہیں اتنا ہی اُن کا اشتیاق فزوں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔ کچھ کم مانتے ہیں اور اسی پہ ناز کرتے ہیں۔۔۔ کچھ بالکل نہیں جانتے لیکن سمجھتے ہیں کہ وہ بہت کچھ جانکاری رکھتے ہیں۔۔۔ اکثر مانتے ہیں کہ ان باتوں کو وہ نہیں جانتے اور ان پہ زیادہ

دماغ سوزی اور مغزماری کو وقت کا زیاں قرار دیتے ہوئے اک گھمبیر سی چپ سادھے زندگی بسر کرتے ہیں۔ان کے مطابق اگر جان لیا تو کیا اور نہ جانا تو کیا۔۔۔ان باتوں کو جان لینے سے اُن کی تنخواہ تو بڑھنے سے رہی۔

زیرِ نظر کتاب کچھ ایسی ہی کھوج کا احوال بھی ہے اور اس تحقیق اور تلاش کے لئے من جانب اللہ ہونے والی ہدایت اور راہنمائی کے انتظام کی کہانی بھی ہے اور اس ہدایت اور راہنمائی کے لئے مقرر ہونے والے بندے کے اندازِ فکر سے لے کر اُس کے طریقِ تربیت تک وہ سب کچھ بیان کرنے کی ایک طالب علمانہ کاوش ہے جو کچھ شعورِ انسانی اپنی گرفت میں لے سکا۔

ڈاکٹر مقصود عظیمی

پشاور ۳ نومبر ۲۰۰۷ء

فہرست

میرا مراد اک نظر میں 13

عرض حال.. 18

جنت اور جہنم.. 28

لوح و قلم کا انگریزی ترجمہ 33

کتاب قلندر شعور کا ترجمہ.. 50

سوداگر اور طوطے کی کہانی 68

درخت باتیں کرتے ہیں.. 75

آسمانی کرنٹ 76

کیف وجذب.. 78

ماورائی علوم میں والدہ کا نام اتنی اہمیت کیوں رکھتا ہے؟ 81

جھوٹ حقائق کا سامنا نہیں کرنے دیتا.. 84

اللہ کے روپ 86

رب راضی تے سب راضی.......... 92
لوح و قلم کا انگریزی ترجمہ 95
قانون: دنیا بندے کے پیچھے پیچھے آنے کی پابند ہے.......... 100
(٦)یقین کسے کہتے ہیں؟ 103
یاحی یاقیوم اور درود شریف.......... 108
غصہ بھی تو ایک آگ ہی ہے.......... 120
مور کے پنکھ جتھے چھتائے ہوتے ہیں.......... 141
نصیب یاوری کریں تو.......... 163
یَاحَیُّ یاقَیُّوم 173
ظالم اور جاہل.......... 182
رفیق اعلیٰ اور شجر ممنوعہ.......... 200
فیض سے کیا مراد ہے؟ 223
حیدر آباد کی روحانی کانفرنس.......... 246

قرآن الہامی طرزِ کلام 273
نیوٹن کی کشش ثقل 294
کتاب تجلیات کی تقریب رونمائی 305
قلندر شعور سے مراد 332
خیال اور برزخ 354
فقیر کو بے وقوف سمجھنا 376
مور کے پر چتھے چھتائے 400
ختم اللہ علی قلوبہم 422
رقیب روسیا 436
کیوں نہ آپ کو سلسلے سے خارج کردیا جائے 453
بروج کا مطلب ہے دنیائیں 466

میرا مراداک نظر میں

نام: جو ماں باپ نے رکھا:	شمس الدین انصاری
اپنے مرشد کی نسبت سے جو نام تجویز کیا:	عظیمی
جس نام سے عوام وخواص پکارتے ہیں:	الشیخ عظیمی صاحب
	عظیمی صاحب
جس نام سے حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے پکارا:	خواجہ صاحب
جس نام سے دربارِ رسالت میں پکارا جاتا ہے:	احمد
سلسلے کے دوست انہیں پکارتے اور مخاطب ہوتے ہیں:	حضور اباجی
	حضور باباجی
والدہ محترمہ کا نام:	اُمتِ الرحمان رحمتہ اللہ علیہ
والد محترم کا نام:	حاجی انیس احمد انصاری رحمتہ اللہ علیہ
دادا کا نام:	حافظ نہال احمد انصاری ولد حاجی نظام الدین انصاری

نوٹ: حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز شیخ الحدیث حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے آپ کے والد جناب انیس احمد انصاری کے بچپن میں یتیم ہو جانے کے بعد اُن کی پرورش فرمائی۔ آپ اُن کے پھوپھا تھے۔ آپ مہاجر مکی و مدنی کہلاتے تھے۔ آپ نے سنن ابی داوٗد کی بے مثال شرح بعنوان 'بذل المجھود فی حل سُنن ابی داوٗد' عربی زبان میں تحریر فرمائی۔ آپ صاحب کرامت بزرگ تھے۔ حضرت مولانا محمد زکریاؒ آپ کے خلیفہ تھے۔ آپ کی تحریر کردہ کتب جامعہ الازہر کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ آپ نے اپنا روحانی ورثہ اپنے پوتے احمد شمس الدین انصاری کو منتقل کرنے کی اجازت دربارِ رسالت سے خصوصی طور پر حاصل کی۔ جناب حاجی انیس احمد انصاری حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے بیعت بھی تھے۔ اس حوالے سے بھی آپ جناب الشیخ عظیمی صاحب کے دادا ہیں۔

پیدائش: قصبہ انبیٹھہ پیرزادگان۔ ضلع سہانپور۔ یوپی

تاریخِ پیدائش: ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء بروز پیر وقت سحر

سلسلہ نسب میزبانِ رسول حضرت خالد ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ ان کے اجداد میں سے ایک صاحب جناب حضرت خواجہ مبارک انصاری جو صوبہ ہرات، افغانستان کے مشہور صوفی بزرگ خواجہ عبداللہ انصاری (پیر ہرات) کی اولاد میں سے تھے۔۔۔ ہجرت کر کے حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کی زیارت کو اپنے بیٹوں کے ہمراہ پانی پت تشریف لائے۔ اُن کے دونوں صاحبزادگان کو حضرت بو علی شاہ قلندرؒ نے اپنے پاس رکھ لیا۔ مرشد کریم انہی صاحبزادگان کی اولاد میں سے ہیں۔

بچپن سہانپور میں گزرا۔ ۱۲ سال کی عمر میں قرآن حفظ فرمایا۔ جوانی میں دہلی میں حکیم امتیاز الدین سے حکمت وطبابت سیکھی تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان تشریف لائے اور والدین کے ساتھ صادق آباد میں رہائش اختیار کی۔ وہاں سے کراچی منتقل ہو گئے۔

آپ کے چھوٹے بھائی جناب اکبر احمد انصاری صاحب امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ بڑے بھائی مولانا ادریس احمد انصاری صاحب دیوبند کے ممتاز علماء میں سے ہیں۔ مولانا محمد الیاس انصاری نے کئی کتب تحریر فرمائی ہیں۔ کئی مدارس و مساجد تعمیر کروائی ہیں۔

آپ کل چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ مولانا محمد ادریس انصاری، مولانا محمد الیاس انصاری، احمد شمس الدین انصاری، محمد اکبر انصاری اور محترمہ آمنہ جبکہ ایک بہن خورشیدہ صغر سنی میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ آپ سب بھائی حافظِ قرآن ہیں۔

زوجہ کا نام: محترمہ سیدہ راشدہ عفت

صاحبزادگان: ڈاکٹر و قاریوسف، فرخ اعظم، حکیم سلام عارف، حکیم نور عجم اور حکیم شاہ عالم۔

صاحبزادیاں: محترمہ کنول گلنار بیگم سہیل احمد، محترمہ ناصرہ عدنان بیگم فاروق احمد عثمانی، محترمہ ہمافاران بیگم شہزاد بٹ اور محترمہ نداء افروز (حنا الماس) بیگم طاہر جلیل۔

جن اصحاب و بزرگان سے براہ راست فیض ملا: حضرت حسن اُخریٰ سید محمد عظیم برخیا المعروف بہ حضور باباولیاؒ، قطب ارشاد حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ، حضرت حافظ فخر الدینؒ خلیفہ حضرت مولانا خلیل احمد سہانپوریؒ اور حضرت چوہدری اقبال سہروردیؒ۔

جن بزرگوں سے بطریق اویسیہ فیض ملا: حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت بلال حبشیؓ، حضرت خواجہ ابوایوب انصاریؓ، حضرت سیدہ بی بی فاطمہؓ، حضرت سیدہ بی بی زینبؓ، حضرت رابعہ بصری، حضرت امام موسیٰ رضا کاظم، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت ابوالحسن علی ہجویری المعروف بہ حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت شاہ عبداللطیف امام بریؒ، حضرت لعل شہباز قلندرؒ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت بو علی شاہ قلندرؒ، حضرت شاہ دولہ دریائیؒ، حضرت بہاؤالدین زکریا سہروردیؒ، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہانپوریؒ اور حضرت مولانا الیاسؒ بانی تبلیغی جماعت و خلیفہ حضرت مولانا خلیل احمد سہانپوریؒ۔

آپ خانوادہ سلسلہ عظیمیہ ہیں اور حضور قلندر باباولیاءؒ کے بعد آپ ہی سربراہ سلسلہ عظیمیہ ہیں۔ آپ نے سلسلہ عظیمیہ کو علمی اور سماجی حیثیت سے اتنا مستحکم فرمادیا ہے کہ آئندہ برسوں تک اس سلسلے کو علمی سطح پر پذیرائی ملتی رہے گی۔ ان شاءاللہ۔

آپ کی تصانیف: ۳۴ کتب اور ۴۶ پمفلٹس

نوٹ: آپ کی تین کتب کے انگریزی تراجم برطانیہ کی سالفورڈ یونیورسٹی برمنگھم کے Department of Rehabilitation میں گریجویشن اور ماسٹر ڈگری کے نصاب میں شامل ہیں۔ کتاب احسان و تصوف بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ علوم اسلامیہ کے ماسٹر ڈگری کے نصاب میں شامل ہے۔

تدریسی خدمات: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی شعبہ علوم اسلامیہ کے وزٹینگ پروفیسر ہیں۔ آپ کی زیرِ نگرانی صوفیانہ علوم قلندر شعور کی مختلف درجوں پر ملک کے مختلف مراقبہ ہالز میں ہفتہ وار کلاسز جاری ہیں۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: جناب ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی کا تصنیف کردہ مکالمہ ''سلسلہ عظیمیہ اور اُس کی علمی اور سماجی خدمات کا تحقیقی جائزہ' جس پہ انہیں کراچی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے۔

عرضِ حال

سفید پوش طبقے سے تعلق رکھنے والا وہ ایک ایسا شخص تھا جو معاشی ناآسودگی اور معاشرتی ناہمواریوں کے بے کراں صحرا میں اپنے لئے ایک کنجِ عافیت، اک گوشہ سکون کی تعمیر میں مصروف تھا۔اُس کی یہ مصروفیت اور تنگ ودو سالوں کی محنت کے بعد کسی قدر بارآور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھا کہ برسوں کی ترساہٹوں سے پنڈ چھوٹا اور اب وہ آسودگی کی چھتری لئے فکرِ معاش کی کڑی دھوپ میں زندگی کی شاہراہ پہ اپنا سفر جاری رکھ سکے گا۔

پھر ایک بگولہ اُٹھا۔ آشیانے کے وہ سارے تنکے حالات کی تند آندھی نے اپنے کاندھوں پہ اُٹھا لئے جنہیں وہ اپنی متاع سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک تنکے کو بچانے دوڑا لیکن جلد ہی تھک گیا۔اس بے سروسامانی نے اُس کے اندر جتنی توڑ پھوڑ کی۔۔۔وہ تو ہوئی لیکن اُس کے متعلقین کی سرد مہری اور موقع پرستی کے آہنی ہتھوڑوں نے اُس کے وجود کو بالکل کرچی کرچی ہی کر دیا۔اک بے یقینی کے عالم میں اُس نے اپنائیت کے نقاب کے پیچھے پوشیدہ غیریت اور بے گانگی کے چہروں پہ اپنے لئے ایک گہری حقارت اور بے تعلقی دیکھی۔اُس کو اس کا یارانہ تھا۔کیا اپنے اور کیا پرائے۔۔۔رشتوں نے جیسے اُسے ڈس لیا۔جب خونی رشتے اُس کو خون آشام دکھنے لگے اور دیگر رشتوں اور تعلقات کے کاغذی پیراہن کی کھڑکھڑاہٹ اُس کے اعصاب کی سکت سے بڑھ گئی تو اُس نے بیوی بچوں کو وہیں چھوڑا اور خود ہجرت کر کے کراچی پہنچ گیا۔

سمندر کنارے ملگجی چاندنی میں ٹہلتے ہوئے اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔جب اُس کا رخ سمندر کی طرف ہوتا تو روشنی نہ ہونے کے باوجود سمندر روشن اور موجود محسوس ہوتا اور جب اُس کا منہ شہر کی طرف ہوتا تو شہر اُس کو تاریک اور ناموجود لگتا۔شہر کی جھلملاتی روشنیاں۔۔۔عمارتوں کے بے روح ہیولوں کو۔۔۔اجاگر تو کر رہی تھیں۔۔۔لیکن اُن میں زندگی کی دھڑکن ناپید محسوس

ہوئی۔اس لمحے اُس نے جھلملاتی روشنیاں رکھنے کے باوجود بے نور سنگلاخ عمارتوں کی بجائے سمندر کے دھڑکتے اور زندہ عمق کی کشش کو اپنے اندر ابھرتے محسوس کیا۔اُس لمحے اس کو یہ فیصلہ کرنے میں کچھ زیادہ دقت نہ ہوئی کہ دنیا کی جھلملاتی روشنیوں اور سنگلاخ عمارتوں سے ناطہ رکھنے کی بجائے اگر وہ علم کے سمندر کی شناوری پہ کمر کس لے تو ہو سکتا ہے کہ کسی روز کسی ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں اندر کی کڑواہٹ اور بیزاری سے اُسے امان مل سکے۔اُس رات بہت عرصے بعد وہ گہری نیند سویا۔

نارتھ کراچی سے گرومندر جاتے ہوئے ناظم آباد چورنگی پہ اشارہ بند ہونے پر اسے رکنا پڑا۔اِدھر اُدھر دیکھتے اُس کی نگاہ ایک اشتہاری بورڈ پر پڑی۔مصنوعات آرائش اور آسائش کے درمیان وہ ایک کتاب کا اشتہار تھا۔سر اُٹھا کر اُس نے قدرے بڑے بورڈ پہ لکھے الفاظ کو دوبارہ پڑھا۔"روحانی سائنس کی پہلی کتاب۔لوح و قلم'۔اچنبھا سا ہوا۔اس کی کئی وجوہات تھیں۔روحانیت کی بابت اُس کا تصور کچھ زیادہ واضح نہ تھا۔وہ اسے عمل حاضرات و عملیات اور علم و نجوم اور تعویز گنڈوں کی قبیل کا ہی کوئی علم سمجھتا تھا۔وہ اُس اشتہاری بورڈ کو کتب بینی کے ذوق کی کمی اور بڑھتے فقدان کا ماتم سمجھے یا عامل کامل پروفیسروں کی اشتہاری مہم کا کوئی حصہ۔اُس کے کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے پیشتر اشارہ کھلا اور اُس نے موٹر سائیکل بڑھا دی۔کئی روز یہی ہوتا رہا۔وہ اُس چورنگی سے گزرتا۔گزرتے گزرتے اور جب رکنا پڑتا تو رک کر وہ اُس اشتہاری بورڈ پر نظر ڈالتا۔کبھی اُسے لگتا کہ وہ بورڈ اُس سے کچھ کہہ رہا ہو۔رفتہ رفتہ وہ اس سے مانوس سا ہو کر بے تعلق ہو گیا۔

اُس کی کاروباری مصروفیات غیر محسوس طور پر کم ہوتی چلی گئیں۔حالات کی مار، معاشی ناآسودگی، معاشرتی ناہمواری کا احساس، کراچی جیسے شہر نگاراں میں خود کو تنہا اور بے یار و مددگار سمجھنے کے سبب اُس کا رجحان مطالعہ قرآن کی طرف بڑھ گیا۔وہ قرآن حکیم کی آیات کا ترجمہ پڑھتا اور چاہتا کہ اس پہ کچھ ایسی کیفیت اور رقت طاری ہو کہ اُس کا پتہ پانی ہو جائے۔لیکن ترجمے کے

الفاظ اُس کو اتنے بے ربط اور بے جان سے لگتے کہ رقت اور خشیئت طاری ہونا تو دور کی بات اُس کو اپنی توجہ اُن پر مرکوز و مرتکز کرنا دوبھر ہو جاتا۔ لیکن وہ اپنی سی تگ ودو میں لگا رہا۔

ایک روز وہ اس نیت سے قرآن مجید لے کر بیٹھا کہ وہ قرآن کے الفاظ کو ترجمے کا سہارا لئے بغیر اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے آغاز کیا اور ھدی اللمتقین پہ آکر سپر ڈال دی۔ یہ کتاب ہدایت دیتی ہے متقیوں کو۔۔۔ اس مفہوم کو ماننے میں اُسے تامل ہوا۔ یہاں الناس نہ سہی تو المسلمین کیوں نہیں کہا گیا؟ کیا یہ کتاب عوام الناس کے لئے ہدایت کا کوئی سامان اپنے اندر نہیں رکھتی؟ کیا اس میں مسلمانوں کی ہدایت کے لئے کچھ نہیں؟ متقی سے کم درجے کے مسلمان کو اس کتاب سے ہدایت پانے کی گنجائش کیوں نہیں چھوڑی گئی؟ حیرت ہے کہ مومن بھی تو نہیں کہا۔ بعض اوقات جو نہ کہا گیا ہو اُس کی اہمیت کہی گئی بات سے بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ سوچتا رہا۔ اُس کو کوئی جواب سجھائی نہ دیا تو وہ الجھ گیا۔ کبھی خیال آتا کہ یہ کوئی شیطانی وسوسہ ہے۔ لیکن اُس کے اندر سے آواز آتی سیدھی سی منطقی بات ہے اللہ تعالٰی نے متقی ہی کیوں فرمایا؟۔ الناس کہہ کر اسے ہر ایک کے لئے عام کرتا نہ سہی تو اسے مسلمین، مومنین، صالحین، صدیقین یا پھر کافرین کے لئے کیوں خاص نہیں کیا؟ صرف متقی ہی کیوں؟ وہ جتنا سوچتا گیا۔۔۔ اتنا ہی اُس کی الجھن میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب کوئی بات اُس کے پلے نہ پڑی تو وہ مذاق پر اتر آیا۔ اُس نے سوچا۔۔ یہ ایک قانونی سقم ہے۔ اب روزِ محشر اسی بات کی آڑ لے کر جان بچا سکتا ہے کہ یہ کتاب تو متقیوں کی ہدایت کا سامان تھی۔ اس لئے وہ اُس سے فیضیاب ہونے کی سعادت کہاں سے لاتا؟ چشم تصور میں وہ اپنی چالاکی کی خود کو داد دیتا۔ قانونی سقم کا خیال اُسے بھا گیا۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اس کی بیوی بچوں کو لے کر اُس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ گھرداری کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ روزگار کے تقاضوں کی مصروفیات کو نبھانے لگا رہا۔

ایک روز حیدری کے جمعہ بازار میں کتابوں کے اسٹال پہ اُس کی نظر خواجہ شمس الدین عظیمی کی تصانیف پر پڑی۔اُن دنوں وہ کبھی کبھار روزنامہ جنگ میں اُن کے کالم پڑھتا تھا۔اُس کو اُن کے کالموں میں ندرت کا احساس ہوتا تھا۔وہ کچھ الگ سے محسوس ہوتے تھے۔روحانی مسائل پہ بات کرتے کرتے وہ کچھ عجیب سی بات لکھ جاتے۔مثلاً کسی نے روزگار اور معاشی پریشانیوں کا ذکر کر کے مدد مانگی ہوتی اور وہ اُس کے جواب میں لکھتے۔۔۔چڑیوں کو باجرہ ڈالیں۔۔۔مُٹھی بھر چینی چیونٹیوں کے بل کے پاس ڈالیں۔۔۔اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ چڑیوں کو باجرہ اور چیونٹیوں کو مُٹھی بھر چینی ڈالنے سے کسی کے معاشی مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں؟ پھر بھی اُسے تجسس ضرور تھا۔اُن کی باتوں میں اُسے ایک نیا پن محسوس ہوتا۔وہ اُس کے دل کو چھوتی بھی تھیں۔اور کبھی الجھا بھی دیتی تھیں۔کچھ ہی روز پہلے اُس نے اُن کے کالم میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی بابت پڑھا تھا۔اُنہوں نے اُس کی بابت جو کچھ لکھا تھا اُس سے وہ متفق تو تب ہوتا جب اُس کی سمجھ میں کچھ آتا۔وہ اُس نظریہ کی بابت جو کچھ پہلے پڑھ چکا تھا وہ اُن کی لکھی باتوں سے بہت مختلف تھا۔اس بات سے اُس کی توجہ اُن کتب کی طرف مبذول ہو گئی۔اُس نے سوچا کسی مصنف کے ذہن کو اچھی طرح جاننے کے لئے اُس کی تمام کتب کا مطالعہ لازمی ہے۔

اُس نے اُس سٹال پہ موجود اُن کی تمام کتابیں خریدیں۔گھر آ کر حسبِ عادت پہلی فرصت میں وہ ایک ایک کتاب یکے بعد دیگرے پڑھتا چلا گیا۔اُس کو کئی نئی باتوں کا علم ہوا، کئی باتوں کو وہ پہلے سے جانتا تھا۔اُس نے ایک بات بہت توجہ سے نوٹ کی۔۔اُن کی تحریروں میں لفاظی کی بجائے سیدھے سادھے انداز میں ازلی اور ابدی حقائق کا تذکرہ فراواں تھا۔علمیت کا رعب گانٹھنے کی بجائے وہ ایک پُر یقین انداز میں سیدھے سبھاؤ بات کہتے محسوس ہوتے،اُن کی کتب میں لوح و قلم اور مصنف لوح و قلم۔۔قلندر بابا اولیا کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کے حوالے بار بار دیکھ کر اُس کو اشتیاق ہوا وہ اُن کی بابت کچھ جانے۔

اُس نے کتاب تذکرہ قلندر باباأولیاؒکھولی اور پڑھنے لگا۔ وہ اُس خط کو پڑھ رہا تھا جو حضور قلندر باباأولیاءؒ نے اپنے کسی مرید کو لکھا تھا۔ جب اُس نے ھدی اللمتقین کی وہ شرح پڑھی جو حضور قلندر باباأولیاءؒ نے فرمائی تھی تو اُس کے اندر تلاطم پیدا ہوا۔ اُس کو لگا اُس کے افکار و نظریات کی پوری عمارت ریت کی بنی ہوئی تھی جو اُن کی شرح کے بہاؤ کی پہلی لہر سے ہی ڈھے رہی تھی۔ اللہ تعالی ہدایت دیتے ہیں اُن کو جو اپنے اندر ذوق رکھتے ہیں اور اس ذوق کی وجہ سے وہ بات کو سمجھنے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔۔۔۔ اُس نے اس بات کو بار بار پڑھا۔ اُس کو اپنی سابقہ سوچ پہ شرم بھی آئی، تاسف بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اُس نے بڑی رسانیت سے خود کو مخاطب کیا۔ جی تو اب کیا خیال ہے؟ یہ قانونی سقم تو الٹا اپنے گلے پڑ گیا ہے۔ خود کو وہ ایک عام سا مسلمان مانتا تھا۔ اُس کو اپنے ذوق کے حوالے سے بہت مان تھا۔ اپنے ذوق سے شعر و شاعری سمجھنے، فلسفیانہ موشگافیوں سے محفوظ ہونے، اچھے لباس، خوشبویات سے لطف اندوز ہونے اور جمالیاتی احساسات سے متصف ہونے کی حد تک ہی واقف تھا۔ یہ بات اُس کو بہت اچھی لگی کہ اللہ کے نزدیک صاحب ذوق لوگ ہی اس قابل ہیں کہ ہدایت پا سکیں۔ بے شک ذوق بھی اللہ ہی کی عطا ہے لیکن سعید ہیں وہ لوگ جو اس عطا کو اُس طرح سے برتتے اور استعمال کرتے ہیں جس طرح سے اللہ تعالی چاہتا ہے۔

اُس نے اُس خط کی دادیوں دی کہ خط کے آخر میں درج ہدایت پہ عمل پیرا ہو کر اُس خط کے مندرجات کو اپنے قلم سے تحریر کیا اور ہر روز دن میں ایک دو دفعہ اُسے پڑھنا اپنا معمول بنا لیا۔ اس مشق سے اُس پہ ایک نکتہ یہ واضح ہوا کہ جب بھی وہ اُس خط کے مندرجات پڑھتا اُس پہ کوئی نیا نکتہ کوئی نئی بات روشن ہوتی۔ اُس خط نے اُس کی سوچوں کے بہت سے بل سیدھے کر دیئے۔ بہت سے جالے اُس کے ذہن سے اترتے چلے گئے۔ اُس کے ذہن میں روحانیت اور روحانی لوگوں کے حوالے سے ایک ایک احترام سا در آیا تھا۔ اب اُس نے تصوف کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ تصّوف اس سے پیشتر اُس کے لئے ایک علمی مناظرے کا عنوان تھا، وقت گزاری کے لئے بزرگوں کے حوالے سے گھڑی گئی باتوں کا مطالعہ اور تذکرہ تھا۔ اس کتاب نے اُس کے افکار کی

پوری نیو کو سیدھا کر دیا۔ وہ اپنے سامنے ایک نئے جہانِ معنٰی کو طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ روحانیت علم کی وہ جہت ہے جو غیر جانبدار طرزِ فکر اور حقیقت آشنائی سکھانے کے بعد اُس منزل کی طرف لے جاتی ہے جہاں بندہ نیابت الٰہیہ سے سرفراز ہو سکتا ہے۔

اب اُس کو جستجو ہوئی کہ وہ لوح و قلم پڑھے۔ مختلف کتب فروشوں سے پوچھتا ایک روز وہ صدر کے ایک دکاندار سے یہ وعدہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اُس کو وہ کتاب لا دے گا۔ جب اُس نے اُس کتاب کو پہلی بار اپنے ہاتھ میں لیا تو اُس کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اُس کو وہ کتاب کچھ زیادہ وزنی اور بھاری سی لگی۔ اُس نے سوچا شاید اس کا کاغذ ہی کچھ ایسا ہے یا گہرے نیلے پلاسٹک کور میں ملبوس اس غیر مجلد کتاب کو اس حوالے سے جانچنے میں اُس سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے ورق گردانی کو اُسے کھولا۔ کتاب کے پہلے صفحے کی جلی تحریر نے اُس کی توجہ کو جکڑ لیا۔

”میں یہ کتاب پیغمبر اسلام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے لکھ رہا ہوں۔۔۔

مجھے یہ حکم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے بطریق اُویسیہ ملا ہے۔“

اُس کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ عقیدت، احترام اور حقیقت شناسی ایک کرنٹ کی طرح اُس کے روں روں میں دوڑ گئی۔ اُس نے اپنے شعور کو نوعِ جن وانس کے ورثے کی امانت کے بوجھ تلے دبتے محسوس کیا۔ اُس کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں لگا کہ یہ کوئی ادیبانہ مبالغہ آرائی ہے۔ حقیقت میں ایسی کسی بے یقینی اور گمان کی گنجائش ہوتی ہی کہاں ہے۔ اُس کو یہ خیال ضرور گزرا کہ اک وہ امانت بھی تو تھی جس کو جبل و سماوات نے اس لئے اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا کہ کہیں وہ ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں لیکن انسان نے اُٹھا لیا تھا۔

اب کئی روز تک وہ تھا اور وہ کتاب لوح و قلم تھی۔ اُس نے اُس کو پڑھا۔ بار بار پڑھا، مختلف انداز سے پڑھا کبھی ایک ہی نشست میں ختم کیا، تو کبھی سبقاً سبقاً اور کبھی جستہ جستہ۔ پھر اُس نے نوٹس لینے شروع کئے۔ اُس میں بیان کئے گئے موضوعات کو اپنے حافظہ میں اتارنے کے لئے طالب علمانہ انداز میں انہیں بار بار دہرایا۔ اس تمام تر مصروفیت میں اُس کو ایک ہی احساس تھا کہ دورانِ مطالعہ وہ کتاب اور اُس کے مندرجات جس قدر سہولت سے اُس کو سمجھ آرہے ہوتے، کتاب بند کرتے ہی وہ سب کچھ اُس کے حافظے سے یوں حذف ہو جاتا کہ محض ایک تاثر باقی رہتا کہ اُس نے کوئی بہت ہی اچھی بات پڑھی ہے لیکن وہ کیا بات تھی اُس کا ذہن اس کو دہرانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ کتاب کے مفہوم کو اپنے ذہن کے حصار میں لے تو لیتا تھا لیکن اُس کو تھامے رکھنے میں اُس کو دشواری ہو رہی تھی۔

اُس نے طالب علمانہ دور میں اور اُس کے بعد بھی بے شمار کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ دوستوں میں اُس کی رفتار مطالعہ اور فہم رسائی کی اچھی خاصی دھاک تھی۔ دوست اُس کی تواضع کو اُسے اچھی اچھی کتابوں کی بابت بتاتے اور کبھی کبھار تو اُس کے ذوق مطالعہ کو خراج پیش کرنے کو کوئی مشکل اوراق کتاب لا دیتے اور بعد میں اُس سے اس کی بابت اُس کی رائے اور تبصرے سے محظوظ ہوتے۔

اُس کی حسِ تنقید کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی بھی کتاب کی اچھی باتوں کے ساتھ ساتھ اُس کی خامیوں اور کمی کو بھی بھانپ لیتا تھا۔ دوست اس کے ناقدانہ انداز کا لطف لیتے تو وہ اور کھل کر اظہار کرتا۔۔۔ لیکن اس کتاب لوح و قلم نے اُس کی تنقیدی صلاحیتوں کے سارے ہی کس بل نکال کے رکھ دیئے تھے۔ اُس نے کسی کتاب کو ایک دو بار سے زیادہ کبھی نہیں پڑھا تھا۔ وہ کتابیں جن کو اُس نے تیسری بار اپنے مطالعہ کے قابل جانا تھا اُن کی تعداد چند ایک سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کتاب کو گیارہویں بار پڑھ رہا تھا اور وہ اُس کے حواس پہ سوار ہو چکی تھی۔

ایک دن وہ اپنے ایک دوست کے سسر سے ملنے اُن کے گھر نارتھ ناظم آباد گیا۔ پراچہ صاحب تپاک سے ملے۔ اُن کی شفقت سے اُسے ڈھارس ہوئی۔ وہ یوں بھی خود کو کراچی میں اکیلا سا محسوس کرتا تھا۔ وہ دنیا گھومے ہوئے تھے۔ اُن کی باتوں میں دنیاداری کا رکھ رکھاؤ تھا۔ انہوں نے اُسے اپنے گھر منعقدہ عید میلادالنبی ﷺ کی تقریب پہ مدعو کیا۔ اُس تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ اُس تقریب میں روضہ اقدس ﷺ کی چادر کے سائے تلے درود و سلام پڑھنے کی سعادت ملی۔ اُس کے بعد وہ اُن سے ملنے کئی بار اُن کے گھر گیا۔ ایک دو بار وہ بھی اُس کے گھر آئے۔ ایک بار وہ اُس کے یہاں آئے تو اُس نے لوح و قلم انہیں بھی دکھائی اور اسی کی بابت گفتگو ہوتی رہی۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی باتوں میں محض اُس کی دلجوئی کے لئے دلچسپی لے رہے ہیں تو اُس نے بات اُن کی دلچسپی کے موضوعات کی طرف موڑ دی۔

رمضان المبارک کا آغاز ہوا۔ ایک دن وہ کام سے گھر جاتے ہوئے پراچہ صاحب کے یہاں رکا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران اُس نے پراچہ صاحب سے خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی بابت دریافت کیا۔ وہ ہنس دیئے۔ اُن کی ہنسی سے وہ جھینپ سا گیا۔

انہوں نے پوچھا۔۔۔ آپ اُن سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟ آپ کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟

میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے میں تو اُن کے علم کے حوالے سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس نے اکھڑ کر کہا۔

اُس نے روزنامہ جنگ کے دفتر سے فون نمبر لے کر اُن سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہاں سے ایک ہی بات کہی گئی کہ آپ اپنا مسئلہ لکھ کر بھیج دیں۔ اب وہ مسئلہ کیا لکھ کر بھیجتا۔ وہ تو فقط اُن سے ملنا چاہتا تھا۔۔۔ کیوں؟ سچی بات تو یہ ہے اُسے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ اُن سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔۔۔ بس ایک تجسس سا تھا۔۔۔ ایک طلب اور تقاضہ کہ اُن سے ملنا چاہئے۔

’’اگر آپ جانتے ہیں کہ اُن سے کہاں ملا جا سکتا ہے تو بتا دیں۔ ورنہ کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں۔ مجھے یوں بھی مشاہیر سے کچھ خوف آتا ہے، کیونکہ اُن کا جو تاثر اُن سے ملنے سے پہلے ہوتا ہے اکثر وہ ملنے کے بعد قائم نہیں رہتا۔' بار بار مسئلہ کا ذکر ہونے سے شاید اُس کے اندر موجود مسائل کے انبار جن سے وہ آنکھیں چرائے پھرتا تھا اُس کے سامنے آجاتے تھے۔ یوں بھی یہ لفظ اُس کی چڑ سی بن گیا تھا۔ ہر ایک مسئلہ پوچھتا تو ہے لیکن حل کوئی نہیں کرتا بلکہ اکثر تو اُس کا مسئلہ سُن کر خود اُسی کا مسئلہ حل کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ تم نے یہ کیوں کیا، یہ کیوں نہیں کیا، تمہیں یہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جب کوئی حل نہیں کر سکتا تو پوچھتا ہی کیوں ہے؟۔۔۔ وہ جھنجھلا اُٹھتا تھا۔

’’جاننے کا کیا مطلب؟ بھئی وہ ہمارے پڑوسی ہیں اور ہم سے اُن کے بہت اچھے مراسم ہیں۔ وہ کئی بار ہمارے یہاں آچکے ہیں۔‘‘ پراچہ صاحب نے کہا۔

روضہ اقدس کی چادر کے حوالے سے پراچہ صاحب خود کو بہت اہم مانتے تھے اور اس بات پہ انہیں فخر بھی بہت تھا۔ انہوں نے اُن کے اپنے یہاں آنے کو جب چادر شریف کا شاخسانہ قرار دیا تو نہ جانے اُس کو یہ بات کچھ عجیب سی کیوں لگی لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ گلو بیٹے انکل کو ساتھ لے جاؤ اور انہیں عظیمی صاحب سے ملوا دو۔ پراچہ صاحب اس وقت یقیناً اچھے موڈ میں تھے۔

غلام محمد (گلو) ماشاءاللہ سات بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔ انہوں نے سعادت مندی سے انکل کی قیادت کی ہامی بھری اور وہ دونوں وہاں سے چار گھر دور ڈ-۳۲ کی طرف چل دیئے۔ ابھی وہ ایک گھر دور تھے کہ غلام محمد نے کہا۔ وہ جا رہے ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُن سے آگے دو بندے جا رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں کوئی برتن تھا۔ شاید افطاری کے لئے کچھ لینے جا رہے تھے۔

غلام محمد تیزی سے آگے بڑھ کر اُن سے جا ملا اور انہیں راستے میں روک کر کہنے لگا۔ انکل نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اُس نے اُن صاحب کو دیکھا جن سے غلام محمد مخاطب تھا۔ میانہ قامت، گٹھیلا لیکن گداز بدن، سفید کرتے پاجامے میں ملبوس، سفید خشخشی ڈاڑھی، مندی مندی پلکوں، تبسم آمیز آنکھوں سے انہوں نے اُس کی طرف نظر کی۔ اُس نے انہیں سلام کیا۔ 'کام اللہ کرتا ہے اور نام بندے کا ہو جاتا ہے'۔۔۔ انہوں نے اُس کو احترام اور عقیدت مندی کے جذبات کا اظہار کرنے کا موقع دیئے بغیر کہا۔

جی ہاں۔ اللہ ہی اپنے بندوں کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ کچھ کریں۔۔۔ جانے کیسے وہ بول پڑا۔

انہوں نے اُس کو نظر بھر کے دیکھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یوں انہیں راہ میں روک کر انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا اور یہ کوئی مہذب طریقہ بھی نہیں۔

'آپ سے ملنا تو چاہتا ہوں لیکن اس طرح نہیں۔۔۔ اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں' اُس نے جلدی سے کہا۔

'ہاں۔۔۔ تو آپ افطار کے بعد تشریف لے آئیں۔ اس وقت تو ہم افطاری کے لئے کچھ لینے جا رہے ہیں'۔

اور۔۔۔ 'جی مناسب ہے'۔۔۔ سُن کر وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

وہ انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ لوح و قلم کے علوم کا حامل بندہ۔۔۔ خراماں خراماں چلتا۔۔۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دائیں بائیں جھومتے ہوئے چل رہے ہیں۔ گلی کی نکڑ پہ مڑ کر وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو اُس نے غلام محمد کو اپنی طرف متوجہ پایا۔

'چلیں؟' اُس نے پوچھا

جی ہاں۔۔۔آپ افطار ہمارے یہاں کر کے ان سے مل کے جایئے گا'۔۔۔اُسے گلو پہ پیار اگیا۔

واپس پلٹتے ہوئے اُس نے اُس کے گھر کے بند دروازے کی طرف دیکھا جہاں روز نامہ جنگ کی دھاتی پلیٹ کے اوپر مکین کا نام نامی چمک رہا تھااور جہاں اسے افطار کے بعد آنا تھا۔

افطار تک وہ پراچہ صاحب کے یہاں رہا۔اس دوران کیا کیا باتیں ہوئیں اُس کا دھیان وہاں ہوتا تو اسے یاد بھی رہتیں۔اُن سے مل کر کوئی ہیجان، کوئی جوش محسوس نہیں کر رہا تھا۔بس ایک انتظار کی کیفیت تھی۔۔۔اُن سے کیا کیا پوچھے؟اُن کی کس کتاب پہ تبصرہ کرے؟کیا تبصرہ کرے؟وہ اُن سے کیا کہے گا کہ وہ اُن سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟افطار کے بعد نماز پڑھتے ہی وہ اُن کے گھر پہنچ گیا۔

جنت اور جہنم

گیٹ نیم وا تھا۔پورچ میں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔دو تین افراد پہلے سے موجود تھے اور کسی طرح کے انتظام میں مصروف تھے۔وہ جوتے اتار کر دری پر بیٹھنے کی جگہ کا تعین کر ہی رہا تھا کہ پورچ کو گھر سے ملانے والی روش پہ وہ سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔اُس نے انہیں سہ پہر کو دیکھا تھا۔اُس وقت اُس نے انہیں سر جھکائے چلتے دیکھا تھا۔اس وقت وہ چلتے ہوئے دائیں بازو کو بلند کر کے بائیں ہاتھ سے آستین کو اوپر کھینچ رہے تھے۔اگر اس لمحے تصویر لی جاتی تو وہ کسی کمان کو بانکپن سے کھینچتے تیر انداز محسوس ہوتے۔روش سے نیچے اتر کر وہاں موجود لوگوں کے سلام کا جواب دیتے وہ ایک کونے میں سر جھکا کے بیٹھ گئے۔وہ اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔چند لمحے سکوت رہا۔اُس نے بات کا آغاز کرنے کو کہا۔'یہ شجرِ ممنوعہ کیا ہے؟'

'نافرمانی کے درخت کو کہتے ہیں۔'

حتمی سے لہجے میں دیا گیا جواب اُس کے بالکل پلے نہ پڑا۔اُس نے دوٹوک جواب کو انتہائی غیر اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن قرآن حکیم میں تو لفظ شجرۃ" آیا ہے'۔

اُس کے ذہن میں تھا کہ وہ شجرہ کی مناسبت سے کچھ کہیں گے۔اُس کی سوچ تھی کہ اِس کا سرا کسی نہ کسی طرح آدم کے بہکنے کی اصل وجہ۔۔۔۔۔شیطان کی طرف سے ابدیت کا لالچ دیا جانا۔۔۔سے جڑا تھا اور اس لالچ کا شکار ہو کر آدم نے نسل کشی کی ابتدا کی تاکہ وہ اپنی اولاد کی صورت اپنا وجود برقرار رکھ سکیں۔اُس نے اُن سے یہ سوال اپنی سوچ کی تصدیق کے لئے کیا تھا۔مگر انہوں نے اُس کے راہوار فکر کو ایک بالکل ہی نئی راہ پہ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اُس کے ذہن کا اڑیل گھوڑا وہیں الف ہو کر اپنی بات پہ مصر رہنا چاہتا تھا۔

'میں نے کہا نا کہ وہ نافرمانی کا ایک درخت تھا۔'انہوں نے قدرے اصرار اور دوٹوک انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی۔اُس نے بات سے زیادہ لہجے کے فیصلے کن انداز کو توجہ دی اور اُن کی ناراضگی کے خوف سے کہا۔

'جی ہاں۔۔۔خوب فرمایا۔۔۔نافرمانی کا درخت۔۔۔واقعی ایک خوبصورت ترکیب ہے۔'کہہ کر اُس نے نہاں خانہِ دل میں سوچا یہ صاحب اپنی بزرگی کے سامنے کسی کی بھلا کیوں چلنے دیں گے۔اُس کے بعد کافی دیر خاموشی رہی۔پھر انہوں نے تبصرے کے سے انداز میں کہا۔

'لوگ تو اسے دانہ گندم بھی بتاتے ہیں۔'

اتنا کہہ کر وہ قدرے اُس کی طرف جھکے اور سر گوشی کے انداز میں پوچھا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟

جی ہاں۔ کہہ کر اُس نے استعجاب سے اُن کو دیکھا کہ اس اچانک سوال کا کیا محل؟

'نہ جانے وہ اس کا تعلق شجر ممنوعہ سے کیوں جوڑتے ہیں۔' انہوں نے مسکراتے ہوئے اُسی رازدرانہ انداز میں کہا۔

اُن کی یہ بات سُن کر وہ خوش ہو گیا۔ اُس کے ذہن سے جیسے کوئی جالا اتر سا گیا۔ اُس نے سوچا۔۔۔ کہنے کی تو بات ہے۔ کون جانے حقیقت کیا ہے؟ جیسے دانہ گندم کی بات اُس کو قبول نہیں اسی طرح اُس کی بات اُن کے نزدیک قابل اعتنا نہیں۔ اُس کو چاہئے کہ وہ اُن کی بات پہ غور کر کے دیکھے۔ اس خیال سے زیادہ اُن کے اپنائیت بھرے انداز نے اُس کو ڈھارس دی اور اُس نے ایک بار پھر کمر ہمت باندھی اور مطلب کی بات زبان پہ لے آیا۔ 'یہ کتاب لوح و قلم تو سمجھ آ کے بھی سمجھ نہیں آتی۔۔۔' اُس نے یہ بات اس جذبے سے کی کہ وہ اُس کو کوئی ایسا طریقہ بتائیں گے جس سے اُس کتاب کا متن اُس کے ذہن کی گرفت میں لانا آسان ہو جائے۔ اُس کتاب کو سمجھنے کی خواہش ہی کے ہاتھوں تو وہ وہاں آیا تھا۔

'جی ہاں۔۔۔ اس کتاب میں بہت گہرائی ہے۔' اس بار اُن کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اُس کا ذہن گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ اُس نے کیفیت کو اپنے اوپر طاری ہونے دیا۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا۔ وہاں کئی اور لوگ بھی آئے۔ وہ آتے اور آ کر ادب سے بیٹھ جاتے۔ اتنے میں ایک صاحب آئے تو آپ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں بانہیں پھیلا کر انہوں نے اُن صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ وہ السلام علیکم ابا حضور! کہہ کر لپٹ گئے۔ رشتوں کا ترسا ہوا وہ اُس منظر پہ سلگ کر رہ گیا۔ اپنی محرومیوں پہ کڑھ کر رہ گیا۔ رشک نے اُس کے دل میں طلب کی ایک لہر اچھالی۔ مجھے بھی۔۔۔ لیکن اُس نے خود کو ڈانٹ دیا۔ کہاں تم کہاں وہ۔

معانقہ کے بعد وہ صاحب دوزانو بیٹھ گئے۔کچھ دیر خاموشی رہی پھر انہوں نے کہا۔'اب حضور ایک الجھن ہے۔'

اُنہوں نے جھکے سر کو اُٹھائے بغیر اُن صاحب کی طرف دیکھا اور کہا۔جی اقبال بھائی۔۔۔فرمایئے کیا الجھن ہے؟

'جب ہم کہتے ہیں کہ انسان مجبور ہے، بے بس ہے اور بے اختیار ہے تو یہ جہنم کا کیا سلسلہ ہے؟اقبال صاحب نے بغیر کسی تمہید کے سوال داغ دیا۔اوروں کا تو کچھ نہیں کہا جاسکتا وہ آگے جھک کر۔۔۔اُن کا جواب سننے لپکا۔اُن کی طرف سے جواب کا آغاز ہونے کے اُس مختصر سے وقفے میں فلسفہ جبر و قدر پہ پڑھی ہر بات اُس کے ذہن نے لہرائی۔اُس نے اس مسئلے پہ خود بھی بہت سوچا تھا لیکن وہ کسی بھی جواب سے، کسی بھی نظریئے سے کماحقہ مطمئن نہیں تھا۔ہر فلسفہ، ہر نظریہ اُس کی تنقید کی کڑی کسوٹی پہ پورا اترنے سے قاصر رہ جاتا تھا۔دیکھیں فقیر اس ضمن میں کیا کہتا ہے؟توجہ کی شت جمائے، کاسہ، سماعت کو اُن کی طرف پھیلائے۔۔ہم تن گوش ہوتے۔۔۔ادراک کو حاضر رکھتے۔۔۔اُس نے سُنا۔

”اگر کوئی بچہ چوری کرے تو کیا آپ حد جاری کر کے اُس کے ہاتھ کاٹ دیں گے؟“

انہوں نے جواب دینے کی بجائے ایک سوال پوچھا۔

وہاں بیٹھے سب ہی افراد کے سر نفی میں ہلے۔

سوال کو سماعتوں میں تہہ نشین ہونے کا موقع دینے کے بعد انہوں نے سوال پوچھنے والے صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اللہ کے بچے بن جائیں۔۔۔۔آپ پہ بھی کوئی حد جاری نہیں ہو گی۔“

بات سماعت کے راستے شعور میں داخل ہوئی اور ادراک میں جا کر پلجھڑی بن گئی۔ آگہی کا اجالا وجدان کی لذت بنتا ہے۔ اک دیرینہ الجھن حل ہوئی۔ اللہ کے بچے بن جائیں۔۔۔ بچہ بننے کی بات زیادہ اُس جہنم سے نجات کا اتنا آسان راستہ سمجھ آنے کی مسرت ابھری۔ اُس کے ذہن نے ایک کلکاری ماری۔۔۔ لطف وانبساط کی لہر نے اُس کو اتنے زور سے جھلایا کہ بے ساختہ اُس کے منہ سے قہقہ نکل گیا۔ وہاں بیٹھے سبھی افراد نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ کسی کی آنکھوں میں اُس کے لئے سرزنش نہ تھی۔ کسی نے بُرا نہیں منایا تھا۔ وہ اپنے انبساط کو ادب کی حدود میں رکھنے پر قادر تھے۔ اُس کو اس کا سلیقہ نہ تھا۔ اس گستاخانہ انداز مسرت پہ وہ خود ہی خفیف سا ہو کر رہ گیا۔

اتنے میں ایک صاحب نے رحل مدرس لا کر اُن کے سامنے رکھ دی اور کہا۔ لوح وقلم کی کلاس شروع ہونے کو ہے غیر متعلق اصحاب کا وقت ختم ہوا۔۔۔ ان سے درخواست ہے وہ وہاں سے ہٹ جائیں۔ لوح وقلم کی کلاس شروع ہونے کو ہے۔۔۔ وہ وہاں اور کس لیے آیا تھا۔۔۔ اس موقع کو وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے وہاں سے نہ ہٹنے کا فیصلہ کر لیا اور ڈٹ کر بیٹھ گیا۔ اُن صاحب نے دوبارہ اعلان کیا۔ کلاس کے طلبا کے علاوہ باقی لوگ وہاں سے چلے جائیں۔ اُس نے اعلان سُن کر بڑی لجاجت اور منت بھری نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا کہ وہ اس کو وہاں بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔ انہوں نے اپنے سامنے موجود کاغذات سے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور نظر ہٹالی۔

وہ اس کا کیا مطلب لے؟ کیا انہوں نے اُس کو وہاں بیٹھنے کی اجازت دے دی ہے یا انہوں نے اُس کو اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ لوح وقلم کو سمجھ سکے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اُس کا دل وہاں سے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ابھی وہ الجھ ہی رہا تھا کہ کسی نے اُس کا

نام لے کر پکارا۔ وہ چونکا اور دیکھا کہ اُسے گیٹ کی طرف بلایا گیا ہے۔ وہاں اُس کے لئے پیغام تھا کہ وہ فوراً گھر پہنچے۔ کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہے۔ اُس نے پلٹ کر اندر دیکھا اور باہر آ گیا۔

لوح و قلم کا انگریزی ترجمہ

(۲)

ایک دو روز بعد اُس نے اخبار میں تھیوسوفیکل ہال میں عظیمی صاحب کے خطاب کی بابت پڑھا اور وہاں پہنچ گیا۔ خطاب کے دوران وہ انہیں دیکھتا رہا۔ ایک دو دفعہ تو اُسے لگا وہ صرف اُسی سے مخاطب ہیں۔ اِس سے اُسے طمانیت اور مسرت کے ساتھ ساتھ اپنائیت کا ایک احساس ہوا۔۔۔ خطاب شروع ہو کر ختم ہو گیا۔ روح اور اُس کو جاننے کے حوالے سے خطاب کے بعد افطاری ہوئی۔ وہ انہیں افطاری کا انتظام کرتے، لوگوں سے ملتے، اُن کے سوالوں کے جواب دیتے۔۔۔ دور دور دیکھتا رہا۔ وہ اُن سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا، بہت سی باتیں کہنا چاہتا تھا، اُن سے بہت کچھ سننا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن لوگوں کے سامنے نہیں۔۔۔ کہیں تنہائی میں۔۔۔

اکیلے میں۔۔۔اُس کا جی چاہا کہ اُن کے پاس جا کر اُن سے اپنی آرزو کا اظہار تو کر دے۔۔۔اور اگر انہوں نے منع کر دیا۔۔۔تو۔۔۔اس تو کے بعد کی صورت اُسے کسی طور قبول نہ تھی۔اس بارے میں کچھ سوچنا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔ لیکن وہ تو روح سے واقف ہیں وہ اُس کے دل کی بات کیوں نہیں سُن رہے۔وہ تو صاحبِ کشف ہیں۔اُن سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں۔وہ اُس کی مدد پہ کیوں آمادہ نہیں ہو جاتے۔وہ تو جانتے ہیں کہ وہ اندر سے کتنے چھوٹے دل کا مالک ہے اُس میں ٹوٹنے اور دھتکارے جانے کے صدمے کو سہنے کی تاب نہیں۔وہ کرے تو کیا کرے؟ایک دفعہ جب وہ اُس کے پاس سے گزرے۔اُس نے چاہا کہ وہ اُن سے مصافحہ کرے لیکن جب تک وہ اس ارادے پہ عمل کرنے کی ہمت مجتمع کرتا۔۔وہ دور جا چکے تھے۔لوگوں کے جلو میں وہ ہال سے باہر نکلے اور وہاں سے چلے گئے۔

وہاں سے گھر جاتے ہوئے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ خط لکھ کر اُن سے حالِ دل کہے گا۔اُس رات وہ دیر گئے تک خط لکھنے کی کوشش کرتا رہا۔پہلے تو القاب و آداب کا مسئلہ ہی طے نہیں ہو سکا۔پھر یہ لکھنا کہ میں آپ سے مل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں اُس کو کوئی مناسب بات نہ لگی۔میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔کیا پوچھنا اور کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔اُس نے اُن کی طرف سے خود سے پوچھا۔اس کے اُس نے بہت سے جواب سوچے لیکن ایک بھی بات اُس کو نہ بھائی۔وہ اُلجھتے اُلجھتے سو گیا۔اگلے روز بھی وہ کوشش کرتا رہا کہ کوئی مناسب سی بات لکھنے میں کامیاب ہو جائے لیکن وہ جو بھی بات طے کرتا کچھ لمحوں بعد وہ اُس بات کو خود ہی رد کر دیتا۔اُس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ اُن سے چاہتا کیا ہے؟ ملنا؟ مگر کیوں؟بس دل چاہے چلا جا رہا تھا اور وہ اُس کو بہلانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

عید پہ وہ عصر کے بعد بیوی بچوں کے ہمراہ پراچہ صاحب کے گھر گیا۔ وہاں اُس نے پراچہ صاحب سے پوچھا۔ 'آپ خواجہ صاحب سے عید ملنے گئے؟ 'اُس کو توقع تھی کہ وہ کہیں گے کہ ہاں۔۔ وہ تو میں اُن سے صبح عید گاہ میں ہی مل لیا تھا۔ لیکن انہوں نے کہا۔ 'بھئی آپ نے اچھا کیا مجھے یاد دلا دیا۔ ایسا کرتے ہیں ابھی چلتے ہیں اور مل آتے ہیں۔'

کچھ ہی ساعتوں کے بعد وہ پراچہ صاحب کے ہمراہ اُن کے گھر میں ڈرائنگ روم سے ملحق کھانے کی میز پر بیٹھا۔۔ پراچہ صاحب کو اُن سے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ پراچہ صاحب سے بات کرتے کرتے کبھی کبھار وہ اُس کی طرف بھی دیکھ لیتے۔ دونوں کی گفتگو میں وقفہ آیا تو میز پر آگے کو جھکا اور ایک جھٹکے سے بولا۔ مجھے آپ کی سرپرستی چاہیئے۔ دونوں نے اُسے دیکھا۔ پراچہ صاحب نے حیرت سے اُسے اور انہوں نے بلا کسی تاثر کے اور کہا۔ ابھی تو ہمیں خود بھی سرپرستی چاہیئے۔ اُس نے اُن کی بات سُنی اور تیزی سے کہا۔ بلاشبہ آپ کو اپنے بڑوں کی سرپرستی درکار ہو گی لیکن میرے لئے تو آپ بڑے ہیں۔۔۔ میں تو آپ ہی سے درخواست کر سکتا ہوں۔' اُس کی اس بات کو سُن کر وہ بڑی رسانیت سے مسکرائے۔ پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔ آپ رات کو سونے سے پہلے نیلی روشنی کا مراقبہ کیا کریں اور یا حی یا قیوم کا ورد کیا کریں۔ اُن کی بات مکمل ہونے سے پیشتر پراچہ صاحب نے کرسی چھوڑ دی اور کہا۔ ہم چلتے ہیں۔ حضور اجازت دیں اور یہ کہنے کے ساتھ باہر کو چل دیئے۔ انہیں الوداع کہنے وہ اُن کی گاڑی تک اُن کے ساتھ آئے۔

وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے بلا تمہید اچانک بول کر اچھا نہیں کیا تھا پراچہ صاحب نے اچانک اُٹھ کر کوئی زیادتی کی تھی۔۔۔ وہ کڑھ کر رہ گیا۔ وہ اُن سے پوچھنا چاہتا تھا یہ نیلی ہی روشنی کا مراقبہ کیوں۔۔۔۔ گلابی یا جامنی روشنی کا کیوں نہیں۔۔۔ یا حی یا قیوم کا ورد کرنے سے کیا ہو گا؟ کب ہو گا؟ کیسے ہو گا؟ محض ورد کرنے سے اللہ کیسے مل سکتا ہے؟ اور اُس کی سرپرستی کی درخواست کا کیا ہوا؟ پراچہ صاحب کو اس بات کا جواب آنے سے پیشتر نہیں اُٹھنا چاہیئے تھا۔۔۔۔ دوبارہ ملاقات کا وقت بھی تو طے نہیں ہوا تھا۔

اُسے چاہئے تھا کہ وہ پراچہ صاحب کے ساتھ جانے کی بجائے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ جاتا۔ کم از کم وہ اس طرح اچانک اُٹھ کے تو نہ چلتے۔۔۔اُس کو بات کرنے سے تو نہ روکتے۔ اگر پراچہ صاحب اُٹھ بھی گئے تھے تو خود اُس نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ذرا ٹھہریں ۔۔۔مجھے بات کرنا ہے یا ٹھیک ہے آپ چلیں میں بات کر کے آتا ہوں۔۔۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں الجھتا اور کڑھتا رہا۔ آخر وہ وقت پہ کیوں نہیں کہہ پاتا اور وقت اُس کے ہاتھ سے کیوں نکل جاتا ہے۔

اُس نے مراقبہ کرنا شروع کیا۔ یَا حَیُّ یَا قَیُّوم کا ورد کرتا۔۔ راتوں کو اُٹھ کر بستر پہ بیٹھ جاتا۔۔۔ یا بستر چھوڑ کر باہر گلی میں ٹہلنے نکل جاتا۔ اُسے چاند میں کبھی حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ رحمتہ اللہ علیہ کی شبیہہ نظر آتی تو کبھی اُسے عظیمی صاحب نظر آتے۔ راہ چلتے ٹھٹھک جاتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ سامنے سے آرہے ہیں۔ جب چلنے والا پاس آتا اور وہ دیکھتا کہ اُسے اشتباہ ہوا ہے۔

اُسے کراچی آئے اب دو ڈھائی سال ہو گئے تھے۔ اس دوران اُس نے دو تین مرتبہ خواجہ صاحب سے ملنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی ایک مرتبہ جب وہ روحانی ڈائجسٹ کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو ابھی ابھی اُٹھ گئے ہیں۔ جب وہ اُن کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ایک روز وہ اپنے ایک دوست حنیف شاہ صاحب سے ملنے نوائے وقت کے دفتر گیا۔ شاہ صاحب اکثر اُس کو سراہتے اور اُس کی دلجوئی کرتے۔ وہ اُس کے مداح تھے اور وہ اُن کا۔ باتوں باتوں میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا ذکر ہوا۔ اُس دفتر میں کام کرنے والے ایک صاحب نے کہا۔ آج تو اُن کا عرس مبارک ہے اور پروگرام کی خاص بات عظیمی صاحب کا وہاں موجود ہونا اور قوالی جیسے پروگراموں کا نہ ہونا بتایا۔ شاہ صاحب نے جیسے اُس کے من کی بات پڑھ لی اور وہ بھی شادمان ٹاؤن میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے عرس کی تقریب میں شرکت کے لئے اُس کے ہمراہ چل دیئے۔

وہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا ساتواں یا آٹھواں عرس تھا۔اس سے پیشتر اُس نے لڑکپن میں ایک دو مرتبہ۔۔۔جن دنوں وہ لاہور رہتا تھا۔۔۔اُس نے داتا صاحب کے عرس میں شرکت کی تھی۔اُس کو اُس وقت اس قسم کی کسی تقریب میں شرکت کے آداب کا کوئی قرینہ تھا اور نہ کوئی خاص لگاؤ۔وہ تو کسی دیہاتی کی طرح شہر کی روشنیاں دیکھنے چلا گیا تھا اور وہی دیکھ کر پلٹ آیا تھا۔روشنیوں کے علاوہ اُس کو جو بات یاد تھی وہ وہاں روٹی دال رکھ کر تقسیم کیا جانا تھا۔اُس کو بتایا گیا۔۔۔یہ لنگر ہے۔اُس وقت سے اب تک وہ روٹی پہ دال رکھ کے کھانے کو ہی لنگر سمجھتا رہا تھا۔

لیکن آج وہ صاحب لوح و قلم کو ہدیہ ءعقیدت اور خراج پیش کرنے اور اُن کے علوم کے وارث اُس بندے کو دیکھنے وہاں چلا آیا تھا جنہیں انہوں نے سولہ برس سے زاہد شب و روز کی قربت اور تربیت سے نوازا تھا۔وہ ہر چیز کو اشتیاق اور تجسس سے دیکھ رہا تھا۔وہاں لوگوں کا اتنا جم غفیر تو نہ تھا جس قدر اُس کو توقع تھی مگر پھر بھی کافی لوگ تھے۔مزار کی مختصر سے عمارت بھری ہوئی تھی۔صحنِ مزار میں بھی کافی لوگ تھے۔عصر کی اذان ہو رہی تھی کہ چہل پہل میں ایک تیزی سی ابھر آئی۔لوگوں نے داخلی راستے کی طرف ہجوم کیا۔وہاں سے خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ایک جمگھٹے کے جلو میں آ رہے تھے۔سب اُسی کی طرف دوڑ پڑے۔جو اپنی جگہ کھڑے تھے وہ بھی اسی سمت دیکھ رہے تھے۔اُس لمحے وہاں موجود بیشتر افراد کے لئے مرکز نگاہ وہی تھے۔اُس کے قریب کھڑے ایک صاحب اپنے ہمراہی کو بتا رہے تھے۔یہ شمسی صاحب ہیں۔بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ان کی دعا میں اثر بہت ہے۔

یہاں زیادہ تر لوگ اسی لئے آئے ہیں کہ ان سے دُعا لیں۔اُس کا جی چاہا کہ اُن صاحب کی اصلاح کو انہیں بتائے کہ یہ شمسی صاحب نہیں ہیں۔یہ بہت عظیم سکالر اور عالم ہی نہیں بلکہ ایک روحانی شخصیت ہیں اور عظیمی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ہر ایک کو حق ہے وہ جس قدر چاہے اپنے علم کو بڑھائے یا محدود رکھے۔

داخلی دروازے کے قریب بنے دوایک کمروں کے صحن میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر عظیمی صاحب بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ بدستور گھیرا ڈالے وہاں موجود تھے۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ وہاں سے اُٹھے تو ہجوم میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ لوگ لپکے۔ کسی نے کہا۔۔۔ نماز کے بعد۔۔۔ نماز کے بعد۔ اُس کو خیال ہوا کہ شاید وہ وہاں کچھ بانٹیں گے اس لئے لوگ گڑ کی مکھیوں کی طرح اُن کی طرف کھینچ رہے ہیں۔

نماز کے دوران اُس نے محسوس کیا کہ بیشتر افراد اُن کے قریب کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے گرد مقناطیسی ہالے کو وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا لیکن وہ اُس کو اُن کی کتب اور تحریروں سے لیا گیا تاثر قرار دے رہا تھا۔ کیا اُن سب افراد نے بھی۔۔۔ جو وہاں موجود تھے، اُن کی تحریروں سے ویسا ہی تاثر لیا تھا جیسا کہ خود اُس کو تجربہ ہوا تھا یا اُس کی وجہ کچھ اور تھی۔ وہ کچھ طے نہیں کر پا رہا تھا اور محض ایک تماشائی بنا ہوا سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ نماز کے بعد کچھ لوگوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا اور وہ اندر مزار کی طرف چل دیئے۔

جوں جوں وہ مزار کے قریب ہو رہے تھے دھکم پیل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ دھکم پیل اُس کو بہت ناگوار گزر رہی تھی۔ اُس کو اس کی کوئی تک بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس ہجوم میں وہ یہی سوچ سکا کہ ماحول کے ہجوم سے نجات پانے کی ضرورت کا پرچار کرنے والوں کو ہی ہجوم کچلنے پہ تلا ہوا ہے۔ اُس نے شاہ صاحب سے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تو انہوں نے عجیب سا تبصرہ کیا۔ اس ہجوم اور دھکم پیل میں نہ جانے کتنے لگوں کی جیب کٹے گی۔

اُن کے سرِ مزار پہنچنے کے بعد تلاوت ہوئی اور ختم پڑھا جانے لگا تو قدرے خاموشی ہو گئی۔ ختم کے بعد درود و سلام کے ساتھ ہی مزار پہ چادریں چڑھائی جانے لگیں۔ لوگ پھولوں کی چادریں، کشیدہ کی ہوئی، رنگ برنگی ریشمی چادریں چڑھا رہے تھے۔

مزار پہ اتنے پھول اور چادریں چڑھائی گئیں کہ مزار اپنی سطح سے دو فٹ اونچا ہو گیا۔ پھر دُعا ہوئی۔ دُعا کے ختم ہوتے ہی اب جو دھکم پیل شروع ہوئی وہ پہلے کی نسبت زیادہ زوردار اور بے محابا تھی۔ وہ چند لوگ جو عظیمی صاحب کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھے انہیں دھکا لگنے سے بچانے کی تگ ودو میں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔

صحن مزار میں پہنچ کر انہوں نے ہاتھ بلند کیا اور کہا۔ باری باری آئیں۔ اُن کے یہ کہتے ہی لوگ بے طرح لپکے۔ سب اُن سے گلے ملنا چاہتے تھے۔ خواتین اُن کے قریب ہوتیں اور وہ اُن کے سر پر ہاتھ رکھتے۔ باری باری آئیں۔۔۔ قطار بنائیں۔۔۔ بار بار کہا جارہا تھا اور لوگ قطار بنا بنا کر انہیں گلے مل رہے تھے۔ اُس نے دیکھا جو بھی اُن سے گلے مل کر ہٹتا اُس کا چہرہ تمتما رہا ہوتا۔ کامیاب ہونے پر۔۔۔ کچھ پالینے پہ جو خوشی ہوتی ہے کچھ ویسی ہی خوشی کی لو اُن کے بشرے سے پھوٹنے لگتی۔

اُس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی سی خاتون اُن کے قریب گئیں۔ کچھ کہا اور اُن کے پاؤں پکڑنے جھکیں۔ انہوں نے متانت سے انہیں منع کرتے ہوئے کہا۔ 'نہیں ماں جی۔۔ نہیں! منع کرنے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ وہ ٹھٹھک سی گئیں اور بے اختیاری سے اپنے دونوں ہاتھ اُن کی واسکٹ پہ پھیر کے اپنے چہرے پہ پھیر لئے۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھے جارہا تھا۔ اُس کی نگاہیں اُن کے چہرے کا طواف کئے جارہی تھیں۔ اُس نے سوچا اگر سکون۔ ٹھہراؤ اور علم مجسم ہو کر متانت اور مسکراہٹ اوڑھ لے اور عاجزی کے سنگھاسن پہ بیٹھ جائے تو شاید کچھ ایسی ہی صورت بنے۔

شاہ صاحب نے اُس کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہے ہوں کیا ارادے ہیں؟ اُس نے کندھے اچکائے اور اپنی جگہ کھڑا گلے ملنے والوں کی ختم ہوتی قطار کو دیکھتا رہا۔ وہ گلے ملنے والوں کو۔۔۔ گلے ملنے سے پہلے اور بعد میں۔۔۔ کے عنوان سے دیکھ رہا تھا۔ گلے ملنے سے پہلے تذبذب، درماندگی اور بے یقینی کی سی کیفیت اور گلے ملنے کے بعد خوشی اور طمانیت کا کیف۔۔۔ یہ سب اتنا واضح تھا کہ

اُس کواس فرق کو محسوس کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اتنا کھویا ہوا تھا کہ اُسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب شاہ صاحب اس کے پہلو سے نکل کر قطار میں جا کھڑے ہوئے۔ وہ اُس وقت چونکا جب وہ قطار میں گلے ملنے والوں میں تیسرے چوتھے نمبر پہ پہنچ چکے تھے۔ اُس سے نگاہیں چار ہوتے ہی وہ مسکرائے اور اُسے بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی اُس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولے۔ اُس کی خود پسندی اس طرح سے اُن سے گلے ملنے میں مزاحم تھی۔ وہ تو اس طرح گلے ملنا چاہتا تھا کہ کم از کم وہ جانتے تو ہوں کہ اُن کے سینے سے لگنے والا کون ہے؟ اور پھر قطار میں لگ کر گلے ملنے اور خود اُن کا اپنی بانہیں پھیلا کر اپنے سینے سے لگانے میں جو فرق تھا وہ فرق بھی اُس کی ہچکچاہٹ کا سبب تھا۔

شاہ صاحب اُن سے گلے مل کر اُس کے پاس آئے اور کچھ اس تفاخر سے اسے دیکھا گویا اُس کی محرومی پہ تاسف کر رہے ہوں۔ جب آخری آدمی مل کر ہٹ رہا تھا تو اُس نے بے اختیار ہو کر قدم بڑھائے اور اُن سے گلے ملا۔ گلے ملنے سے پہلے اُس کی نگاہوں نے اُن کے چہرے کو اس امید سے دیکھا کہ شاید وہاں شناسائی کی کوئی لہر ابھرے۔ لیکن وہاں صرف ایک دھیمی سی مسکان ہی دیکھ سکا۔ گلے مل کر ہٹتے ہوئے اُس نے سنا۔۔۔ بس بھئی۔۔۔ یا اور کوئی بھی ہے؟ اُس کا جی چاہا وہ پلٹ کر پھر اُن کے سینے سے لگ جائے۔ لیکن اپنے اس ندیدے پن کا اظہار کرنے کو درکار ہمت کہاں سے لاتا۔

اُس روز وہ دیر تک سونے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کو بظاہر کوئی پریشانی بھی نہ تھی لیکن وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ اُن کی کتابوں میں سے پڑھے ہوئے جملے اور باتیں اُس کے ذہن میں دور کرتی رہیں۔ پھر وہ اُٹھ بیٹھا اور کتاب لوح و قلم از سرِ نو پڑھنے لگا۔ اذان فجر کے وقت اُس نے کتاب بند کی۔ کچھ دیر مراقبہ کرنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔ نیم غنودگی میں دیکھا کہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روبرو دوزانو بیٹھا ہے۔ آپ ﷺ نے کسی کو طلب کیا۔ باب العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لاتے ہیں تو آپ

ﷺ اُن کو مسافر کی مدارت کا حکم دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ۔۔۔جی اچھا۔۔ کہہ کر چلے جاتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو اُنؓ کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک کاسہ نما پیالہ ہے۔۔۔۔دستہ لگا ہوا۔۔۔۔وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر پیالہ اُنؓ کے ہاتھ سے لے لیتا ہے۔دیکھتا ہے کہ پیالہ دودھ سے لبریز ہے۔وہ اُس پیالے کو منہ لگا کر دودھ پیتا ہے اور ہنستے ہوئے کہتا ہے۔۔۔واہ یہ تو اونٹنی کا دودھ ہے۔۔۔اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔اُس نے بہت غور کیا۔اُس کو اس خواب کی کچھ سمجھ نہ آئی۔اُس نے سوچا کہ جب بھی موقع ملا وہ عظیمی صاحب سے اس کی تعبیر لے گا۔

اُس نے کئی بار کوشش کی کہ اُن سے ملاقات ہو جائے لیکن ہر بار ناکام ہی رہا۔ایک روز وہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے مزار پہ گیا۔وہاں کوئی نہیں تھا۔اُس کو وہاں سکون اور طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔اُس روز بھی اُسے ایسا ہی محسوس ہوا گویا وہ کسی ٹھہرے ہوئے پر سکون پانی میں اتر گیا ہو۔اس نے مراقبہ کے بعد دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور سوچنے لگا کیا دُعا مانگے۔کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے طے کیا کہ اُس کو اپنے کئے گئے وعدے نبھانے میں دشواری کا سامنا رہتا ہے۔اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُس نے دعا کی۔ بار الٰہ میں جس سے جو وعدہ کیا کروں وہ پورا ہو جایا کرے۔دُعا ختم ہوتے ہی اُس کو لگا۔کسی نے اُس سے دریافت کیا۔کیا وہ جھوٹے وعدے کرتا ہے؟اُس نے جواباً کہا۔نہیں اپنی طرف سے تو وہ سچا وعدہ ہی کرتا ہے لیکن حالات و واقعات اُس کو جھوٹا کر دیتے ہیں۔اس پہ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔تو اس کا مطلب ہوا کوئی تمہیں جھوٹا کر دیتا ہے۔بھئی جب کوئی اور جھوٹا کرتا ہے تو تمہیں چاہیئے کہ تم جھوٹے ہو جایا کرو۔

اُس نے اس قسم کی منطق اس پیشتر اپنے اندر کبھی ابھرتے محسوس نہیں کی تھی۔وہ ڈر گیا۔اُس نے اپنی دُعا تبدیل کر دی اور کہا۔ یا اللہ تو مجھے اتنا علم اتنی سوجھ بوجھ اور توفیق دے کہ میں تیرے کاموں کو اُس طرح سمجھ سکوں۔۔۔جس طرح وہ ہوتے ہیں۔

اس دُعا کے بعد وہ اُٹھ کر وہاں سے چلنے کو تھا کہ اُسے خیال آیا کہ اُسے یہ دُعا کرنا چاہیئے تھی کہ لوح و قلم اُسے سمجھ آجائے۔ ابھی وہ اس خیال کو الفاظ میں ادا کرنے کی بات سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کو اپنے اندر ایک اور عجیب سا خیال ابھرتا محسوس ہوا۔ دراصل یہ کتاب روحانی سائنس کی کتاب ہے اور وہ سائنس کو انگریزی زبان میں پڑھنے کا عادی ہے اس لئے اگر وہ کتاب کو انگریزی میں پڑھے گا تو یہ کتاب اُسے سمجھ آجائے گی۔ اُس نے سوچا کہ بات تو درست ہے لیکن جہاں تک اُسے معلوم ہے یہ کتاب انگریزی زبان میں دستیاب نہیں ہے تو وہ اسے انگریزی میں کیسے پڑھے ؟

ترجمہ کر کے۔۔۔ کوئی اُس کے اندر بولا۔

اُس کے بعد چار ساڑھے چار سال کب اور کیسے گزرے اسے کچھ ہوش نہیں۔ دن بھر سکول میں اور سکول کے بعد ٹیوشن سنٹر جا کر بچوں کو پڑھاتا۔۔ وہاں سے رات کو گھر آتا۔ کھانا کھا کر جب بیوی بچے سو جاتے تو وہ بیٹھ کر ترجمہ کرتا۔ اُس کو اتنی انگریزی کہاں آتی تھی کہ وہ لوح و قلم جیسی معرکہ الآرا کتاب کے ترجمہ کا حق ادا کر سکتا۔ مناسب الفاظ اور اصطلاحات کی تلاش میں کتنے ہی دروازے اُس کی دستک کی زد میں آئے اور جب اُس کو اور کچھ نہ سوجھا تو اُس نے ڈکشنری کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ بعض اصطلاحات کے لئے نئے الفاظ تراشے۔ ترجمہ مکمل ہو گیا تو اُس کو ٹائپ کیا۔ اُس میں غلطیوں کی نشاندہی کرتا اور پورا مسودہ دوبارہ ٹائپ کرتا۔ چار بار ایسا کرنے کے بعد اُس کو کچھ اطمینان ہوا تو اُس نے اُسے کسی ایسے بندے کو دکھانے کا سوچا جو اردو اور انگریزی پہ یکساں عبور رکھتا ہو۔

انہی دنوں اُس کی دوستی ماجد علی سید سے ہو گئی۔ انگریزی انشا پردازی میں وہ بہت ماہر تھے۔ اُن کی کئی کہانیوں کو عالمی مقابلوں میں انعام بھی ملا۔ انہیں جنرل نالج سے بہت شغف تھا۔ عسکری حقائق کے عنوان سے ایک انسائیکلوپیڈیا بھی مرتب کیا تھا۔ اُن کے انگریزی فکاہیہ کالم کئی روزناموں اور ہفت روزوں میں شائع ہوتے تھے۔ اُس نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اُس کے کئے

ہوئے ترجمے کا مسودہ پڑھ کر اگر کوئی غلطیاں ہوں تو اُن کی نشاندہی کر دیں۔ پہلے تو انہوں نے کوئی توجہ نہ کی لیکن اُس کے اصرار کے سامنے بالآخر گھٹنے ٹیک دیئے اور یہ طے ہوا کہ وہ ایک وقت میں انہیں دس اوراق دے جایا کرے اور جب وہ دس اوراق پڑھ لئے جائیں گے تو وہ مزید دس اوراق انہیں دے دے گا۔

رفتہ رفتہ مسودہ تمام ہوا۔ ایک روز باتوں باتوں میں کہا۔ آپ نے اتنا اچھا ترجمہ کیا ہے کہ قلندر بابا اولیا کا لب و لہجہ تک انگریزی میں منتقل کر دیا ہے۔ یوں لگتا ہے حضور قلندر بابا اولیاءؒ انگریزی میں بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا یہ لوح و قلم اتنی بڑی کتاب ہے کہ اس سے دو سو کتابیں مزید جنم لیں گی۔

ماجد سید کی اس بات نے اُس کو حوصلہ دیا۔ اُس کی ہمت بندھی تو اُس کو خواہش ہوئی کہ کسی طرح وہ اس مسودے کو عظیمی صاحب تک پہنچا دے۔ اُس کی بیوی نے ایک ایسی بات کہی کہ اُس کے حوصلے پست ہو گئے۔ اُس نے کہا۔ آپ نے اتنی محنت کی اگر انہوں نے اسے ناپسند کیا تو کیا آپ سہہ سکیں گے؟ ناپسند کیا؟ کیوں ناپسند کریں گے؟ اُس نے خالصتاً اپنی طالب علمانہ تشنگی کی خاطر یہ کنواں کھودا تھا اور اب اگر وہ اس علم کی ترویج چاہتا تھا تو اُن کو کیوں ناپسند ہو گا؟ وہ الجھ کر رہ گیا۔ اُس نے مسودے کو ڈاک کے ذریعے بھیجنے کا سوچا لیکن پھر فیصلہ کیا کہ خود روحانی ڈائجسٹ کے دفتر جائے گا اور یہ مسودہ وہاں چھوڑ آئے گا۔ پھر بعد میں جو بھی فیصلہ کریں۔۔ کریں۔

روحانی ڈائجسٹ کے دفتر پہنچا تو استقبالیہ ڈیسک پہ ایک صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ انہوں نے کچھ توقف کے بعد توجہ کی اور پوچھا۔ جی فرمایئے؟ کیسے آنا ہوا؟ اُس نے کہا۔ خواجہ صاحب سے ملنے۔

وہ تو انڈیا گئے ہوئے ہیں اگر آپ کا کوئی مسئلہ ہے تو لکھ کر دے جائیں وہ آئیں گے تو آپ کو جواب دے دیں گے۔

اُس نے کہاالحمد اللہ میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے کتاب لوح و قلم کا ترجمہ کیا ہے اور میں اس مسودہ اُن کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کب تک آئیں گے ؟

دوماہ بعد۔ جواب ملا

اُن کی جگہ کوئی اور صاحب ہوں تو اُن کے حوالے کردوں؟

بغیر کوئی تاثر لئے انہوں نے کہا۔ 'نہیں۔ جب وہ انڈیا سے آجائیں تو آپ یہ خود انہی کو دیں۔'

اُس نے سوچا۔ کتاب لوح و قلم یقیناً ان صاحب کے مطالعے سے نہیں گزری ہے ورنہ وہ اتنے سپاٹ نہ رہتے اور اُن سے بات کرنے کی خاطر کہا۔ میں نے یہ کام بہت ڈرتے ڈرتے کیا ہے کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔۔۔

انہوں نے اسی سپاٹ سے لہجے میں کہا۔۔ ڈرتے ڈرتے کیا ہے تو پھر اچھا ہی ہوا ہو گا اور واپس اپنے سامنے رکھے کاغذوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہاں سے واپس آکر اُس نے مسودے کو الماری کے اوپر رکھا اور اُس طرف سے دھیان ہٹانے کی طرف لگ گیا۔ وہ خود سے بحث کرتا۔ تم نے یہ کام لوح و قلم کو سمجھنے کے لئے کیا اب اس کو انہیں دکھا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ اس بہانے اُن سے ربط استوار کرنا چاہتا ہوں۔ بالآخر اس نے خود اپنے سامنے اعتراف کر ہی لیا۔

چند دن بعد اُس نے ڈائجسٹ کے دفتر فون کیا۔ فون پہ وہی صاحب بات کر رہے تھے جن سے وہ اُس روز ملا تھا۔ اُس نے اپنا نام بتا کر تعارف کے طور پر کہا۔۔۔ وہی جس نے لوح و قلم کا ترجمہ کیا ہے اور۔۔۔۔ پیشتر اس کے وہ کچھ اور کہتا انہوں نے اُس کی

بات کاٹ کر قدرے تیزی سے کہا۔ عظیمی صاحب انڈیا سے واپس آ گئے ہیں اور انہوں نے آپ کے لئے پیغام دیا ہے کہ آپ مراقبہ ہال آ جائیں وہ آپ کو وہیں ملیں گے۔ اس نے اپنے لئے اُن کا پیغام پہ اک گونہ سربلندی سی محسوس کی۔ پھر اُن سے مراقبہ ہال کا پتہ لیا ۔الماری کے اوپر سے مسودے کا خاکی لفافہ اتارا اور اسی وقت مراقبہ ہال کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرجانی ٹاؤن جاتے ہوئے راستے میں وہ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پستا رہا۔ اس کے اندر کا کمزور رُخ اُس کو غلطیوں کا سامنا ہونے والی شرمندگی سے بچانے کے نام پر اس راہ کی سمت جانے سے روک رہا تھا اور دوسرا رُخ اُس کو اپنی غلطیوں کا دفاع کرنے اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنے کو اُس کے اندر نقارے بجا رہا تھا اور اسے ابھار رہا تھا کہ وہ بڑھتا ہی چلا جائے۔ اسی کشمکش میں الجھا وہ مراقبہ ہال کے مین گیٹ سے سر اندر ڈالے دیکھ رہا تھا۔

کوئی ہے؟ کی صدا اُس کے اندر گونج رہی تھی کہ ایک صاحب اچانک پہلو سے نمودار ہوئے اور پوچھا۔ جی۔۔۔ کس سے ملنا ہے؟ اُس نے اُن اچانک سامنے آنے کے جھٹکے کو پیتے ہو کہا۔ خواجہ صاحب سے۔۔ وہ تو نہیں ہیں، سُن کر اُس کے بشرے پہ پھیلتی مایوسی کی سیاہ لہر کو دیکھ کر رشید صاحب نے اُس سے پوچھا مسئلہ کیا ہے؟ اُس نے کہا۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں لوح و قلم کتاب ترجمہ کر بیٹھا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اسے خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے دیکھوں وہ اس مسئلے کا کیا حل بتاتے ہیں۔ رشید صاحب نے یہ سُن کر اسے گیٹ کے ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے کے صحن میں بیٹھنے کی دعوت دی، اُسے پانی پلایا اور چائے کو پوچھا۔ کچھ دیر گپ شپ ہوئی۔ پھر انہوں نے اُسے صلاح دی۔ آپ صبح طلوع آفتاب کے وقت یہاں آئیں۔ اس وقت یہاں مراقبہ ختم ہوتا ہے۔ ابا حضور ناشتے سے پہلے آپ سے مل سکیں گے۔

اگلے روز وہ صبح کی اذان کے ساتھ ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ آج اس کے اندر ہونے والی کشمکش اس قدر بے طرح اور شدید نہ تھی جیسی کل محسوس ہو رہی تھی۔ وسوسوں کا زور ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔ اندیشوں کی دھار کچھ کند سی لگ رہی تھی۔ شاید وہ کچھ عادی سا ہو گیا تھا اور یا پھر امید اور سحر کی کیفیات غالب تھیں۔ جب وہ مراقبہ ہال کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا تو آفتاب اُس کے داہنے کندھے کی سیدھ میں افق پر طلوع ہو چکا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس کی نگاہ اسم بامسمیٰ شمس پہ پڑی۔ وہ سامنے مشرقی دیوار کے ساتھ بنی کیاری کے پاس کھڑے ہو کر پودوں کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کے دیکھنے میں اتنا انہماک تھا گویا وہ اُن پودوں سے محو گفتگو تھے۔

مخل ہونے کے خیال سے وہ وہیں رک گیا۔ پھر اُس نے رشید صاحب کو دیکھا۔ انہوں نے پاس آکر مصافحہ کیا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں وہیں رکنے کا کہہ کر خود آہستہ خرامی سے اُن کی طرف بڑھ گئے۔

اُن کے قریب جا کر رشید صاحب نے کچھ کہا۔ انہوں نے جواب میں کچھ کہا۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ کچھ سمجھ نہ آئی۔ رشید صاحب اُس کی طرف آنے کی بجائے گیٹ کے سامنے بنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ پھر ایک صاحب میز اُٹھائے ہوئے آئے اور میز کو گیٹ کے عین سامنے راستے میں رکھ کر چلے گئے۔ چند ساعت بعد ایک اور صاحب ایک کرسی لائے اور میز کے ساتھ رکھ کر چلے گئے۔

اب خواجہ صاحب آئیں گے۔ اس کرسی پر بیٹھیں گے پھر اُس کو اذنِ باریابی ہو گا۔ وہ فوجی انداز میں جا کر سلوٹ مارے گا اور بغل سے مسودے کا لفافہ نکال کر انہیں پیش کرے گا۔ وہ بیک جنبش سر اُس کو ڈس مس کر دیں گے اور وہ اباؤٹ ٹرن لے کر لیفٹ رائٹ کرتا ہوا گیٹ سے باہر نکل کر گھر چلا جائے گا۔۔۔ اُس کی سوچ یہیں تک پہنچی تھی کہ رشید صاحب ایک مزید کرسی لئے وہاں

آئے اور میز پہ پہلی کرسی کے مقابل دوسری طرف رکھ دی۔اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے پودوں سے مذاکرات ختم کئے اور آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔

رشید صاحب اُن کے پیچھے کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے انہوں نے اُسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔وہ میز کے پاس پہنچ کر ایک جھٹکے سے رکا۔سلام کیا اور کھڑا رہا۔سلام کا جواب دے کر انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔آئیں بیٹھیں۔

وہ جھٹ سے کرسی پہ بیٹھ گیا۔لفافہ بغل سے نکل کر اُس کی گود میں آگیا۔اس کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ کہے کیا کہے، کیسے کہے۔وہاں اُن کے سامنے پہنچ کر وہ پھر سے صفر پر آگیا تھا۔اُس نے یہاں تک پہنچنے کے خواب دیکھے تھے۔اب یہ خواب تو پورے ہوئے۔تنہائی بھی تھی وہ ایک دوسرے کے روبرو بھی۔اب آگے کیا ہوگا، کیا ہونا چاہئے، کیا کرنا چاہئے۔یہ سب تو اُس نے سوچا ہی نہ تھا۔وہ تو بس انہیں تکے جارہا تھا۔اُس کو صرف یہ احساس تھا کہ وہ ہے۔یہ کیا ہے۔کہاں ہے اور کیوں ہے۔یہ سب اُس کے شعور سے باہر چھلک گیا تھا۔

آپ کیسے ہیں؟اُس کی محویت کو توڑتی اُس مدھر سی آواز کے جواب میں خود کو۔۔۔اللہ کا شکر ہے۔۔۔کہتے سنا اور پھر وہی پرسکون سکوت۔۔خیال کی کوئی لہر آہی نہ رہی ہو تو کوئی کر ہی کیا سکتا ہے۔

کچھ توقف کے بعد انہوں نے اُس کی گود میں دھرے لفافے کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا۔یہ کیا ہے؟

'جی یہ؟'۔۔۔وہ گڑبڑا گیا۔۔۔'وہ مسودہ ہے۔'اُس نے لفافے سے ٹائپ شدہ مسودہ نکال کر اُن کی طرف بڑھا دیا۔

انہوں نے مسودہ لے کر دیکھنا شروع کیا۔ایک صفحہ پھر دوسرا صفحہ۔۔۔ایک ورق پھر اگلا ورق۔جب انہوں نے تیسرا ورق پلٹا تواُن کے چہرے پہ کسی تاثر کو تلاش کرتی نظروں نے ناکام ہو کر سوچا کیا انہیں انگریزی آتی ہے؟؟انہیں لوح و قلم آتی ہے اُس نے عقیدت سے سوچا۔

چند صفحات دیکھنے کے بعد ارشاد ہوا۔۔۔آپ نے بہت محنت کی ہے۔۔۔اُس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔۔۔محنت کی ہے۔۔۔وہ بھی عجیب دل رکھتا تھا۔۔جہاں ہنسنا ہوتا وہ روپڑتا اور جہاں رونا ہوتا۔۔۔وہاں بھی وہ کم ہی ہنستا تھا۔۔اُس کے گالوں پہ پھیلتی نمی کے آگے بند باندھنے کو انہوں نے دریافت کی۔

آپ نے اصطلاحات کا کیا کیا؟

اُس نے جلدی سے اپنے لہجے پہ قابو پاتے ہوئے انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں سے باہر چھلکتے پانی کو پونچھا اور عرض کی۔" وہ ایسے ہے کہ جن اصطلاحات کی سمجھ آگئی اور اُن کے لئے کوئی متبادل اصطلاح انگریزی میں دستیاب تھی اُن کو تو بے کھٹکے ترجمہ کر دیا لیکن جن اصطلاحات کا متبادل دستیاب نہیں تھا یا جن کی بابت میرا اپنا تصور واضح نہیں تھا اُن کو قریب ترین مفہوم کے مطابق ڈھال دیا ہے اور ان کو رومن طرز میں بھی لکھ دیا ہے۔اب فیصلہ آپ پہ ہے کہ ان کا کیا کرنا ہے۔

"ایسے ہی تو ہوتا ہے۔"۔۔۔۔انہوں نے سراہا اور کہا۔

"اسے کچھ لوگوں کو دکھاؤں گا پھر دیکھیں اس کا کیا کرنا ہے۔"

اُس کے بعد انہوں نے اُسے اپنے ساتھ ناشتہ کرنے کی دعوت دی۔ گیٹ ک ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے میں، زمین پہ بچھے دستر خوان پہ اللہ کے اُس بندے کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتے۔۔۔ جسے خلق خدا کی خدمت نے اللہ کا ولی اور قلندر بابا اولیا کی تربیت اور فیضانِ نظر نے خانوادہ سلسلہ عظیمیہ بنادیا تھا۔۔اُس کے احساسات انشراح اور بالیدگی کی نئی حدوں کو چھوتے رہے۔ ناشتہ کے دوران معلوم ہوا کہ مراقبہ ہال کا آغاز چند ہی ماہ پیشتر ہوا ہے اور اس کے لئے انہوں نے کافی بھاگ دوڑ کی ہے۔ دفتروں کے چکر لگاتے رہے۔ لوگوں سے ملے۔ دعائیں کیں تب جاکر بقول اُن فقیر کو ایک کٹیا بنانے کی اجازت اور جگہ ملی۔ اب اُس کی تعمیر کا مرحلہ درپیش ہے۔

ناشتے کے بعد وہ اُٹھ کر نالی دار چادروں کی چھت سے بنے اپنے دفتر کی طرف چل دیئے۔ وہ ساتھ ساتھ چلتا اُن کے دفتر میں داخل ہوا۔ انہوں نے اپنی میز پر بیٹھ کر اپنے سامنے دھرے خطوں کے انبار کی طرف توجہ کی تو اُس نے رخصت ہونے کی اجازت لینے کا سوچا اور پوچھا۔ حضور اب میرے لیے کیا حکم ہے؟

'آپ قلندر شعور کا ترجمہ کر دیں۔۔۔۔اور پھر تبسم اور مسکراہٹ کی لو کو مزید تیز کرتے ہوئے فرمایا۔'یہ تو آپ جلد ہی کر لیں گے۔۔۔اور کہا۔۔ جمعے کو محفل مراقبہ اور سوال وجواب کی نشست ہوتی ہے آیا کریں۔

اُس نے سوچا کہہ دے جی اچھا۔۔۔ لیکن خیال آیا کہ اللہ والوں سے وہ بات تو بالکل بھی نہیں کہنی چاہئے جو وہ کر نہ سکے۔ اُس نے کہا۔ حضور اس طرح ہجوم میں وہ بات کہاں کہی اور سنی جاسکتی ہے جو اکیلے میں ہی مناسب رہتی ہے۔ انہوں نے اس کے جواب میں سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے اُس کو مسکرا کے دیکھنے پہ ہی اکتفا کیا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بالک کیا چاہتا ہے۔ خوشی سے نہال۔۔۔ شاداں و فرحاں وہ گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اللہ کے یہاں نہ تو دیر ہے اور نہ ہی اندھیر۔ وہ عجیب سی خوشی تھی۔ دھیمی

دھیمی آنچ دیتی۔اندر ہی اندر ابالتی اور کاڑھتی ہوئی۔۔۔پوری طرح دہکے ہوئے کوئلوں پہ رکھے کڑھتے دودھ کی طرح۔۔۔ گرم اتنا کہ منہ جلادے لیکن ابال کا جوش کہیں دکھائی نہ دے۔اس سے پہلے جب بھی وہ خوش ہوتا تو اسے محسوس ہوتا تھا گویا خوشی اُس کو اندر سے ٹھوکریں مار رہی ہو۔وہ خوش ہو کر اچھلتا کودتا، ہنستا گاتا اور گنگناتا۔۔۔لیکن آج کی خوشی بے طرح خوشی نہ تھی بس خوشی تھی اور اک نہایت طرح دار خوشی۔

کتاب قلندر شعور کا ترجمہ

(۳)

اس خوشی میں اُسے خبر ہی نہ ہوئی اور قلندر شعور ترجمہ ہو گئی۔دیباچہ لکھنا باقی تھا کہ وہ حنیف شاہ صاحب سے ملنے جانکلا۔ وہ لوح و قلم کے مسودے کو خواجہ صاحب کو دینے کے بعد کا پوچھ رہے تھے اور جب اُس نے انہیں بتایا کہ اُس روز کے بعد سے وہ آج تک اُن سے ملنے نہیں گیا ہے تو انہوں نے حیرت سے کہا۔۔ چھوڑیں جی۔۔۔یہ کیا بات ہوئی؟ کوئی اور ہوتا تو اب تک اُس نے چوکھٹ گھسا دی ہوتی۔آپ کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔۔۔اُس نے کوئی جواب دینے اور تبصرہ کرنے کی بجائے جھینپ کر سر نیچے کر لیا۔اتنے میں شاہ صاحب کے شریک کار محمود صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔اسے دیکھ کر وہ اُس کے قریب آ کر بیٹھ گئے اور کہا۔آپ کو عظیمی صاحب نے بلایا ہے۔

حیرت سے وہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ عظیمی صاحب نے ؟ کب بلایا؟ کیسے بلایا؟ آپ ہی سے کہنا تھا کہ اُسے بلا لائیں ؟ وہ کیسے جانتے تھے کہ آپ مجھے جانتے ہیں اور میں یہاں اس دفتر آتا ہوں ؟ میں نے تو اُن کے سامنے کبھی کوئی ایسا تذکرہ نہیں کیا پھر انہوں نے پیغام یہاں کیسے بھجوا دیا؟ ان تمام سوالوں کا جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ جمعے مرکزی مراقبہ ہال گئے تھے۔۔۔ کوئی مسئلہ دریافت کرنے۔۔۔ پھر وہاں درس میں بھی شامل ہوئے اور سوال جواب میں وقفے کے دوران اُس کا حوالہ دیا اور بتایا کہ وہ اُسے جانتے ہیں۔ اس پہ انہوں نے پوچھا وہ کون صاحب ہیں اور جب انہوں نے بتایا کہ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے لوح و قلم کا ترجمہ کیا ہے انہوں نے فرمایا۔ ''بھئی وہ کہاں ہیں ؟ میں اُن کا انتظار کر رہا ہوں۔ اُن سے کہیئے گا۔۔۔ آ کے ملیں تو سہی۔''

اُس نے شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ شاہ صاحب نے اس تبصرے کو اپنے تکیہ کلام کا سہارا لیا اور کئی بار لہجہ بدل بدل کے کہا۔ بڑی بات ہے۔۔۔ اور پھر اسی خوشی میں چائے لانے کا فرمان جاری کیا۔ چائے کے دوران وہ حیرت سے باہر نکلنے کو ہزار جتن کرتے رہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہہ کر انہوں نے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ اڑ گیا۔ ایک کروڑ سے زائد آبادی والے ایک شہر بے ہنگام میں ایک بندہ دوسرے بندے کو اپنے انتظار کی اطلاع دیتا ہے۔۔۔۔ اس اطلاع کی ترسیل کا انتظام ہوتا ہے اور کیا خوب ہوتا ہے۔ یہ ہر گز کوئی اتفاق نہیں ہے۔ یہ نپا تلا اور جچا ہوا نظام ہے جس کو۔۔۔ تو نمی دانی و ہر گز نمی دانی۔

اُس رات اُس نے ترجمے کا باقی ماندہ کام مکمل کیا اور مسودہ لفافے میں بند کر کے صبح کے انتظار میں سو گیا۔ اگلے روز جب ساکنانِ مرکزی مراقبہ ہال ناشتہ کرنے دستر خوان پہ بیٹھے ہی تھے کہ وہ جا پہنچا۔ اُس نے سلام کیا تو انہوں نے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ نے قلندر شعور کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا۔'' اتنا کہہ کر اُس نے مسودے کا لفافہ حضور خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ مسودہ نکال کر انہوں نے وہاں بیٹھے ایک دبلے پتلے صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میاں صاحب۔۔۔ یہ دیکھیں۔

میاں صاحب مسودہ دیکھنے لگے تو انہوں نے لفافہ اُس کو دیتے ہوئے کہا۔ اس پہ اپنا نام اور پتہ لکھیں۔ آپ سے اگر رابطہ کرنا ہو تو کیا جا سکے۔ ''زہے نصیب'' کہہ کر اُس نے اپنا نام اور پتہ لکھا۔ وہ پتہ لکھ رہا تھا کہ انہوں نے میاں صاحب سے اُس مسودے میں سے کچھ باآواز بلند پڑھنے کو کہا۔ میاں صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ میاں صاحب نے پنجابی لب ولہجے میں انگریزی پڑھنا شروع کی تو اُس سے رہا نہ گیا اور اُس نے خود پڑھنے کی اجازت مانگی۔ دو ایک صفحات پڑھ کر اُس نے اُن کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سر کی جنبش سے بس کافی کا اشارہ کیا تو وہ خاموش ہو گیا۔

کیوں نیاز صاحب؟۔۔۔ انہوں نے ایک گورے چٹے پٹھان کو رائے دینے کو کہا۔ نیاز صاحب نے۔۔۔ ''ماشاءاللہ۔۔ بہت خوب''۔۔۔ کہہ کر اور میاں صاحب نے سر کو تائیدی انداز میں ہلا کر اُس کو امتحان میں پاس کر دیا۔ ٹھیک اسی جگہ تین چار ماہ قبل وہ حواس باختہ سا بیٹھا تھا آج وہ ایک تفاخر محسوس کر رہا تھا۔ امید و بیم سے لے کر قربت کی اُس منزل تک کی مسافت۔۔۔ کتنے ماہ و سال لگے تھے اور وہ کیسی کیسی کیفیتوں سے دوچار رہا تھا۔ ناشتے کے دوران کسی شادی کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے اُسے بھی مدعو کرتے ہوئے بتایا کہ سعیدہ خاتون کے بیٹے کی شادی ہے۔ آپ بھی آیئے گا۔

ناشتہ ختم کر کے وہ دستر خوان سے اُٹھ کر دفتر کی طرف بڑھے۔ میاں صاحب، شہابی صاحب اور نیاز صاحب کو اُن کے ساتھ جاتا دیکھ کر اُسے حوصلہ ہوا وہ بھی اُن کے ہمراہ ہو لیا۔ جب وہ کرسی پہ بیٹھ گئے تو وہ آگے بڑھا اور قلندر شعور کتاب اُن کے

سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ میرے پاس نہ تو آپ کی کوئی تصویر ہے اور نہ ہی کوئی قلمی تحریر۔۔۔اس پہ میرے لئے کچھ لکھ دیں۔ انہوں نے قلم پکڑا۔ پوچھا کیانام ہے؟اُس نے نام بتایا۔ انہوں نے لکھا۔ میرے عزیز۔۔۔۔

اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ حضور اس کے ساتھ عظیمی بھی لکھ دیں۔

پوچھا۔ ''آپ نے فارم بھرا ہے؟''

اُس نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ فارم۔۔۔کیسا فارم۔۔۔کون سا فارم؟

''میاں صاحب ان سے فارم بھروائیں!۔'' کہہ کر وہ کتاب پہ لکھنے لگ گئے۔ میاں صاحب اُٹھے۔ الماری سے فارم نکال کر اُسے دیا۔ جتنی دیر میں اُس نے سلسلے میں داخلے کا فارم بھرا۔ اتنی دیر میں انہوں نے لکھ کر کتاب میاں صاحب کو دے دی۔ میاں صاحب نے کتاب پہ لکھی تحریر کو پڑھا اور کتاب نیاز صاحب کی طرف بڑھا دی۔ نیاز صاحب نے تحریر کو پہلے چوما پھر پڑھ کر ماتھے سے لگایا اور کتاب شہابی صاحب کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے فارم میز کے دوسری جانب بڑھایا۔ انہوں نے فارم پڑھ کر کے اُس کے دائیں کونے میں ''اجازت'' لکھا اور اپنے دستخط کر دیئے۔ شہابی صاحب نے مبارک ہو کہہ کر اُس سے مصافحہ کیا پھر میاں صاحب اور نیاز صاحب نے بھی اُس کو مبارک باد دی۔ وہ اُن سے مصافحہ کر کے اپنے مراد کی طرف بڑھا۔ اُس وقت اُس کو اُن کے سینے سے لگ جانے کی ہڑک سی اُٹھی لیکن جب انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ اپنے مراد کا ہاتھ تھماتے ہی اُس کی ٹانگیں کپکپائیں، وہ زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ اُس نے اپنا سر اُن کی گود میں رکھ دیا۔ اُس کے ایک ایک مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ ایک ہچکی سی نکلی اور وہ پھوٹ کے رو دیا۔ ضبط کے سارے بندھن اُن کی ممتا بھری شفقت کے ریلے میں بہہ گئے۔

اُس کو لگا کڑی دھوپ میں کسی بے آب و گیاہ، سنگلاخ، پتھریلی اور کانٹوں بھری راہ کا مسافر اچانک ہی کسی چشمے کنارے ایک سرسبز و شاداب، چھتنار سایہ دار درخت کے نیچے پہنچ گیا ہو۔ پانی اور سایہ دیکھ کر اُس کے قویٰ نے جواب دے دیا تھا۔ سکون و شانتی کے ساتھ ساتھ تحفظ و عافیت کے احساس کو پختہ کرنے کو اُس کے مراد کا تشفی آمیز ہاتھ اُس کے سر کو سہلا اور کندھوں کو تھپک رہا تھا۔ اُس کے مراد کی زیرِلب دی گئی دعا۔۔۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔۔۔ اُس کی اندر کی خشک زمین پہ بہار کی پھوار بن کر برس رہی تھی۔

اُس نے آنسوؤں کی چلمن کے عقب سے انہیں دیکھا۔ اُن کے چہرے پہ اُس کو ممتا کے نور کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دیا۔ اللہ تعالیٰ بھی تو اپنی مخلوق کے لئے اپنی محبت کو ستر ماؤں کی محبت سے زیادہ بتاتا ہے۔ اُس کے مرادنے اُسے خود کو ابّا کہنے کا جو ادھیکار دیا تھا وہ اس کی زندگی کا حاصل اور توشہ آخرت تھا۔ اُس نے خود کو بمشکل سنبھالا۔ اپنی ٹانگوں کو اپنا بوجھ اُٹھانے پر آمادہ کیا اور پرے ہٹ کر کرسی پہ بیٹھ کر پسینہ اور آنسو پونچھنے لگ گیا۔

سلسلے میں داخلہ ملنے کا احساس اتنا جانفزا تھا کہ اُس کو مراقبہ ہال اور وہاں کی ہر چیز اپنی اپنی سی لگنے لگی۔ اُس روز وہ دوپہر تک وہیں رہا۔ اپنے مراد کی باتیں سنتا رہا۔ مراقبہ ہال کے انتظامی امور سے متعلق باتیں، شاگردوں کی فکری راہنمائی سے متعلق باتیں، اُن کی عام سی ادھر اُدھر کی باتوں میں بھی اُس کو لوح و قلم کے حوالے محسوس ہوتے رہے۔ مرید نے سوال پوچھا۔ حضور یہ علم الاسما کیا ہے؟

مراد نے کہا۔ ''آج تو آپ کو نرسری جماعت میں داخلہ ملا ہے اور آپ کا سوال پی ایچ ڈی کے لیول کا ہے۔'' مرید نے دل ہی دل میں شکر کیا۔ داخلہ تو ملا اب پی ایچ ڈی بھی ہو ہی جائے گی۔ مراد نے قدرے توقف کے بعد دھیمے سے اضافہ کیا۔ ''علم الاسما ایک صندوق ہے علوم کا جو مراقبے کی چابی سے کھلتا ہے۔'' آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ مرید نے سوچا۔

مراد گویا ہوا۔ ''لوگ فقیر کے پاس اس لئے آتے ہیں کہ کوئی نئی بات سنیں۔ دراصل لوگ ہر روز ایک نیا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ہے جیسے فلم پہ نہ گئے فقیر سے ملنے آ گئے۔ فقیر کے یہاں ایک تو عام لنگر چلتا ہے۔۔۔ جو آئے سو کھائے۔۔۔ لیکن ایک ہنڈیا وہ الگ سے بھی پکاتا ہے اور شرط رکھ دیتا ہے کہ یہ سالن وہ صرف اُس کو دے گا جس کا برتن سب سے زیادہ صاف ہو گا۔ اب کوئی ادھر بیٹھا اپنی پلیٹ مانجھ رہا ہے اور کوئی اُدھر بیٹھا اپنا برتن چمکا رہا ہے۔'' انہوں نے خانقاہی طرزِ تربیت سے روشناس کرانے کو کہا۔

گھر جا کر وہ چارپائی پہ لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔ شام کو اُٹھا۔ تیار ہو کر شادی ہال پہنچ گیا۔ نیاز صاحب نے مرید کو اُس کے مراد کے ہمراہ کھڑا کر کے اُن کی کئی تصویریں بنائیں۔ صبح کی گئی فرمائش رات ہونے سے پہلے پہلے پوری کر دی جائے تو بچوں پہ شکر کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ آج صبح ہی تو اُس نے تصویر اور تحریر والی بات کہی تھی۔ مراد نے غیر محسوس طریقے سے بغیر جتائے مرید کی خواہش پوری کر کے اُس کو طمانیت آشنا کر دیا۔ سنتے ہیں مرشد کامل کچھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں کیوں کہ وہی ایسا کر سکتے ہیں۔

بارات کے آنے میں ابھی وقت تھا۔ وہاں کسی سے اُس کی شناسائی نہ تھی سوائے اپنے مراد کے۔ جن اصحاب سے وہ اُن دنوں روشناس ہوا تھا اُن میں سے صرف نیاز صاحب ہی وہاں نظر آئے جو کیمرہ لئے تصویریں اتار رہے تھے۔ اُسے لگا وہ اسی بہانے اپنے مراد کا طواف کر رہے ہیں جو اُس وقت شادی ہال کے گیٹ کے قریب کھڑے تھے۔ چند ایک افراد اُن کے ساتھ پہلو بہ پہلو

کھڑے نیم دائرہ سا بنائے ہوئے تھے۔ وہ سب ہی اُن کے مرید تھے۔ سب ہی انہیں ابّا کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ابّا حضور بھی اپنے روحانی شاگردوں کو شاگرد یا مرید سمجھنے کی بجائے انہیں اپنی اولاد مان کر اُن کی ذہنی، فکری، اخلاقی اور روحانی تربیت میں جتے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ اپنے پہلو میں کھڑے صاحب کے کندھے پہ رکھ کے باتیں کرتے وہ اپنائیت کا احساس نشر کر رہے تھے۔

لاہور مراقبہ ہال کے حوالے سے کوئی بات ہو رہی تھی۔ کچھ کتابوں کی اشاعت کا معاملہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں فرمایا۔ یہ ترجمہ کرنا بھی ایک خصوصی صلاحیت ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام دربار میں بلقیس کا تخت لانے والے بندے کی صلاحیت بھی تو ایک خصوصی صلاحیت تھی۔ اُس لمحے تک مرید کے ذہن میں موجود اخباری، صحافتی اور ادبی حلقوں میں پایا جانے والا عام تاثر کہ ترجمہ کرنا کوئی اتنے بھی اعزاز کی بات نہیں مٹ گیا۔ اُس کو احساس کمتری سے نجات دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے سب کی توجہ یہ کہہ کر اللہ کی طرف موڑ دی۔ ''ہر خصوصی صلاحیت اللہ ہی کی طرف سے ملتی ہے۔''

مہمان آتے رہے۔ آ کر سجے ہوئے پنڈال میں بیٹھتے رہے۔ پھر بارات آئی۔ کھانے کا اعلان ہوا۔ سب نے کھانا کھایا۔ کھانے میں وہ ہڑبونگ اور افراتفری دیکھنے میں نہ آئی جو ایسی تقریبات کا خاصہ ہوتی ہے۔ اُس نے سوچا یہ کراچی کے لوگ ہیں جو پشاور اور لاہور کے لوگوں سے زیادہ تہذیب یافتہ ہیں۔ وہ اپنے مراد کو لوگوں سے ملتے، اُن کے تہنیتی کلمات اور مزاج پرسی کے رسمی جملوں کو بھی اسی دلجمعی اور توجہ سے سنتے اور جواباً اُن کی مزاج پرسی کرتے دیکھتا رہا جیسے وہ لوگوں کے مسائل سن کر اُن کا حل بتاتے تھے۔

مرید نے عرس پہ لوگوں کے ہجوم کو اپنے کشادہ اور وسیع سینے میں سمیٹنے کا منظر کا اس رکھ رکھاؤ سے لوگوں کے اُن سے ملنے کا موازنہ کیا۔ آج لوگوں کو اُن میں کشش کی وہ لہریں کیوں محسوس نہیں ہو رہیں جن کا مشاہدہ اُس کو چار سال پیشتر عرس پہ ہوا

تھا۔ایک مرید کہہ رہا تھا۔" یہ سب کچھ خود ہی کرتے ہیں۔۔۔اگر ہمہ وقت لہروں کی کشش کا وہی عالم قائم رہے تو دنیا کے کام کیسے ہوں گے۔"کشش کی لہریں وہاں نہ ہوتیں تو وہ اُس بیگانی شادی میں آتا ہی کیوں۔

اگلے روز وہ پھر مراقبہ ہال پہنچا ہوا تھا۔یہاں دستر خوان پہ ایک طرف مادی جسم ناشتہ کرتے ہیں تو دوسری جانب روح میزبان کی میزبانی سے خود سیراب کرتی ہے۔روح کے تقاضے جسمانی تقاضوں سے کہیں زیادہ رفیع الشان اور زور دار ہوتے ہیں اور جب وہی نظر انداز ہو جائیں تو روح بلبلا جاتی ہے۔روح کی اس بے چینی اور اضطراب ہی کا اظہار تو ہیں۔۔۔انسانی زندگی کی یہ پریشانیاں،کشائش اور ادبار میزبان اپنے بھارتی دورے کی بابت بتا رہا تھا۔"میرا دو ماہ کا پروگرام تھا کہ اوپر والوں نے اچانک ہی واپس جانے کا حکم صادر کر دیا۔وہاں لوگوں کے شعور نے اُن کی نیلم جڑی سونے کی انگوٹھی اور ڈاڑھی پن کو بہانہ بنا کر اُن کی بات کو توجہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔حالانکہ وہ اُس انگوٹھی کا نیلم اپنے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی عنایتوں کی ایک یاد کے طور پر پہنے ہوئے تھے۔اُن کے لہجے میں اُس لمحے دکھ در آیا جب انہوں نے کہا۔" اگر میں سائیکالوجی یا اسی قبیل کا کوئی اور علم سیکھنے سکھانے کا ادارہ بناتا اور اُس کا پرنسپل ہوتا تو کیا پھر بھی آپ میرے علم کو میرے ڈاڑھی سے ناپتے؟ ہر گز نہیں۔انہوں نے بتایا۔وہاں ایک دو مندروں میں بھی گئے۔ایک مندر کی بابت بتایا۔" وہاں آنے والے یاتری خیرات کرتے ہیں اور بعض لوگ صرف خیرات ہی کھاتے ہیں اور خصوصی طور پر خیرات کے کھانے کھانے پر معمور ہیں۔ہزاروں سینکڑوں لڈو انہیں روزانہ کھانے پڑتے ہیں۔اُن میں سے ایک آدمی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔یہ لحیم شحیم اور تن و مند آدمی۔بندہ دیکھے تو حیرت زدہ رہ جائے۔"فرمایا۔"اُس کی جسامت دیکھ کر میں نے اُن لوگوں سے پوچھا کہ بندے کے ہاتھ تو اُس کے پیٹ کے پھیلاؤ کے سبب جسم کے نچلے حصے تک پہنچتے نہیں ہیں پھر آخر یہ رفع حاجت کے بعد طہارت کیوں کرتا ہے؟ اس پر مجھے بتایا گیا کہ جب یہ فارغ ہو جاتا ہے تو ماشکی مشک سے پانی ڈالتا ہے۔ایک آدمی

آگے کھڑا ہوتا ہے اور ایک پیچھے اور وہ دونوں ایک لمبا تولیا لے کر اُس کے جسم کے نچلے حصے کی صفائی کر دیتے ہیں۔ ہنس کہا۔ یہ سوال پوچھنے کا خیال شاید ہی کسی کو آیا ہو۔

پھر ایک دوسرے مندر کی بابت بتایا۔ اُس مندر میں کسی دیوتا کی ایک مورتی کے بارے میں لوگوں کا گمان ہے کہ اگر اُس مورتی کو نئے کپڑے پہنائے جائیں تو گمشدہ لوگ بازیاب ہو جاتے ہیں۔ جب وہ وہاں گئے تو ایک عورت اُس مورتی کا لباس تبدیل کر رہی تھی۔ جس عقیدت اور احترام سے وہ لباس تبدیل کر رہی تھی وہ دیدنی تھا۔ اُس نے باقاعدہ اُس مورتی کے گرد تولیہ لپیٹ کر اُس کی ستر پوشی کی۔ پھر اُس کے دھوتی کھولی۔ اسے اتار کر اُس تولیے کے اوپر نئی دھوتی باندھی اور پھر تولیہ کھول کر نیچے سے کھینچ لیا۔ معلوم ہوا کہ اُس عورت کا بچہ کھو گیا تھا۔ فرمایا۔ ماں کی ممتا کے قرار کے لئے ہم نے بھی دعا کی کہ اللہ اُس کا بیٹا اُس سے ملوا دے۔

مرید نے سوچا ایک طرف لوگوں کے شعور کی مزاحمت کا یہ عالم اور دوسری طرف اُن کے اخلاص کی یہ حد۔ فقیر ہی نہیں وہ قلندر دوراں بھی تو ہیں۔ لوگوں نے اپنے ظرف کے مطابق بات کی اور انہوں نے اپنی عالی ظرفی کے مطابق۔ یہ سب قرآن کی تعلیمات کو درست انداز سے سمجھنے اور قلندر بابا اولیا ہی کی وجہ سے ہے۔ اس کی ذہنی رو ایک مرتبہ پھر لوح و قلم کی طرف مڑ گئی۔ لوح و قلم پڑھنے کے بعد اُسے اس بات کا ذاتی تجربہ ہو رہا تھا کہ قرآن حکیم کی فہم بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ قرآن پڑھتا تو اُس کو اُس کے مفاہیم کچھ زیادہ بہتر اور موثر انداز میں سمجھ آتے تھے۔ اُس نے اپنے مراد سے کہا۔ قرآن پاک کے جتنے بھی تراجم اور جتنی بھی تفاسیر اُس نے دیکھی ہیں اُن سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص زاویہ زیادہ ابھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن کسی نے قرآن حکیم کی روحانی حوالے سے ترجمہ یا تفسیر کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

''لوگ قتل کر دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا تو اُن کے ہاتھوں کے جوڑ کھنچوا کر انہیں لجا کر دیا گیا تھا۔ اب ایسے میں کس کو پڑی ہے کہ بلا وجہ قتل ہوتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانیت علم سینہ ہی بنی رہی۔'' انہوں نے لوگوں کی بے بصیرتی کو اُن کی جہالت کی وجہ قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

''اچھا یہ فرمائیں کہ فقیروں اور بادشاہوں میں کبھی کیوں نہیں بنی؟'' اُس نے اپنے اندر ایک بہت پرانے سوال کی پھانس اُن کے سامنے رکھ دی۔

''آپ مجھے یہ بتائیں کیا کبھی کسی فقیر نے کسی بادشاہ کو تخت سے اتار کر خود بادشاہ بننے کی کوشش کی؟'' انہوں نے اُس کے سوال کی خامی کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے ذہن کو درست راہ پر ڈالنے کو سوال پوچھا۔ اور جب دیکھا کہ ابھی اُس کو ان باتوں کا شعور ہی نہیں تو فرمایا۔ ''اجی کبھی کسی فقیر نے بادشاہ بننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ خواہشِ اقتدار ہی نہیں رکھتا تو وہ کسی بادشاہ سے بھلا کیوں پرخاش رکھے گا۔ ہاں جب بھی کسی بادشاہ نے فقیر سے مدد مانگی اُس نے کی۔ بادشاہوں نے فقیر کے در پہ ماتھا ٹیکا۔ وہ اپنی غرض کو ننگے پاؤں چل کر فقیروں کے پاس گئے۔ ہمایوں گیا تھا اولاد کی بھیک مانگنے سلیم چشتی کے پاس۔ بھئی بادشاہوں کو فقیر سے ڈر لگتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر عوام نے اس کی بات سُن لی تو وہ اُس چکر میں نہیں آئیں گے۔ فقیر تو خود بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کیوں بننے لگا۔''

بھئی یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں نے تخت و تاج چھوڑ کر فقیری اختیار کی۔ بدھا سے لے کر ابراہیم بن ادھم تک کتنوں نے بادشاہت کو لات ماری۔ آپ دیکھیں دنیاوی وسائل بادشاہ کے پاس ہوتے ہیں یا فقیر کے پاس؟

سب نے ایک آواز سے جواب دیا۔ ''بادشاہ کے پاس۔''

فرمایا۔"کسی بادشاہ نے کبھی لنگر کیوں نہیں چلایا؟ فقیر چلاتا ہے لنگر۔آپ لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ دیکھیں۔۔۔اُسی لاہور میں داتا صاحب کا مزار بھی ہے۔دونوں کا فرق واضح ہے۔ایک جگہ لوگ تفریح کے لئے جاتے ہیں اور دوسری جگہ عقیدت و احترام سے منتیں اور مرادیں مانگنے۔ایک جگہ دن میں چار لوگ جائیں تو جائیں،رات میں کتنے کتے لوٹتے ہیں اور دوسری جگہ دن ہو یا رات مانگنے والوں کا رش لگا رہتا ہے۔"

پھر اُس کو حقیقت سے روشناس کرنے کو فرمایا۔"اہلِ بیت پہ اتنے مظالم ہوئے،انہیں چن چن کر قتل کیا گیا۔انہوں نے علم کو اپنے سینوں میں چھپالیا اور خود خانقاہوں میں جا چھپے۔کہا یہ دنیا تم ہی کو مبارک ہو۔اسے تم ساتھ لے کر تو جا نہیں سکتے۔جو وہ ساتھ لے جا سکتے تھے اس کی دیکھ بھال میں لگے رہے۔"

پھر ایک قصہ سُنایا۔شیر شاہ سوری ایک فقیر سے ملنے چلا گیا۔فقیر نے اُس کی خوب آؤ بھگت کی۔تواضع میں لگا رہا۔جب شیر شاہ سوری رخصت ہونے لگا تو اُس نے فقیر سے کہا۔میں تو سمجھا تھا کہ آپ مجھے اتنی توجہ نہیں دیں گے لیکن آپ تو بالکل دنیاداروں کی طرح میری خاطر داری میں ہی لگے رہے۔فقیر نے پوچھا۔"آپ نے میرے بارے ایسا گمان کیوں رکھا کہ میں آپ پہ التفات نہیں کروں گا؟اُس نے کہا۔آپ نے دنیا چھوڑی۔۔۔یہاں ویرانے میں پڑے ہیں۔۔۔آپ کو دنیاداروں سے کوئی توقع نہیں ہونا چاہئے۔آپ نے میری تواضع کی تو اس میں آپ کا ضرور کوئی مقصد ہو گا۔فقیر نے کہا۔"میں نے آپ کی تواضع اور خاطر مدارت اس لئے نہیں کی کہ مجھے آپ سے کوئی غرض ہے بلکہ یہ سب اس لئے کیا ہے کیوں کہ آپ مجھ سے بڑے فقیر ہیں۔اب شیر شاہ سوری چونکا۔اُس نے کہا۔"میں کہاں سے فقیر ہوں۔؟"فقیر نے کہا۔"آپ نے مجھے فقیر جانا کیوں کہ میں نے دُنیا کو چھوڑا۔میں آپ کو اس لئے بڑا فقیر مانتا ہوں کیوں کہ آپ نے آخرت کو چھوڑا۔اب آپ ہی بتائیں کہ بڑا فقیر کون ہے؟فرمایا۔اُس فقیر کی بات کا اُس پہ

اتنا اثر ہوا کہ وہ دنیا چھوڑ کر فقیری اختیار کرنے پہ تیار ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ خواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اُسے سمجھایا کہ ''تم دنیا میں اچھے کام کرو۔۔۔ یہ دنیا چھوڑنے سے کہیں بہتر ہے اور فقیروں کے چکر میں مت پڑو۔''

کچھ توقف کے بعد اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فقیر کے قریب زیادہ نہیں رہنا چاہیے۔ آدمی دنیا کے کام کا نہیں رہتا۔ آپ کمرے میں ہزار واٹ کا بلب لگالیں دیکھیں کتنی دیر برداشت کرتے ہیں۔ آپ کو پسینہ آجائے گا۔ آپ کا سر چکرا جائے گا۔ آپ فقیر سے کتنی باتیں نئی سُنیں گے۔ ایک بات سُنیں اُس پہ غور کریں۔ پھر دوسری سُنیں اُس پہ غور کریں پھر تیسری سُنیں۔ یہ نہیں کہ ایک ساتھ ہی کئی باتیں سُنیں۔ اس سے ذہن سُن ہو جاتا ہے۔''

اُس کو لگا یہ بات انہوں نے خاص اُس کی خواہشوں کو لگام دینے کو کہی ہے۔ اُس نے بہت دھیان سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ آدمی دنیا کے کام کا نہیں رہتا تو پھر وہ کس کام کا رہ جاتا ہے؟ جو لوگ دنیا کے کام کے نہیں ہوتے لوگ انہیں ناکارہ اور بے کار قرار دیتے ہیں۔ تو کیا فقیر کی باتیں سننے سے لوگ ناکارہ اور بے کار ہو جاتے ہیں؟ اُس کا جی چاہا کہ وہ یہ سوال اُن سے دریافت کرے۔ اُس کے اس سوال کا الفاظ کا جامہ پہنانے سے پیشتر انہوں نے فرمایا۔ ''نہ جانے لوگ روحانیت کے چکر میں پڑتے ہی کیوں ہیں؟ اس سے نہ تو نوکری ملتی ہے اور نہ ہی کسی تنخواہ میں کبھی اضافہ ہوتا ہے۔''

اُس کی سوچ فکر کی راہ کے اس موڑ کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ وہ گھوم کر رہ گیا۔ وہ طنز فرما رہے تھے یا اک ایسی تلخ حقیقت بیان کر رہے تھے جس کی طرف اس سے پیشتر کبھی دھیان گیا ہی نہ تھا۔ اُس نے جلدی سے بات بنانے کو کہہ دیا۔ لوگ فقیر کے پاس فقیری سیکھنے بھی تو آتے ہیں۔

انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ اُس کی طرف کی اور فرمایا۔"مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھے کہا تھا۔ خواجہ صاحب! فقیر ذات کا چمار ہوتا ہے اُس پہ اوپر سے بیگار نازل ہوتی ہے۔۔۔اب کون ہو گا جو بیگار کے لئے تیار رہنا چاہے گا۔ یہاں تو جس کو دیکھو اسی چکر میں ہوتا ہے کہ فقیر اُس کے لئے دُعا کرے اور اُس کے بگڑے کام بنتے رہیں۔اب اگر فقیر دنیاداروں کی طرح سوچنے لگے تو وہ کر چکا دُعا۔"

پیشتر اس کے وہ کچھ اور کہتا۔۔۔ایک صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔۔۔اُن کے ایک عزیز کو ایک عجیب سی پریشانی لاحق ہے اور وہ یہ ہے کہ انہیں کئی ہفتوں سے بالکل کوئی اجابت نہیں ہو رہی ہے۔اُن کو کوئی خاص تکلیف بھی نہیں سوائے اس کے کہ اُن کے سر میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے وہ کئی حکیموں اور طبیبوں کو بھی دکھا چکے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔وہ اس کی وجہ جاننے کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی دریافت کرنا چاہ رہے تھے۔اُس پہ انہوں نے فرمایا۔"کسی وجہ سے اُن کا نسمہ متحرک ہو گیا ہے اور وہ اُن کے فضلے کو اِدھر اُدھر کر دیتا ہے اور علاج یہ فرمایا کہ مریض کو میٹھا زیادہ کھلائیں، زیادہ سلائیں اور وہ زیادہ وقت اندھیرے میں گزارے۔اس کے ساتھ ہی وہ آگے کو جھکے۔دونوں ہاتھ زمین پہ ٹیک کر اُٹھے اور چل پڑے۔

محفل کے اس طرح یک دم بلا کسی اعلان کے اختتام پذیر ہونے کا جھٹکا برداشت کرنے کو سب ہی کو اُن کے ساتھ ہی اُٹھنا پڑا۔اُن سب کو وہیں رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے یہ کہہ کر کہ۔۔۔۔میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔۔۔اور پھر ہاتھ دھو کر۔۔۔۔وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ایک دبلے پتلے صاحب نے جو پاسبانی کے فرائض سنبھالے ہوئے تھے، احترام سے دروازے کی چِق اُٹھائی اور وہ اندر داخل ہو گئے۔چِق چھوڑ کے وہ ایک طرف ہٹ کر مودب اور منتظر کھڑے ہو گئے۔سب کی نگاہیں اُن کے تعاقب میں اُن کے ساتھ ساتھ تھیں۔چِق گرنے کے بعد جیسے سب اپنے آپ میں واپس آ گئے۔کسی کو دفتر یاد آ گیا، کسی کو اپنے ذمے لگے کام

کی فکر ہوئی۔ دو ایک نے جھاڑو پکڑا اور ایک دو افراد پودوں کو پانی دینے اور دیگر انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ کچھ ایک دوسرے سے باتوں میں لگ گئے۔

اُس نے موقع غنیمت جانا اور مراقبہ ہال کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ گیٹ کے ساتھ بنا کمرہ استقبالیہ اور بعام گاہ دونوں ہی کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کا صحن ایک طرح کی عام چوپال تھی۔ اس صحن کی حدِ بندی۔۔۔ داخلہ کا راستہ چھوڑ کر۔۔۔۔ دو فٹ اونچی منڈیر سے کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ شمال کی طرف کبوتروں کے کابک، ایک کمرہ، دو تین باتھ روم۔ اس کے بالکل مقابل مغربی سمت میں ایک چوکور سا کمرہ جس کے اوپر آستانہ لکھا ہوا تھا۔ آستانے کی سیدھ میں شمال کی طرف دو کمرے ایک پہ ''حضور اباجی کا کمرہ'' اور دوسرے پہ ''دفتر'' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دفتر کے پہلو میں ایک دالان نما برآمدہ تھا۔ دالان اور اُس کے سامنے لان کی حد بندی کو ایک ڈیڑھ فٹ کی منڈیر تھی۔ لان کی طرف منڈیر کے ساتھ ساتھ پختہ روش کے دونوں جانب سُرخ رنگ کا حاشیہ سلیقے اور جمالیاتی ذوق کا پتہ دیتا تھا۔ لان کے مغربی اور جنوبی جانب مہندی کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ مغربی باڑ کے پیچھے گلاب کے پھولوں کی کیاری تھی۔

اُس کیاری کے بعد مغربی دیوار کے ساتھ شمال کی طرف ایک قد آدم گہرے چوکور گڑھے کے کنارے نیلے رنگ کی تختی پہ ''حرا'' لکھا دیکھ کر قریب چلا گیا۔ تالاب نما خشک گڑھے کے اندر لوہے کا بنا ہوا اہرامی ڈھانچہ دیکھ کر وہ حرا اور اہرام میں قدر مشترک کی بابت سوچنے لگا۔ اُس کے اندر ذہن میں دو باتیں آئیں۔ اہرام اور حرا کا تعلق انبیائے کرام سے تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں ہی ایک مخصوص زاویے کے حامل تھے۔ ایک میں اشیاء کو محفوظ کرنے کی صلاحیت تھی تو دوسرے میں فکر کو لافانی بنانے کا اعجاز۔

لان کی جنوبی باڑ کے عقب میں ایک چبوترہ جس پر لکڑی کے چار ستون کھڑے کر کے کھپر ل کی چھت ڈالی ہوئی تھی۔ایک ستون پہ لگی تختی پہ ''صفہ'' لکھا دیکھ کر اُسے ایک مسرت آمیز احساس نے اپنے حصار میں لے لیا۔وہ جوتے اتار کر چبوترے میں بچھی دری پہ بیٹھ گیا۔پورے مراقبہ ہال کی زمین کے گردا گرد سیمنٹ کے بلاک اوپر تلے رکھ کر بنائی ہوئی دیوار کو دیکھتے ہوئے جانے کیوں اُس کو اپنے لڑکپن کی یاد آگئی۔جب وہ ایک گاؤں میں رہٹ کنارے کھپریل کی چھت والے چبوترے پہ گڑے لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھ کر اصحاب صفہ کا تذکرہ پڑھتے ہوئے سوچا کرتا تھا۔وہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنی چھت سے کھجور کے کچے خوشے لٹکا دیتے تھے۔جب کھجوریں پک کر گرتی تھیں تو اُن کو کھاتے تھے۔

اُس وقت وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوا کرتا تھا کہ کھجوریں کتنے دنوں میں جا کر اتنی پکتی ہوں گی کہ ٹپک سکیں اور اتنے دن کیا وہ اور کچھ نہیں کھاتے تھے۔آج اُس کو اپنی حیرت یاد آئی اور آج ہی اُس کو یہ بھی سمجھ آگئی کہ فقیری کے تین بنیادی اصولوں۔۔۔کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا۔۔۔کی اصل اور جڑ کتنی گہری ہے۔وہ اس لئے کم کھاتے تھے کہ اُن کے پاس اس کام پہ صرف کرنے کا وقت نہیں ہوتا تھا نہ کہ اس لئے کہ کھانے کو کچھ دستیاب نہ ہوتا تھا۔اب ہم جو چاہیں سمجھتے رہیں۔وہ اُس وقت بھی حیران ہوا تھا جب اُس نے لڑکپن میں یہ بات پڑھی تھی اور حیرت آج بھی تھی۔۔۔لیکن اُس وقت کی حیرت یہ تھی کہ جب کھانے کو دستیاب نہ ہو تو گزران کیسے کی جائے اور آج اسے حیرانی اس بات پہ تھی کہ آخر وہ مصروفیت کیا تھی جس کے سبب اصحابِ صفہ کے پاس کھانے کا انتظام کرنے کا وقت نہ تھا۔ابھی وہ اُن کی مصروفیات کا تعین نہ کر پایا تھا کہ اُس کو خیال آیا کہ گزران اور مصروفیت میں تمیز کرنے کرنے میں وہ اپنی جوانی کا دور عبور کرنے کو ہے۔اس سالگرہ پہ وہ چالیسویں سال میں جا لگے گا اور اُس میں بھی اب کم دن ہی رہ گئے تھے۔

اچانک اس نے دیکھا کہ اُس کا مراد زمین سے کانٹے پتھر اور سنگریزے اُٹھا رہا ہے۔اُن کے ساتھ دوسرے افراد بھی مراقبہ ہال کے احاطے سے کنکر چن رہے ہیں۔چند لمحے تو وہ انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے جوتی پہنی اور خود اس کام میں جت گیا۔اب دھوپ میں تمازت آچکی تھی۔ کنکر، پتھر چنتے ہوئے اُس کو پسینہ آگیا۔انگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اُس نے سوچا۔۔۔میں مراقبہ ہال کی زمین سے کانٹے پتھر نہیں بلکہ اپنے نصیب میں گڑی پھانسیں اور زندگی کی راہ میں اٹکے روڑے نکال رہا ہوں۔۔۔یہ سوچتے ہوئے اُس نے اپنے مراد کی طرف نظر کی۔ عین اُسی لمحے انہوں نے بھی اُس کی طرف دیکھا۔ہاں شاید کچھ ایسا ہی ہے۔۔اُس کو محسوس ہوا کہ اُن کا اس کو دیکھنے میں یہ پیغام تھا۔۔۔اُس نے نگاہیں جھکالیں اور دلجمعی سے کنکر، پتھر اور کانٹے چننے لگا۔

اب وہ اکثر مراقبہ ہال آجایا کرتا۔ کبھی صبح سویرے تو کبھی شام ڈھلے۔ صبح نماز فجر کے بعد آستانے میں اپنے مراد کو مچھروں سے بچنے کو چادر اوڑھے مراقبہ کرتے دیکھتا رہتا۔اُن کے ساتھ مراقبہ کرنے والے آنکھیں بند کئے تصور شیخ کا مراقبہ کرتے۔ وہ مراقبے کے آغاز میں آنکھیں بند کرتا اور پھر آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگ جاتا۔وہ حسبِ ہدایت تصور کرنے کی کوشش کرتا لیکن اُس کے اندر اتھل پتھل شروع ہو جاتی۔ مرید کو سمجھ نہ آتی کہ جب اُس کا مراد بنفس نفیس اُس کے سامنے ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے اُن کا تصور کیوں کرے؟ براہ راست اُن کو دیکھ سکتا ہو تو پھر آنکھیں بند کرنا کفرانِ نعمت نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ انہیں دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے؟ وہ اپنے پیر و مرشد حضور قلندر باباؒ اولیاء کا تصور کئے بیٹھے ہیں یا کہیں کچھ تکوینی امور چل رہے ہیں۔ سوچتے سوچتے وہ اُن کے پیچھے لگی قلندر بابا اولیا کی تصویر کو دیکھنے لگ جاتا۔لوح و قلم میں لکھی کوئی بات حافظے میں دور کرتی اور وہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتا۔ کبھی وہ آستانے کے اندر بیٹھا دیواروں میں بنے روزنوں کو دیکھتا۔اُن روزنوں کی وجہ سے اُسے لگتا کہ آستانے کے باہر کی فضا آستانے میں داخل ہے۔

ایک دو بار جب اُسے وہاں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی اور اندر مزید افراد کی گنجائش نہ دیکھی تو وہاں آستانے کے باہر دروازے کے سامنے بیٹھے لوگوں کے ساتھ مراقبہ کرنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اندر کی فضا کا پھیلاؤ باہر پورے مراقبہ ہال کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ مراقبہ ختم ہونے کا اعلان درود شریف کی مدھر اور میٹھی آواز سے ہوتا۔ کبھی کبھی تو اُسے لگتا وہ اُس آواز کے انتظار میں ہی مراقبہ کرتا رہا تھا۔

مراقبہ کے بعد وہ دُعا کرتے۔ دُعا کے بعد کسی موضوع پہ اظہارِ خیال کرتے۔ اس درس میں خانقائی نظام کے آداب سے لے کر باطنی اسرار اور رموز سبھی کچھ ساتھ ساتھ ہوتا۔ کبھی وہ کسی ایک موضوع کے کسی ایک جزو کو مرکز توجہ بنا دیتے اور اس کو مثالوں سے سجاتے چلے جاتے، کبھی مختلف موضوعات کا ایک گلدستہ بنا کر اپنے بچوں کی طرزِ فکر کو آرستہ فرماتے۔ کبھی اُسے محسوس ہوتا کہ وہ صرف اسی سے مخاطب ہیں اور اُس کے ذہن میں موجود سوالیہ نشانوں کو کھرچ رہے ہیں۔

درس کے بعد اگلی قطار میں سے ایک دو افراد۔۔۔ سر جھکائے۔۔۔ بیٹھے بیٹھے۔۔۔ آگے بڑھتے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اُن کے سر پہ رکھ دیتے اور انہیں دم کرتے۔ دم کر کے اُن پہ ایک دو بار پھونک مارتے۔ وہ انہیں لوگوں کو دم کرتے دیکھ کر سوچتا کہ کوئی کچھ منہ سے کہتا نہیں ہے اور وہ دم کر دیتے ہیں۔ کیا انہیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ دم کروانے والا کیا چاہتا ہے؟

ایک دن اوروں کی دیکھا دیکھی وہ بھی آگے بڑھا۔ انہوں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اُسے اپنا دایاں ہاتھ دل کے مقام پہ رکھنے کو کہا۔ وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اُس کے ماتھے پہ پھونک ماری۔ سر پہ رکھے ہاتھ کی انگلیوں میں جنبش سی ہوئی، گویا کچھ لکھ رہے ہوں۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وقت تھم سا گیا تھا۔ اُس نے ہٹنے کا سوچا لیکن اُن کے ہاتھ کا ہلکا سا

دباؤ برقرار رہا۔ وہ بیٹھا رہا۔ انہوں نے دو بار مزید پھونکا اور ہاتھ ہٹا کر اپنی انگلیوں کو جھاڑنے کے انداز میں جھٹک دیا۔ وہاں سے ہٹ کر وہ واپس اپنی جگہ بیٹھا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔

اس کے بعد وہ اُٹھ جاتے اور مراقبہ ہال کا چکر لگاتے۔ ایک دو افراد ہمراہ ہو جاتے۔ تعمیر و تزئین کے حوالے سے ہدایات دیتے۔ پھر گھنٹی بجتی اور سب دستر خوان پہ اکٹھے مل کر بیٹھ کر ناشتہ کرتے۔ ناشتہ کے دوران کبھی کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ اُس کی وضاحت فرماتے۔ کبھی کوئی لطیفہ سنا دیتے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُن کی حسِ مزاح نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ لطافت اور شگفتگی کے علاوہ کوئی نہ کوئی سبق اپنے اندر سمیٹے ہوئے۔ اندازِ بیان ایسا کہ ذہن کی اسکرین پہ مناظر ابھر کر حواس کو اپنی گرفت میں لیتے چلے جاتے۔ ایک بار فرمایا۔ ''بھئی میں تو ایک داستان گو ہوں'' کچھ لوگ کہانی سنا ہی نہیں سکتے۔ لیکن کچھ افراد میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ بات شروع کر دیں تو سماں باندھ دیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ناشتہ ختم ہونے کے بعد بھی محفل جمی رہتی۔ سوال پوچھے جاتے، جواب ملتے اور انشراح کی کیفیت دو آتشہ ہوتی چلی جاتی۔

سوداگر اور طوطے کی کہانی

ایک روز جب وہ مراقبہ ہال پہنچا تو اُس نے ایک نستعلیق سے صاحب کو اپنے مراد کے پاس بیٹھے دیکھا۔ انہوں نے تعارف کروایا۔ وہ روز نامہ جسارت کے ناشر ذاکر صاحب تھے۔ اُن کی سعادت تھی کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے اُن کا ماتھا چوما تھا۔ بات ہو رہی تھی زیرِ زمین میٹھے پانی کی موجودگی کی۔ ذاکر صاحب نے اپنے ساتھ لائی ہوئی ڈاؤزنگ راڈز کی مدد سے پورے مراقبہ ہال کی زمین کا جائزہ لینے کے بعد مراقبہ ہال کی شمال مغربی سمت میں میٹھے پانی کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ اُس کے مراد نے اُن سے دریافت کیا۔ چائے پیئں گے؟ انہوں نے کچھ پس و پیش کے بعد کہا تبرکاً پی لیتے ہیں۔ اس پہ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بھئی انہیں تبرک والی چائے پلائیں۔'' جانے سے پہلے انہوں نے بتایا کہ انہیں وہاں آکر انشراح اور بالیدگی حاصل ہوئی ہے تو اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہاں آنے والے اکثر کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔

اس انشراح اور بالیدگی کی بات میں اُس نے اتنا پھیلاؤ دیکھا تھا کہ اس کی بیوی اپنے گھر آئے مہمانوں سے اُن کی بابت بات کرتے کہتی۔۔۔ ہمارے باباجی۔۔۔اور وہ اسے چھیڑنے کو کہتا وہ تو میرے باباجی ہیں تمہارے کہاں سے ہو گئے۔ تم ہمارے کے بجائے "ان کے باباجی" کہا کرو۔ وہ کہتی میں باباجی سے آپ کی شکایت کروں گی۔ وہ کہتا۔ تم شکایت کرو گی تو وہ تمہی کو ڈانٹیں گے کہ تم کیسی بیوی ہو کہ اپنے شوہر کی شکایت کر رہی ہو۔ وہ دل برداشتہ ہونے کے بجائے بڑے وثوق سے کہتی۔ جی نہیں وہ آپ کے کان کھینچیں گے کہ تم اپنی بیوی کو ستاتے ہو۔

ایک روز وہ دونوں اپنے بچوں کے ہمراہ مراقبہ ہال پہنچ گئے۔ بچوں کی خوشی دیدنی تھی۔ کھلتے پھولوں پہ نکھار آ گیا تھا۔ وہ ادھر سے اُدھر یوں دوڑنے بھاگنے لگے جیسے وہ اپنے گھر پہنچ گئے ہوں۔ اُس نے اُن کی اپنائیت اور اتنی جلد مانوس ہونے کی بابت سوچنے کا تکلف کرنے کی بجائے اس بات کو اپنے مراد کا اعجاز مانا کہ وہاں کسی کو غیریت اور بے گانگی محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ دونوں اب حضور کے کمرے میں اُن کے سامنے بیٹھے تھے، اُس کو چہل سوجھی اور اُس نے اپنے مراد کو مخاطب کر کے اپنی بیوی کی بابت کہا۔ حضور اس کو منع کریں۔۔ یہ آپ سے بیعت تو ہوئی نہیں اور یہ خود کو عظیمی بتاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ بھی آپ کی مریدنی ہیں۔

"کیوں آپ یہ نہیں چاہتے کہ یہ بھی جنت میں جائیں؟" انہوں نے اُس کی خوش طبعی کا مزا لیتے ہوئے فرمایا۔

اپنے مراد کی زبانی جنت کی بشارت سُن کر وہ کھل ہی تو گیا۔ اُس نے شرارت سے کہا۔ حضور یہ وہاں۔۔۔ جنت میں بھی۔۔۔اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

انہوں نے مقدمے کو طول دینے کی بجائے فرمایا۔ ''چلیں کبھی یہ ملنے آجایا کریں گی کبھی آپ چلے جایا کریں گے۔'' اور کہا ''لاؤ بھئی ان سے فارم بھروادیں۔ وہ فارم لے کر آیا۔ فارم بھرنے کے دوران اُس کو ایک اور چہل سوجھی۔ اُس نے تاریخ پیدائش اور عمر کی خانہ پوری پہ بیوی کو شرارت سے دیکھتے ہوئے معصوم بن کر پوچھا۔ یہاں کیا لکھوں۔ اکثر خواتین کی طرح اُس کو اس بات کا دھیان رہتا تھا کہ لوگ اُس کی عمر کا درست اندازہ نہ لگا پائیں اس لئے وہ اپنا سن پیدائش بھلائے رکھتی تھی۔ اس نے اُس وقت بھی یہی کہا۔ وہ تو مجھے یاد نہیں۔ اس پہ انہوں نے کہا آپ تیس سال لکھ دیں۔ پیشتر اس کے وہ کوئی اور بات کرتا انہوں نے اُس کو بیعت کر کے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اُس کو دم کیا۔

اگلے روز جب وہ دونوں اپنے مراد کے پاس پہنچے تو اُس کی طبیعت کی جولانی مستی پہ مائل تھی۔ وہ کسی قدر شوخی پہ اترا ہوا تھا۔ اُس نے مصنوعی سنجیدگی کہا۔

''حضور ایک عجیب سا مسئلہ ہو گیا ہے۔'' انہوں نے سوالیہ انداز سے اُس کی طرف دیکھ کر اُسے مسئلہ بیان کرنے کی اجازت بخشی تو اُس نے کہا۔

''حضور اب میری بیوی سلسلے کے حوالے سے میری بہن بھی ہوئی۔۔۔۔'' اور اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ شاید ادب مانع آگیا تھا۔

انہوں نے اُس کی بات سُنی اور مسکرا دیئے اور کہا۔ جب آپ کی امی کو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے سلسلے میں بیعت کیا اُس وقت ہمیں بھی کچھ ایسی ہی بات سوجھی تھی۔ آپ نے تو محض سوال پوچھا ہے۔ بھئی ہم نے تو شرارت میں بھی کہہ دیا تھا۔ آپ کی

امی نے بات کو اتنا بڑھا دیا کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے شکایت کر دی۔ انہوں نے کہا۔ ہاں بھئی کفارہ دینا پڑے گا فیصلہ دے کر انہیں ساٹھ آدمیوں کے لئے کھانے کھلانے کا کہا تو تب جا کر کہیں معاملہ رفع دفع ہوا تھا۔"

اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی خوشی کی خاطر اُس کی گستاخی سے نہ صرف نظر فرما گئے ہیں بلکہ دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ یہ سبق بھی تعلیم کیا کہ احتیاط ہی بہتر ہے۔

رفتہ رفتہ مراقبہ ہال میں اپنائیت کا احساس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ چند ایک بار سہ پہر میں وہاں گیا اور رات گئے گھر گیا۔ ایک دو بار وہاں مراقبہ ہال میں ہی شب بسر کی۔ وہ اپنے مراد کے شب و روز قریب سے قریب تر ہو کر دیکھنے کا متمنی تھا اور وہ اُس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ جس رات وہ پہلی بار مراقبہ ہال میں شب بسری کے لئے رکا۔ اُس رات اُس کو معلوم ہوا کہ مراقبہ ہال کے تمام امور سلسلے کے بھائی رضاکارانہ طور پر سرانجام دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذمے ڈیوٹیاں لے رکھی ہیں۔ کچھ دن میں وہاں آ کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں تو کچھ رات میں۔ دن میں آنے والوں کو مراقبہ ہال کی صفائی، مطبخ کے انتظام، استعمال شدہ برتنوں کی صفائی سے لے کر روحانی ڈاک میں آنے والے خطوط کو کھولنا، اُن کو فائل میں لگانا، انہیں اپنے مرشد کے ملاحظہ کے لئے پیش کرنا، اُن خطوط کے لکھے جوابات کو لفافوں میں بند کرنا، انہیں حوالہ ڈاک کرنا۔۔۔ شامل تھا۔ رات میں آنے والوں نے شام ہوتے ہی لالٹینوں کی صفائی کرنے، پودوں کو پانی دینے، رات کا کھانا بنانے، برتن سنبھالنے، اور رات کی ڈیوٹی پر مامور لوگوں کے لئے چائے بنا کر دینے اور رات میں رکنے والے مہمانوں کے لئے بستر لگانے جیسے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ انہی دنوں مسجد کی تعمیر بھی شروع تھی۔ رات میں آنے والے ایک بھائی نے اُسے بتایا کہ حضور اُس کے رات کو یہاں قیام سے بہت خوش ہیں۔ اُس بھائی کی بات سے اُس کو بہت حوصلہ ہوا۔ اُس نے جانا کہ وہ سب جانتے ہیں کہ کون کیا چاہتا ہے۔

رات میں مراقبہ ہال میں قیام کا تجربہ اُس کو اپنی زندگی کے انمول تجربات میں سے ایک لگا۔ شام ہوئی تو مغرب کی نماز کے بعد اُس کا مراد لان کی گھاس پہ بچھی جاء نماز پہ ہی مراقب ہو گیا۔ مراقبہ کے بعد وہاں لالٹینیں جل اُٹھیں۔ برقی روشنیوں کے شہر نگاراں میں فقیر کی کٹیا میں چراغ جل اُٹھے تھے اور اُن چراغوں کی لو صاحب روشن ضمیر اصحاب کے دلوں کو جگمگا رہی تھی۔

سرجانی ٹاؤن میں اُس وقت تک آبادی مراقبہ ہال سے کوسوں دور تھی۔ اُس نے سوچا کہ وہ اُن سے کوئی سوال پوچھے۔ کیا پوچھے؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا وہاں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ پیشتر اس کے آنے والے افراد میں سے کوئی بات کرے۔۔۔ اُس کے مراد نے ایک کہانی سنانا شروع کر دی۔ نہایت تفصیل اور جزیات کے ساتھ انہیں تیسری چوتھی جماعت کے نصاب میں شامل سوداگر اور چین کے طوطے والی کہانی سنائی۔

اُس کہانی کے مطابق ایک سوداگر چین جانے کے لئے سفر پر نکلنے سے پیشتر اپنے بچوں سے پوچھتا ہے کہ وہ اُن کے لئے کیا لائے؟ اُس کا بیٹا لکڑی کے گھوڑے کی فرمائش کرتا ہے اور بیٹی گڑیا کی۔ پھر وہ سوداگر اپنے گھر میں پنجرے میں بند طوطے سے دریافت کرتا ہے کہ میاں مٹھو۔۔۔ تم بتاؤ میں تمہارے لئے چین سے کیا لاؤں؟ وہ طوطا کہتا ہے کہ آپ میرا ایک پیغام چین کے طوطوں کو دے سکیں اور جو جواب وہ دیں وہ آ کر مجھے بتا دیں تو آپ کی بہت عنایت ہو گی۔ سوداگر اُس کا پیغام لے جانے اور جواب لا کر دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ طوطا سوداگر سے کہتا ہے کہ چین کے طوطوں سے کہنا۔ تم یہاں کھلی فضاؤں میں آزادی سے اُڑتے پھرتے ہو۔ کبھی اس باغ اور کبھی اِس باغ۔ لیکن تمہارا ایک ساتھی یہاں سے بہت دور ایک قفس میں قید ہے۔ اُس نے تمہیں سلام کہا ہے۔ سوداگر چین پہنچ کر اپنا سامان بیچ لیتا ہے۔ واپس جانے کی تیاری کرتا ہے۔ بچوں کے لئے اُن کی فرمائش کے علاوہ بھی تحائف

خریدتا ہے۔ راستے میں وہ ایک باغ کے قریب سے گزرتے ہوئے طوطوں کے ایک غول کو دیکھتا ہے تو اُسے اپنے مٹھو کا پیغام یاد آتا ہے اور وہ پکار کر اُن کو مٹھو کا پیغام دیتا ہے۔ مٹھو کا پیغام سُن کر ایک ڈال پہ بیٹھے طوطوں میں ایک طوطا نیچے گرتا ہے۔

سوداگر پاس جا کر دیکھتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا کہ وہ طوطا تو مر چکا ہے۔ سوداگر افسوس کرتا ہے اور اپنی راہ چل کر گھر آتا ہے۔ بچوں کو اُن کے تحائف دینے کے بعد جب وہ طوطے کے پاس آتا ہے اور طوطا اُس کا اپنا پیغام کی بابت پوچھتا ہے اور سوداگر اُس کو پورا واقعہ تفصیل سے سناتا ہے۔ سوداگر سے پوری بات سُن کر اُس کا طوطا گم سم ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد سوداگر دیکھتا ہے کہ اُس کا مٹھو بھی مر چکا ہے۔ وہ پنجرے کا دروازہ کھول کر مٹھو کی لاش باہر پھینکتا ہے۔ جونہی مٹھو زمین سے ٹکراتا ہے وہ زندہ ہو کر اُڑ کر قریبی درخت کی شاخ پر جا بیٹھتا ہے۔

سوداگر حیران ہو کر اُس سے دریافت کرتا ہے کہ میاں یہ کیا ماجرا ہے؟ تو مٹھو کہتا ہے دراصل چین کے طوطے نے اُس کو یہی پیغام بھجوایا ہے کہ اگر آزادی چاہئے تو مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ تمہیں آزادی مل جائے گی۔ اور فرمایا۔ روح کا طوطا بھی اس جسم کے پنجرے میں قید ہے اور مراقبہ درحقیقت مرنے سے پہلے مرنا سیکھنے کا ذریعہ ہے۔

آخری جملہ سننے سے پہلے کہانی سننے کے دوران وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ بچوں کی یہ کہانی وہ انہیں کیوں سنا رہے ہیں لیکن جونہی انہوں نے کہانی کا آخری جملہ ارشاد فرمایا۔۔۔ وہ کہانی جس پہ اُس نے آج تک غور کرنے کی زحمت نہیں کی تھی یکدم اک گنجینہء معنیٰ بن گئی۔ کتنی ہی کام کی باتیں اُس نے سُن کر کھو دی تھیں۔ اسی طرح کی کام کی ایک بات انہوں نے اُن سب کو لوٹا دی تھی۔ اُس کا سر جھک گیا۔ اُس نے سوچا کہ فقیر کس طرح سامنے کی بات اُن کو سمجھاتا ہے۔ اُس نے یہی کہانی اپنے بچپن میں، گرمیوں کی چاندنی رات میں چھت پہ اپنی ماں کے پہلو میں لیٹ کے بھی سنی تھی۔ اُس وقت اُس کے ذہن میں طوطے کی چالاکی اور طوطا چشمی کے علاوہ کچھ

سمجھ نہ آیا تھا۔اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ''مر جاؤ مرنے سے پہلے''۔۔۔کا سبق تو وہ سمجھ ہی نہ سکا تھا۔اُس نے احسان مندی سے گہرے ہوتے اندھیرے کے پسِ منظر میں اپنے مراد کا روشن اور پُر نور ہیولا دیکھا۔انہوں نے کس ہنر مندی سے انہیں جتایا تھا کہ وہ تو ابھی پہلے کا پڑھا سبق ہی نہیں سمجھے مزید آگے پڑھنے کی سکت پیدا ہو گی تو وہ آگے چلیں گے۔نشانِ منزل کی وضاحت بھی ہو اور راستہ بھی معلوم تو پھر نہ چلنا اپنا ہی قصور ٹھہرتا ہے۔

درخت باتیں کرتے ہیں

کھانے کے بعد اُس نے رات کو اپنے مراد کو ٹہلتے دیکھا تو اُس سے رہا نہ گیا اور وہ اُن کے ہمراہ ہو لیا۔ اُس کو پہلا خیال یہی آیا کہ وہ کس قدر خوش بخت ہے کہ وہ اپنے مراد کے ساتھ ہم قدم ہے۔ کچھ ہی دیر میں اس فخر پہ سعادتمندی کا احساس غالب آگیا۔ اُن کی قربت میں فخر کی گردن کا تنا ن سعادت مندی کے ایک ہی چھینٹے نے بھگو کر ڈھیلا کر دیا۔ ٹہلنے کے دوران اُسے ایک عجیب سا احساس ہوا وہاں اندھیرا ہونے کے باوجود تاریکی نہ تھی۔ رات کا اندھیرا بھی کچھ روشن روشن سا تھا۔ درخت اور پودے واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ دور اُفق پر شہر کی روشنیوں کی ضیاء کو اس اجالے کا سبب قرار دے کر اُس نے اس بات کی تفصیل پوچھنے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ اُس کو کہنے کو کوئی اور بات نہ ملی تو اُس نے دریافت کیا" حضور۔۔۔ یہ نباتات اور جمادات بھی باتیں کرتے ہیں؟۔۔ کیا یہ بات درست ہے یا یہ کوئی تمثیلی اندازِ بیان ہی ہے؟

"جی ہاں کرتے ہیں۔۔۔ خود مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ آپ نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے تذکرے میں نہیں پڑھا کہ ایک درخت بہت باتیں کیا کرتا تھا۔ اُس سے اُن کے کام میں حرج ہوتا تھا اوپر والوں نے اُسے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ ایک بار ایک خاتون آئیں تو اس درخت نے مجھ سے کہا۔ یہ ٹھیک عورت نہیں۔۔۔ اس سے ہوشیار رہیئے۔ اس کو یہاں سے ہٹا دیں۔ انہوں نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔" بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بات درست تھی وہ عورت جہاں بھی جاتی کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتی۔"اس کی سوچ میں اپنے بچپن کی حیرت تھی کہ کہانیوں میں طوطے مینا باتیں کرتے اور حکمت و دانائی کے موتی رولتے ہیں تو کیا یہ درخت بھی اسی پائے کی حکمت و دانش کی باتیں کرتے ہیں؟ مزید فرمایا" یہ درخت بھی بہت سمجھدار ہیں۔ یہ سب رات دو

ڈھائی بجے اُٹھتے ہیں اور سحر ہونے تک مراقبہ کرتے ہیں۔"اُس نے دل ہی دل میں کہا۔لو کر لو بات۔۔۔اِدھر بات تمہارے دل میں آتی اُدھر وہ اُس کا جواب فرما دیتے ہیں اور تمہیں کیا چاہئے۔

آسمانی کرنٹ

چہل قدمی کے بعد وہ اپنے کمرے کے قریب آکر رُکے۔ایک صاحب چارپائی اُٹھا لائے۔پلاسٹک کی نوار نما پٹی سے بُنی ہوئی لوہے کے فریم والی چارپائی بچھی۔اُس نے سوچا آپ نے نہ تو کسی سے چارپائی لانے کو کہا اور نہ ہی کوئی اشارہ کیا۔یہ صاحب چارپائی کیوں اُٹھا لائے ہیں۔پھر یہ سوچ کر اُس نے سر جھٹک دیا کہ ان کا معمول ہو گا۔وہ چارپائی پہ بیٹھ گئے تو وہ بھی کھسک کر قریب ہو کر زمین پہ بیٹھ گیا۔غسل خانے کو دیکھتے ہوئے اُس کو ایک سوال سوجھا۔اُس نے پوچھا کہ غسل جنابت کی فرضیت میں کیا حکمت ہے؟

انسان کو اس کی اصل اور غلیظ حالت کی طرف متوجہ کرنا ہی اس کی اصل حکمت ہے۔کچھ توقف کے بعد فرمایا۔"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بہت ہی بڑے ماہر نفسیات تھے۔انہوں نے اس قوم کو نہانے پہ لگا دیا ورنہ یہ تو سالوں بھی نہ نہاتے۔"

اس نے وضو کی بابت دریافت کیا کہ پیروں کے مسح کی بجائے اُن کو دھونے پہ اصرار کیا قرآن حکیم کی تعلیمات میں تحریف کے مترادف نہیں ہے؟

تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کر ایک پاؤں کو گھٹنے پہ جماتے ہوئے انہوں نے کہا۔قرآن پہ بس نہیں چلا لیکن ترجمے میں کسر بھی کوئی نہیں چھوڑی۔اور پھر بتایا کہ پاؤں دھونے سے جب تلوے گیلے ہوتے ہیں تو زمین میں دور کرتا کرنٹ انسان میں داخل ہوتا

ہے۔جب کہ مسح کرنے سے آسمان سے آنے والی شعاعوں کے نتیجے میں انسان کے اندر بننے والا کرنٹ زمین میں ارتھ ہوتا ہے۔اُس نے یہ بات پہلے نہ کبھی سنی تھی اور نہ پڑھی۔وہ چکرا کر رہ گیا۔انہوں نے اپنے پیر کے تلوے کو ہاتھ لگاتے ہوئے اُسے پوچھا اگر میں تلوے گیلے کر کے ایسی جگہ کھڑا ہو جاؤں جہاں برقی کرنٹ دور کر رہا ہو گا تو کیا ہو گا؟اُس نے کہا وہ کرنٹ آپ کے پیروں کے راستے آپ کے جسم میں داخل ہو گا۔اس پہ انہوں نے دوسرا سوال پوچھا۔زمین کا کرنٹ زیادہ ہے یا انسان میں دور کرنے والا کرنٹ؟اس کا جواب تھا کہ زمین میں دور کرنے والا کرنٹ انسان میں دور کرنے والے کرنٹ سے زیادہ ہے۔تب انہوں نے بتایا کہ جب زمین کا کرنٹ انسان میں داخل ہوتا ہے تو انسانی جسم کے اندر داخل ہو کر خالی جگہوں کو بھرتا ہے اور توند نکلنے اور گردن موٹی ہونے کی یہی وجہ ہے کہ زمینی کرنٹ وہاں جمع ہوتا رہتا ہے۔اس نے پوچھا تو کیا یوگی اور سادھو اسی لئے لکڑی کی کھڑاس استعمال کرتے ہیں؟اس پہ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔"جی ہاں وہ آسمانی کرنٹ کی حفاظت کا شعور تو رکھتے ہیں۔"

آسمانی کرنٹ کی اصطلاح سے جانے کیسے اُس کے ذہن میں صوتِ سرمدی کا خیال آ گیا۔اُس نے دریافت کیا۔یہ صوت سرمدی کیا ہے؟

فرمایا۔"اللہ کو دیکھنے والوں کی کمی نہیں۔جس کسی نے ایک بار وہ آواز سن لی پھر وہ زندگی بھر اسی کے چکر میں پڑا رہتا ہے کہ کسی طور اُس کو دوبارہ سنے۔سننے والے کم ہیں۔۔دیکھنے والے زیادہ اور وہ خوش نصیب تو بہت ہی کم ہیں جو اُسے مسلسل سنتے رہتے ہیں۔اللہ کے کن کہنے سے جو صوت ابھری اُسے بھی صوتِ سرمدی کہتے ہیں۔وہ آواز آج بھی کائنات میں گردش کر رہی ہے۔اس کے لئے کچھ مراقبے مخصوص ہیں۔

کیف وجذب

اُن کے بات کہنے میں کچھ ایسی کیفیت بن گئی کہ وہ دیر تک گم سم بیٹھا اپنے مراد کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جانے کیسے اُس نے ہمت مجتمع کی اور کہا۔ حضور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالے سے یہ بات عام طور پر کہی اور سنی جاتی ہے کہ ان کو ایک تیر لگا اور وہ کسی طور جسم سے نکالا نہیں جا رہا تھا۔ اُس پہ آپ نے کہا کہ رہنے دو۔ جب میں نماز قائم کروں اُس وقت نکال دینا اب جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ نماز سے انسان پہ خواب کے حواس مسلط ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حالتِ نماز میں اُن پہ خواب کے حواس غالب آ گئے تھے تو ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی خواہ وہ کتنی گہری نیند کیوں نہ سویا ہوا اگر اُس کو سوئی چبھو دی جائے تو وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ جاتا ہے۔ جب کہ وہاں تو ایک تیر تھا جو جسم میں تراز و ہو چکا تھا اور جب وہ تیر نکالا گیا ہو گا تو جسم کو مزید چیرا نہ بھی دیا گیا ہو اور تیر کو کاٹ کر نکالا گیا ہو تب بھی۔۔۔ جسم کو تکلیف تو ضرور ہوئی ہو گی۔ یعنی زخم کی تکلیف تو خواب کے حواس میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خواب حواس کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آپ مہربانی فرما کر اس کی کچھ وضاحت فرما دیں کہ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟

اُس نے اپنے مراد کے چہرے پہ اپنے اس سوال کے پوچھنے کی ستائش محسوس کی۔ وہ قدرے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ ''اجی یہ خواب کے نہیں موت کے حواس کی بات ہے۔ وہ حضور ﷺ کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے 'موتو قبل انتم موتا' کا سبق خوب سمجھ لیا تھا۔ وہ خواب کے حواس سے گزر کر موت کے حواس سے آشنا ہو چکے تھے اور وہ اُن کو خود پہ اسی طرح طاری کر سکتے تھے جس طرح جب آپ سونا چاہتے ہیں تو خود پہ خواب کے حواس طاری کر لیتے ہیں۔

پھر بتایا کہ حضور قلندر بابا اولیا ؒ پہ استغراق کی یہ کیفیت اس قدر طاری رہتی تھی اور آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ بیٹھے ہیں اور چیونٹیاں اُن کے پیروں سے گوشت نوچتی رہتی تھیں اور انہیں خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ ہم آتے اور دیکھتے اور گھبرا کر چیونٹیاں

جھاڑتے۔ کیا ہے؟ کیا ہے بھئی؟ وہ ہماری گھبراہٹ سے چونک جاتے۔ ہم کہتے حضور چیونٹیاں ہیں۔ آپ کے پیر زخمی کر دیئے ہیں۔ توفرماتے اچھا۔ خیر ویسے بھی یہ جسم انہی کی خوراک ہے۔ جانے اس وقت وہ کہاں چلے جاتے تھے؟

قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ یہ کیفیت بے کیف ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ بے کیف ہونا ہی اصل زندگی ہے۔ آپ چوبیس گھنٹے میں چوبیس منٹ بے کیف ہوگئے تو یہ چوبیس منٹ آپ کی اصل زندگی ہے باقی سب ضائع ہو گیا۔ بے کیفی درحقیقت رنج و خوشی سے بے نیاز ہو جانا ہے۔ حضرت علی کی کیفیت نیند کے حواس سے گزر کر موت کے حواس کا طاری ہونا تھا۔ یہ بڑی صلاحیت ہے۔ آدمی اپنی مرضی سے مر جائے۔ بھئی یہ تو کمال ہے اور اس سے بڑھ کر کمال یہ ہے کہ آدمی اس زندگی میں محض اس لئے پلٹ آئے کیونکہ اللہ چاہتا ہے کہ یہاں آپ زندہ رہیں۔ یہ ایک وہبی (Gifted) صلاحیت ہوتی ہے۔ جس کو نصیب ہو جائے۔ پھر دھیمے سے لہجے میں کہا۔ چہ نسبت ایں خاک را باآں عالم پاک طینت را

فرمایا کہ ایک بار حضور قلندر باباؒ اولیاء نے مجھ سے کہا۔ دیکھنا بھئی میرے کرتے میں کوئی مکھی یا کھٹمل تو نہیں گھس آیا۔ میں نے کرتا اُٹھا کر دیکھا تو وہاں ایک چھپکلی جانے کب سے گری ہوئی تھی اُس نے باہر نکلنے کی راہ نہ پا کر پنجے مار مار کر انہیں کھرچ کے رکھ دیا تھا۔ مرید کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُس نے کہا کیا یہ بے حسی نہ تھی؟

فرمایا۔ جی نہیں۔ یہ بے حسی نہیں بلکہ کمال کی انتہا ہے۔ مر جاؤ مرنے سے پہلے کی عملی تفسیر ہے۔ اگر آپ ہر وقت بے کیفی کے عالم میں رہیں گے تو یہ جذب کی حالت ہوئی۔ جذب اور بے کیفی کی مزید وضاحت کو ارشاد فرمایا۔ حضور قلندر باباؒ اولیاء کو جب اُن کی بیگم کھانے پر بلاتیں تو وہ کھانے کے لئے آ کر بیٹھ جاتے اور دس منٹ بعد اگر کھانا نہ بھی آیا ہوتا تو اُٹھ جاتے اور یوں ہاتھ

دھوتے گویا انہوں نے کھانا کھالیا ہو۔ جب اماں جی کھانا لاتیں اور اصرار کرتیں کہ آکر کھانا کھائیں تو ناراض ہوتے۔ میرا پیٹ خراب کردو گی۔ دو دو بار کھلاتی ہو۔ بھئی وہ کھانا تو صرف اس لئے کھاتے تھے کہ مادی جسم کو اتنی خوراک مل جائے کہ اُس کا کام ہوتا رہے۔

بے کیفی کے کیف کے ضمن میں بتایا کہ دنیا کی سب سے بڑی خوشی اور راحت جنسی تلذذ کو سمجھا جاتا ہے۔ بے کیفی میں تو اس میں بھی گھن آنے لگتی ہے۔ حالات و واقعات سے انسان کا جی اس خوشی سے بھی اس حد تک بھر جاتا ہے کہ سیکس کا خیال آنے سے بھی گھن محسوس ہوتی ہے۔ کھانوں میں گوشت کی نسبت سبزی اور دال بھلی لگتی ہیں۔ گوشت میں تو ویسے بھی سڑاند اور تعفن زیادہ ہوتا ہے۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔ آپ کہیں گوشت رکھ دیں اور وہیں سبزی یا کوئی ترکاری وغیرہ رکھ دیں۔ گوشت کی سڑاند دور دور تک پھیلے گی اور جلد پھیلے گی۔ ترکاری اور سبزی وغیرہ کی بدبو پاس جانے پہ ہی محسوس ہو گی اور دیر میں پیدا ہو گی۔

خواب کی کیفیات سے بڑھتے ہوئے موت کے اعلیٰ ترین حواس کی بابت بات سنتے ہوئے اُس کے فکر کی اُڑان ایک لامحدود اور بے کنار وسیع عالم کو اپنے سامنے محسوس کر رہی تھی۔ وہ نیند سے تو وہ خوب واقف تھا کہ جب انسان کو نیند آتی ہے تو لاکھوں کروڑوں کی دولت بھی ہیچ لگتی ہے۔۔۔انسان اپنی جان سے گزر جانا گوارا کر لیتا ہے لیکن نیند سے باز نہیں آسکتا۔ سڑکوں پہ حادثات کی ایک اچھی خاصی شرح کا اصل سبب نیند آنا ہی ہے۔ خود وہ کئی بار نیند کی جھونک میں گاڑی پہ قابو کھو چکا تھا۔ اُس نے چاہا کہ وہ اُن سے دریافت کرے کہ خواب کے حواس میں داخل ہونے کے لئے مراقبہ کیا جاتا ہے تو موت کے حواس سے واقف اور آگاہ ہونے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ یہ بے کیف ہونے کے لوازم کیا ہیں؟ ان کی شروعات کیسے کی جائے؟ ابھی وہ سوال کے الفاظ کو ذہن میں ترتیب دے ہی رہا تھا کہ وہاں بیٹھے ایک صاحب نے صبح کی نماز کے حوالے سے دریافت کیا کہ باجماعت نماز کا کیا وقت مقرر کیا جائے؟

''بھئی ہم نے تھوڑے ہی کوئی وقت مقرر کرنا ہے۔ وہ تو طے ہے۔ آپ ایک بنا ہوا اوقاتِ نماز کا چارٹ لا کر یہاں آویزاں کر دیں۔''اور فرمایا۔ ''حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے انہیں ایک واقعہ سنایا تھا۔ دو بھائی تھے محمد خان اور احمد خان۔ دونوں نے گھر کے قریب مسجد بنوائی۔ ایک روز بڑے بھائی محمد خان کو تاخیر ہو گئی۔ احمد خان نے امام صاحب سے نماز شروع کرنے کو کہا۔ محمد خان کی ایک رکعت چھوٹ گئی۔ بعد میں انہوں نے امام صاحب سے کہا۔ مولوی صاحب آج آپ نے جلدی ٹھوک دی۔ احمد خان نے کہا تھا کہ محمد خان کو رہنے دو۔ انہوں نے کہا۔ اب سے یہاں احمد خان ہی نماز پڑھا کرے گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور اُس کے بعد کبھی مسجد جا کر نہ دیا۔

اُس نے سوچا وہ کہاں کی بات سنا رہے تھے اور اچانک انہیں کہاں کی بات بتانا پڑی لیکن مجال ہے وہ کچھ بھی بے مزہ ہوئے ہوں بلکہ اُس میں بھی اُن کی شگفتگی اور مزاج کی لطافت کا ہی اظہار ہوا۔

ماورائی علوم میں والدہ کا نام اتنی اہمیت کیوں رکھتا ہے؟

ایک اور صاحب نے دریافت کیا ماورائی علوم میں والدہ کا نام اتنی اہمیت کیوں رکھتا ہے؟

فرمایا۔ ''عورت کا اصل محبوب تو اُس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔ وہ اس کی تخلیق کا ذریعہ بنتی ہے۔ ماں ڈائی ہوتی ہے۔ جہاں پہ وہ بنتا ہے وہ اُس کی ماں ہی ہوتی ہے۔ اس لئے کسی بھی آدمی کو دیکھنا ہو تو ضروری ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ کہاں بنا تھا۔

پھر عورتوں کے حوالے سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ عورت کا سب سے عظیم روپ ماں ہے۔ بیوی کے روپ میں تو وہ مرد کے کثیف جذبات کے نکاس کا ذریعہ ہے۔ وہ ایک گٹر کی طرح اُس کی غلاظت اُس سے دور کرتی ہے۔ لیکن مرد پھر بھی اُس پہ ظلم

ہی کرتا ہے۔اور تو اور اُس کی منڈیاں لگا کر اُس کی خرید و فروخت تک باز نہیں آیا۔آج عورت ہی کو استعمال کیا جا رہا ہے۔بھلا ان چیزوں کا عورت کو دکھانے سے کیا تعلق؟ یہ سب عورت کا استحصال ہی تو ہے۔حالانکہ وہ مرد کی ماں بھی ہے۔پھر فرمایا کہ لگ بھگ دس ہزار سال پہلے دنیا پہ عورتوں کی حکمرانی تھی۔انہوں نے مردوں پہ بہت ظلم کئے۔۔۔وقت بدلا۔۔۔مردوں نے تختہ الٹ دیا۔

انہیں غلام بنالیا۔۔۔اُن کو ہتھکڑیوں میں جکڑ کر رکھنے کا رواج ہوا۔۔۔اُن کی نکیل ڈالی جاتی۔۔۔کانوں کو چھید کر اُن میں رسی پرو دی جاتی۔پھر بعد میں جب تہذیب و تمدن نے ترقی کی۔۔۔گھر بنے تو انہیں گھروں میں مقید کیا گیا۔۔۔یہ چوڑیاں،کڑے،ہار،پازیب، نتھ اور جھمکے اور بُندے سب انہی چیزوں کی ترقی یافتہ صورتیں ہی تو ہیں۔یہ سب ملکیت کے جذبے کا چکر ہے۔خواہش اقتدار کا کھیل ہے۔پہلے عورت کو طاقت کے زور پر قابو کیا جاتا تھا اب اسے رسموں اور دولت کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔اب آئندہ دور خواتین کی حکمرانی کا ہوگا۔اس دور کے دس ہزار سال پورے ہونے کو ہیں۔اب خواتین مردوں پہ ظلم کریں گی تو یہ سب غلط ہو جائے گا۔ انہیں بہت خیال رکھنا ہوگا ورنہ کیا فرق ہوگا۔اس سے فساد اور ظلم کا دروازہ تو بند نہیں ہوگا۔

ایک صاحب نے عورت کے مرد کی پسلی سے بننے کی بات کا تذکرہ کیا تو ناگواری سے ہاتھ جھٹک کر کہا۔عورت کے بارے میں یہ سب کچھ اُس کی توہین کرنے کے لئے کہا جاتا رہا ہے کیونکہ پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے۔مردوں نے عورتوں پہ بہت ظلم کئے۔انہیں زندہ گاڑا گیا۔سرِ بازار خریدا اور بیچا گیا۔حالانکہ عورت نے ہی پیغمبروں کو جنم دیا۔

فرمایا۔میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اپنے ہی لباس کو نوچتے کھسوٹتے رہتے ہیں۔اصل بات یہ ہے کہ انسان کو خوش رہنا ہی نہیں آتا۔اب آپ دیکھیں کہ عید کے دن کوئی فالتو تنخواہ نہیں لیتا پھر بھی ہر گھر میں نئے کپڑے بنتے ہیں،اچھے اچھے کھانے پکتے ہیں۔ہر بچے کی جیب میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔دراصل انسان نے خوش ہونے کا

ایک دن مقرر کر لیا ہے۔اُس دن وہ خوش ہو جاتا ہے۔اگر وہ سبھی خوش رہنا چاہے تو اللہ اُس کو سب دن خوش رکھ سکتا ہے۔ یہ سب یقین کرنے سے ہوتا ہے۔

پرندوں کا یقین دانہ بن جاتا ہے۔ایک بار میں نے رن وے پہ ایک پرندے کو چگتے دیکھا ہے۔اب سوچیں وہ وہاں کیا چگ رہا ہوگا۔دراصل پرندوں کو یقین ہوتا ہے کہ اُن کے زمین پر اترنے سے پہلے ہی اُن کے لئے دانہ مہیا ہو جائے گا۔انسان کھیتی باڑی کرتا ہے۔پرندے کیا کرتے ہیں؟کسان تو کرم خوردہ دانے تک جھاڑو سے سمیٹ کر اپنے مویشیوں کو ڈال دیتا ہے۔پھر پرندے کیا کرتے ہیں؟تاج الدین بابا ناگپوری کا ایک شعر پڑھا۔

اجگر کریں نہ چاکری پنچھی کریں نہ کام　　　　داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

اور پھر یہ کہہ کر محفل برخواست کر دی کہ رات بہت ہوگئی ہے اب سونا چاہیئے۔

اُن کے کہنے سے انہیں معلوم ہوا کہ اتنا وقت گزرنے کا انہیں احساس تک نہ ہوا تھا۔وہ اُٹھ کر جائے تو کہاں؟ سونے کی جگہ کہاں ہے؟اُس نے کندھے اچکائے اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔وہاں سے آکر دیکھا وہاں ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔سب ہی لوگ کہیں جا چکے تھے۔وہ ٹہلتا ہوا برآمدے کی طرف چل پڑا۔کچھ لوگ دریاں بچھائے لیٹ چکے تھے۔وہ کیا کرے؟ کس سے پوچھے؟وہ یہی کچھ سوچتا بڑھتا ہوا ''حرا'' کے پاس جا رکا۔وہاں کوئی نہ تھا۔اُس نے سوچا یہاں بیٹھ کر مراقبہ کرنا چاہیئے اور چار سیڑھیاں اتر کر اہرامی ڈھانچے کی نوک کے عین نیچے مراقب ہو گیا۔اُس کو پہلا احساس یہ ہوا کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد اُس کے اندر ایک اجالا سا ابھرا اور وہ اک روشن سی مخروطی تکون میں بند ہو گیا ہے۔دوسرا احساس اُس کو مچھروں کے کاٹنے کا ہوا۔اُس نے ان دونوں ہی احساسات کو جھٹک کر مراقبے میں دھیان لگانے کی کوشش کی۔وہ مراقبہ میں منہمک ہونا چاہ رہا تھا لیکن اُس کے اندر اپنے مراد کی کہی ہوئی باتیں

گونج رہی تھیں۔ کبھی ایک جملہ اور کبھی دوسرا جملہ اُس کی یادداشت کی سطح پہ ابھرتا اور ڈوب جاتا۔ کافی دیر یہی ہوتا رہا پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ رات کے ڈیڑھ دو بجے اُس نے کسی کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ قریب آ کر اُن صاحب نے اُسے کہا۔ اگر وہ سونا چاہتا ہو تو وہاں دالان میں سو سکتا ہے۔ آواز سُن کر وہ سُن ہو کر رہ گیا۔ اپنے مراد کی مدھ بھری آوازرات کے اُس پہر غیر متوقع سن کر اُسے ایک جھٹکا لگا۔ جی اچھا کہہ کر وہ دالان میں دری پہ بچھے گدیلے پہ جا کر لیٹ گیا۔ اُس کے ارد گرد لیٹے لوگوں میں سے کچھ خراٹے لے رہے تھے اور کچھ تیز آواز میں سانس۔۔ نیند میں سانس کی آواز بلند ہو جاتی ہے یا سناٹے کی وجہ سے۔۔۔ لیکن اگر سناٹے کی وجہ سے ایسا ہے تو خود اُس کو اپنے سانس کی آواز کیوں نہیں آ رہی؟ اُس نے سوچا اور پھر اس گتھی کو صبح اپنے مراد کے حضور پیش کرنے کا سوچتے ہوئے وہ نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

جھوٹ حقائق کا سامنا نہیں کرنے دیتا

صبح اذان فجر کے ساتھ ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوتے ہی اُس کے شعور میں پہلی بات یہی آئی کہ وہ مراقبہ ہال میں ہے۔ وضو کرنے سے لے کر نماز پڑھنے اور پھر آستانے میں اپنے مراد کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھنے سے لے کر مراقبہ ختم ہونے تک وہ ایک بے خیالی کی کیفیت میں رہا۔ مراقبے کے بعد انہوں نے جھوٹ بولنے کی بابت خطاب میں کہا کہ جھوٹ اللہ کو اس لئے ناپسند ہے کہ اس سے انسان اللہ سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں فرمائی کہ جھوٹ بولنے سے انسان کے اندر ایک کمزوری در آتی ہے اور وہ حقائق کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اللہ جو سب سے بڑی اور اصل حقیقت ہے وہ اُس کا سامنا کرنے کی سکت کھو دیتا ہے۔ حضور ﷺ کا لقب صادق اور امین تھا۔ اور یہ لقب انہیں بعثت نبوی سے پہلے آپ ﷺ کو بہت قریب سے جاننے والوں نے دیا تھا۔ جھوٹ کی بابت آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ ناپائیدار اور عارضی ہوتا ہے۔ کاٹھ کی ہنڈیا کی مانند ہوتا ہے جو بار

بار نہیں چڑھتی۔

درس کے بعد چہل قدمی کے دوران وہ ایک ایک پودے کو دیکھتے بڑھ رہے تھے۔ رشید صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ اس پودے کو تراش دیں، یہاں بادام کے پودے لگائیں، یہاں سرس ٹھیک رہے گا، یہاں نیم کا درخت بھلا لگے گا۔ پھر اُس کو مخاطب کر کے بتانے لگے کہ یہ دیوار عارضی ہے اس کو سڑک کے کنارے لگائے گئے پودوں کے تحفظ کے لئے فٹ پاتھ کی جگہ بنایا ہے جب پودے بڑے ہو جائیں گے تو یہ دیوار ان پودوں کی آڑ میں چلی جائے گی۔ وہ اس دور اندیشی کو سراہنے کی بجائے یہ سوچنے لگا کبھی دیوار پودوں کو تحفظ دیتی ہے اور کبھی پودے دیوار کی شان بڑھاتے ہیں، کبھی ماں باپ اپنے بچوں کے تحفظ کے لئے سینہ سپر اور کبھی بچے اپنے والدین کے نگہباں۔ کبھی بچے اپنے والدین کو سدِ راہ سمجھتے ہیں اور کبھی والدین بچوں کی ناقدری سے نالاں۔ مرید کو ایک سوال سوجھا۔ عرض کی حضور بعض اوقات انسان کے اندر ایک طویل بحث چلتی ہے اور اس دوران کئی منفی خیالات بھی آتے ہیں۔ ایسے خیالات مواخذے کا سبب تو نہیں بنتے؟ انہوں نے ”جی نہیں“ کہہ کر گیٹ پر لٹکی گھنٹی کی طرف اشارہ کر کے تبسم ریز لہجے میں کہا۔ یہ کیا عدل جہانگیری والی گھنٹی ہے؟ اور ناشتے کے لئے دستر خوان کی طرف بڑھ گئے۔

اللہ کے روپ

ناشتے پہ خالد جاوید تارڑ سے کہا۔ یہاں کھیل کا کوئی انتظام ہونا چاہئے۔ سب نے مختلف آراء دیں۔ پھر والی بال کے حق میں فیصلہ ہوا۔ پھر اُس کے لئے جگہ کا تعین ہوا۔ مراقبہ ہال کے گیٹ کے ساتھ مشرقی دیوار کے باہر جگہ بنانے کا فیصلہ ہو گیا۔

ناشتے کے بعد رئیس امروہوی کا ذکر آ گیا۔ فرمایا۔ ایک بار میں نے اُن سے پوچھا کہ آخر آپ کس برتے پہ روحانیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ بھئی رئیس امروہوی بہت کھرے آدمی تھے۔ صاف کہہ دیا کہ میں اپنے مطالعہ کے زور پہ لکھتا ہوں۔ ایک بار میں اُن سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھے دروازے پہ روک دیا اور کہا۔ میرے پاس کچھ ایسے لوگ بیٹھے ہیں کہ میں آپ کو اندر لے جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں نے اُن سے کہا۔ کیا ہوا اگر ہم اب ایسے نہیں کبھی تو ہم بھی ایسے ہی تھے۔ وہ فوراً مان گئے اور مجھے اندر لے گئے۔ وہاں دور چل رہا تھا۔ ہنس کے کہا۔ وہ بھلے آدمی ہی تو تھے کہ فوراً مان گئے اور مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ پھر بتایا کس طرح ایک بار انہوں نے انہیں دھوکے سے ایل ایس ڈی کی ایک خوراک کھلا دی تھی۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے مراقبہ شروع کر دیا۔

مرید نے سوال کیا کہ ایسی حالت میں مراقبہ؟

فرمایا۔ نشہ شعور کو معطل کرتا ہے۔ اُس وقت اگر آپ خود ہی شعور کو ڈھیلا چھوڑ دیں تو نشہ تنگ نہیں کر سکتا۔ جب حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے میں نے اس بات کا تذکرہ کیا تو آپ نے اُن کی اس حرکت کو بہت ناپسند کیا اور بہت ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

مرید مگن ہو کر سُن رہا تھا کہ اچانک ایک بہت پرانے سوال نے اُس کے اندر کروٹ لی۔ اُس نے عرض کی۔ ''کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ دن میں ستر بار یا اس سے زائد مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے۔ جب انبیاء معصوم ہوتے ہیں تو پھر دن میں اتنی بار استغفار کا کیا مطلب ہوا؟

فرمایا۔ استغفر اللہ کا مطلب مجھے حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے بتایا تھا۔ اور پھر سوچ کر یاد کر کے فرمایا۔ کم مائیگی۔۔۔ ہاں انہوں نے فرمایا تھا کہ اللہ میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتا ہوں۔ دراصل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے کسی نہ کسی نئے روپ کا مشاہدہ فرما رہے ہوتے تھے اور ابھی ایک روپ کا نظارہ پوری طرح مکمل نہیں ہوتا تھا کہ وہاں کا نظارہ بدل جاتا تھا۔ اس پہ حضور ﷺ استغفار فرماتے تھے۔ حضور ﷺ نے اسی پہ فرمایا تھا میں دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں تم بھی کیا کرو۔ پھر مراقبہ ہال کی کیاریوں میں کھلے پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ سب بے شمار پھول بھی تو اللہ کے روپ ہیں۔

اللہ کے روپ انسان کے مشاہدے کے لئے اس قدر قریب اور فراواں ہیں مرید نے اس سے پیشتر ایسا کبھی کہاں سوچا تھا۔ حیرت کی ایک لہر اُس کو ماورائی دنیا سے باہر نکال کر اُسے اُس کے ارد گرد کی دنیا میں لے آئی تھی۔ حیرت اور استعجاب کی ایک اور لہر نے اُسے اللہ کے اور قریب کر دیا جب اُس نے سنا کہ اُس کا مراد کہہ رہا ہے کہ اللہ کا لغوی مطلب ہی حیران کر دینے والا ہے۔ یعنی جب کوئی بندہ حیران ہوتا ہے تو وہ دراصل اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے بندے کے اندر اللہ کی موجودگی کا احساس ابھرتا ہے۔ اور جب بندے کے اندر اللہ کی موجودگی کا احساس جڑ پکڑ لے تو بندہ دیکھنے لگتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ بالکل اُس مرید کی طرح جس کو اُس کے پیر و مرشد کی عنایتوں کے سبب اپنے پیر بھائیوں کے رشک و حسد کا سامنا تھا اور پھر اُس مرشد نے اُن سب کی تالیف قلب کے لئے یہ اہتمام کیا کہ ایک روز انہوں نے اُن میں سے ایک کو ایک مرغ اور چُھری دے کر راز

درانہ فرمائش کی کہ اس مرغ کو کسی ایسی جگہ جا کر ذبح کر لاؤ جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ وہ مرید خوشی اور افتخار کے جذبات سے مغلوب ہو کر مرغ کو بغل میں چھپایا اور چُھری کو نیفے میں اڑس کر ہوا ہو گیا۔ اور پانچ منٹ میں ذبح کئے ہوئے، کھال اترے صاف شدہ مرغ سمیت اپنے مرشد کے سامنے حاضر ہو کر اپنی کار کردگی کی داد طلب کر رہا تھا۔ اُس کو حیرت ہو رہی تھی کہ اُس کا مرشد اُس کی کارکردگی کے حسن و خوبی کو جانچنے اور اس کے تعمیل ارشاد میں اتنی تعجیل کو سراہنے کی بجائے اُس سے استفسار کئے جا رہا تھا کہ کہیں کسی نے دیکھا تو نہیں، کسی کو شبہ تو نہیں ہوا، کوئی وہاں موجود تو نہ تھا۔

اور پھر اُن کی حیرت اُس وقت اور بھی سوا ہو گئی جب مرشد نے اپنے چہیتے مرید کو ایک طرف لے جا راز درانہ انداز میں اُس کو ایک مرغا اور چھری دے کر اس شرط پہ کسی ایسی جگہ لے جا کر ذبح کرنے کی فرمائش کی جہاں اُسے یہ کام کرتے کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ اپنے مرشد کی بات سنتے ہی اُس مرید کے بشرے پہ سوچ و فکر کی کیفیت ابھرتے سب نے دیکھی۔ وہ کندھے جھکائے، سر کو ایک طرف لٹکائے۔۔۔ میں کوشش کر دیکھتا ہوں۔۔۔ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔۔ اُسے گئے گھنٹہ بھر ہو گیا تو پیر بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف معنٰی خیز نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ جب دو سے چار گھنٹے ہو گئے۔ تو تبصرے کھلتے چلے گئے۔ پھر صبح سے دوپہر ہو گئی۔۔۔ لیکن اُس چہیتے مرید کا کوئی پتہ نہیں کہاں رہ گئے۔ جب سہ پہر کے بعد شام ہونے کو آئی تو استہزا اور حقارت کے ساتھ بتایا جانے لگا کہ لو اتنا سا کام مرشد نے کہا اور وہ اُن سے ہو کے نہیں دے رہا۔ پھر رات ہو گئی۔ سب نے دبی دبی ہنسی میں اُس کے گھر جا کر پوچھنے کی تجویز دینا شروع کی اور ساتھ ہی آنکھیں مچ مچا کر اسے رد کیا کہ اُن کے آرام میں خلل پڑ جائے گا۔

قصہ مختصر اگلا دن آ گا اور کہیں دن ڈھلے وہ مرید پژمردہ و درماندہ، تھکا ہارا۔۔ ناکامی کا اشتہار بنا واپس آتا دکھائی دیا۔۔ ترنت مرشد کو اُس کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ سب سنبھل کر منتظر ہو بیٹھے کہ دیکھیں اپنی کوتاہی اور سستی کیا عذر پیش کریں گے۔ وہ آئے

۔پریشانی،رت جگے،ناکامی سے سوجھی آنکھوں سے اُس نے اپنے مرشد کی طرف دیکھا۔چادر کھولی اور زندہ سلامت مرغا بغل سے نکال کر سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔میں معافی چاہتا ہوں کہ میں کسی بھی طور اس کام کو سرانجام دینے کی سعادت حاصل نہیں کر پایا۔مرشد نے وجہ پوچھی تو اُس نے نظریں جھکا کر اتنا ہی کہا،آپ نے فرمایا تھا کہ اس کو کسی ایسی جگہ ذبح کرنا ہے جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔میں نے تو جہاں بھی چھری کو اس کی گردن پہ رکھا تو دیکھا اللہ دیکھ رہا۔اب آپ ہی بتایئے کہ کیا ایسے میں اسے ذبح کر دیتا؟

اُس نے اپنے مراد سے یہ بات سُن کر سوچا۔۔۔یہ اتنی سی بات۔۔۔ سمجھ آکر بھی سمجھ کیوں نہیں آتی۔،سب جانتے ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے لیکن یہ بات ہمارے احساس میں کیوں شامل نہیں ہو پا رہی،ہم علم سے سرتا سرلبریز ہو کر بھی احساس سے اتنے خالی کیوں رہ جاتے ہیں؟اُس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ یہ سوال اپنے مراد کی خدمت میں پیش کرے۔لیکن اُس کے شعور کو ڈر لگا کہ کہیں وہ اُسے اس احساس سے لبریز ہی نہ کر دیں اس لئے وہ اُس کو یہ ہمت دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ابھی اُس کے اندر یہ کشمکش چل رہی تھی کہ تارڑ صاحب نے آکر اطلاع دی کہ والی بال کے لئے میدان تیار ہے۔نیٹ لگا دیا ہے جس کسی نے کھیلنا ہو وہ میدان میں اترے اور جو کھیلنا نہیں چاہتے وہ آکر کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کریں۔وہاں کل آٹھ دس افراد ہی تو تھے۔سب اُس کے مراد کی سربراہی میں باہر کی طرف چل پڑے۔

وہاں جا کر دیکھا دو افراد ایک دوسرے کی طرف گیند اچھال رہے ہیں۔باقی سب احتراماً ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔انہوں نے چند ساعت دیکھا پھر کہا۔بھئی دو ٹیمیں بنائیں۔۔میں بھی کھیلوں گا۔۔اب سب اُنہی کی ٹیم میں شامل ہونا چاہ رہے تھے۔پھر پانچ پانچ کھلاڑیوں پہ مشتمل دو ٹیمیں بنیں۔کھلاریوں کی اوسط عمر چالیس سے اوپر ہی رہی ہوگی۔کورٹ کے جنوبی سڑک والے حصے میں اس کا مراد اپنی ٹیم کی سربراہی میں اترا اور وہ اپنے مراد کو سامنے سے دیکھنے والوں کی ٹیم میں شامل کیا گیا۔کھیل شروع ہوا۔

سب ہی ہنستے ہوئے کھیل رہے تھے۔ کسی کو اس کھیل کی مبادیات تک کی خبر نہ تھی۔ بس گیند کو دونوں ہاتھوں سے زمین پہ گرنے سے روکنے اور اُسے خود سے دور پھینکنے کی جدوجہد ہو رہی تھی۔ پانچ چھ ہی منٹ میں سب کی سانس پھولنے لگی۔ اتنے میں اُن کی طرف سے گیند کو دوسری طرف اچھالا گیا۔ اچھالنے والے نے کچھ زیادہ ہی زور لگا دیا تھا۔ اس کے مراد نے اگے بڑھ کر اُس گیند کو ہاتھوں پہ لینے کی کوشش کی۔ مشق نہ ہونے کے باعث گیند ایک ہاتھ کی طرف زور کر گئی۔ انہوں نے ہاتھ جھٹکا۔ تکلیف کی لہر ابھری اور پھیلتی چلی گئی۔ کھیل ختم ہو گیا۔ وہ ایک ہاتھ کو دوسرے سے دباتے۔ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

وہاں کوئی مساج وغیرہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہاتھ پہ پٹی لپیٹے باہر آئے۔ اب وہ دفتر جانے کے لئے تیار تھے۔ لطیف صاحب سوزوکی گیٹ کے پاس لا چکے تھے۔ جب وہ اُس کے پاس کھڑے کسی کو کچھ ہدایت دے رہے تھے۔۔۔ اُس نے کہا۔۔ ہاتھ کو سر سے بلند کرنے سے سوجن اور تکلیف میں کمی ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ہاتھ کو سر سے بلند کرتے ہوئے کہا اب ہم اس طرح گھر جائیں گے۔ سب ہی ہنس دیئے۔ وہ خجل سا ہو گیا۔ اُس کو اُن کی مخالف ٹیم میں ہونے کا ملال بھی تھا اور اپنے مراد کی تکلیف کا دکھ بھی۔ اوپر سے اُن کے حوصلے، برداشت اور سکت کا یہ مظاہرہ کہ تکلیف کے باوجود مزاح کے اظہار کو مستعد۔ اُس کو لگا اُن کو اُسکی نظر لگ گئی ہے۔ کہتے ہیں اچھا چاہنے والوں کی بھی نظر لگ جاتی ہے۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ تو اُس نے بھی اپنے گھر کی راہ لی۔

گھر جاتے ہوئے مراقبہ ہال میں اپنے قیام کا ایک ایک لمحہ اُس کو ایک بیش قیمت سرمایہ محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کو کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ ایک کان جواہر سے بیش قیمت ہی نہیں نادر و نایاب لعل و گوہر جھولی بھر کر کامیاب و بامراد لوٹ رہا ہو۔ اسی سر شاری و سر مستی میں وہ کئی دن مگن رہا۔ گھر آئے مہمانوں سے لے کر جہاں کہیں کسی کام سے بھی جانا ہوا وہاں ملنے جلنے والوں تک سے

وہ اپنے مراد سے سنی باتوں کا تذکرہ کرتا، انہیں دہراتا اور کہتا وہ اس بہانے اپنا آموختہ یاد کر رہا ہے۔ اپنی اس حرکت کے لئے وہ کوئی شعوری کاوش بھی نہیں کرتا تھا۔ یہ باتیں تو بس اُس کے اندر سے خود بخود ابلنے لگتی تھیں۔

ایک دور تھا جب وہ ادب کے طالب علم کے طور پر دن بھر شعر و شاعری، افسانوں اور ناولوں، ادیبوں کے شاعروں کی باتیں کرتا۔ رات رات بھر اُن کے افکار و نظریات پہ مباحث ہوتے۔ وہ سخن فہمی کی دعوے کرتا اور اپنی نکتہ آفرینیوں سے دوستوں کو مرعوب کرنے کی شعوری اور لاشعوری سعی میں جتا رہتا لیکن پھر رفتہ رفتہ غم روزگار اور غمِ دوراں نے اُسے ان سب باتوں کو دماغ کا خلل قرار دینے پر مائل کیا۔ ادب عالیہ کو کم لوگوں کی سخن وری اور زیادہ تر سخن کی فہمی کی شے مان کر اسے سرہانے اور کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب مطالعہ میں بھی رکھتا لیکن اس سے زندگی کے ٹھوس اور تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے لئے کسی باقاعدہ نظام اور لائحہ عمل کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

جمالیات کے ایک طالب علم ہونے کے ناطے اُس نے سقراط وارسطو سے لے کر ہیگل اور مارکس تک اور دانتے سے لے کر وچے اور برنارڈ شا تک چھوٹے بڑے کئی فلاسفروں کو اُن کے نظریات سے آگاہ ہونے کی خاطر پڑھا تھا اور سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ برگسان، نطشے۔ آئن سٹائن، فرائڈ اور سٹیفن ہاکنگ جیسے حکما کے نظریات اور سوچ سے بھی آگاہی رکھتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اُس کو اس درجے پر متاثر نہ کر سکا تھا کہ وہ اس کے نظریے کو اپنانے پہ خود کو آمادہ و تیار کر لیتا کیونکہ ہر ایک کے یہاں اُس کو کچھ نہ کچھ کمی اور ادھورے پن کا احساس رہتا تھا۔ آخر میں وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ کوئی بھی فلاسفر مکمل بات نہیں جانتا۔ جس حد تک جانتا ہے وہ اُس کو سیدھے سادھے انداز کی بجائے پیچ دار بنا کر پیش کرتا ہے تا کہ ایک مخصوص حلقے میں اپنی شناخت بنا لے۔ مختلف مذاہب کی کتب بھی اُس کے مطالعے سے گزر چکی تھیں۔ قرآن کی بابت اس کا وجدان بتاتا تھا کہ یہاں ایک ایسا ضابطہ حیات اور لائحہ

عمل ہے جو دُنیا اور آخرت دونوں کی نہ صرف خبر دیتا ہے بلکہ اُس کو درست انداز میں بسر کرنے کے طریقے اور گربھی تعلیم کرتا ہے لیکن اُس کے شعور میں جو الجھاؤ اور پیچ پڑے ہوئے تھے اُس کو سدھارنے کی اُس کو کوئی راہ نہ مل رہی تھی۔

اب جب سے اُس نے لوح و قلم کو پڑھا تھا، حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے واقف ہو رہا تھا اور اُن کے نہایت قابل اور اہل شاگرد رشید سے مل چکا تھا تو اُس کو محسوس ہو رہا تھا کہ جس راہبر و راہنما کی اُس کو تلاش تھی اللہ نے اُس کو عطا کر دیا تھا۔ وہ اس عطا کا جشن منا رہا تھا اور اسے کھو دینے کے خیال سے خوفزدہ بھی تھا اور اس موقع کو ضائع ہونے سے بچانے کی بھرپور کوشش بھی کر رہا تھا وہ خود کو کسی بھی ایسی حرکت کا مرتکب نہیں ہونے دینا چاہتا تھا جس سے اس عطا میں کوئی کمی ہو۔۔۔ وہ تو اس تاڑ میں تھا کہ جس طرح بن پڑے اس عطا میں افزودنی و فروانی ہوتی رہے۔ اسی اُدھیڑ بن میں اُس کے اندر ایک بات ابھری۔ کیا یہ عطا تمہاری کسی کوشش و کاوش کے نتیجے میں ہوئی ہے یا محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل و کرم ہے؟ اور اگر یہ اللہ کا کرم اور انعام ہے تو فکر کاہے کو کرتے ہو وہ اس کو جتنا چاہے بڑھا دے گا اور وہ شانت ہوتا چلا گیا۔

رب راضی تے سب راضی

چند روز بعد جمعہ کے دن گھر میں اخبار "جنگ" میں اپنے مراد کا کالم روحانی ڈاک دیکھ رہا تھا کہ ایک جملے نے مرید کی توجہ کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ ایک خط میں لکھا تھا آپ اتنا کام کرتے ہیں۔ اتنے خطوں کے جواب دیتے ہیں اتنے لوگوں کو مشورے دیتے ہیں اور پھر بھی آپ کا چہرہ کسی گلاب کی مانند کھلا رہتا ہے۔ اس بات کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا۔ "میں خوش رہتا ہوں کیونکہ میرا تعلق اللہ سے قائم اور جڑا ہوا ہے اور میں جانتا ہوں کہ میرا رب مجھ سے راضی ہے۔" اُس نے یہ جملہ پڑھا اور بار

بار پڑھا۔ اُس کو لگا اُس کے اندر کوئی چیز پگھل رہی ہے۔ جیسے موم تپش اور حرارت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ یقین و ایمان کی اس حرارت کے سامنے پگھلا جا رہا تھا۔ اُس کے اندر تشکر و اطمینان کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ مرید نے خود سے کہا۔ اللہ نے تم پہ کیسا انعام کیا ہے کہ تم کو اپنے ایک ایسے بندے تک لے گیا ہے جس سے وہ راضی ہے اور اُس بندے کو یقین ہے کہ اُس کا تعلق اللہ سے استوار ہے۔ وہ کتنی ہی دیر اس کیف و سرور سے بھیگتا رہا۔ شام کو وہ پھر عازم سرجانی ٹاؤن تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ آج وہاں مریض دیکھے جا رہے ہوں گے۔ درس ہو رہا ہو گا۔ اجتماعی مراقبہ ہو گا۔ وہ بھیڑ بھاڑ میں اپنے مراد سے کیسے ملے گا؟ چلیں اور کچھ نہیں تو اک جھلک دیکھنے کو ملے گی۔۔۔ یہ کہہ کر اُس نے خود کو تسلی دی۔

مراقبہ ہال پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ اُن کے کمرے کے سامنے چند لوگ قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ دربانی پہ مامور اقبال صاحب باری باری ایک ایک آدمی کو اندر جانے کا اشارہ کرتے۔ جب وہ اندر سے تجویز کردہ علاج کی پرچی تھامے باہر نکلتا تو چق اُٹھا کر دوسرے مریض کو اندر جانے کی راہ دیتے۔ اُس نے جا کر اقبال صاحب کو سلام کیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اقبال صاحب نے چق اُٹھائی اور اُسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھا کسی اور سے کہہ رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا تو انہوں نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ آپ اندر تشریف لے جائیں۔ آپ یہاں کیوں کھڑے ہو گئے؟ وہ گڑبڑا کر اس عنایت پہ شکریہ کہتا اندر داخل ہوا۔

کمرے میں کھڑکی کے قریب دیوار کی طرف پشت کئے اس کا مراد سر جھکائے سامنے بیٹھے مریض کے لئے علاج لکھ رہا تھا۔ وہ دروازے میں ہی رک گیا۔ انہوں نے آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ آیئے آیئے۔ وہ سلام کر کے فرش پہ

بچھی سفید چاندنی پہ اُن کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے لکھنا جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس یہ چند مریض دیکھ لوں'' اُس نے اس عزت افزائی کو اُن کی ذرہ نوازی پہ محمول کرتے ہوئے کہا۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ تسلی سے فارغ ہو لیں۔

وہ مریض کو دیکھتے۔۔۔ ''جی فرمایئے'' کہتے۔ ادھر مریض کیفیت بیان کرنا شروع کرتا ادھر اُن کا قلم کاغذ پہ رواں ہو جاتا۔ جتنی دیر میں مریض اپنی بات ختم کرتا۔ وہ علاج تجویز کر دیتے۔ اگر تسلی کو کچھ کہنا ہوتا ساتھ میں وہ بھی کہہ دیتے۔ اُس نے محسوس کیا جتنی بات وہ سننا چاہتے مریض اتنی ہی بات کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ لکھنے کے دوران دائیں آنکھ قدرے زیادہ بند ہو جاتی اور کبھی کبھار آنکھوں کی پتلی اوپر کو اُٹھتی اور ساکت ہو جاتی۔ وہ انہیں تکتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا مریض دوسرے کے بعد تیسرا۔۔۔ آخری مریض فارغ ہونے کو تھا کہ اقبال صاحب نے سلیقے سے سجی چائے کی ٹرے لا کر اُن کے پاس رکھی اور ادب سے باہر چلے گئے۔ مریض کے جانے کے بعد اُس کے مراد نے چائے کی پیالی اُس کی طرف بڑھائی۔ شکریہ کہہ کر اُس نے چائے کی پیالی تھامی اور کہا۔ آج صبح اخبار میں آپ کا کالم دیکھا۔ یہ پڑھ کر کہ میں جانتا ہوں کہ میرا رب مجھ سے راضی ہے۔۔۔ ایک کیفیت طاری ہو گئی۔

اُس کی بات سن کر مسکرائے اور ناگپور سے ایک مائی صاحبہ کی آمد کی بابت بتایا۔ کس طرح اُن کے آنے سے پورا گھر روشن ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ درو دیوار سے روشنیاں پھوٹ رہی ہوں۔ اُن سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو میں نے اُس نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمائیں۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور انگلی اُٹھا کر کہا۔۔۔ رب راضی تے سب راضی۔۔۔ اور کہا۔۔ مزے کرو تم سے تمہارا رب راضی ہے۔

فرمایا۔ جب بندے سے اُس کا رب راضی ہو تو وہ ناخوش کیسے رہ سکتا ہے۔ بھئی رب راضی ہو تو بندے کو مست ہی رہنا چاہیئے۔۔۔۔ بات سُن کر مرید کو اتنا اچھا لگا کہ وہ بے اختیار ہنس دیا اور کہا۔ آج مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ ہمارے سلسلے کی مثال نظام

شمسی کی سی ہے۔ جیسے سورج میں روشنی عمل انشقاق واحتراق کے سبب ہوتی ہے اسی طرح حضور ﷺ اللہ کی تجلیات سے روشن اور منور ہیں اور جیسے سورج کی روشنی چاند کو روشن کرتی ہے اُس ہی طرح نورِ نبوت سے حضور قلندر باباولیاءؒ جگمگارہے ہیں اور آپ اسی چاند کی چاندنی ہیں۔ مرید کی یہ بات سُن کر اُس کا مراد ہنس دیا اور کہا آپ نے تو سورج چاند ستارے اپنے ہی گھر میں جمع کر لئے۔ مرید اپنے مراد کی ہنسی سے شہہ پاکر اور بھی شیر ہو گیا اور مزید وثوق سے کہا۔ میں تو کچھ ایسا ہی سمجھا ہوں۔ اس پہ انہوں نے بتایا کہ حضور قلندر باباولیاءؒ سے ملنے کے بعد انہیں کبھی کوئی مرعوب نہیں کر سکا۔

فرمایا۔ بھئی ہم اپنے مرشد کے سامنے اپنا ذہن استعمال نہیں کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بازار سے کچھ لانے کو کہا اور بتایا کہ دوروپے میں آئے گی۔ ہم بازار گئے۔ دکاندار نے پونے دوروپے طلب کئے۔ ہم وہ چیز لئے بنا ہی واپس آگئے کہ صاحب دو روپے کی نہیں ملتی۔ وہ پونے دو کی دے رہا ہے۔۔۔ کیا حکم ہے؟ جب کہ لوگ وہی کرتے ہیں جو اُن کا دل چاہتا ہے۔ مرید نے سوچا ہم پیرومرشد کی باتوں میں سے اپنے لئے صرف وہی پسند کرتے ہیں جو ہمیں پسند ہوتی ہیں۔ ہم یہ خیال رکھنا سیکھ جائیں کہ اُن کو کیا پسند ہے تو ہمارا نصیب ہی نہ سنور جائے۔

لوح و قلم کا انگریزی ترجمہ

مرید نے عرض کی حضور یہ بات کچھ عجیب سی محسوس ہوتی ہے کہ جب تک لوح و قلم کا ترجمہ ہوتا رہا دنیاوی مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن جب سے یہ ترجمے کا کام مکمل ہوا ہے تمام مصروفیات بھی ختم ہو گئی ہیں۔

جی ہاں۔۔۔ یہ سب آپ کے شعور کو بیلنس رکھنے کا انتظام تھا۔۔۔اُن کے مرید کو ایک خوشگوار سی حیرت بھی ہوئی اور فخر بھی محسوس ہوا کہ وہ بھی اس قابل ہے کہ اُس کے لئے کچھ خصوصی انتظام ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اُس کو کچھ ہی دیر پہلے اقبال صاحب کا اسے قطار سے ہٹ کر اندر بھیجنے نے خود کو کسی قدر اہم محسوس کرنے پر ابھارا لیکن اپنے مراد کے حضور ہونے کی اہمیت نے اُس خیال کو دھندلا دیا۔اس وقت وہ اُن کے ساتھ بیٹھا چائے چسک رہا ہے اور اُن سے جو جی چاہ رہا ہے۔۔۔ کہہ رہا ہے۔اُس نے چاہا کہ دریافت کرے کہ لوح و قلم کے ترجمے کے مسودے کا کیا ہوا؟ لیکن پھر یہ سوچ کر چپکا بیٹھا رہا کہ کہیں یہ اُس کی ذاتی نمائش کی خواہش نہ ہو۔انہوں نے خود ہی پوچھا۔ بھئی اب اس ترجمے کا مزید کیا کرنا ہے؟

اُس نے جو بات کہی وہ خود اُس کے اپنے وہم و گمان میں نہ تھی۔اُس نے خود کو کہتے سُنا۔"میرا خیال ہے کہ اس کی اشاعت سے پہلے کوئی ایسا بندہ مل جائے جو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی کچھ مس رکھتا ہو اور لوح و قلم کو بھی کچھ نہ کچھ سمجھتا ہو۔ پھر میں اس ترجمے کو لفظ بہ لفظ خود اُن کے سامنے پڑھوں۔اس سے یہ ہو گا کہ اگر کوئی غلطی ہو گی تو وہ سامنے آجائے گی اور اس طرح اس کی پرکھ بھی ہو جائے گی کہ سننے میں یہ کیسا لگتا ہے۔"

آپ کو "بندہ" مل جائے گا۔ مسکراتے ہوئے لفظ بندہ پہ زور دے کر کہا گیا۔

اُس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اُن کو دیکھا تو طرح دیتے ہوئے فرمایا۔"میں سمجھ گیا۔اس سے یہ ہو گا کہ اس طرح پڑھنے سے الفاظ کی سیٹنگ کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔میں خالد نیاز سے کہہ دوں گا وہ آپ سے مل لیں گے۔"

آپ کو اس ترجمے کا بہت فائدہ ہو گا۔لوح و قلم تو الہامی کتاب ہے۔قرآن حکیم اور فتوحاتِ مکیہ کے بعد یہ پہلی تصنیف ہے۔ باقی سب کتب تالیف کے زمرے میں آتی ہیں۔ بھئی حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ سہرا آپ کے سر باندھ دیا ہے۔میرے مرشدِ

کریم کی خواہش تھی کہ یہ کتاب میرے نام سے چھپے۔جب میں نے اس کا ٹائٹل بنوالیا تو شام کو اندھیرے میں دکھایا اور اُن کے نام پر انگوٹھا رکھ کر اُن سے منظوری لے لی۔قلندر بابا اولیا نے جو کچھ لکھوایا تھا۔۔جب کتابت کا مرحلہ آیا تو بہت سے حصے قلم زد شروع کر دیئے۔اس کی کیا ضرورت ہے۔۔۔یہ ضروری نہیں۔۔۔یہ غیر ضروری ہے۔۔میں ڈرا کہ کہیں سب ہی نہ کاٹ دیں۔میں نے کتاب دکھانا ہی بند کر دی۔وہ سب کچھ انہوں نے مجھے لکھوایا تھا۔۔۔وہ سب میرے لئے تھا۔۔یہ تو میری تعلیمات کا حصہ تھا۔۔۔لوگوں کے لئے تھوڑے ہی تھا۔لیکن ہمیں اتنا جوش تھا کہ لوگوں کو معلوم تو ہو۔۔۔اب دیکھیں کسی کو سمجھ بھی تو آئے۔۔۔مراد اُس کو بتا رہا تھا۔

وہ اُن کو بولتے سُن بھی رہا تھا اور اُن کی طرف ممنونیت سے دیکھ بھی رہا تھا۔اُس نے اُن کی باتوں میں دکھ محسوس کیا تو بولا۔۔یہ آپ کا ہم پہ احسان ہے کہ آپ نے اس علم کو عام کرنے کو اس کی اشاعت کا فیصلہ فرمایا۔اوروں کی بابت تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میری آرزو ہے کہ یہ کتاب مجھے سمجھ آجائے اور اس کے لئے میں ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔آپ نے علم کو سینوں سے باہر نکلنے کا راستہ فراہم کیا ہے۔اب یہ ان شاءاللہ اپنا راستہ خود ہی بنائے گا۔

اللہ آپ کو خوش رکھے۔کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

کمرے سے باہر نکلے تو سامنے سے کالا چشمہ پہنے ایک صاحب ہاتھ میں کچھ کاغذات تھامے، پان چباتے چلے آرہے تھے۔شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں بھی سیاہ چشمہ۔۔۔اُس کو کچھ عجیب سا لگا۔انہوں نے قریب آکر چشمہ اتارا۔سلام کیا اور اخبار میں دینے کے لئے کالم کی بابت کچھ بات کہی۔ابّا نے۔۔۔بھئی یہ ہیں خالد صاحب۔۔۔کہہ کر اُن سے متعارف کروا کر انہیں اُس کی ترجمہ سننے کی خواہش کا بتا کر کہا آپ آپس میں طے کر لیں کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔پھر خالد نیاز سے کہا۔آپ کوئی جگہ اور دن

مقرر کر کے مل بیٹھا کریں۔۔۔ایک دو گھنٹے کام کیا۔۔۔اس طرح کچھ نشستوں میں کام ہو جائے گا۔ دونوں نے اس پہ صاد کیا اور پھر یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دیئے کہ مجھے کسی کے یہاں پہنچنا ہے۔

خالد نیاز کے ساتھ نشستیں شروع ہوئیں۔ انہوں نے اُس کو سلسلے کے حوالے سے کئی باتوں سے روشناس کرا دیا۔ وہ لوح و قلم کی کلاس کے طالب علم رہے تھے۔ اُن کو ماورائی دنیا سے کچھ زیادہ ہی شغف تھا۔ وہ اوپر والوں کے تکوینی امور کے حوالے سے اُسے بتاتے، قلندر باباولیا کے تکوینی رتبے کی باتیں کرتے، اُن کی رسائی اور دسترس کی باتیں بتاتے۔ اپنے مرشد کریم سے والہانہ لگاؤ کے پس پردہ اُن سے اکتسابِ فیض کی مچلتی خواہش کو وہ چھپانے کی کوشش بھی نہ کرتے۔ مختلف اخبارات میں اُن کے لکھے کالم لے کر جاتے، وہاں سے ڈاک سمیٹ کر لاتے اور اسی طرح کے کئی چھوٹے بڑے کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ وہ اُن کے گھر بھی آتے جاتے تھے اور روحانی ڈائجسٹ اور مطب بھی پہنچ جایا کرتے۔ اُن سے اپنے مراد کے سامنے نشست و برخاست اور سلسلے کے آداب کو سمجھنے میں اُسے بہت مدد ملی۔

وہ اُس کو نو آموز اور سادہ لوح جان کر اُس کو اپنے مرشد سے ایسے ایسے سوال پوچھنے پر ابھارتے جن کو دریافت کرنے کا خود اُن کو حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ پیر بھائیوں کی بابت یا تو اُن کے تجربات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے اور یا پھر اُن کے مقابلے میں خود کو مرشد کے زیادہ قریب ماننے کے سبب خود کو لئے دیئے رکھتے تھے۔ کبھی کبھار تو اُس کو اُن کی باتوں سے کچھ یوں محسوس ہوتا گویا وہ سب اسی تاک میں ہیں کہ مرشد کریم کے علوم کو کہیں کوئی دوسرا نہ لے اڑے۔ اُس کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ سورج کی روشنی تو سب کے لئے یکساں دستیاب ہے تو پھر اُس پہ کسی قسم کی کوئی کھینچا تانی کی گنجائش کہاں۔ اگر کسی نے کچھ زیادہ اکتسابِ فیض کیا تو یہ اُس کے

نصیب اور ہمت۔۔۔ کبھی کبھی اُسے محسوس ہوتا کہ وہ اُس کی باتوں کو نظریاتی حد تک ہی تسلیم کرتے۔۔۔اُن کو عملی حدوں کے لئے ناقابل عمل کہتے تو نہ تھے لیکن مانتے کچھ ایسا ہی تھے۔

اُن دنوں وہ ہفتے میں ایک دو بار مراقبہ ہال جاتا۔ایک روز وہ مراقبہ ہال پہنچا تو وہ گلاب کی کیاری کے پاس کھڑے دکھائی دیئے۔وہ بھی پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔وہ ایک ایک پودے کے ایک ایک پتے کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ڈاکٹر مریض کی تشخیص کرتے وقت پوری توجہ اور دھیان سے معائنہ کرتا اور ذہن میں اسباب و علل کی فہرست بنا رہا ہوتا ہے۔

اُس نے دیکھا کہ گلاب کے پتے پھولوں کی پتیاں چر مرائی ہوئی ہیں۔دیکھ کر اُسے افسوس سا ہوا کہ اُس کے مراد کے گلستان کے پھولوں پہ یہ افتاد کیوں؟انہی دنوں اُس نے کہیں یہ پڑھا تھا کہ گلاب کو رات کے وقت پانی دینے سے اُس کے پتے اور پنکھڑیاں چر مرا جاتے ہیں۔اُس نے یہی بات کہہ دی۔انہوں نے سُنا لیکن کچھ نہ کہا۔کچھ آگے جا کر اُس نے اپنی بات پھر دہرائی۔سُن کر چپ ہو رہے۔آگے جاکر مزید پودوں کی یہی حالت دیکھی تو تیسری بار کہا۔یہ سب پودے اس لئے خراب ہو رہے ہیں کہ انہیں رات کو پانی دیا جاتا ہے۔اب حضور رُکے اور اُس سے کہا۔آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔مجھے یہ بات معلوم نہیں۔۔۔بھئی میری مجبوری یہ ہے کہ یہاں پانی آتا ہی رات کو ہے۔

مرید کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں۔اپنے مراد کے سامنے اپنے علم کا اظہار کرنے کی حماقت کا مرتکب ہو کر وہ شرمندہ تھا۔اُس نے چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔وہ سر جھکائے وہاں کھڑا تھا کہ انہوں نے۔۔۔جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔اُس کو مخاطب کرتے ہوئے جھڑے ہوئے پھولوں کی سوکھی ڈوڈیاں توڑ کر دکھاتے ہوئے کہا۔ان کو توڑ دیں تو نئی کونپلیں زیادہ نکلتی ہیں۔

اُس کو ایک نئی بات سیکھنے کی جو خوشی ہوئی وہ معافی ملنے کی خوشی کے ساتھ مل کر دوچند ہوگئی۔ وہ کیاری میں لگے پودوں کی سوکھی شاخیں اور ڈوڈیاں توڑنے لگ گیا۔

ایک بار وہ مراقبہ ہال پہنچا تو اُس نے کفیل صاحب کو اپنی بیگم کے ہمراہ حضور کے کمرے کے باہر کھڑے دیکھا۔ وہ اُن کے قریب چلا گیا۔ اُس کو کفیل صاحب بہت ہی نفیس اور بھلے لگے۔ اُن کی بیگم بھی بردبار اور باوقار سی خاتون تھیں۔ اُن کو معلوم ہوا کہ حضور نہانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام طے ہے اور وہ انہیں لینے آئے ہیں۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضور اپنے کمرے سے نکل کر اپنے لئے مختص باتھ روم کی طرف چلے۔ دھوتی لپیٹے، بنیان پہنے وہ اُن کے قریب آئے تو انہوں نے انہیں سلام کیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ انہوں نے نہانے سے پہلے جسم پہ تیل لگایا ہوا ہے۔ انہیں لنگی بنیان میں دیکھ کر اُسے بالکل بھی عجیب نہ لگا۔ اُس حالت میں بھی وہ اتنے اچھے لگے جیسے فارمل لباس میں نظر آتے تھے۔

قانون: دنیا بندے کے پیچھے پیچھے آنے کی پابند ہے

وہ اُن کے پاس رُکے اور کہا۔ انسان ایک قانون کے تحت دنیا سے بندھا ہوا ہے۔ جب انسان دنیا کی طرف رخ کرتا ہے تو دنیا آگے ہی آگے کھسکتی ہے۔ پھر اپنی بات کی وضاحت کو پیروں کے بل نیچے بیٹھتے ہوئے، زمین سے دو پتھروں کو اُٹھا کر آپس میں جوڑ کر دکھاتے ہوئے فرمایا۔ یہ دنیا اور بندے کی مثال ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ہیں۔ اب یہ ایک دوسرے میں گھس تو نہیں سکتے۔ جب بندہ دنیا کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُسی کی طرف زور کرتا ہے تو یہ دنیا یوں آگے ہی آگے ہٹتی رہتی ہے۔

لیکن جب بندہ اپنا رخ دنیا کی طرف سے پھیر کر چلتا ہے تو یہ دونوں آپس میں جڑے ہونے کے سبب الگ تو ہو نہیں سکتے۔اب ہوتا یہ ہے کہ دنیا بندے کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔

وہ تینوں اُن کے گرد کھڑے۔۔۔انہیں زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھے۔۔۔اپنی بات کی وضاحت کرتے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بات مکمل کی اور گردن اوپر کر کے اُن کی طرف دیکھا۔ بھئی دنیا بندے کے پیچھے پیچھے آنے کی پابند ہے۔۔۔کہتے ہوئے۔۔۔دونوں پتھر ہاتھ میں لئے۔۔۔اُٹھ کھڑے ہوئے اور باتھ روم کے قریب جا کر اُن پتھروں۔۔۔بندے اور دنیا دونوں کو ۔۔۔دیوار سے باہر اچھال کر۔۔۔ٹھکانے لگا کر۔۔۔ہاتھ جھاڑے اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

وہ وہیں کھڑے بتائی گئی بات کو سمجھنے اور اُس کو اپنے ذہن میں اتارنے کی تگ ودو کرتے رہے۔وہ دنیا سے ہٹنے کو فنا ہونے کے مترادف مانتا تھا۔ تبھی تو دنیا سے خود ہٹ جانے اور دنیا سے رخ ہٹانے کا فرق اُس پہ واضح نہ تھا۔انہوں نے اُس کی توجہ اس کے سامنے کی غلطی پر مبذول کرادی تھی۔شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا سے ہٹنے کے بعد جب بندے کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو پھر پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔وہ سوچوں کے ان بنتے بگڑتے دائروں کو کھڑا دیکھتا رہا۔

نہا کر نکلے، تولیہ کاندھے پہ لٹکائے اُن کے قریب سے گزرتے ہوئے دوبارہ رُک گئے اور فرمایا۔اسلام میں ہر موقع کے لئے دُعا ہے، کھانے سے پہلے، کھانے کے بعد، پانی پینے سے پہلے، پانی پینے کے بعد، مسجد میں داخل ہونے، مسجد سے نکلتے وقت، بیت الخلا میں داخل ہوتے وقت، بیت الخلا سے باہر آتے وقت کی دُعا۔۔اور تو اور میاں بیوی کے مابین بھی دعائیں ہیں۔۔تینوں نے اثبات میں سر ہلایا تو معصومیت سے پوچھا۔۔کیوں جی۔۔اُس وقت بھلا کوئی دُعا یاد آتی ہے؟ بیگم کفیل اپنی مسکراہٹ چھپانے کو دو قدم ہٹ کر وہاں لگے پھول دیکھنے لگیں۔۔وہ دونوں ہنسنے لگے۔۔۔اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

یقین کسے کہتے ہیں؟

اُن کے مراقبہ ہال سے چلے جانے کے بعد وہاں اک سناٹا سا در آتا ہے۔ جب وہ وہاں موجود نہیں ہوتے تو لوگوں کا دل نہیں لگتا۔ وہ وہاں ہوں تو لوگ بلاوجہ بھی کھنچے چلے آتے ہیں لیکن اُن کے جانے کے بعد۔۔۔ کسی کو اُن کے جانے کی خبر نہ بھی ہو پھر بھی۔۔۔ دل گویا اُٹھ سا جاتا ہے۔ وہاں رکنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ کوئی بہت ہی توانا اور زوردار بہانہ ہو تو کچھ اور بات ہوتی ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے تو وہ مراقبہ ہال کے اندر واپس آ گیا۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا کوئی نظر نہ آیا تو وہ آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں ایک دو اصحاب بیٹھے ڈاک کھول رہے تھے۔ خطوط کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لفافہ کھولنے کے بعد جس خط سے جوابی لفافہ بر آمد ہوتا اُس کو اُسی خط کے ساتھ لف کیا جاتا۔ دوسری طرف جن خطوط کے جواب تیار ہوتے ہیں اُن کو جوابی لفافوں میں بند کیا جا رہا تھا۔ ہر روز سینکڑوں خطوط کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا۔

اُن کے کام کے دوران اُن سے باتیں ہوئیں۔ باتوں کے دوران اُس نے ایک بات بہت دلچسپی سے نوٹ کی کہ وہ سب رضا کارانہ کام کر رہے ہیں۔ اُن کو اس خدمت کا سلہ طمانیت قلب اور روحانی کیف کی صورت میں مل رہا ہے۔ وہ گپ شپ کرتے کام بھی نپٹا رہے تھے۔ آپس میں ہلکی پھلکی جملے بازی بھی ہو رہی تھی اور چہلیں بھی۔ بات بے بات حضور ابا جی کا تذکرہ بھی ہو رہا تھا۔ عقیدت کے علاوہ اُن کے ذہن میں کوئی دوسری بات نہ تھی۔ ایک صاحب کالج کی چھٹیوں کے سبب وہاں تھے اور دوسرے کالج سے فراغت کے باعث۔ وہ دونوں روحانی ڈائجسٹ کی زلف گرہ کے اسیر ہو کر وہاں تک پہنچے تھے اور اپنے مرشد کے شکر گزار تھے کہ اُس نے اُن کو خدمت کی اس سعادت سے بہرہ مند کیا تھا۔

جس کرسی پہ مرشد بیٹھ کر کام کرتے تھے اُن کی غیر موجودگی میں بھی کوئی اُس پہ بیٹھنے کی جسارت نہیں کر رہا تھا۔ سبز میز پوش پہ پھولوں کی ایک بڑی سی سینری بچھا کر اُس کے اوپر شیشہ رکھا ہوا تھا۔ شیشے کے نیچے کچھ ویزٹنگ کارڈز بھی لگے تھے۔ ایک کھڑکی حضور کی کرسی کی پشت کی جانب شمالی سمت میں تھی۔ اُس کمرے میں دوسری کھڑکی مغربی دیوار میں برآمدے کی جانب کھلتی تھی اور تیسری کھڑکی جنوبی دیوار میں لان کی سمت۔ جس کرسی پہ وہ بیٹھا تھا اس کی پشت پہ لان میں کھلنے والی کھڑکی تھی۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر اُن کی خالی کرسی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اپنے بیعت ہونے کے لمحات کی کیفیات کی یاد تازہ ہو گئی۔

وہ اُن لمحات کو یاد کرتا میز کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کی توجہ سینری کے اوپر بنے ایک نشان کی طرف مبذول ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کسی نے وہاں رکھا کوئی کارڈ یا کاغذ تازہ تازہ ہٹایا تھا۔ اس جگہ کا رنگ باقی تصویر کے رنگ سے کچھ مختلف تھا۔ باقی تصویر کا رنگ ہلکا اور مدھم لگ رہا تھا۔ جبکہ اُس جگہ کے رنگ قدرے گہرے اور شوخ تھے۔ وہ اس فرق کی وجہ کھوجنے لگا۔ اُس کو پہلا خیال یہ آیا کہ دھوپ کی وجہ سے تصویر کے رنگ اڑے ہوں گے جبکہ کارڈ کے نیچے کی جگہ دھوپ کے اثر سے محفوظ رہ گئی ہے۔ لیکن یہاں اس کمرے میں دھوپ کہاں سے آتی ہو گی۔ مشرق کی سمت تو کوئی کھڑکی ہے نہیں اور مغربی کھڑکی کے اوپر برآمدے کی چھت ہے اب شمالی یا جنوبی سمت کی کھڑکیوں سے تو دھوپ آنے سے رہی۔ تو پھر یہ ضرور کراچی کی آب وہوا کی وجہ سے ہو گا۔ جب وہ کسی نتیجے پہ نہ پہنچ سکا تو اس کا ذہن الجھ جاتا تھا۔ اُس نے وہاں موجود دونوں اصحاب کو بھی اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ اُس نے تیسرا امکان یہ ظاہر کیا کہ شاید میز باہر کھلے میں رکھی گئی ہو گی اس وجہ سے اس پہ دھوپ اور موسم کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اُس کی اس بات سے دونوں نے اتفاق نہیں کیا۔ ایک نے بتایا یہ سینری اس کے سامنے چھ سات ماہ پیشتر وہاں لائی گئی تھی اور جب سے وہ میز اُسی کمرے میں رہی ہے۔ اُس کا تجسس اُس کو قرار نہیں لینے دے رہا تھا۔

اُس کو الجھتا دیکھ کر ایک صاحب نے کہا۔ آپ کا دھوپ والا نظریہ ہی ٹھیک ہے۔

لیکن یہاں دھوپ کہاں؟

آپ دھوپ کا کہتے ہیں یہاں تو پورا سورج چمکتا ہے۔۔۔ کہہ کر وہ ہنس دیئے تو اُس کو ہزار واٹ کے بلب والی بات یاد آگئی جو اُس کے مراد نے مراقبہ ہال میں ابتدائی ملاقات میں کہی تھی۔ اُن تینوں نے اُس جگہ کا دوبارہ جائزہ لیا اور اس نتیجے پہ متفق ہو گئے کہ تصویر میں پیلا رنگ نسبتاً زیادہ کم ہے۔ اس بار دوسرے صاحب نے تبصرہ کیا۔ زرد رنگ دنیا کا رنگ ہے فقیر کے سامنے یہ رنگ کتنی دیر ٹک سکتا ہے۔

چند روز بعد اُس کا بہنوئی امریکہ سے آیا۔ اُس نے اُس کے حالات سُن کر اُسے امریکہ آنے کی دعوت دی۔ اُس نے ایک دو روز بعد اُس کو جواب دینے کا کہا اور اپنے مرشد سے پوچھنے چل پڑا۔ وہ مراقبہ ہال آیا۔ ''ابا اس طرح امریکہ کا چانس بن رہا ہے۔ میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''کیا امریکہ میں کوئی دوسرے اللہ میاں ہیں؟ انہوں نے دریافت کیا۔

''جی نہیں'' اُس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر جو اللہ وہاں دے سکتا ہے کیا وہ یہاں نہیں دے سکتا؟ انہوں نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔

کچھ دیر بعد ایک صاحب وہاں آئے اور انہوں نے بھی امریکہ جانے اور وہاں پہ مواقع کی دستیابی کی بات کی تو اُن سے کہا۔ ہاں یہ تو ہے۔ آپ ضرور کوشش کریں اللہ بہتر کرے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ اللہ نے اُس کے لئے امریکہ جا کر محنت مزدوری کی تمثیل لوحِ محفوظ پر بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے اُس کو جانے کا مشورہ دے دیا۔

اُس نے عرض کی۔ ''حضور وہ کون سی آیت تھی جس کو قلندر بابا اولیاء کے کہنے پر پڑھنے سے آپ کو اللہ تعالیٰ نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔''

فرمایا۔ ''جب وقت آئے گا تو بتا دیں گے۔ ورنہ آپ تو ہر چیز کو سجدہ کرتے پھریں گے۔ کبوتر آیا تو اُس کو سجدہ۔۔۔ بیوی سامنے آئی تو اُس کو سجدہ۔''

اُس کو شوخی سوجھی۔۔ یہ تو بہت بہتر ہو جائے گا۔۔۔ اسی بہانے بیوی بھی خوش ہو جائے گی۔

''خوش ہو گی یا جوتے لگائے گی؟ انہوں نے سوال کر کے اُس کی شوخی کو لگام دی۔

ایک روز خالد نیاز اور اُس کے درمیان یقین، علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کی بابت دیر تک بات ہوتی رہی۔ وہ دونوں بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ کسی حتمی نتیجے پہ نہ پہنچ سکا۔ اگلے روز جب وہ مراقبہ ہال پہنچا۔ گیٹ کے بالکل سامنے اُس نے خالد نیاز کو اپنے مراد کے ہمراہ کھڑے دیکھا۔ سلام کر کے قریب جا کھڑا ہوا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہوئے تو اُس نے دریافت کیا۔ حضور۔۔۔ یہ یقین کیا ہے؟

آپ کا رُخ اُس وقت گیٹ کی طرف تھا۔ آپ نے اپنا بایاں ہاتھ بلند کر کے زیرِ تعمیر مسجد جامعہ عظیمیہ کی طرف اشارہ کر کے عجیب سے لہجے میں کہا۔ یہ ہے یقین۔

قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ یہاں سے یقین بٹے گا۔

پھر ارشاد ہوا۔ یہ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین وغیرہ۔۔۔ اور ہاتھ کو یوں ہلایا گویا فرما رہے ہوں کچھ نہیں۔۔۔ اور کہا "یقین تو صرف یقین ہوتا ہے۔"

خالد نیاز نے اُسے دیکھا اور اُس نے انہیں۔ دونوں میں سے کسی کو اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ اس بات کی وضاحت کی درخواست کرتے۔ وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ گھر جاتے ہوئے اچانک اس کو یہ بات سمجھ آئی کہ انہوں نے اُسے یہ بات سمجھائی ہے کہ یقین ایک طاقت ہے اور علم الیقین وغیرہ علم کے درجے ہیں۔ جامعہ عظیمیہ ایک بندے کے یقین کی طاقت ہی تو ہے کہ بغیر مادی وسائل کے وہ بن رہی ہے۔

اُس کو یاد آیا کہ ایک بار انہوں نے فرمایا تھا کہ بھئی ہم وسائل کے چکر میں نہیں پڑتے اللہ کے بھروسے پہ کام شروع کر دیتے ہیں اُس کے لئے وسائل خود بخود مہیا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر مزار کی تعمیر کی مثال دیتے ہوئے فرمایا یہ سب پیسے اکٹھے کرنے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں دو لاکھ ہوں تو تعمیر شروع کریں۔۔۔ دس لاکھ ہوں تو تعمیر کا آغاز کریں۔۔ نتیجہ یہ کہ ابھی تک مزار کی تعمیر شروع نہیں ہو سکی۔۔۔ اگر وہ وسائل کے چکر میں نہ پڑتے تو اب تک اللہ اُس کو پورا کر دیتا ہے۔

یاحی یاقیوم اور درود شریف

چند روز بعد جب وہ مراقبہ ہال آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس بار حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ عرس کی تقریبات ایک دن قبل روحانی کانفرنس کی تقریب سے آغاز کرنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ عرس پہ شرکت کے لئے زائرین کے ساتھ ساتھ مندوبین کو روحانی کانفرنس میں شرکت کے لئے مدعو کیا جائے گا۔ آنے والے زائرین کی بابت حضور مرشد کریم نے فرمایا ہے کہ وہ سب حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے مہمان ہوں گے۔ کراچی میں رہنے والے سلسلے کے بہن بھائیوں نے تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔ اس کے لئے رضاکار اپنا نام دے دیں۔ اُن کی کمیٹیاں بنا دی جائیں گی۔ جب اُس نے یہ بات سُنی تو اپنی خدمات پیش کرنے کی ٹھانی۔

دفتر میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ دفتر کے ایک کونے میں تشریف فرما مرشد کریم کے سامنے زمین پہ بچھی دری پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ خدمت کے شعبوں کا تعین کر دیا گیا تھا۔ شعبے کا نام پکارا جاتا اور اُس ذیل میں کام کرنے کے خواہش مند پکار کر ہاتھ کھڑا کر کے اپنا نام درج کروا رہے تھے۔ پہلے صفائی کے لئے رضاکار طلب کئے گئے۔ یہ بات واضح کر دی گئی کہ مراقبہ ہال کی صفائی میں باتھ رومز کی صفائی بھی شامل ہے۔ اس کے بعد کچن میں کام کرنے کے لئے رضاکاروں نے نام دیئے۔ انہیں بتا دیا گیا کہ کھانا پروسنے سے لے کر استعمال شدہ برتنوں کی صفائی اور دیکھ بھال سبھی اس شعبے میں شامل ہیں۔ پھر بستر کمیٹی کے لئے رضاکار مانگے گئے۔ پہلے دونوں شعبوں کے لئے تو وہ خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کے لئے اُس نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ نام لکھنے والے صاحب نے اُس کا نام دریافت کیا تو اُس کے مراد نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ آپ بستر اُٹھائیں گے؟ اُس نے سمجھا کہ وہ اُس کے ذمے کوئی اور کام لگانا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا۔ وہ بھی اُٹھائے گا اور اس کے علاوہ جو خدمت ہو گی وہ بھی کرے گا۔ انہوں نے نام درج کرنے والے

صاحب کو آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اگلے روز جب لسٹیں مکمل ہو گئیں تو اپنا نام استقبالیہ کمیٹی میں دیکھ کر اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔

کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوئیں تو ادھر کراچی میں ۲۶ جنوری کو ہڑتال کا اعلان ہو گیا۔ مراقبہ ہال کے گیٹ کے ساتھ منڈیر پہ ٹانگ پہ ٹانگ دھرے بیٹھے اپنے مراد کے قریب کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ کانفرنس کے دن جب شہر میں ہڑتال ہو گی، سیاسی جلسہ ہو گا، ٹریفک بھی جام ہو گی تو لوگ کیسے آئیں گے۔ اگر یہ تجویز دوں کہ کانفرنس کی تاریخ آگے بڑھا دی جائے تو۔۔۔ اور ساتھ ہی وہ ڈرا کہ وہ بہتر جانتے ہیں۔۔۔ میں کسی گستاخی کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔۔۔ لیکن خیال تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا۔

اُنہوں نے ارشاد فرمایا۔ ''اللہ کے لئے یہ بالکل بھی مشکل نہیں کہ وہ کانفرنس کے لئے پورے شہر کو بھیج دے لیکن ہم انہیں بٹھائیں گے کہاں؟ ہمارے پاس اتنے لوگوں کا انتظام ابھی نہیں ہے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ ہمیں صرف وہ لوگ چاہیئں جو اپنے اندر اللہ کے بارے میں خلوص رکھتے ہوں۔ اگر ہڑتال کے خوف سے یا کسی اور نقصان کے ڈر سے اللہ کے لئے وقت نہیں دے سکتا تو ہمیں اُس سے کیا لینا دینا؟ وہ اول تو ہماری بات سُنے گا نہیں اور اگر اُس نے سُن بھی لی تو سمجھے گا نہیں۔ ا‌ٓج لوگ تو صرف اپنے مطلب کی بات سننا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو ایسے لوگ چاہیئں جو خالص ہو کر آئیں۔

انہوں نے اُس کے ذہن میں لگے کتنے ہی جالے ایک ہی ہاتھ میں صاف کر دیئے تھے وہ گنگ ہو کر اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

کسی قدر توقف کے بعد انہوں نے فرمایا۔ آپ پشاور چلے جائیں۔ اُس کا دل دہل کر رہ گیا۔ وہ شہر ناپرساں جہاں سے وہ انتہائی کس مپرسی کی حالت میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوا تھا جہاں کیا اپنے کیا پرائے سب سے نالاں ہو کر وہ کراچی آیا تھا۔ اُسے اُس شہر کے

نام سے ہول اُٹھتے تھے۔ اب اُس کا مرشد اُسے واپس اُسی شہر جانے کو کہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اُس نے نہایت لجاجت سے عرض کی حضور میری خواہش تو یہ ہے کہ میری باقی ماندہ زندگی اب آپ ہی کے قدموں میں گزرے۔

فرمایا۔ بھئی دور رہنے سے محبت کم تو نہیں ہو جاتی۔ اب سعیدہ کو ہی دیکھیں۔ بے چاری کہاں بیٹھی ہیں۔ جب واپس جاتی ہیں روتے ہوئے جاتی ہیں۔ یہاں سے جانے کو جی کس کا کرتا ہے۔ لیکن سلسلے کی خاطر وہ چلی جاتی ہیں۔

مرید نے چاہا کہ وہ کہے کہ وہ تو سلسلے کی خاطر کچھ کام کر رہی ہیں میں کندہ ناتراش بھلا کس کام کا ہوں آپ مجھے وہاں نہ بھیجیں۔ کہیں اور جانے کا حکم دے دیں۔ لیکن کہنے کی تاب پیدا نہ کر سکا۔

فرمایا۔ آپ پشاور چلے جائیں۔ وہاں سلسلے کا کام کیجیئے۔ ان شاءاللہ بہت اچھی سیٹنگ ہو گی۔ یہاں تو لوگ آتے ہیں پھر اپنی جگہ جا کر کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

وہ روپڑا۔ اتنی عزت، اتنی شفقت اُس سے سنبھالے نہیں دے رہی تھی۔

پھر اُس کی دل جوئی کو بتانے لگے۔ اس دنیا میں میرا دل نہیں لگتا مگر مرشد کا حکم ہے کہ میں یہاں رہوں۔ بس نہیں چلتا ورنہ میں تو یہاں رُکنے پہ تیار ہی نہیں۔

اُس کے بعد کئی روز تک وہ اپنے مراد کو دور دور سے ہی دیکھ سکا۔

پہلی روحانی کانفرنس تھی۔ تین چار سو افراد آئے۔ مراقبہ ہال کے سامنے پنڈال لگا۔ لوگوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشن کی پیش رفت کے حوالے سے بہت سی باتیں کیں، بہت سے بلند و بانگ دعوے بھی ہوئے۔ پھر میزبان جناب خواجہ شمس

الدین عظیمی صاحب کو دعوتِ خطاب دے کر مائک اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ استقبالیہ گیٹ پہ کھڑا اپنے مراد کی تقریر سننے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس نے جو کچھ اور جتنا سُنا اُس کو یہی بات مسحور کن لگی کہ جب وہ تقریر فرما رہے تھے تو ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا یوں لگتا تھا کہ وہاں موجود لوگ ہی نہیں بلکہ درخت، پرندے اور بچے تک اُس کے مراد کی باتوں کے سحر میں گرفتار ہیں۔ انہوں نے کہہ بھی دیا سلسلہ عظیمیہ میں سکون بہت ہے۔ اس سلسلے کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ حضور ﷺ اس سلسلے کے معاملات کی براہ راست نگرانی فرماتے ہیں۔ فرمایا۔ کبھی کوئی سچا عظیمی بے گھر نہیں رہ سکتا، بھوکا نہیں رہ سکتا، اُس کے باپ کے پاس علوم کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔

کسی اہلِ نظر نے اہل کانفرنس کو یہ نوید بھی دی کہ آقائے دوجہاں سرورکائنات حضور نبی کریم ﷺ، حضرت اویس قرنی اور حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ نے بھی اس کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے۔

کانفرنس سے اگلے روز وہ عرس کی تقریب میں شمولیت کے لئے آنے والے مہمانوں سے ملنے، مزار پہ جا کر چادریں چڑھانے اور لنگر کی تقسیم کے انتظامات میں ہی مصروف رہے۔ لنگر کے انتظامات لطیف بھائی کے سپرد تھے۔ رات کو لنگر کی تقسیم کے دوران وہ گھبرائے ہوئے اپنے مرشد کے روبرو ہو کر کہہ رہے تھے۔ حلیم کی دیگیں کم پڑتی محسوس ہو رہی ہیں لوگ زیادہ ہیں۔ کیا کیا جائے؟ آپ نے کہا۔ چلیں چل کر دیکھتے ہیں کتنے لوگ ہیں اور کتنی دیگیں ہیں۔ راستے میں لطیف بھائی نے بتایا کہ پانچ چھ دیگیں رہ گئی ہیں لیکن لوگوں کی تعداد کے پیشِ نظر شاید بیس ایک دیگیں اور درکار ہوں گی کیونکہ اتنی ہی دیگیں وہ تقسیم کر چکے ہیں اور ابھی اتنے ہی لوگ باقی ہیں کوئی کہہ رہا تھا۔ لوگ بھی تو زیادتی کرتے ہیں تین تین مرتبہ کھاتے ہیں۔

آپ نے دیگوں کے قریب جاکر کفگیر پکڑا۔اُسے وہاں پڑی ہر دیگ میں باری باری چلا کر دیکھااور باورچی بابا سے کہا۔ایک دو دیگیں پانی گرم کریں اور ان دیگوں میں دو دو ڈول ڈال دیں۔یہ بہت گاڑھی ہے۔ان شاءاللہ گزارا ہو جائے گا۔

اور پھر واقعی سب کا گزارا ہو گیا۔وہاں آیا ہوا کوئی فرد ایسا نہ تھا جس نے اُس رات لنگر کی حلیم نہ کھائی ہو۔بلکہ صبح ناشتے میں میز بانوں نے اُسی حلیم کا ناشتہ کیا۔مہمانوں کے لئے ناشتے کا خصوصی اہتمام تھا۔

عرس پہ آنے والے مہمانوں سے ملتے جلتے کئی ایک سے اُس کی اچھی خاصی شناسائی ہو گئی۔وہ جس کسی سے بھی ملا۔اُس کو اپنے مرشد کا دیوانہ اور اُن کی خوشنودی کا طالب ہی پایا۔ایک دو کی چاہتوں کی شدت دیکھ کر اُس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔لو میاں دیکھ لو تم کیا بیچتے ہو۔

لوگ اُن سے فرداًفرداًاور وفود کی صورت میں مل رہے تھے۔مسئلے مسائل بیان ہوتے، تکلیفوں، پریشانیوں اور خواہشوں کا تذکرہ ہوتااور وہ بہت تیز آنچ والی دھیمی سی مسکراہٹ کا چھاتا پھیلائے ہر ایک سے کچھ ایسی بات کہتے جس سے وہ شانت ہو جائے اور اُس کا رُخ دنیا سے ہٹ جائے بلکہ زیادہ درست تو یہ ہے کہ اُس کا رخ دنیا سے ہٹ جائے تاکہ وہ شانت ہو جائے۔اس قبلے کی درستی ہی کے لئے تو وہ سارا سلسلہ اور نظام پھیلا رہے تھے۔

ایک وفد سے فرما رہے تھے۔عالم اعراف میں آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور وہاں رہائش کی جگہ کم پڑ گئی ہے۔یہ اوپر والوں نے دنیا میں فلیٹ سسٹم اسی لئے شروع کروایا تھا کہ اس مسئلے کو حل کیا جاسکے۔

دنیا کے فلیٹوں کا اعراف کی بڑھتی آبادی سے کیا تعلق؟کسی نے دریافت کیا۔

جب ان بلڈنگوں کا اورا(Aura)اوپر منتقل ہوگا تو وہاں کے لوگوں کی رہائش کا مسئلہ حل کیا جاسکے گا۔

بلڈنگوں کا اورا؟ پوچھنے والے کی حیرت سوال بنی تو بتایا۔ ہر شے کا اورا ہوتا ہے۔ انسان یہاں مرتا ہے تو اُس کا اورا اوپر منتقل ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہاں بننے والی عمارات کا اورا بھی اُس وقت اوپر منتقل ہوتا ہے جب وہ اپنی دنیاوی زندگی کی مدت مکمل کر لیتی ہے۔انسان جس طرح کی زندگی یہاں جیتا ہے اُسی طرح وہاں بھی زندگی کی کچھ ایسی ہی طرزیں ہیں۔ وہاں بھی کھانا پینا ہے۔ وقت پہ گھنٹی بجتی ہے۔ سب کھانے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جیسے یہاں رہنے کے لئے گھر بنائے جاتے ہیں اُس طرح وہاں بھی گھر ہیں۔ جو لوگ غاروں میں رہتے تھے اُن کے لئے غار ہیں، جو جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اُن کے لئے جھونپڑیاں ہیں۔ وہاں انسان کا مادی جسم نہیں ہوتا اسی طرح وہاں کی چیزیں بھی کوئی مادی جسم نہیں رکھتیں۔

کسی نے دریافت کیا یہ ستارے کیا ہیں؟ فرمایا یہ بھی دنیائیں ہیں۔ اسی طرح کی دنیائیں جس طرح یہ ہماری دنیا۔

یہ چاند پہ گئے تو وہاں تو انہیں کچھ نہیں ملا۔ کسی نے پڑھی ہوئی بات کو اپنا علم مانتے ہوئے تبصرہ کیا۔

ارشاد ہوا۔ ارے صاحب یہ چاند تک گئے ہی کب ہیں۔ وہاں کی فضا تک میں تو داخل ہوئے نہیں۔ آپ کچھ انتظار کریں سب باتیں خود بخود سامنے آجائیں گی۔ یہ سب کچھ اور ہی تھا۔ عنقریب آپ کے سائنسدان خود ہی اس راز سے پردہ اُٹھا دیں گے کہ وہ کبھی چاند تک نہیں پہنچے۔ بھئی یہ سب جھوٹ ہے۔

انسانی سوچ پہ تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ انسان کی سوچ بھی بالکل اُلٹ ہے۔ سب سے پرشور اور پر ہنگام جگہ ہی سب سے مہنگی خریدتا ہے اور پھر سکون بھی مانگتا ہے۔ انسان جسے ترقی کہتا ہے۔ وہ ترقی کہاں ہوئی؟ کیا عمروں میں کوئی اضافہ ہوگیا؟ بیماریاں کم

ہو گئیں یا سکون میں کوئی اضافہ ہو گیا؟ اجی یہاں تو سب الٹا ہے اور تو اور لوگ اللہ سے ڈر اور خوف محسوس کرتے ہیں۔ بھئی جب آپ اُس سے ڈر اور خوف محسوس کریں گے تو آپ اُس کی طرف کیسے بڑھیں گے؟

ایک سیاہ داڑھی والے صاحب گویا ہوئے۔ تو پھر خشیت الٰہی کا کیا مطلب ہوا۔

''آپ قرآن پہ تفکر کرنے کے لئے ایک موضوع کی تمام آیات کو اکٹھا کر کے اُس پہ غور کریں۔ اگر خشیت الٰہی کا مطلب ڈر اور خوف مان لیا جائے تو قرآن کی پوری تعلیمات ہی کی نفی ہو جائے گی۔''

مرید نے فرمائش کی۔ ''حضور آپ ہی اس کا مطلب بیان فرما دیں۔''

کوئی آیت سامنے ہو تو بتا سکوں گا۔ اس وقت کوئی ایسی آیت ذہن میں نہیں آ رہی۔ اتنا کہہ کر بات بدل دی۔ مرید نے جانا کہ وہ لوگوں کے سامنے بات نہیں کہنا چاہ رہے۔ وہ سر مارتا رہا۔ لوگ چلے گئے۔ اگلے روز اُسے خشی الرَّحمٰن بالغیب۔۔۔ والی آیت یاد آئی۔ اُس نے انہیں اکیلے میں جا لیا اور عرض گزار ہوا کہ اس آیت کی روشنی میں خشیت کا کیا مطلب ہے؟

''بھئی ڈکشنری دیکھنا پڑے گی۔۔۔ یہ کہہ کر اُٹھ کر چل دیئے۔۔ آج دفتر بھی جانا ہے۔ وہ اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھ کہ وہ ایسی بے رُخی فرمائیں گے۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے یک دم پلٹے اور اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو بعد میں بتا دوں گا۔'' اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ حضور نے اس سے پیشتر کبھی کسی سوال کو یوں نہیں ٹالا۔۔۔۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ بہت سر مارا۔ کچھ سمجھ نہ آیا۔ عصر کی نماز کے لئے جاتے ہوئے اچانک اُسے ایک خیال آیا کہ اللہ کی موجودگی کو محسوس کرنا ہی خشیت ہے اور آیت کا اصل

مفہوم یہ ہوا کہ اُن لوگوں کو بشارت ہو جو رحمان کی موجودگی کو بن دیکھے محسوس کرتے ہیں۔۔وہ خوشی سے اچھل پڑا۔اب اُس کو اس خیال کی تصدیق درکار تھی۔

شام کو جب حضور وہاں پہنچے تو وہ منتظر تھا۔وہ گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف جارہے تھے کہ اُس نے دوڑ کر انہیں جا لیا۔وہ اپنے کمرے کی چق اُٹھا کر کمرے میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے پھولی سانس سے کہا ''ابّا ایک منٹ۔'' وہ وہیں چق تھامے رُک گئے۔اُس نے خشیت کا وہ مفہوم جو وہ سمجھا تھا۔۔۔بیان کر کے تصدیق چاہی۔

بہت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔''بھئی آپ کا ذہن پیچھے پڑ گیا تو یہ مطلب بھی مل گیا۔''

وہ ایسے خوش ہو رہا تھا گویا اُس کو کوئی خزانہ مل گیا ہو۔وہ کمرے میں داخل ہوئے تو وہ بھی دیوانہ وار اُن کے ہمراہ اندر چلا گیا۔ اُس سرخوشی میں اُس کو درود شریف کا وہ مفہوم یاد آیا جو کبھی اُس کو سوجھا تھا اور وہ اُس کی تصدیق نہ ہونے کے باعث کسی کو بتانے سے کتراتا تھا۔اُس نے عرض کی۔

''حضور کیا درود شریف کا یہ مفہوم لیا جاسکتا ہے کہ اے اللہ! ہمارا تعلق حضور ﷺ سے جوڑ دے؟''

مسرت بھرے لہجے میں اُس کا مراد گویا ہوا۔''ہاں۔۔۔یہ ہوئی نا بات!''

پھر کہا۔''اگر کسی کو راز دار بنانا ہی ہو تو پیر و مرشد کو بنانا چاہیئے۔جب راہِ سلوک کے مسافر کو مشاہدات ہوتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی کو اپنا حال بتانا چاہتا ہے۔یہی وہ مقام ہے جس کے لئے مرشد کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

گرہ کی ایک بات یہ بتائی کہ ''مرشد کی باتوں کو ڈائری میں لکھ لینا چاہئے۔ اس سے طرزِ فکر منتقل ہونے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ساٹھ فی صد طرزِ فکر تو اسی طرح منتقل ہو جاتی ہے۔ خود میرے پاس کتنی ہی ڈائریاں بھری پڑی ہیں۔''

پھر قدرے توقف کے بعد کہا'' پیرو مرشد باتھ روم کی مثال ہوتا ہے۔ ادھر وہ مرید کو صاف ستھرا کرتا ہے اُدھر وہ پھر گندہ ہو کر آ جاتا ہے۔ نہ مرید باز آتا ہے اور نہ مرشد تھکتا ہے۔ پھر اُٹھے اور درجن بھر پین مرید کو دیتے ہوئے کہا یہ آپ کے لئے ہیں۔ ابھی آپ کو بہت لکھنا ہے۔ آپ کے کام آئیں گے۔ یہ آپ لے لیں۔ اُس نے اپنے مراد کے ہاتھوں دی جانے والی اس سوغات اور تحفے کو اپنے بارے میں حکم مانتے ہوئے حرزِ جان بنانے اور اُن کے کہے کا پاس رکھنے کا عہد کرتے ہوئے شکر گزاری کے احساس کے ساتھ قبول کیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

اپنے مرشد سے مزید قربتوں کی آرزو پالتا، وہ عید کے دن بیوی بچوں کو ساتھ لئے اُن کے گھر پہنچا۔ امی حضور نے اُس کی بیوی کو دلہن کہہ کر مخاطب کیا۔ وہاں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے صاحبزادے رؤف صاحب تشریف فرما تھے۔ اُکے مرادنے اُس کی بیوی کو یہ ہماری بڑی بہو ہیں کہہ کر متعارف کرایا تو وہ اپنائیت کے احساس سے شرابور ہو گیا۔ اُس روز جب انہوں نے رخصت ہونے کی اجازت مانگی تو امی حضور نے اُس کی بیوی کو کپڑوں کا ایک جوڑا دیا اور مرشدِ کریم نے اُس کو پار کر کا ایک قلم دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یہ اچھا لگتا ہے۔ یہ آپ لے لیں۔'' مرید نے سوچا اب وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اُس کا کوئی نہیں ہے؟ اللہ نے اُس کو اُن جیسا سرپرست اور والی عطا کیا اب اُسے اور کیا چاہئے؟ انہوں نے اُس کو یہ احساس عطا کیا گویا ایک بیٹا اپنے باپ کے گھر آیا ہے۔

وہ بھی ایک عید ہی کا دن تھا جب وہ اُن سے ملنے اُن کے گھر حاضر ہوا تھا۔ لان میں گھاس پہ چند کرسیاں رکھی تھیں۔ پھول اور مٹھائی اندر بھیج کر وہ ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہاں ایک دو اصحاب اور بھی بیٹھے تھے۔ آپ باہر تشریف لائے۔ سب کے سلام اور عید

مبارک کہنے کا جواب دیتے آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ اُن کے سامنے والی کرسی پر تھا کہ اچانک اُس نے اُن کو پیچھے کی جانب جھکتے دیکھا۔ گرنے سے بچنے کو اُن کا ہاتھ اضطراری طور پر ہوا میں بلند ہوا۔ وہ اپنی جگہ اچھل کر اُن کی طرف لپکا اور اُن کی بغل میں ہاتھ ڈال کر انہیں تھام لیا۔ یہ سب خود بخود ہوا۔ اس میں اُس کی کوئی شعوری کاوش شامل نہ تھی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ کرسی کو دیکھنے پہ نظر آ رہا تھا کہ زمین کے گیلے اور نرم ہونے کے سبب کرسی کے پچھلے پیر دھنسے اور بے خیالی کے سبب وہ پچھلی کی طرف الٹنے لگے تھے۔ سنبھلنے کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھ کو استعجاب کے انداز میں ہلایا۔ گویا کسی سے پوچھ رہے ہوں۔ یہ کیا ہوا۔۔۔ کیوں ہوا؟ پھر اُس کو نظر بھر کے دیکھا اور گویا ہوئے۔ عجیب بات ہے! اُس کو وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہ نگاہیں نیچی کئے بیٹھا رہا تھا۔

اور وہ بھی عید ہی کا دن تھا جب اُس نے سرپرستی کی درخواست اُن کی خدمت میں پیش کی تھی اور اُس ملاقات کا آخری جملہ اُس کی یادداشت میں ایسے تازہ تھا جیسے انہوں نے ابھی کچھ ہی دیر قبل اُس کو یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ کا ورد کرنے کی تلقین کی ہو۔ اُس نے بات کا سرا کئی سال پہلے کے اُسی لمحے سے جوڑتے ہوئے عرض کی حضور یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ کا کیا مطلب ہے؟

فرمایا۔ اے زندہ۔۔۔ اے قائم۔۔۔ رکھ ہمیں زندہ اور قائم۔۔۔ یعنی زندگی کو پکارنے سے اللہ کی صفت حیات متوجہ ہوتی ہے۔ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا وسائل فراہم کرنے والا۔ روحانیت کے کوئی دو سو سلاسل ہیں اور اُن سب میں یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ کسی نہ کسی طور رائج ہے اور یہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا فیض ہے کہ انہوں نے اس کے ورد کی اجازت کو عام فرما دیا ہے۔

مرید نے دریافت کیا کہ اجازت سے کیا مطلب ہے؟ کیا اللہ کا ذکر کرنے کے لئے بھی کوئی اجازت لینا ہوتی ہے؟

نہایت مشفقانہ انداز میں کہا۔ ''کسی اسم الٰہی کا کسی ایسے بندے کی اجازت سے ذکر کرنا جس نے اُس کی زکوٰۃ ادا کی ہو۔ فائدہ دیتا ہے۔ بغیر اجازت اسماء الٰہی کا ذکر کرنا تو ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر کوئی دوائی کھانا شروع کر دیں۔ اب ہو سکتا ہے کہ وہ فائدہ دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی نقصان کا سبب بن جائے۔ اکثر لوگوں کو زیادہ وظائف پڑھنے کی عادت ہوتی ہے۔ انہیں پریشانیوں کا سامنا رہتا ہے۔ جب وہ وظائف پڑھتے ہیں تو اُن کے اندر انوار کا ذخیرہ ہونے لگتا ہے۔ چونکہ شعور کو اُن انوار کو برداشت کرنے کی نہ تو سکت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی تربیت۔ لہٰذا وہ انوار اُن کے لئے پریشانی کا سبب بنتے ہیں اور اسی میں خرچ ہوتے ہیں۔

بالکل جیسے وٹامن اور طاقت کی ادویہ زیادہ اور بلا ضرورت کھانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ مرید نے سوچا اور دریافت کیا۔

''یہ زکوٰۃ دینا کیا ہوتا ہے؟''

فرمایا۔ کسی اسم کی زکوٰۃ یہ ہے کہ اُس اسم کو ایک مخصوص تعداد میں جو کم از کم سوا لاکھ ہوتی ہے، وقت اور جگہ مقرر کر کے پڑھا جاتا ہے۔ اسے چالیس روز میں مکمل کرنا ہوتا ہے۔ اسے اپنے پیر و مرشد کی اجازت سے ہی کرنا چاہیے۔ ورنہ رجعت ہوتی ہے۔

پیشتر اس کے وہ رجعت کے بارے میں جاننے کو مزید سوال کرتا۔ خالد نیاز بھی آ گئے۔ وہ لوح و قلم کے انگریزی ترجمے کی اشاعت کے سلسلے میں سرگرم عمل ہو چکے تھے۔ وہ کتاب کے ٹائیٹل کی تیاری اور چھپائی کے بارے میں بات کرنے لگے۔ مرشد کریم نے انہیں ہدایت کی اُس میں اوقاف کی جگہ دائرے لگائے جائیں۔

مرید نے اس ہدایت میں مستور حکم جاننے کی خواہش کی تو بتایا کہ جب قاری جملہ پڑھتے ہوئے اُس کے اختتام پہ دائرہ دیکھے گا تو اُس کا ذہن لاشعور کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ دائرے سے مراد وہ حرکت ہے جو لگاتار اور مسلسل جاری رہتی ہے اور مثلث سے مراد وہ حرکت ہے جو کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنا رُخ بدلتی ہے۔ واہمہ سے خیال، خیال سے تصور اور پھر احساس اور مادی وجود۔۔۔ یہ سب مثلث کی حرکات ہیں جن میں رخ کی تبدیلی سے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ دائرے کو کاٹیں تو مثلث حاصل ہوتی ہے۔ فرشتے اور جنات دائرے کی مخلوق ہیں اور انسان مثلث کی۔ مثلث Dimensions یعنی ابعاد اور حدود کا نام ہے۔ انسان مثلث کی وجہ سے زیادہ سکت رکھتا ہے۔ اس لئے جب وہ دائرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ سب دائروں سے آگے نکل جاتا ہے۔

مرید نے کہا حضور میرے ذہن میں ٹائم (زماں) کا تصور ایک Conveyer Belt کا سا ہے۔ فرمایا:

''جی ہاں یہ ایک میگنیٹک فیلڈ ہے۔ اس کو لاشعور بھی کہتے ہیں۔

اور پھر اُس سے دریافت کیا ''آپ پشاور کب جا رہے ہیں؟'' مرید نے بادلِ نخواستہ کہا۔

''بس جلد ہی۔ مالک مکان کو نوٹس دے دیا ہے جونہی وہ سیکورٹی کی رقم واپس کر دے گا۔ ہم روانہ ہو جائیں گے۔''

غصہ بھی تو ایک آگ ہی ہے

پشاور پہنچ کر اُس نے روزگار کے حصول کی کوششوں کا آغاز کیا اور کچھ ہی عرصے میں وہ اپنے کاروبار کا از سر نو آغاز کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہی دنوں ایک پرانے جاننے والے صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے فرنیچر کے کارخانے کی چابیاں اُسے دیتے ہوئے کہا۔ یہ کارخانہ آج سے آپ کا ہوا۔ اب اسے آپ ہی نے چلانا ہے۔ اُس نے اُن سے کہا کہ پہلے کی بات اور تھی۔ اُس وقت اپنے فیصلے میں خود ہی کیا کرتا تھا۔ اب صورتِ حال وہ نہیں ہے۔ میں نے ایک بندے کو اپنا باپ مان لیا ہے تو یہ غلط ہو گا کہ میں اُن سے مشورہ نہ کروں۔ انہوں نے پوچھا آپ کب تک دریافت کر لیں گے؟ اُس نے دو دن کی مہلت مانگ لی۔

اسی روز شام کو وہ پشاور مراقبہ ہال کے انچارج نیاز احمد عظیمی صاحب سے ملا اور انہیں اس آفر کی بابت بتا کر اُن سے درخواست کی کہ حضور مرشد کریم سے وہ اس پیشکش کی بابت بتا کر اُن سے دریافت کریں کہ اُس کو کیا کرنا چاہیئے۔ نیاز صاحب بہت خوش ہوئے کہ اُس کو ایک کارخانہ دار بننے کا موقع مل رہا ہے۔ انہوں نے رات کو باباجی سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ صبح دفتر پہنچ کر جب اُس نے اُن سے فون پہ رابطہ کیا اور پوچھا کہ باباجی سے بات ہوئی کہ نہیں تو انہوں نے بتایا۔ ہاں بات تو ہوئی لیکن انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اُس نے پوچھا۔ ''پھر بھی کیا بات ہوئی؟''

اُنہوں نے بتایا کہ پوری بات سُن کر باباجی نے اُن سے پوچھا۔ ''کیا مقصود صاحب نے کبھی کرسی بنائی ہے؟'' اور پھر بات بدل دی۔

انہوں نے یہ بھی کہا۔ ''میں تو کچھ سمجھا ہی نہیں۔'' اُس نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔''

اگلے روز جب وہ صاحب آئے تو اُس نے انہیں کارخانے کی چابیاں واپس کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے پیر و مرشد نے اُس کام کا کوئی سابقہ تجربہ نہ ہونے کے سبب منع کر دیا ہے۔ بعد میں اُس کو معلوم ہوا کہ فرنیچر کے کام کا تجربہ نہ ہو تو کاریگر سے لے کر گاہکوں تک سب ہی کس قدر پریشان کرتے ہیں اور لکڑی کی پہچان سے لے کر ہنر مندی تک کتنے ہی مراحل ہیں جنہیں سیکھنے کے لئے اک عمر درکار ہوتی ہے اور اسی قسم کی پریشانیوں سے تنگ آ کر وہ صاحب اپنی بلا اُس کے گلے ڈالنا چاہ رہے تھے لیکن اُس کے مراد نے اس کو ہر طرح کی کٹھنائی سے صاف بچا لیا تھا۔ جس قدر وہ اس بات پہ غور کرتا اسی قدر اپنے مراد کے لئے تشکر و اطمینان کا احساس فزوں تر ہوتا۔

وہ وہاں مراقبہ ہال جاتا اور مراقبہ ہال میں ہونے والی تقریبات میں حصہ لیتا پھر اُس کو معلوم ہوا کہ مرشد کریم پشاور کے دورے پہ آ رہے ہیں۔ پہلے وہ راولپنڈی آئیں گے۔ وہاں سے کوہاٹ جائیں گے، جہاں آرمی میس میں خطاب کریں گے۔ وہاں پشاور آئیں گے پھر اُس کے بعد وہ سوات جائیں گے۔ وہاں سے واپس آ کر اٹک چلے جائیں گے۔ اقبال قریشی اور نیاز احمد صاحب انتظامات میں پیش پیش تھے۔ سلسلے میں داخلہ ملے اُس کو ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا تھا لیکن پھر بھی یہ سب کچھ اُس کے لئے نیا تھا۔ ابھی اُس کو بہت کچھ جاننا اور سیکھنا تھا۔

پروگرام یہ بنا کہ پشاور سے چند اصحاب کوہاٹ جا کر خطاب سنیں اور پھر مرشد کریم کو اپنے ساتھ لے کر پشاور آ جائیں۔ قرعہ انتخاب اُس کے نام نکلا۔ کوہاٹ سے پشاور تک اُس کو اپنے مرشد کریم کا وزیر مہمان داری مقرر کیا گیا۔ اس اعزاز کو اپنے لئے

سعادت جانتے ہوئے، وہ بیوی بچوں کو ساتھ لئے صبح سویرے کوہاٹ پہنچ گیا۔ اُس کا سسرال کوہاٹ ہی میں تھا۔ وہ بیوی بچوں کو وہاں چھوڑ کر عصر کے بعد چھاؤنی میں آفیسرز میس پہنچا۔

گاڑی کھڑی کر کے ابھی وہ ادھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس نے کچھ لوگوں کو پارکنگ ایریا سے ملحق سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ چند افسروں کے درمیان اُس کو اپنا مرادؒ زمین سے ابھرتا اور اُس کی نگاہوں کے افق کو بھرتا ہوا نظر آیا۔ وہ سامنے ہوا کہ وہ اُس کو دیکھ لیں۔ اُس پہ نگاہ پڑتے ہی اُن کی مسکراتی آنکھیں گویا ہنس دیں اور انہوں نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور وہ اپنے مرادؒ کی پھیلی بانہوں کے درمیان اُن کے سینے سے جا لگا۔ یہ اُس کو بے خود کرنے کو کافی تھا۔ سب اُسی کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اعزاز عطا کر کے، یہ سعادت بخش کر انہوں نے اُسے اتنا سرفراز کر دیا تھا کہ وہ بے خودی کے ساتویں آسمان پہ پرواز کرنے لگا۔ اُن سے گلے مل کر ہٹا تو فخر کی بجائے عاجزی اور انکسار نے اُس کی پلکوں کو اتنا بوجھل کر دیا تھا کہ وہ اُن کے ارد گرد موجود لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی اُن کو دیکھنے کے لئے آنکھ نہیں اُٹھا پا رہا تھا۔

وہاں سے وہ سب ہال کی طرف بڑھے۔ کرنل منظور بخشی نے اپنے دوستوں سے اُس کے مرادؒ کی بابت نہایت اخلاص سے کسی زبان دانی کا سہارا لئے بغیر صاف صاف کہا۔ ایسی روحانی ہستیوں کی قربت کا ایک لمحہ سالوں کی بے ریا اطاعت سے افضل ہے کیونکہ وہ بہت ہی گہرے تفکر کو ابھارنے کی کرامت جانتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے رہنا اُن کو خوب آتا ہے۔

اُس کے بعد اُس کے مرادؒ نے وہاں جو بھی کہا اُس کا ایک ہی اثر ہوا۔ ہر بندہ خود کو اللہ سے قریب تر محسوس کرتا رہا۔ وہ مرتبہء احسان کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے اُن سب کو اللہ کے دیکھنے کو محسوس کرنے کی دعوت دیتے ہوئے خود کو اللہ کو دیکھنے کی بابت فرما رہے تھے۔ ہماری روح نے ازل میں اللہ کو دیکھا ہے اور روح اللہ کو اب بھی دیکھ سکتی ہے۔ مادی آنکھ کی اتنی مجال کہاں کہ وہ

اللہ کو پاسکے لیکن اللہ کے لئے یہ امر کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ خود کو روح کی آنکھ پہ آشکار کر دے۔ بندہ خود بخود خواہش تو کرے لیکن ہم تو یہ خواہش ہی نہیں رکھتے۔ حالانکہ کہنے کو ہم کہتے ہیں۔ ہمیں اللہ سے ملنا ہے۔ لیکن ہم اس کا یقین نہیں رکھتے۔ اگر ہم خود میں یہ یقین پیدا کر لیں کہ ہم اللہ کو دیکھ سکتے ہیں تو اللہ کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ وہ خود کو نہ دکھا سکے۔

اُس کے بعد سوال جواب کی نشست ہوئی۔ محفل برخاست ہوئی اور وہ عازم پشاور ہو لئے۔ میس سے باہر آ کر اُس نے ابا کو بتایا کہ اُس کے سسرال وہاں کوہاٹ میں ہیں۔ بیوی بچوں کو اُس نے وہاں چھوڑا تھا۔ اگر اجازت ہو تو اُن کو ہمراہ لے لے۔ آپ نے نہایت شفقت سے کہا۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ورنہ وہ محسوس کریں گی۔

اُس نے گاڑی گھر کے سامنے کھڑی کی اور اپنے آنے کی اطلاع کروائی۔ اُس کو اپنے مرشد کا باہر گاڑی میں بیٹھے رہنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ سوچ کر اُس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے کہ وہ کیا سوچیں گے کہ یہ لوگ کتنے بد اخلاق ہیں کہ کوئی انہیں مدعو نہیں کر رہا۔ گھر کے اندر بلا کر بٹھائے۔۔۔ اُس کو اپنی بیوی پہ غصہ آنے لگا کہ اتنے عظیم بندے کو اُس کی وجہ سے باہر گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی تناؤ میں اُس نے ہارن بجا دیا تا کہ وہ جلدی سے باہر آئے۔۔۔ اس پہ آپ نے فرمایا۔

یہ گھر اندر سے دیکھنا چاہئے۔ یہ کہا اور گاڑی سے اتر کر گھر کے اندر چل دیئے۔ اُس کی ساس انہیں دیکھ کر ان کے استقبال کو آگے بڑھیں اور سلام کیا۔ وہاں صحن میں لگے انجیروں سے لدے درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔۔ بھئی واہ! یہ تو جنت کا پھل ہے۔ اُس کی سالی نے ایک پلیٹ میں۔۔۔ پہلے سے توڑ کر فریج میں رکھے ہوئے۔۔۔ خوب پکے ہوئے انجیر پیش کئے۔ ایک دانہ لے کر کھایا اور فرمایا۔۔۔ کوہاٹ کا پانی میٹھا ہے۔۔۔ سب نے اُن کی بات پر صاد کیا۔ وہ سب اُن کے بہت مشکور تھے کہ انہوں نے انہیں سرفراز کیا ہے۔

اُس کی ساس نے اُن کو اپنے یہاں رات رُکنے کی دعوت دی تو آپ نے انہیں کراچی آنے اور حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے عرس میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا۔ ''آپ وہاں آئیں تو میرے پاس رہیں۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ خوشی کا ایک تناور درخت وہاں لگا کر جا رہے ہیں۔

آج بھی اُس کی ساس اُن لمحات کا تذکرہ کرتی ہے اور لوگوں کو فخر یہ بتاتی ہے کہ باباجی اُس کے گھر آئے تھے اور انہوں نے اُس کے گھر کے انجیر کھائے۔ یہ بات کہتے ہوئے اُس کی بوڑھی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں اور یہ بتاتے ہوئے تو اُس کے چہرے پہ ایک نکھار چھا جاتا ہے کہ انہوں نے کوہاٹ کے پانی کو میٹھا کہا تھا اور پھر وہ اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی کے زمانے میں کوہاٹ کے نواح میں چشموں پہ جانے اور وہاں کے پانی کے اوصاف کے حوالے سے بتاتی ہیں کہ کوہاٹ کے امرودوں کا اسی لئے تو شہرہ ہے کہ وہاں کا پانی خاص ہے۔

پشاور روانگی کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو اُس کی بیوی نے اپنے گھر سے متصل عمارات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور کو بتایا۔ یہ سب میرے دادا کی جائیداد تھی جنہیں میرے والد نے بیچ دیا تھا۔ حضور نے دھیرے سے کہا۔ ''ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ نہ بیچتے تو اُن کی اولاد بیچ دیتی۔''

کوہاٹ سے نکل کر چکردار پہاڑی راستہ طے کرتے ہوئے فرمایا۔ ''غصہ کی بابت قریشی صاحب نے ایک عجیب بات کہی کہ جس زمین پہ آگ جلتی ہے وہاں کبھی کچھ نہیں اُگتا۔'' پھر فرمایا۔ ''غصہ بھی تو ایک آگ ہی ہے۔ جس ذہن میں غصہ آ جائے وہاں روحانیت داخل نہیں ہو سکتی۔ غصہ کرنے سے منع کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے اس سے دوسروں کی دل شکنی اور دل آزاری

ہوتی ہے۔اُس کو چند لمحے پہلے اپنی بیوی پہ جو تاؤ آیا تھا۔اُسی کے حوالے سے انہوں نے اُس کو یہ بات تعلیم فرمائی تھی اور اس لطافت بھرے انداز میں کہ اُس کی بیوی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ وہ اُس کو کیا سمجھا رہے ہیں۔

پھر فرمایا۔ ”سلسلے میں آنے والے لوگ مختلف زمینوں کی مانند ہوتے ہیں۔کسان زمین کے مختلف ٹکڑوں پہ توجہ کرتا ہے۔ جھاڑ جھنکار صاف کرتا ہے۔ہل چلا کر بیج بوتا ہے انہیں پانی دیتا ہے۔جہاں کی زمین اچھی ہوتی ہے۔وہاں زیادہ اچھی فصل ہوتی ہے اور جو زمین کمزور ہوتی ہے وہاں کی فصل اتنی اچھی نہیں ہوتی لیکن کسان اُس زمین کو چھوڑ نہیں دیتا۔اپنی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ فقیر بھی بہت سے افراد اکٹھے کرتا ہے۔اُن میں سے کچھ کو چھانٹ کر اُن کی تربیت کرتا ہے۔گھاس پھونس الگ کرتا ہے، پنیری تیار کرتا ہے۔کام کے پودوں کو مناسب جگہ لگاتا ہے۔اُن کی دیکھ بھال کرتا ہے۔“

یہ بھی فرمایا کہ ”جو بندہ زیادہ آدمی جمع کر لیتا ہے اُس کو اُن میں سے انتخاب کرنا اتنا ہی دو بھر ہو جاتا ہے۔ پھر مثال دی کہ ایک آدمی کے پاس دس گھوڑے ہوں اور اُس کو اُن میں سے ایک اچھے گھوڑے کا انتخاب کرنا ہو تو۔۔۔۔اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا سو گھوڑوں میں سے ایک اچھے گھوڑے کا انتخاب کرنا دشوار ہوتا ہے۔

راستے میں چرواہوں کو بھیڑ بکریاں چراتے دیکھ کر مرید کا ذہن اس طرف مبذول ہو گیا کہ انبیاء علیہ السلام نے بھیڑ بکریاں چرائیں، تجارت کی، کھیتی باڑی کس نے کی؟

اُس کا مراد گویا ہوا۔ ”حضرت آدم علیہ السلام پہلے کاشتکار تھے۔فرشتے نے انہیں زمین دکھائی اور کہا یہاں اس طرح کاشت کرنا۔انہوں نے فرشتے سے کہا۔ذرا اور آگے بڑھ کر نشان لگاؤ۔فرشتے نے افسوس سے سر ہلایا۔آپ اپنی اولاد میں لالچ کا بیج بو دیا۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ اُن کے سوا وہاں اور کون ہے؟ وہ ساری زمین انہی کی تو تھی۔

ایک گھنٹے کا راستہ اُس دن ڈیڑھ دو گھنٹے میں طے ہوا لیکن اُس کو لگا کہ وہ چند ساعتوں میں ہی پشاور پہنچ گئے ہیں۔ شہر میں واپڈا گرڈ سٹیشن کے ساتھ ایکسین کے بنگلے میں ہی مراقبہ ہال قائم کیا گیا تھا۔ وہ وہاں پہنچے تو سلسلے کے دوستوں نے اپنی محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ پھولوں کی پتیاں بھی اپنے مرشد پہ نچھاور کیں۔

جتنی دیر میں وہ گاڑی پارک کر کے آیا۔ اُس کو بتایا گیا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ اگلے روز صبح محفلِ مراقبہ میں شرکت کی سب کو اجازت ہے۔ جس کے بعد درس اور سوال جواب کی نشست ہو گی۔ پھر سلسلے کے بہن بھائیوں کے مسئلے مسائل ہوں گے۔ شام کو لوگوں سے خطاب فرمائیں۔ جو آنا چاہے اس کو اذنِ عام ہے۔ مہمان داری کا استحقاق تمام ہوا اور اب وہ اپنی نشست پہ بیٹھ کر میزبانی سے مستفیض ہو۔

وہ وہاں بیٹھ گیا۔ نیاز صاحب اُس کے پاس آئے اور اُسے اور اُس کی بیوی کو رات کے کھانے پہ مدعو کیا۔ وہ نہال ہی تو ہو گیا۔ اُسے یوں لگا گویا اُس کو ایک شناخت اور پہچان مل گئی ہو۔ وہاں جتنے بھی لوگ جمع تھے اُن میں سے کسی کا جی وہاں سے ہٹنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ قریشی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں سمجھایا تو کچھ بادل نخواستہ ہٹ گئے اور کچھ وہاں ٹھہرنے کے حیلے تراشنے لگے اور سب سے بڑا حیلہ یہی تھا کہ نیاز صاحب کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔

رات کھانے کے بعد اُس کے مراد نے اُس سے دریافت کیا۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟ جب اُس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا تو نیاز صاحب نے اپنے مرشد کی سوچ کو بھانپتے ہوئے کہا۔ کل ہم یونیورسٹی جائیں گے تو واپسی پہ چائے ان کے یہاں پی لیں گے۔ مرشد کریم نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی منظوری سے نواز دیا۔

مراد بر آنے پہ وہ خوشی کے اظہار کو ابھی مناسب الفاظ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کے مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ اب آپ چل کر

چائے کا بندوبست کریں۔ وہ اسے محفل کی برخاستگی کا اشارہ سمجھ کر کمرے سے باہر آگیا۔

اگلے روز جب تین گاڑیوں کا مختصر قافلہ اُس کے گھر پہنچا تو اُس کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ کیا کرے۔ انہیں کہاں بٹھائے۔ وہ انہیں لے کر کبھی ایک کمرے میں جاتا کبھی دوسرے۔ گھر میں ہر طرف لگی اپنی تصاویر دیکھ کر فرمایا۔ ''بھئی یہ کیا فوٹو گرافر کی دکان بنا رکھی ہے۔ مرید کے اندر ایک جھماکا ہوا۔ اُس نے عرض کی۔ ''یہ سب تصاویر اُس نے کراچی سے روانہ ہوتے وقت خود اُن کی اجازت سے اتاری تھیں۔

اس پہ تبصرہ فرماتے ہوئے کہا۔ ''مرید نے عقیدت سے پیر صاحب کی تصویر لگائی۔ صبح کام پہ جاتے ہوئے تصویر کو دیکھا۔ اب اگر دن اچھا گزرا یا جس کام سے وہ جا رہا تھا۔۔۔ وہ کام ہو گیا تو سارا کریڈٹ دیا پیر صاحب کو اور پھر اُن کی تصویر کو۔ لیجیئے بُت پرستی شروع ہو گئی۔ اب پہلے اُس تصویر پہ پھول چڑھے اور یہ سلسلہ دراز ہو کر نذر نیاز تک جا پہنچا۔ ان چکروں سے بچنا چاہیئے۔ بھئی کام تو اللہ ہی کرتا ہے اور نام بندوں کا ہو جاتا ہے۔

شاید اُس کی سوچ کی اسی ٹیڑھ اور کجی کو درست کرنے کے لئے انہوں نے اُس کے گھر آنے کا پروگرام بنایا تھا۔

اُس کے بعد قلندر شعور فاؤنڈیشن (سرحد) کے قیام کا حکم دیا اور اس کی کاغذی کاروائی مکمل کرنے کے لئے نیاز صاحب کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ایک ہی ہلے میں ذہنوں کی کج ہوتی دیوار کو سنبھالا اور اسی ہلے میں ایک نیا پودا لگا کر وہ اپنی راہ کچھ اس ادا سے چل دیئے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اُس رات وہ نیاز صاحب کے گھر برآمدے میں بیٹھا اُس دروازے کو جس کے دوسری طرف اُس کا مرادِ آرام فرما رہا تھا تکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ لطافت خیال اور حسن عمل کا باہمی تعلق کس قدر گہرا اور اٹوٹ ہے۔ اگر حسن عمل میں کمی رہ جائے تو لطافت خیال کامل نہیں اور خیال میں کہیں رکاوٹ و کثافت کا شائبہ بھی ہو تو نتیجہ قباحت عمل کے سوا کچھ اور نہیں نکلتا۔ اگر اس کو مرشد کامل کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو رات کے اس پہر یہاں برآمدے میں زمین پہ بیٹھ کر ایسی باتوں کا ادراک کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ دیر تک وہاں بیٹھا ایسی باتیں سوچتا رہا جن کی بابت اس پیشتر کبھی اُس کے ذہن میں خیال تک نہ آیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ایسے خیالات اُس کے ذہن کی سطح پہ کیوں ابھر رہے ہیں جن سے وہ کبھی آشنا نہ تھا؟ لطافت خیال کے اجزائے ترکیبی پہ غور کیا تو ذہن رعنائی خیال کے لالچ میں اس راہ پہ ساتھ ہو لیا جو بے غرضی کے صدر دروازے سے شروع ہو کر استغنا کے محل سرا تک جاتی ہے اور ایثار اور محبت کے درخت کیف و سرور کی خوشبو بکھیرتے دو رویہ ایستادہ ہیں۔

اس راہ پہ سفر اتنا کٹھن اور محال کیوں ہوتا ہے؟۔۔۔اُس نے تصور میں اپنے مراد سے سوال کیا۔ شعور اپنی تن آسانی اور تساہل کے سبب ایسا مانتا ہے ورنہ تو کچھ بھی محال نہیں۔ تصور میں جھلملاتا عکس گویا ہوا۔

”یہ بات حسنِ عمل کے لئے تو درست ہو سکتی ہے لیکن لطافت اور رعنائی خیال کی بنیاد کیوں کر ہوئی؟“ اُس نے بات کو بڑھایا۔

بات وہی ہے شعور اپنی تربیت کروانے پہ آمادہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ تن آسانی اور سہل پسندی سدراہ کو کچھ زیادہ ہی اونچا دکھاتے ہیں۔ بالکل جیسے رکاوٹوں والی دوڑ میں اپنی کمزوری رکاوٹوں کو زیادہ ہی اونچا کر دیتی ہے۔

اُس کو ایک آہٹ نے چونکا دیا۔ اُس نے گیٹ کی طرف دیکھا وہاں ایک سایہ سا لہرایا۔ وہ اُٹھ کر گیٹ کی طرف گیا۔ زبیر عزیز بنگلے کے گیٹ پہ کھڑے اپنے مرشد کی موجودگی کے احساس سے کھیل رہے تھے۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ زبیر بھائی اپنی لاحاصل زیست میں مرشد کی صورت ہونے والے انعام کو درست انداز میں برتنے کے لئے کچھ کرنے کی بات کر رہے تھے اور اس بات کی تکرار کر رہے تھے کہ وہ اپنے مرشد کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ سلسلے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟

پہلی بات کی بابت اُس کا خیال تھا کہ وہ مرشد کریم کے لئے ہی کیا کر سکتے ہیں۔ ابھی تو وہ بہت ہی چھوٹے بچے ہیں۔ دوسری بات البتہ قابل عمل محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک کچھ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ بالآخر اُس نے زبیر سے یہ پوچھا کہ رات کے اس پہر کڑاہی میں یہ ابال کیسا؟ اُس نے ایک لحظہ سوچا اور کندھے اچکا کر کہا۔ وہی کچھ ایسا چاہ رہے ہوں گے۔ ورنہ اس سے پیشتر اُس نے ایسا کیوں نہیں سوچا۔ تو پھر ہمیں چاہئے کہ ہم اس خیال کو حرز جان بنالیں اور کچھ کرنے کی بابت سوچیں اور نہ صرف سوچیں بلکہ کریں۔ دونوں نے اس بات سے اتفاق کیا۔

صبح مراقبے اور درس کے بعد سیر سے واپسی پہ ایک ضعیف العمر بزرگ گیٹ پہ منتظر تھے۔ سلام دُعا کے بعد انہوں نے اپنی صحت مندی کی دعا کے لئے کہا۔

مسکان گہری ہوئی۔ پوچھا۔ کیا آپ جوان ہونا چاہتے ہیں؟

وہ بھی خوب تھے ڈٹ گئے اور کہا۔ جی ہاں!

اب مسکان کھلکھلاتا تبسم بن کر گویا ہوئی۔ جوان ہو کر شادی کریں گے؟

پورے تن سے چھاتی چوڑی کر کے پورے زور سے اقرار کیا۔جی ہاں!

سب ہی ہنس پڑے۔آپ آگے بڑھے۔وہ صاحب اتنے آسودہ اور مطمئن کہ انہوں نے ساتھ بڑھنے کی بجائے وہیں رُکنے کو ترجیح دی۔

آپ نے برآمدے میں بچھی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔شادی بھی عجیب شے ہے۔بستر مرگ پہ لیٹے بوڑھے سے پوچھو۔شادی کرو گے ؟ایک بار تو وہ ضرور آنکھ کھول دے گا۔کہتے ہوئے آنکھیں بند کر کے۔۔۔ایک آنکھ قدرے کھولتے ہوئے دکھا کر بتایا کہ یوں۔

شادی کی بابت یہ فرمایا۔ویسے لغت کے مطابق شادی کا مطلب خوشی ہے۔لیکن یہاں شادی کر کے بھی لوگ خوش نہیں ہوتے۔اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمیں خوش ہونا ہی نہیں آتا۔خوش ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم خوشی کے مفہوم سے تو واقف ہوں۔ہم جانتے تو ہوں کہ خوشی ہوتی کیا ہے؟

مرید کے ذہن میں پنجابی کا ایک شعر تازہ ہو گیا۔

خوشی جے آگئی اے تے اینوں کنج منا لیئے

ساڈے گھر تے اے وی رونا پے جاندا اے

(یعنی اگر ہمارے گھر کبھی خوشی آ بھی جائے تو ہمارے یہاں یہی رونا دھونا شروع ہو جاتا ہے کہ اس کو منایا کیسے جائے۔)

کسی نے اُن سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ خوشی کیا ہوتی ہے؟خوشی کسے کہتے ہیں؟اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟اس کے حصول کی شرائط کیا ہیں؟ یہ جنس نایاب جس کی بابت وہ کہہ رہے ہیں کہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ خوشی ہوتی کیا ہے۔۔۔کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟وہ جس کا تکیہ کلام ہی یہ ہے۔۔۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔۔۔کوئی اُن سے اتنی سی بات کہنے پہ آمادہ وتیار نہیں کہ حضور آپ جانتے ہیں کہ ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ خوشی کیا ہوتی ہے،خوش کیسے ہونا چاہئے اور خوش کیسے رہا جا سکتا ہے۔۔۔آپ ہی اس کی شرح فرمادیں۔

وہ خوشی و مسرت کو مفت تقسیم کرنے پہ تلے ہوئے ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ اُسے گندی نالیوں میں پھینک دیں۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔وہاں موجود لوگوں کی دلچسپی ورجحان کی بات کہنے میں عافیت دیکھی اور فرمایا۔ ہمارے یہاں تو شادی سیکس کے لئے کی جاتی ہے اور جب تک سیکس بیچ میں رہتی ہے یہ بندھن بھی برقرار رہتا ہے اور جب سیکس ختم ہو جاتی ہے تو تعلق بھی ختم۔۔ پھر لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں۔ایک دوسرے سے لاتعلق ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر بوڑھا بوڑھی اگر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے اکٹھے گھومتے پھریں تو اچھے لگتے ہیں۔ مگر یہاں تو اجی پرے ہٹو۔۔۔بچے جوان ہو گئے ہیں۔۔۔کی دیوار بیچ میں آن پڑتی ہے۔حالانکہ ماں باپ میں پیار ہو تو نہ صرف دیکھنے میں اچھا لگتا ہے بلکہ اولاد ذہنی طور پہ پُرسکون اور محبت کرنے والی ہوتی ہے۔اولاد کی تربیت کے لئے یہ بہت ہی ضروری ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو چاہتے ہوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہوں۔ پھر ایک عجیب بات یہ ارشاد فرمائی کہ دنیا سے جانے کے بعد بہت کم جوڑے اوپر جا کر ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے والدین اوپر بھی اکٹھے ہیں۔

مرید نے سوچا بلاشبہ ایسے ہی والدین کی اولاد قلندر بننے کے لائق ہو گی۔

اس کے بعد اشتہار بازی کے طور طریقوں سے ہوتی ہوئی بات جنسی ادویات کے کھلے عام فروخت تک جا پہنچی۔ فرمایا۔''امساک کی ادویہ دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی ادویہ ہیں۔ پھر حضور قلندر باباولیاءؒ کا ایک نسخہ بتایا۔ جو اعصابی سکون وطاقت کے علاوہ امساک کے لئے بھی مفید تھا۔ اُس میں افیون اور چھوہارے کو ایک خاص طریقے سے استعمال کرنا تھا۔ پھر اپنی تربیت کے ایک مرحلے کا تذکرہ فرمایا۔ حضور قلندر باباولیاءؒ مجھے تھوہر، سنکھیا اور اسی قبیل کی انتہائی کڑوی جڑی بوٹیاں کھلایا کرتے تھے۔ مسکراتے ہوئے کہا۔ شاید وہ مجھے دوزخ کی خوراک کا مزا چکھا رہے تھے۔ اُٹھتے ہوئے مسکرا کر دھیمے سے فرمایا۔ بھئی وصل تو جنت کی چیز تھی دنیا میں جانے کیسے آ گئی۔

ابھی ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ اٹک مراقبہ ہال کے انچارج ڈاکٹر ممتاز اختر کچھ ساتھیوں کے ہمراہ تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ اٹک لے جانے آئے تھے۔ اس نے اُن سے درخواست کی کہ وہ حضور کے ہمراہ اٹک انا چاہتا ہے۔ انہوں نے فورا کہا۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ابا تو خوش ہوں گے۔

ابا خوش ہوں گے۔ سُن کر پہلے تو وہ خود خوش ہو گیا۔ ممتاز بھائی نے کہا۔ ہم تو سوال سوچتے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں اُن سے سوال کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ آپ سوال پوچھتے ہیں تو آپ کے طفیل ہم بھی مستفیض ہو جاتے ہیں۔ تعریف سُن کر سرخوشی کی کیفیت دوآتشہ ہی تو ہو گئی۔ وہ سلسلے میں اُس سے کافی پہلے سے تھے اور مرشد کا ادب کرنا جانتے تھے۔ وہ چونکہ اُن سب کی نسبت نیا تھا اس لئے وہ اپنی جہالت اور لاعلمی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ وہ سب اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ سلسلے میں نئے آنے والوں کو مختلف باتیں سمجھنے کی خاطر مرشد سے ہر طرح کے سوال جواب کی آزادی اور مواقع ملنا ضروری ہیں۔

سفر میں یوں بھی توجہ اپنے ہمراہی کی طرف رہنا ایک فطری سا عمل ہوتا ہے۔اس قربت سے وہ اس انداز سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا کہ ذہن میں آنے والے کسی بھی سوال، اشتباہ اور معاملے کو اُن کے ساتھ بے تکلفانہ دریافت کر سکتا تھا۔ادھر وہ اُس کی حوصلہ افزائی کو اُس کو کئی بار بتا چکے تھے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات اپنے مرشد سے دریافت کرنی چاہئے۔اس سے مرشد کی طرزِ فکر اپنانے میں مدد ملتی ہے جب آدمی زندگی سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات اُس طرح سوچنے لگتا ہے جس طرح اُس کا مرشد سوچتا اور سمجھتا ہے تو اُس کے سوچنے اور سمجھنے کی طرزیں اپنے مرشد کی مانند ہو جاتی ہیں۔

وہ خود بھی درس وتدریس سے مس رکھتا تھا۔اُس کو اندازہ تھا کہ ایک استاد کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کچھ نہیں ہوتی کہ اُس کا شاگرد اتنا قابل ہو کہ وہ اُس پہ فخر کر سکے۔نالائق تلامذہ کے اساتذہ کو اُس نے کبھی سر بلند نہیں پایا۔تلمیذ کتنا بھی مودب رہے اگر اُس کی وجہ سے استاد کا سر فخر سے بلند نہیں ہوتا تو محض ادب اتنا بھی قابل فخر نہیں۔اپنی نالائقی اور جہالت کو چھپانے کی بجائے اُس کو دور کرنے کی کاوش بہر طور احسن اور قابل ستائش ہے۔

احسن اور قابل ستائش تو یہ بھی ہے کہ جو مرشد کہے وہ سمجھو۔۔۔جو وہ سمجھائے وہی سمجھو اور اتنا ہی سمجھو جتنا وہ سمجھائے۔جو وہ کروائے وہی کرے اور جتنا کہے اتنا کر کے بس کرنے کی بجائے اُس پہ قائم ہونے کی کوشش کرو۔مرشد جب مرید کو صاف ستھرا کرے تو وہ کم از کم اُس صفائی کی اتنی حفاظت تو کرے جتنی صاف کپڑوں کی جاتی ہے۔ماں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کپڑے شام تک میلے ہو جائیں گے لیکن اگر بچہ دس ہی منٹ میں کپڑوں کا حشر شام تک میلے ہونے والے کپڑوں سے بھی بدتر کر دے تو ماں کی کوفت فطری بھی ہے اور جائز بھی۔

اس کے مراد کا اپنے مریدوں کو سکھانے کا یوں تو ہر آن ہی ایک انداز، ایک نادر طریقہ اور کوئی اچھوتا زاویہ ہوتا ہے لیکن ان کے انداز تربیت کے چند عمومی طریقے بھی ہیں اور بات کہنے، بات سمجھانے۔۔۔اپنی اور لوگوں کی مثالیں دے کر اُسے ذہن نشین کرنے کی سعی کے علاوہ مرید کو عملی تجربات سے گزارنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اُسے محسوس ہوتا کہ یہ پوری دنیا ایک وسیع و عریض درسگاہ ہے اور زندگی اس درسگاہ سے کچھ سیکھنے کی مہلت۔

اٹک جاتے ہوئے راستے میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اٹک کے پل سے گزر رہے تھے تو دریائے سندھ میں پانی کی رنگت اور بہاؤ کی مقدار پہ بات ہو رہی تھی کہ اٹک پہ چیک پوسٹ پہ رُکنا پڑا۔ اپنی باری کے انتظار کے دوران ارشاد ہوا کہ چیک پوسٹیں اس لئے بنائی جاتی ہیں تاکہ ہر کوئی یہ کام نہ کر سکے۔ صرف کرنے والے ہی کریں۔ مرید سمجھا اُن کا اشارہ سمگلرز کی طرف ہے تو اس کی اصلاح کو فرمایا۔ ایک طرف تو یہ امتناع عام کا حکم رکھتی ہے اور دوسری جانب خاص لوگوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس سے اشیائے ممنوعہ کی عام ترسیل کو روک کر اُس کی قیمت بڑھائی جاتی ہے۔ ان کا عملہ تو اپنے ذاتی مفاد کے چکر میں پڑ کر چند ایک کو راہ دے دیتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ چیک پوسٹیں ہی کیا بیشتر تعزیری قوانین کے پس پردہ یہی حکمت کارفرما ہے۔ ایک وقت تھا کہ حکومتیں سگریٹ نوشی کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں تاکہ اُس کی آمدن پہ ٹیکس لگا سکیں اب بھی تو یہی مقصد ہے لیکن اب اس کی ممانعت کر کے اس کی قیمت میں اضافہ کر کے پہلے سے زیادہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ تلاشی دینے کی باری آ گئی۔ تلاشی پہ معمور سپاہی نے کار کی خالی ڈکی دیکھ کر انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تو ایک دوسرے صاحب نے آگے بڑھ کر اُس سے ریڈیو لائسنس کا پوچھا۔ اُس نے بڑے مان سے اپنے مراد کی طرف کی دیکھا کہ وہ اس بلائے ناگہانی سے اُسے بچائیں۔ لیکن وہ اُس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ جب اُس نے کہا۔ وہ تو نہیں ہے تو وہ

افسری پہ اتر آیا۔ گاڑی سائڈ پر لگالیں۔ نیچے۔ صاحب سے بات کریں۔ بے بسی سے اُن گاڑیوں کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھ کر جو اُن صاحب کے اشارے کے باوجود وہاں رکے بغیر بڑھ رہی تھیں۔۔ اس نے بحث میں پڑنے سے بہتر یہ سمجھا کہ وہ اتر کر جا کر اُس کے صاحب کے پاس جائے۔ اُن صاحب نے اُس کا نام پوچھا گاڑی کا نمبر لکھا اور لائسنس بنا کر اُسے تھماتے ہوئے فیس بتائی۔ اُس نے سوچا بس اتنی سی بات۔ واہ یہ تو خیر ہو گئی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ وہ اپنے مراد کے ہمراہ ہے تو شاید قانون سے ہی بالا ہو گیا ہے۔ انہوں نے لاتعلقی کا اظہار کر کے اُس کو سبق دیا کہ اپنے معاملات کو خود ہی درست رکھنا سیکھو۔ سبق کا دوسرا حصہ یہ بنا کہ قانون کسی کو کھاتا نہیں۔ اس کی پاسداری میں ہی عافیت ہے۔

وہ گاڑی میں آکر بیٹھا تو انہوں نے دریافت کیا۔۔ کیا ہوا؟ جو ہوا تھا وہ اُس نے بتایا تو فرمایا۔ چلیں اچھا ہوا۔ اب آئندہ کبھی کوئی دوبارہ روکے گا تو نہیں۔ جب اُس نے دیکھا کہ انہیں اس انتظار پہ کوئی کوفت نہیں ہوئی تو وہ مطمئن ہو گیا۔ ورنہ اپنی کوتاہی اُسے کھائے جاتی۔

کچھ دور چل کر اُس نے بات کا سرا وہیں سے جوڑنے کو کہا۔ یہ ٹیکس کے لئے اتنی گھما کر ناک پکڑنے کی کیا تُک ہے؟

فرمایا۔ تاکہ عوام کے شعور پہ بوجھ نہ پڑے۔ بھئی اگر لوگ منع کر دیں تو حکومت ٹیکس کس سے لے گی۔ وہ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے کبھی سڑک بنا دے گی، کہیں پانی اور سیوریج ٹھیک کروا دے گی تاکہ لوگ سمجھیں کہ وہ ٹیکس دیتے ہیں تو اُن کا اپنا ہی بھلا ہوتا ہے۔ یہ حکومت کرنے والے بہت ہوشیار لوگ ہوتے ہیں انہیں عوام کی نفسیات کا پورا علم ہوتا ہے ورنہ اگر حکومت کو عوام کے بھلے اور خیر خواہی کا اتنا ہی خیال ہو جتنا وہ بتاتے ہیں تو یہ راولپنڈی میں پریزیڈینٹ کی ناک کے عین نیچے ہی تو ہے مری

بریوری کی فیکٹری۔ گیارہ سال اسلام کی رٹ لگانے والے تک کو تو وہ فیکٹری دکھائی نہیں دی۔ اگر وہ اسلام کا اتنا ہی شیدائی تھا یا اُس کو لوگوں کی صحت کا اتنا ہی پاس تھا تو کیا وہ اسے بند نہیں کروا سکتا تھا؟

فقیر جس بھی موضوع پہ بات کرے اپنی فراست کے نور سے سننے والے کے ذہن کو منور کر دیتا ہے۔ اتنا کتابی علم ہونے کے باوجود وہ آج تک اتنی سیدھی اور سامنے کی بات نہیں سمجھا تھا تو وہ اور کیا جان سکتا تھا۔

اُس نے سوچا کہ وہ اپنا ایک مسئلہ اپنے مراد کو تائے گا۔ کل کوا گر کچھ الٹا ہو گیا تو وہ کہیں گے آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اُص نے کھنکار کر بات شروع کی۔ حضور میری گرفتاری کے وارنٹ لے کر پولیس مجھے پکڑنے آئی تھی۔ میں آپ کے پاس تھا۔ آج کل میں وہ دوبارہ ائیں گے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

انہوں نے چونکے بغیر کہا۔ ہوا کیا تھا؟

اُس نے بتایا کہ اُس نے کسی دوست کو بنک سے قرض لے کر دینے میں اُس کی ضمانت دی تھی۔ اب وہ دوست غائب ہے۔ جب وہ کراچی میں تھا اُس وقت سمن وغیرہ آتے رہے پھر اُس کی غیر موجودگی میں کیس عدالت میں چلا گیا اب عدالت نے اُس کے وارنٹ جاری کر دیئے ہیں۔

انہوں نے کہا۔ آپ تھانے چلے جائیں۔

تھانے خود چلا گیا تو وہ مجھے گرفتار کرلیں گے اور ضمانت ہونے تک حوالات میں رہنا ہوگا۔ وہ سوچ کر الجھ گیا کہ اسی تماشے سے بچنے کے لئے تو اُس نے اُن سے بات کی تھی اور اب وہی فرما رہے ہیں کہ تھانے چلے جائیں۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ کچھ توقف کے بعد دوبارہ فرمایا۔ آپ تھانے تک ضرور جائیں۔

اٹک پہنچے تو وہاں کا پروگرام بھی آرمی میس ہی میں تھا۔ بریگیڈیر رفیق میزبان تھے۔ بریگیڈیر صاحب نے فوجی وردی میں عسکری کروفر کے ساتھ استقبال کیا۔ ہال میں خطاب لئے جانے سے پیشتر حضور کو ایکمرے میں آرام کرنے کی دعوت دی گئی۔ جس کو انہوں نے یہ کہہ کر جزوی طور پر قبول کیا کہ ٹھیک ہے اتنی سیر میں لوگ اپنی نشستیں سنبھال لیں گے۔

انہیں کمرے میں بٹھا کر میزبان باہر نکلے تو آپ نے ڈاکٹر ممتاز اختر سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ اس طرح مجھے فوجی طرزِ فکر سے روشناس کروانا چاہتے ہوں گے۔ یعنی فوجیوں سے بات ہوگی تو اُن کے اندازِ فکر اور زاویہ نظر کا پتہ چلے گا اور شاید یہ بھی کہ اُن کا ڈسپلن قریب سے دیکھ کر اپنے سلسلے کے دوستوں کی تربیت کا نظام بہتر ہو سکے گا۔

ہال کی طرف چلے تو میزبان نے برآمدے میں ایک میز پر مہمانوں کے تاثرات کے لئے سلیقے سے رکھے ایک رجسٹر میں اپنے تاثرات قلم بند کرنے کی فرمائش کی۔ آپ نے کیا لکھا وہ پوری طرح نہ دیکھ سکا۔ البتہ جب وہ لکھ کر ہٹے تو اُس کی نظر اُن کے جانے پہچانے دستخط اور اُس کے نیچے لکھے چیف ایڈیٹر ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ کراچی کے الفاظ ہی دیکھ سکی۔

ہال میں کرسیوں پر نظم و ضبط سے بیٹھے افراد نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ آپ نے بات کا آغاز کرنے سے پہلے اپنے مخصوص دھیمے اور کومل سروں میں تلاوت کلام پاک سے نوازا۔ پھر پھر خواب اور اُن کی روحانی تشریح و توضیح فرمائی۔ جب آپ نے بات شروع کی تو کسی نے کہا کہ آواز بلند ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھی نے انگریزی میں کہا۔ ''وہ بہت نرم گفتار ہیں تمہی کو توجہ دینا

ہو گی۔'' یہ بات کہنے والا بلند آہنگ کی فرمائش کرنے والے سے شاید عہدے میں بڑا تھا اس لئے وہ فوراً کرسی پہ آگے ہو بیٹھا اور پوری توجہ سے بات کو سننے کی کوشش میں لگ گیا۔

نرم لہجے میں بات آغاز ہو کر رفتہ رفتہ بلند ہوتی چلی گئی۔ خواب کو خیال و خواب ماننے والوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروا کر کہ یہ روح کی تحریکات کے سوا کچھ نہیں جنہیں ہمارا لاشعور ہمارے شعور کو اُس وقت مہیا کرتا ہے جب وہ نیند کی آغوش میں ہوتا ہے۔ لاشعور کی دی گئی ان اطلاعات کو شعور اپنی ساخت اور طرزوں کے مطابق تصویری صورت دے دیتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ خواب دراصل روح کے پیغامات ہوتے ہیں جنہیں روح اپنی زبان میں ادا کرتی ہے اور اُن کی تعبیر و تشریح ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جو روح کی زبان جانتے ہوں۔

اس کے بعد آپ نے قرآن حکیم میں مذکورہ خوابوں کا شرح و بسط سے ذکر کر کے اپنی بات کی وضاحت فرمائی۔ سوال و جواب کے ایک مختصر دور کے بعد محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔ میزبان انہیں لے کر کھانے کی وسیع و عریض میز کی طرف بڑھا۔ مرید کو میزبان نے مہمان خصوصی کے بالکل سامنے اونچی پشت والی نشست پر اپنے بائیں ہاتھ بیٹھنے کو کہا تو وہ گھبرا گیا۔ وہ خود کو اپنے مرشد کے مقابل بیٹھنے کا اہل کہاں سمجھتا تھا۔ جب میزبان نے سالن کی رکاب اُس کی طرف نہایت تمیز اور سلیقے سے بڑھا کر اُسے کھانا نکالنے کو کہا تو اُس نے اپنے مراد کی طرف نظر کی جن کے قریب کے سبب اُس کو وہاں بیٹھنے کی سعادت ملی تھی۔

اُس نے ارد گرد کھڑے مستعد او چاک و چوبند باوردی پیکروں کو دیکھا اور چھری کانٹا پکڑ کر اپنی پلیٹ پہ جھک گیا۔ پہلے لقمے کے ساتھ ہی اُس کے اندر سلسلہ خیال کا آغاز ہوا۔ انسان نے عزت و بے عزتی کے بھی کیا معیار بنائے ہوئے ہیں۔ اگر سالن روٹی پہ رکھ کر اُس کے ہاتھوں میں دے کر دروازے کے پائیدان پہ بیٹھ کے کھانے کو کہا جاتا تو وہ یہی روٹی اور سالن کھاتے ہوئے وہ بے عزتی

کارونا بھی رو رہا ہوتا اور جب یہی روٹی اور سالن وہ اپنے مراد کے سامنے کرسی نشین ہو کر کھا رہا ہے تو وہ اُس کو فخر و مباہات گردان رہا ہے۔اُس کے اندر بنے ہوئے معیاروں میں پہلے دراڑ پڑی۔۔۔ پھر شگاف بن گئی۔۔۔اُس کو لگا کہ اُس کے نظریات کی پوری عمارت اُس کے اوپر ڈھے رہی ہے۔ کھانے کے دوران وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں۔میزبان نے کس کس طرح اُس کے مراد کی تواضع کی۔۔۔ اُن کو رجھایا۔۔۔وہ دیکھ تو رہا تھا لیکن جیسے کوئی بہت دور سے دیکھ رہا ہو۔اُس نے اپنے اندر ہوتی ٹوٹ پھوٹ اور گرتے ملبے کی دھول سے بھیگتی پلکوں کو کئی بار پونچھا۔

شکر گزاری میں حقیقت شناسی کی آمیزش ہو جائے تو انکسار صورت ابھرتی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی کمزوری اُس کے آڑے آ رہی تھی جو جھکائے رکھنے کے باوجود اُس کے اندر کی اڑتی دھول پہ برستی بوچھاڑ کے چھینٹوں کو باہر نکلنے سے روکنے میں ناکام تھیں۔

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ پھر عمارت کے بیرونی برآمدے میں گروپ فوٹو ہوئے۔ دوبارہ آنے کی درخواست ہوئی۔ نہایت تپاک سے رخصت کئے جانے کے بعد وہ اٹک مراقبہ ہال کی طرف چل دیئے۔ فوجی نظم و ضبط کے صاف ستھرے ماحول سے باہر آ کر۔۔۔ سڑک پہ اڑتی دھول کو پیچھے چھوڑتے۔۔۔ وہ اٹک کے بازاروں کی بے ہنگم ٹریفک میں راستہ بناتے۔۔۔ بازار میں دکانوں کے اوپر بنے۔۔۔ تین کمروں کے ایک فلیٹ کے سامنے رکے۔

سلسلے کے پُر جوش نوجوان دوستوں نے والہانہ استقبال کیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے اور ملاقتوں، مسئلے مسائل کا دور شروع ہوا۔ پھر معلوم ہوا کہ رات کو حضور پنڈی تشریف لے جائیں گے۔ راولپنڈی مراقبہ ہال سے لوگ آ ئیں گے اور وہ اپنے مرشد کو اپنے ہمراہ لے جائیں گے۔ پشاور کی ٹیم اب واپس جا سکتی ہے۔ مرشد کریم سے الوداع ملاقات کر کے وہ واپس روانہ ہوئے تو نوشہرہ

تک راستے میں خاموشی رہی۔اس کا سبب تھکن تھا یا اداسی۔۔۔۔یا دونوں۔۔۔۔وہ کوئی اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔۔۔البتہ وہ خوش تھا کہ اُس کو اپنے مراد کے قریب کی چند انمول ساعتیں نصیب ہوئیں۔

مور کے پنکھ چتھے چتھائے ہوتے ہیں

واپس پشاور پہنچ کر گلبہار تھانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ اپنے گھر چلا گیا کہ صبح دیکھیں گے۔ کم از کم ضمانت وغیرہ کا بندوبست کر کے ہی جاؤں گا۔ صبح ہوئی تو وہ اپنے دفتر پہنچا۔ ابھی وہ بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ ضمانت کے لئے کس سے کہے کہ دو پولیس والے آن دھمکے۔ اُس سے اسی کی بابت پوچھا۔ کہ وہ کہاں ہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اُس نے بے بسی سے سوچا ابھی تک تو وہ کوئی بندوبست نہیں کر سکا تھا اب وہ کیا کرے۔ اُس نے اُن کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی اور ایک فون کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے کہا۔ شوق سے۔

اب وہ سوچ میں پڑ گیا کس کو اطلاع دوں؟۔ گزشتہ رات سے اُس وقت تک وہ کسی نتیجے پہ نہ پہنچ سکا تھا تو اب کیا پہنچتا۔ اُس نے سر کھجایا اور اپنی والدہ کا نمبر ملا کر اُن سے بات کی۔ وہ کچھ عرصے سے اُن سے ناراض تھا اور اس ناراضگی کی وجہ سے جب کبھی وہ بات کرنا چاہتی تھیں تو وہ کر لیا کرتا لیکن خود فون کر کے بات کئے اُس کو اک مدت ہو گئی تھی۔ شاید ماں کو دکھ دینا ہی چاہتا تھا۔ اُس نے جب انہیں اطلاع دی کہ پولیس اُسے گرفتار کرنے آئی ہے تو ماں نے پوچھا کیوں؟ ہوا کیا ہے؟ اب کیا ہو گا؟ اُن کی آواز میں دکھ اور لہجے میں پریشانی سے اُس کو اُس گم گشتہ محبت اور ممتا کا احساس ہوا جس کی کمی کا رونا رو کر وہ اُن سے ناراض تھا۔ اُس نے فون بند کیا تو ایک پولیس والے نے اُس سے پوچھا۔ یہ آپ نے کس کو فون کیا؟

اُس نے بتایا کہ اپنی ماں کو۔ انہوں نے کہا وہ تو ہمیں آپ کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا لیکن ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کو پوری دنیا میں اور کوئی نہیں ملا تھا جس کو آپ یہ اطلاع دیتے۔ بوڑھی ماں کو آپ نے دکھ دے کر اچھا نہیں کیا۔ اُس نے کہا۔ میں جس کسی کو بھی اطلاع دیتا۔ بات میری ماں تک ضرور پہنچتی اور اُس کو زیادہ دکھ ہوتا کہ میں نے خود اُس سے بات کیوں نہیں کی۔

اب اور کچھ ہو یا نہ۔۔۔ کم از کم وہ دعا گو تو ہو گی کہ اللہ اُس کے بیٹے کی سختی معاف کرے۔ میں ایک ناکردہ گناہ کی پکڑ میں ہوں۔ اب میں نے دوستی میں ضمانت دی اور حال یہ ہے کہ آج تک مجھے اپنی ضمانت کے لئے کوئی بندہ نظر نہیں آرہا۔

اُس کی بات سُن کر حوالدار امیر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھی سے کہا آؤ چلیں۔ وہ اُٹھ کر اُن کے ساتھ روانہ ہونے لگا تو وہ دروازے پہ رُک کر بولا۔ آپ نہیں۔ آپ یہیں بیٹھیں۔ آپ شام کو تھانے آجانا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ کون دوست ہے جو اپنی جان بچانے کو اپنے محسن کو ذبح کرنا چاہتا ہے۔ پیسے اُس نے کھائے ہیں تو بھرنے بھی اُسی کو چاہیئں۔ یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا کہ کرے کوئی بھریں آپ۔ پھر وہ پلٹا اور کہا۔ ہاں اپنی والدہ کو ابھی فون کر کے بتادو کہ ہم نے اُن کی وجہ سے آپ کو گرفتار نہیں کیا۔

شام کو وہ تھانے گیا۔ وہاں امیر محمد سے بات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ وہ ائندہ پیشی پہ عدالت چلا جائے۔ اتنی دیر میں وہ اصل قرض خواہ کو سمجھا کر وہاں لے آئیگا۔ جب اُس نے کہا کہ اُس کو کوئی نہیں سمجھا سکتا تو حوالدار نے تڑپ کر کہا۔ اللہ تو سمجھا سکتا ہے۔ میں اُس کو کہہ دوں گا کہ تم آجاؤ۔ میں ریڈر سے کہہ کر تمہیں قسطیں کروا دوں گا ورنہ میں یہ رقم کسی اور سے بھروا کر اُس کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ تو وہ اُس کی اولاد بھی یاد رکھے گی۔ وہ اسی لئے کر رہا ہے کہ وہ آپ کو کمزور دیکھتا ہے۔ جب اُسے معلوم ہو گا کہ آپ کمزور نہیں تو بات ضرور مانے گا۔ باقی اللہ مالک۔

وہ حیرت میں ڈوبا۔ اپنے مراد کی ہدایت کہ آپ تھانے ضرور جانا۔۔۔ یہ غور کرتا۔ گھر کو چل دیا۔ ایک ہی ملے میں وہ اپنی ماں سے راضی ہوا۔۔۔ مقدمے سے جان چھوٹی۔۔۔ دوست کے کئے کی سزا اور کوفت سے بچا۔۔۔ اور ایک ایسا اچھا انسان دوست بن گیا جو کسی بے کس کے ساتھ مردوں کی طرح کھڑا ہونا اپنا فرض سمجھ رہا تھا۔۔۔ اور تم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ اُس نے زندگی کو اس سے پیشتر کبھی اتنا سہل اور خوشگوار کہاں پایا تھا۔

ایک روز وہ گھر پہ لیٹا چھت کو تک رہا تھا اور سوچ میں تھا کہ وہ اپنے مراد کی خوشنودی کے حصول کے ایسا کیا کر سکتا ہے جو اُنہیں اتنا اچھا لگے کہ وہ اُسے اپنے قریب کر لیں۔ اچانک اُس ذہن میں ایک سر گوشی ابھری اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے دھیان میں اپنے مراد کی ایک بات آئی۔ انہوں نے ایک بار فرمایا تھا کہ اخبارات میں مضامین آنے سے لوگوں کو روحانی علوم کے حوالے سے آگاہی ہو گی تو اس سے سلسلے کو تقویت ملے گی۔ اُس نے انہی خطوط پہ سوچنا شروع کر دیا۔

یہی سوچتے ہوئے اُس نے اپنے مراد کی ایک کتاب اُٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ ذہنی سکون کے حوالے سے ایک مضمون کو دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا کہ وہ اس بات کو اگر انگریزی میں لکھے اور کسی اخبار کو دے تو کیسا مزہ آئے گا۔ پھر اُس نے اک مضمون لکھ ہی لیا اور اُسے ایک اخبار کو بھجوا دیا۔ اس کو یقین نہ تھا کہ وہ مضمون چھپ جائے گا۔ پھر ایک دن جب دفتر سے گھر آیا تو اُس کے ایک جاننے والے نے اُس کو اُس کا مضمون اخبار میں چھپنے کی مبارک باد دی تو اُسے بہت اچھا لگا۔

اُس کا جی چاہا کہ وہ مرشد کریم کو اس کی اطلاع دے لیکن وہ خود میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں کر سکا تو اُس نے نیاز صاحب کو فون کر کے اطلاع دی۔ انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ کیا اُس نے حضور باباجی کو یہ بات بتادی ہے۔ جب انہوں نے نفی میں جواب سُنا تو کہا چلیں آپ فکر نہ کریں میں انہیں خود اطلاع دوں گا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ لاہور میں ایک روحانی کانفرنس کا اعلان کیا گیا ہے اور سلسلے کے سب افراد کو دعوت بھی دی جارہی ہے۔ چند ایک روز میں باباجی بھی لاہور آجائیں گے۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ ابا حضور لاہور آچکے ہیں تو اُس سے رہا نہ گیا اور کانفرنس سے ایک دو روز قبل ہی لاہور پہنچ گیا۔ لاہور بس اسٹینڈ سے قصور جانے والی بس پہ بیٹھ کر وہ آہلو روڈ پہ لاہور مراقبہ ہال کا پتہ پوچھتا ہوا وہاں پہنچا۔ مراقبہ ہال کے وسیع میدان میں

لگی قناتوں کے اندر بیٹھے وہ مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ جب وہ فارغ ہوئے تو وہ ملنے آگے بڑھا۔ اُسے اپنی طرف آتا دیکھ کر اُٹھے۔ ابھی وہ اُٹھ ہی رہے تھے کہ منتظمین میں سے کسی نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ مقصود صاحب پشاور سے آئے ہیں۔

یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔۔۔۔ کہتے ہوئے بڑی شفقت اور اپنائیت سے اُسے گلے لگا یا۔ مل کر ہٹا تو وہاں دوبارہ بیٹھنے کی بجائے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ انہوں نے اُس سے فرداً فرداً اُس کے بیوی بچوں کا پوچھا پھر نیاز بھائی، قریشی صاحب کا پوچھا۔ وہ اُن کی باتوں کا جواب دیتے دیتے اُن کے ہمراہ اُن کے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہ اُن کے آرام کے خیال سے باہر ہی رکنا چاہ رہا تھا کہ میاں مشتاق احمد عظیمی جو اُن کے پیچھے پیچھے آرہے تھے نے اُس کو بازو سے پکڑ کر بے تکلفی سے کمرے کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر داخل ہو کر حضور کمرے میں بچھے لکڑی کے تخت پوش پہ بیٹھ گئے اور اس کے ہمراہ آنے والے دو تین افراد زمین پہ بچھی دری پہ بیٹھ گئے۔

اُس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ فرنٹیئر پوسٹ میں آپ کے مضامین کا سلسلہ شروع ہوا نیاز صاحب نے بتایا تو بہت اچھا لگا۔ مرید عرض گزار ہوا حضور میں تو آپ ہی کا لکھا اور کہا انگریزی میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فرمایا۔ ادب میں ایک آدمی کی چوری سرقہ اور دس بیس افراد کے کاموں کو اپنے نام سے چھپوانا ریسرچ کہلاتا ہے۔ پھر بہت ہی نرم اور میٹھے سے لہجے میں گویا ہوئے۔ چلیں اک چراغ اور جلا تو سہی۔ لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مرید کو لگا کسی نے بہت سا کیف اُس کے اندر انڈیل دیا ہو۔ پہلے تو وہ سرقے اور ریسرچ کی اصطلاحات کی شرح کا لطف لینے لگا لیکن یہ محسوس کر کے ششدر رہ گیا کہ انہوں نے اُس کے خانہ دل کا چور پکڑ کر اُس کو اپنی نگارشات سے استفادے کی کھلی چھٹی دی ہے۔

پھر اگلی منزلوں کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے فرمایا۔ جب تک آپ اپنے قارئین کو involve نہیں کریں گے وہ آپ کے مضامین پڑھ کر لطف تو لیں گے لیکن آپ کو خطوط نہیں لکھیں گے۔ بھئی میں بھی پہلے آپ ہی کی طرح مضامین لکھا کرتا تھا اور یہ بات اسی تجربے کی روشنی میں کہہ رہا ہوں۔ مرید ابھی پہلی بات کے سرور سے باہر نہیں نکلا کہ انہوں نے 'آپ کی طرح' کہہ کر اُسے لطف وانبساط کی ایک آبشار کے نیچے کھڑا کر دیا۔

پھر دیکھنے کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ ہم بکری کو نہیں دیکھتے۔۔۔ بلکہ بکری کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔ ہم اپنے اندر دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ باہر دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا دراصل اندر دیکھنا ہی اصل دیکھنا ہے۔ مرید نے جانا کہ ہماری باطنی آنکھ ہمارے اندر کی سکرین پہ مرتکز رہتی ہے۔ وہاں جو بھی عکس ابھرتا ہے ہم اُسی کو دیکھتے ہیں خواہ وہ کسی بیرونی مہیج کے زیر اثر بنے یا کسی باطنی تحریک کے نتیجے میں پیدا ہو۔

ایک بات مزید یہ ارشاد فرمائی کہ دنیا غلاظت ہے اور لوگوں کو نہ جانے کیوں سمجھ نہیں آتی۔ آیت الکرسی پڑھتے ہیں تو دنیا کی طلب میں، قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں تو دنیا کے مانگنے کو اور اگر روحانیت سیکھنے آتے ہیں تو حصول دنیا کے لئے۔ خدا کے نور سے غلاظت سمیٹنے پر لگے ہوئے ہیں۔

مرید کو لگا انہوں نے اُس کی ننگی خواہشوں پہ اک تازیانہ رسید کیا ہے۔ وہ سہم گیا لیکن اُس کے اندر کا گنہگار اور پاپی من اڑ گیا۔ اُس نے کہا" حضور اب آپ کے سامنے کیسے عرض کروں کہ یہ بات بھی تو ہمارے بزرگ ہی ہمیں بتاتے ہیں کہ اتنی مرتبہ آیت الکرسی پڑھو تو شادی ہو جائے گی اور قرآن کی فلاں آیت اتنی بار اس وقت پڑھو تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اگر لوگ روحانیت

سیکھنا چاہتے ہیں تو صرف اس لئے کہا نہیں یہی بتایا جاتا ہے کہ روحانیت سیکھنے سے ماورائی طاقتیں حاصل ہوتی ہیں، انسان کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔۔۔وہ مٹی کو سونا بنا سکتا ہے۔۔۔اب آپ ہی بتائیں ہم کریں تو کیا کریں۔

تخت پوش کے کنارے پہ ٹانگیں لٹکائے دونوں ہاتھوں سے تخت پوش تھامے اگے کو جھک کر وہ اُس کی بات پوری توجہ سے سُن رہے تھے۔جب وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو انہوں نے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پہ رکھتے ہوئے کمر کو سیدھا کیا اور کہا۔"جی ہاں آپ درست کہہ رہے ہیں۔ہمارے بزرگوں نے مصلحت سے کام لیا۔قرآن کا اعجاز ثابت کرنے کو لوگوں کو دنیا کا لالچ بھی دیا اور روحانی طاقتوں کا بھی کہ شاید اسی طرح کوئی راہ پہ آجائے۔اب وقت آگیا ہے کہ آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ ہمیں قرآن سے دنیا نہیں بلکہ دنیا کے مالک اللہ تعالیٰ کو حاصل کرنا ہے۔دراصل فقیروں نے لوگوں کو اللہ کی طرف مائل کرنے کا کیا کیا جتن نہیں کیا۔قوالی، سماع سے لے کر لنگر تک محض اس لئے آغاز کئے کہ لوگ کسی طور تو مائل ہوں۔جب لوگ مائل ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں دنیا سے ہٹا کر مالک کائنات کی طرف متوجہ کرنے لگ جاتے ہیں۔لیکن یہاں تو کچھ عجیب ہی ہوا اب لوگ اسی طرف ہی مائل ہوتے ہیں اللہ کی طرف توجہ نہیں ہوتے۔بھئی جس اللہ کے کلام کو پڑھ کے آپ کا مسئلہ حل ہوا اُس کو اللہ کی طرف توجہ کرنا کتنا سود مند ہو گا۔لیکن ہم تو دنیا کو ہی سب کچھ مان کر اُس کے کلام کو حصول دنیا کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مرید نے پہلے تو دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس کی گستاخی پہ اُس کی پکڑ کی بجائے انہوں نے اتنی شفقت سے اُس کو سمجھایا کہ اب اس دنیا کی بجائے دنیا کے مالک کی طرف توجہ ہو جانا چاہیے۔

پھر ایک حکایت سنائی کہ ایک بار ایک بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ جس کا جو جی چاہے وہ اُس کمرے میں موجود کوئی بھی ایک چیز اُٹھا لے۔وہ اُس کی ہو جائے گی سب اِدھر اُدھر دوڑے۔کسی نے قالین لپیٹا، تو کوئی دربار میں رکھے سامانِ آرائش کی

طرف لپکا، کسی نے سونے چاندی کے ظروف اُٹھائے تو کسی نے شاہی شمع دان۔ لیکن ایک کنیز سب سے بچتے بچاتے بادشاہ کے قریب ہوئی اور اُس نے بادشاہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا۔۔۔ یہ کیا؟

اُس کنیز نے کہا۔ جہاں پناہ آپ نے اجازت دی کہ اس کمرے میں سے جو جی چاہے لے لو۔ سو میں آپ کی خواستگار ہوں۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔

فرمایا اسی طرح ہم بھی اللہ کی بنائی چیزوں کی تو قیمت لگاتے ہیں اللہ کی قیمت نہیں لگاتے۔ اگر ہم اللہ کی قیمت لگائیں گے تو یہ دنیا تو خیر بہت ہی چھوٹی اور بے مایہ چیز ہے اللہ کی پوری کائنات ہمارے آگے سرنگوں ہو جائے گی۔

مرید نے سمجھ لیا کہ دنیا کو غلاظت کہہ کر انہوں نے انہیں یہی سمجھایا ہے کہ دنیا کی بجائے دنیا اور کائنات کے خالق کی طرف متوجہ ہونے میں بھلائی ہے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے ر آدمی کے disposal پہ بیس ہزار فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ اب جیسے کسی نالائق افسر کے ماتحت بے کر رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں اس طرح جو لوگ اپنے فرشتوں سے کام لینا نہیں جانتے وہ اُن کو بھی بے کار کر دیتے ہیں۔

جو لوگ اپنے فرشتوں سے واقف نہیں وہ کتنے بھی بڑے ہو جائیں، دنیا میں کتنے ہی بڑے نظر آئیں۔۔۔ در حقیقت اتنے بڑے ہوتے نہیں۔ اصل میں تو یہ بہت چھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔ سیاسی لوگ تو خاص طور پر بڑے پن سے خالی ہی دیکھے ہیں۔ بڑے لوگ اول تو سیاست میں آتے ہی نہیں اور اگر کبھی انا بھی چاہیں تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اب آپ مولانا طاہر القادری ہی کی مثال لے لیں وہ ایک عالم آدمی ہیں۔۔۔ ایک عالم کے بیٹے ہیں۔۔۔ قرآن کے حوالے سے انہوں نے بہت کام کیا۔۔۔ لیکن جب وہ سیاست

میں آ گئے تو اتنے مشہور ہونے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔ بھئی لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک عالم آدمی ہے ہم اس کے پاس مسئلہ لے کر جائیں گے تو یہ اُلٹا ہماری اصلاح کرنے بیٹھ جائے گا۔۔اب ایسے کو کوئی ووٹ کیوں دے گا۔اپنی اصلاح تو کوئی کرواناہ نہیں چاہتا۔ اس لئے کبھی کسی کی اصلاح کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیئے۔

میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ آج پوری امت مسلمہ کا یہ مسئلہ کینسر کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ ہر آدمی دوسرے کی اصلاح کرنے پہ تلا ہوا ہے لیکن اپنی اصلاح سے بے خبر ہے۔اللہ ہم پہ رحم کرے۔

اتنے میں دروازہ کھلا ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور دستر خوان بچھایا گیا وہ اُٹھ کر باہر جانے کو ہلا ہی تھا کہ میاں صاحب نے اُس کو مخاطب ہو کر فرمایا۔آپ کھانا ہمارے ساتھ یہیں کھائیے۔اُس نے شکر گزاری سے دیکھا کہ انہوں نے اُس کو اپنے مراد کے ہمراہ دستر خوان پہ بیٹھنے کی سعادت ایک بامزید عطا کی۔

وہ اپنے مراد کے حضور سر جھکائے بیٹھا محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا مراد اُس کو دیکھ رہا ہے۔چند ساعتوں بعد اُس نے احساس کی تصدیق کو سر اُٹھائے بغیر اُن کی جانب نگاہ کی۔وہ واقعی اُسے دیکھ رہے تھے۔اُن کی آنکھوں میں دیکھنے کا اُس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔نگاہ کو فوراً جھکانے کے باوجود وہ ممتا کی روشن لہروں کو اپنے وجود کو بھرتے محسوس کر رہا تھا۔کھانے کے بعد وہ وہاں ہٹ گیا۔

دوسرا دن کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف لوگوں کو دیکھتے، ارد گرد کے علاقوں سے آئے سلسلے کے لوگوں سے ملتے ملاتے اُن سے گپ شپ کرتے گزرا۔اس دوران کبھی کھانے پہ تو کبھی سیر پہ جاتے اور کبھی شام کو۔۔۔جب سب اُن کے گرد جمع ہو کر اپنے مراد کی باتیں سنتے تو۔۔۔وہ بھی ہجوم عاشقاں کا حصہ بنا یہ سب دیکھتا اور سُنتا رہتا۔

تیسرے روز صبح مراقبے کے آغاز پہ یاحی یاقیوم کاذکر جہری کراتے ہوئے حضور نے کسی صاحب کوٹوکا کہ ناک سے آواز نکالنے پر جنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے اس لئے ناک سے آواز نہ نکالیں۔

مراقبے کے بعد خود درس دینے کے بجائے مرید سے کہا کہ وہ تصورِ شیخ پہ بات کرے۔ مرید نے مراقبے کی کیفیت کے زیرِ اثر موضوع کی بابت سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے سامنے دیکھا۔اتنا بڑا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا دیکھ کر اُس کو بہت اچھا لگا کہ اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اُس کو اپنے مراد کے کہنے پہ بات کرنے کا اعزاز ملا ہے۔اُس نے بات کا آغاز کیا۔ دوستوں کے سامنے کسی موضوع پہ گھنٹوں اظہار خیال کرنا اور مرشد کریم کی موجودگی میں سینکڑوں افراد کے سامنے کچھ کہنے میں جو فرق ہے وہ آڑے آرہا تھا یا اعزاز کا افتخار سد راہ ہو رہا تھا۔۔۔ وہ چند ایک بے ربط ٹوٹے پھوٹے جملوں کے بعد ہی لڑکھڑا گیا تو انہوں نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا۔

تصورِ شیخ کے بارے میں وضاحت سے بتایا کہ انسان میں معین مقداریں کام کرتی ہیں۔ انسان ہی نہیں بلکہ ہر شے میں معین مقداریں کام کرتی ہیں اور یہ سب ایک سسٹم کے تحت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آم کے درخت پہ صرف آم اور سیب کے درخت پہ صرف سیب ہی لگتے ہیں۔ انسان میں تین باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر اُسے دوسروں پہ فضیلت حاصل ہے۔ معین مقداروں کا علم رکھنا، انہیں استعمال کی صلاحیت رکھنا اور انہیں استعمال کر سکنا۔ اچھائی برائی کا علم ہونے کے ساتھ ساتھ سسٹم کو چلانے کا علم رکھنا اور صلاحیت رکھنا۔ یہ سارا سسٹم لہروں پہ قائم ہے۔ تصورِ شیخ مرشد کے اندر کام کرنے والے انوار یعنی لہروں کو اپنے اندر منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اس میں مرید کا ذہن اگر تصویر کشی میں مصروف ہو جائے تو یہ درست نہیں بلکہ یہ ایک قسم کی بت پرستی ہو گئی۔ اس کا درست طریقہ خود کو مرشد جیسا سمجھنا، خود کو مرشد کی جگہ رکھ کر سوچنا ہے۔ مرشد کے تصور میں مستغرق ہونے اور

محض مرشد کی تصویر کو ذہن میں ابھارنے میں جو فرق ہے اُس کو سمجھانے کو ماں کی طرزِ فکر کا بچے کو منتقل ہونے کی مثال دی۔ فرمایا کہ بچہ وہی زبان بولتا ہے جو ماں بولتی ہے۔ بچہ انہی طرزوں میں سوچتا اور بات کرتا جن طرزوں کو اپناتا ہے۔ اگر آپ اپنے مرشد سے متاثر ہو کر اُس کی طرزِ فکر کو اپناتے ہیں تو تصورِ شیخ کے تقاضے پورے ہونے کی سبیل بن گئی۔

مراقبے کے بعد وہ تمام دن نادم اور خجل اِدھر اُدھر ہوتا رہا کہ وہ عین موقعے پہ بات کیوں نہیں کہہ پایا۔ وہ سب سے نظر چرائے پھرتا۔۔۔ خود کو کوستا رہا۔۔ شام کو حضور کچن کے پاس چارپائی پہ بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر ممتاز اٹک سے پہنچ گئے۔ وہ مرشد کریم کے ساتھ چارپائی پر پائنتی کی طرف ادب سے نگاہ نیچی کئے بیٹھے تھے کہ اُن سے تصورِ شیخ کی بابت کچھ کہنے کو کہا۔ انہوں نے اس بارے میں کافی دیر بات کی کہ تصورِ شیخ سے مرید کو مرشد کی طرزِ فکر حاصل ہوتی ہے وہ مراقبہ تصور شیخ کے فوائد گنواتے رہے۔ جب آپ نے ہاتھ اُٹھایا تو وہ خاموش ہو گئے۔

وہ موقع کی تاڑ میں تھا۔ اُس نے قریب ہو کر اپنی صبح کی ناکامی کے حوالے سے معذرت کی۔ انہوں نے صرف اتنا فرمایا۔ کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے۔ اگر دھیان کو موضوع پہ رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ ذہن میں بات ڈال دیتا ہے اور وہاں سے اُٹھ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ وہ ادب سے ایک طرف ہٹ کر کھڑا یہ سوچتا رہا کہ انہوں نے ایک ہی جملے میں کس خوبصورتی سے نہ صرف اُس کو فنِ تقریر و خطابت کا ایک زرین اصول تعلیم فرمایا بلکہ اُس کو احساسِ ندامت سے بھی مکت کر دیا ہے۔

اگلے روز روحانی کانفرنس میں پانچ چھ سو افراد کی شرکت کا منظر دیکھتے وہ شرکا کی تقاریر سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُس کو کوئی بھی متاثر نہیں کر رہا تھا۔ پھر جب انہوں نے مائک سنبھالا تو وہاں سبھی لوگ اس قدر منہمک ہو گئے کہ کسی کو وقت گزرنے کا احساس تک نہ رہا۔ روحانیت کا پھیلاؤ جس کا مشن ہو وہ اس کو محض ایک تقریر کا موضوع مان کر بات کرنے والوں کی نسبت

کس قدر خلوص سے بات کرتا ہے۔ وہاں موجود سبھی اس فرق کو سمجھ بھی رہے تھے اور اُس سے متاثر بھی ہو رہے تھے۔

بعد میں اُس نے کئی افراد کو سلسلے میں شمولیت کے خواہش لئے داخلہ فارم بھرتے اور اس میں شامل ہونے کی بابت دریافت کرتے دیکھا۔

لاہور سے واپسی کے بعد بھی وہ خود کو ایک عجیب سے کیف و سرور کی کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتا رہا۔ چند روز اسی کیف اور سرور میں گزار کر وہ رفتہ رفتہ زندگی کے معمولات کی طرف لوٹتا چلا گیا۔

کبھی کبھار خالد نیاز سے فون پر بات ہو جاتی۔ وہ اُس سے اپنے مراد کی بابت پوچھتا پھر ایک روز خبر ملی کہ لوح و قلم کا انگریزی ترجمہ چھپ گیا ہے اور اُس کی رونمائی لندن میں طے ہونا پائی ہے۔ اُس نے بہت للچا کر پوچھا۔ اُس کو وہاں شرکت کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ خالد نیاز نے کہا وہ ابا حضور سے بات کر کے بتائیں گے۔

پھر پیغام ملا کہ وہ ویزے کے لئے درخواست دے دے۔ وہ اسلام آباد گیا۔ اُس کو ویزہ نہ ملا۔ دل گرفتہ وہاں سے واپس لوٹتے ہوئے اُس نے خود کو تسلی دی کہ ابھی تم بہت چھوٹے ہو جب بڑے ہو جاؤ گے تو پھر لندن بھی دیکھ لینا۔ خود کو تسلی دیتے دیتے وہ الجھ گیا۔ اگر ویزہ نہیں لگ سکتا تھا تو وہ مجھے سیدھے سبھاؤ سے منع کر دیتے۔۔۔ اس کوفت اور تھکن سے تو بچا سکتے تھے۔ کئی روز وہ یونہی خود سے الجھتا رہا۔ ایک روز سلسلے کے ایک بھائی ملنے آئے۔ اُن سے باتوں کرتے ہوئے وہ پھٹ پڑا۔

کسی نے میری خوشی کو کچھ نہ کیا۔ کتاب ترجمہ ہوئی اور جب وہ چھپ گئی تو اُس کو دیکھنے اور اُس کی لانچنگ میں شرکت نسیب نہیں ہو سکی۔ وہاں کے عظیمی بھائیوں نے مناسب انداز میں سفارت خانے کو اطلاع دی ہوتی تو میرا ویزا لگ جاتا۔ میں خود اپنا

ٹکٹ لیتا، وہاں خود اپنی رہائش کا بندوبست کرتا۔ اللہ نے مجھے یہ سعادت دی تھی۔ اس خوشی کو دیکھنے کا موقع دیا لیکن سب آڑے آ گئے۔ اُس کو سب پہ غصہ تھا، سفارت خانے کے لوگوں پہ بھی جنہوں نے اُس کے خلوص اور جذبات کی بجائے اپنی مادی طرزوں میں سوچتے ہوئے اُس کی نیت پہ شبہ کیا اور سب سے بڑھ کر وہ خود سے ناراض تھا کہ اُس نے ایسی خواہش کی ہی کیوں۔ انہوں نے اس کو تسلی دینے کی بہت کوشش کی لیکن دلِ بے قرار کو رونے کا بہانہ چاہئے تھا اور وہ اس بہانے سے پہلو تہی نہیں کر رہا تھا۔

اسی روز رات کو جب وہ سونے جا رہا تھا۔۔۔ فون کی گھنٹی بجی۔ اُس کے بیٹے نے فون سُنا اور کہا۔ ابو آپ کے لئے انگلینڈ سے فون ہے۔ انگلینڈ سے۔۔۔ کون ہو سکتا ہے؟؟۔۔۔ سوچتے ہوئے اُس نے فون لیا۔ دوسری طرف ایک مدھر سی میٹھی آواز کان میں پڑی۔ السلام علیکم! وہ حیرت کے مارے گنگ ہو کر رہ گیا۔ اُس کا مراد اُس کو مبارک باد دے رہا تھا کہ اس کتاب لوح و قلم نے مغرب میں روحانیت کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اُس نے اُن کی آواز سُنی لیکن سمجھا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور اُس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ چھوٹے بچے کی طرح روہانسی آواز میں بولا۔ مجھے ویزا نہیں ملا۔

فرمایا۔ اس میں کوئی مصلحت ہو گی۔

اس نے اُن کی بات پہ غور کرنے کی بجائے کہا۔ جی ہاں اللہ کے یہاں مصلحتیں بھی تو بہت ہوتی ہیں۔ انہوں نے اُس کو ڈھارس دینے کو فرمایا۔ آپ کی کاوش کا حضور علیہ الصلوٰۃ ولسلام نے پسند فرمایا ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ رحمتہ اللہ علیہ نے اس کو پسند کیا۔ وہ اُن کی بات سُن کہاں رہا تھا وہ تو اپنے مراد کی آواز سُن کر اس قدر بے خود ہو چکا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ جذبات سے رُندھی آواز میں وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ انہوں نے مجھ سے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ آپ کو بتایا ہے۔ مجھے تو آپ اپنی پسندگی اور قبولیت کی اطلاع فرمائیں۔ آپ کو کیسا لگا؟

اس پہ انہوں نے اُس کو دعا دی۔اللہ آپ کو روحانی علوم عطا فرمائے۔پھر کہا۔فون کر کے خالد نیاز کو بھی مبارک باد دے دیں۔اُن کی کوششوں سے ہی یہ کتاب وقت پہ چھپ سکی ہے۔پھر یہ بھی بتایا کہ لندن میں انگریزی بولنے والوں کے لئے مراقبہ ہال قائم کر دیا ہے۔

اُن کا فون بند ہونے تک اُس کے اندر کی زہر ناکی ختم ہو چکی تھی۔وہ راضی بہ رضا ہونے کی کیفیت کو اپنے اندر ابھرتے محسوس کر رہا تھا۔اُس نے خالد نیاز کو ابا حضور کی طرف سے مبارک باد کا بتایا۔وہ کرید کرید کر پوچھ رہے تھے انہوں نے اور کیا کہا اور کیا بتایا۔میرے بارے میں اور کچھ کہا۔آپ پوری بات نہیں بتا رہے۔وہ ہنس پڑا اُسے اپنی بے چینی، بے تابی اور تلملاہٹ گزارے ابھی چند لمحے ہی تو ہوئے تھے۔وہ اُس کے مرشد کا کرم تھا کہ انہوں نے اُس کو اپنی ممتا کی ردالپیٹ کر اُسے تھپک دیا تھا اور وہ دوبارہ ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔اُس نے خالد نیاز کو دو چار بار اپنی کیفیات سُنا کر بتایا کہ وہ اتنا بھی نہیں رونے دیتے ہ بندہ رو رو کر ہی ہلاک ہو جائے۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ ابا لندن سے واپس آ گئے ہیں تو کراچی جا پہنچا۔انہوں نے اُسے گلے لگایا۔اُس کا ماتھا چوما۔جب بیٹھ گئے تو فرمایا۔بھئی آپ وہاں نہ آ سکے۔اس کا مجھے افسوس ہے۔وہاں سب نے آپ کی کمی محسوس کی۔

اُس نے کوئی ایسی ویسی بات کہنے کی بجائے انہی کی کہی بات کی آڑ لیتے ہوئے کہا۔کوئی بات نہیں اس میں کوئی مصلحت ہو گی۔

فرمایا۔ہاں شاید ابھی حضور قلندر بابا اولیاءؒ آپ کو سامنے نہیں لانا چاہتے۔

اس سے رہا نہیں گیا اور اُس نے پھٹ سے کہہ دیا۔ جی ہاں کیونکہ ابھی میں بہت چھوٹا ہوں نا۔

اُس کا مراد اُس کے احساس کمتری اور کم مائیگی کو قبول کرنے پہ آمادہ نہیں تھا۔ یک دم تیزی سے کہا۔ اجی چھوٹا وٹا کچھ نہیں ہوتا۔ تلسی داس کہہ گئے ہیں۔ مور کے پنکھ پتھے چتھائے ہوتے ہیں۔

مرید نے دریافت کیا۔ یہ پتھے چتھائے کیا ہوتے ہیں؟

فرمایا مور کے پروں پر اُن کے اُگنے کے بعد ٹھپا نہیں لگایا جاتا بلکہ اُن کے رنگ اور ڈیزائن مور کے خون میں لہروں کی شکل میں شروع سے ہی گردش کرتے ہیں۔ پر کی ایک ہڈی سی اگتی ہے۔۔۔ جب خون گردش کرتا ہوا اُس میں داخل ہوتا ہے تو رنگوں کی لہروں کا تانا بانا پروں پر اپنے مخصوص پیٹرن میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔

ایک ساتھ اتنی بہت سی صاف ہوئیں تو کھل اُٹھا۔ اُسے یوں لگا بارش کی پھوار نے خشک ہوتے پودے کو سیراب کر کے اُس کی مرجھاہٹ کو نکھار میں تبدیل کر دیا ہو۔ کسی قسم کا ملال یا کدورت دل میں رہے تو وہ جونک کی طرح اندر ہی اندر بندے کی خوشیوں کا خون چوستے رہتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں مرشدِ کامل مرید کے نفس کی مہار تھام لیتا ہے اور اُسے زیست کی ان کٹھنائیوں بھری راہ سے ایک ماہر ساربان کی طرح یوں بچاتے ہوئے گزار دیتا ہے کہ اُسے اُس وقت یہ خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ کیسی عمیق کھائیوں میں گرنے کو تھا۔ بہت بعد میں جب شعور ترقی کر کے اس قابل ہوتا کہ وہ محسوس کر سکے کہ اُس پہ کتنا کرم ہوا تھا تو روح سرشار ہو جاتی ہے۔

مرید اپنے مراد سے اُن کے دورہ انگلینڈ اور کتاب کے حوالے سے اُن کو مبارک باد دی تو وہاں کی گئی تقریر کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے تقریر اردو میں کی اور انگریز حاضرین کے لئے اُس کا ترجمہ انگریزی میں ساتھ ساتھ کیا گیا۔ فرمایا۔ مترجم کو اتنی اردو آنی چاہیئے جتنی مقرر کو آتی ہے اور پھر اُس کو اتنی ہی انگلش آنی چاہیئے جتنی سامعین کو آتی ہے اور پھر اُسے موضوع اور مضمون کے مفہوم کی اتنی ہی آگاہی ہو جتنی مقرر کو ہے یعنی مترجم میں تین صلاحیتیں ہوں تو وہ ایک اچھا مترجم کہلائے گا۔

پھر بتایا کہ وہاں ایک صاحب نے اُن سے انٹرویو لیا۔ مترجم کے ذریعے آواگوان کے بارے میں بہت دیر بات ہوئی۔ لیکن وہ مطمئن نہ ہو سکے تھے۔ فرمایا۔ دیکھیں نا میں نے کہا۔ چار جمع چار آٹھ ہوتے ہیں۔ اب اس کا ترجمہ بھی ایک ہی جملے میں ہونا چاہیئے۔ یہ تو نہیں کہ آپ ترجمہ کچھ یوں کریں کہ دو جمع دو۔۔۔ چار ہوئے۔۔۔ چار میں دو دفعہ دو جمع کریں تو آٹھ ہوں گے۔ یہ تو بات ہی بدل گئی۔ مترجم کو بات کی تشریح تو کرنا نہیں۔ اُس کو تو صرف ترجمہ کرنا چاہیئے۔

مکھیوں کی بہتات دیکھ کر فرمایا۔ ذمہ دار اداروں سے بات کرو تو جواب ملتا ہے، کیا کریں جی۔۔۔ سیزن ہے۔

فرمایا۔ لو اب مکھیوں اور مچھروں کا بھی سیزن ہوتا ہے۔

پھر ارشاد ہوا۔ ہم بھی کیا اذیت پسند ہیں۔ بھئی یہ اذیت پسندی ہی تو ہے کہ اتنی گرمی میں گھر بار چھوڑے یہاں آبیٹھے ہیں۔ گرمی ستا رہی ہے۔۔ مکھیاں پریشان کر رہی ہیں۔۔۔ مچھر رات بھر سونے نہیں دیتے۔۔ پھر بھی یہاں پڑے ہیں۔

پھر تبسم ریز لہجے میں فرمایا۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی جنت میں ستر ستر حوریں کیسے سنبھالے گا۔ یہاں ستر مکھیاں لپٹ جائیں تو آدمی بلبلا اُٹھتا ہے۔ شاید مسلمان اسی لئے مکھیوں کو سہنے کی پریکٹس کرتے ہیں کہ وہاں دشواری نہ ہو۔

طنز میں مزاح کی ایسی لطافت۔۔۔اور مزاح میں طنز کی ایسی کاٹ۔۔۔وہ عش عش کر اُٹھا۔

دریافت کیا۔ حضور جنت میں کون کون سے پرندے اور جانور ہوں گے۔

فرمایا۔ بھئی پرندے تو ہوں گے جانوروں کی بابت سعیدہ باجی سے دریافت کریں وہ دیکھ چکی ہیں۔ بعد میں باجی سعیدہ نے دریافت کرنے پر بتایا کہ مور اور دیگر خوبصورت پرندے تو میں نے وہاں دیکھے ہیں البتہ کوئی جانور نہیں دیکھا۔

باہر کسی گاڑی والے نے ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز سے ناگواری سی محسوس کی اور فرمایا۔ اچانک دھماکے، پٹاخے یا تیز ہارن کی آواز سے بندہ اچھل پڑتا ہے۔ ایسی آواز تو سینکڑوں نہیں ہزاروں کیلوریز یک دم ہی کھا جاتی ہے۔ ایٹمی دھماکے کی حرارت سے اتنے لوگ نہیں مرتے جتنے اُس کی آواز اور تابکاری کی لہروں سے۔ فرمایا: ہر کام میں توانائی خرچ ہوتی ہے۔ دیکھنے، سننے، بات کرنے میں بھی، دریافت کیا دیکھنے سننے میں تو توانائی کیسے صرف ہوی ہے۔ فرمایا: جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں اور دماغ کو معانی پہنا دے تو وہ چیز دیکھنے میں ایک کیلوری انرجی خرچ ہو گئی۔ اسی طرح جب آپ کوئی آواز سنتے ہیں اور ذہن اُس کو معانی پہناتا ہے تو ایک کیلوری انرجی خرچ ہوتی ہے۔ اسی لئے ایسی جگہوں پہ رہنے والے زیادہ تھکتے ہیں جہاں چیزیں بے ترتیب ہوں، بہت سی ہوں اور شور ہو۔ اسی لئے فقیر شور سے دور جنگلوں میں نکل جاتے ہیں اور کم از کم اشیا ہمراہ رکھتے ہیں۔

مرید نے سوچا قرآن حکیم کے اس فرمان کہ وہ ایک آواز سے بجھ کر رہ گئے۔۔ کی اصل بھی تو یہی ہے کہ وہ آواز اتنی تیز اور بلند آہنگ ہو گی کہ انسان کی ساری انرجی یک لخت ہی ختم ہو جائے گی۔ صورِ اسرافیل بھی تو ایک آواز ہی ہو گی۔ اس کو خیال آیا۔۔۔ کن بھی تو ایک آوا ہی ہے لیکن وہ عطائے زندگی کا سبب۔۔۔ اور یہ شور اور صور خاتم حیات و موجودات۔۔۔ یہ ہونا نہ ہونا۔۔ سب

اک آواز ہی کا تو کھیل ہے۔۔اک آواز سُن کر بندہ عدم سے وجود میں آتا ہے اور دوسری آواز سے موجود معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہ بقاو فنااتنے قریب ہیں تو پھر مابین کیا ہے؟

مراد گویا ہوا۔ بھئی یہاں کی زندگی تو اصل زندگی کی تیاری ہے۔ جو مرنے کے بعد شروع ہو گی۔ یہاں جو انرجی ملی ہے وہ محدود ہے۔ آپ کتنا زندہ رہ لیں گے۔ ستر سال، اسی سال یا سو سال۔ اگر وہاں کوئی مصروفیت نہ مل سکی تو زندگی جو لا متنا ہی ہے۔ اُس کو گزارنا تو عذاب ہی ہو جائے گا۔

پوچھا کہ وہاں مصروفیت ملنے سے کیا مراد؟

فرمایا: بھئی کوئی بھی کام جو دوسروں کے لئے کیا جا سکے۔

مرید نے جانا کہ وہ تکوینی ڈیوٹی ملنے کی بات فرمار ہے ہیں اُس نے چاہا کہ وہ منتخب ہونے کا طریقہ پوچھے۔ اُس کے ذہن سے گزرا کہ یہ صلاحیت و طلب کی بنا پہ تو ہوتا نہیں۔ وہ ڈھیلے سے لہجے میں بولا۔ یہ تو عطا کی بات ہوئی نا۔

فرمایا: جی ہاں۔ بھلے چپراسی کی پوسٹ ہی کیوں نہ ملے۔۔۔ لے لینی چاہئے۔

بات کا رُخ دوبارہ دورہ انگلینڈ کی طرف ہوا تو علی اصغر کی بابت پیار سے کہا وہ بھی کیا مسخرے ہیں۔ پوچھا وہ کیسے؟

فرمایا۔ انگلینڈ میں کافی دیر گھومتے پھرتے رہے میں نے اُن سے ایک دو مرتبہ چائے کا کہا مگر وہ جی بہتر کہہ کر گول کر گئے تو میں نے کہا بھئی پانی ہی پلوا دو۔۔۔ تو کہنے لگے وہ دراصل یہاں کے ہوٹلوں کے برتنوں کا کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں کیونکہ یہاں لوگ

اُن میں اُلٹی سیدھی چیزیں استعمال رتے ہیں اور ہمیں یہ گوارا نہیں کہ آپ ان کے برتن برتیں۔ احتیاط کے چکر میں وہ مجھے پیاسا رکھنے پر ہی تلے ہوئے تھے۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ صبح سویرے ہی لوگ انا شروع ہو گئے۔ مراقبے سے فارغ ہو کر جب وہ ناشتہ کر چکے تو وہ زیرِ تعمیر مسجد کی طرف جانے لگا۔ گیٹ پر جو بھائی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ اُن سے کافی دفعہ مل چکا تھا۔ انہوں نے اُس سے اپنی جگہ کھڑے ہونے کو کہا کہ انہیں کسی کام سے جانا ہے وہ ایک دو گھنٹے م،یں لوٹ آئیں گے۔۔ وہ اُن کی جگہ گیٹ کیپنگ کرنے لگا۔ نماز کے لئے جاتے ہوئے۔۔۔ اُس کے پاس سے گزرتے۔۔۔ اُس کا مراد اُسے وہاں کھے دیکھ کر مسکرایا اور فرمایا۔ تو آج آپ ڈیوٹی کر رہے ہیں۔

گزشتہ روز چپراسی کی ڈیوٹی ملنے والی بات اُس کے ذہن میں لہرا کر رہ گئی۔

مراقبہ ہال میں کچھ وقت گزار کر جب سرشاری کا کیف دینے لگا تو مراد نے اُس کی توجہ اس جانب مبذول کرنے کہا۔ یہاں وسوسے نہیں آتے؟ آپ 4-K کے سٹاپ تک چلے جائیں اور کسی چائے خانے بیٹھ کر آدھ گھنٹہ گزاریں پھر دیکھیں۔

مرید نے سوچا انہوں نے ہوٹل کیوں نہیں کہا۔ چائے خانہ ہی کیوں فرمایا۔ کہیں اس بات کو چائے خانوں سے اُس کی اُس انسیت سے تو کوئی نسبت نہیں جب وہ چائے خانوں میں بیٹھ کر درجنوں پیالایں چائے پیتا اور بیسیوں سگریٹوں کا دھواں اُڑاتے ادبی و شعری گفتگو میں مگن رہ کر گزارا کرتا تھا۔

مرادنے اُسے اپنی نظر کی گہرائی کی بابت مطلع کرنے کو بتایا کہ حضور قلندر باباولیاءؒ بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ میری ۱۹۴۸ء کی ایک تصویر دیکھ کر فرمایا خواجہ صاحب اس میں تو سُرخ بالوں والی بسی ہوئی ہے۔ بتا کر فرمایا۔ سُن کر میرے تو پسینے آ گئے۔ بھئی حضور کی نظر بہت ہی گہری تھی۔

مرید نے اپنے چھوٹتے پسینے کو پونچھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا آپ کی نظر کون سی کم گہری ہے۔ مراد نے بات جاری رکھتے ہوئے بتایا۔

ہماری بیعت کی شرائط میں یہ بات شامل تھی کہ کسی کے اندر جھانکیں گے نہیں۔ اسلحہ نہیں رکھیں گے۔ اپنے نام پر زمین نہیں لیں گے۔ سودی پیسوں سے کاروبار نہیں کریں گے، کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اولاد کو نوکری نہیں کروائیں گے۔

لیکن آپ نے تو ہم پہ تو ایسی ویسی کوئی شرط عائد نہیں کی۔ مرید نے دریافت کیا۔

جی ہاں! یہ شرائط صرف میرے لئے ہیں۔ آپ کے لئے سلسلے کے قوائد وضوابط ہیں نا۔ وہی آپ کی بیعت کی شرائط ہیں۔

بھئی ہمیں دیگر سلاسل میں بھی بیعت کیا گیا تھا۔ شکر ہے کہ ابھی تک ان شرائط پہ پورا اترا ہوں۔

بعد میں مرید کو خیال آیا کہ انہوں نے بات کسی کے اندر نہ جھانکنے کے حوالے سے خود پہ عائد کڑی شرط اور اُس پہ کامیابی سے کاربند رہنے کے حوالے سے فرمائی تھی لیکن وہ اُسے اپنی محدود طرزوں میں اسلحہ اور سودی پیسوں کے لین دین سے احتراز کی حد تک ہی سمجھا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر اُسے اپنی چھتنا اور شفقت کا احساس دلایا تھا۔

وہ اُسے ڈانٹ کے یہ بھی تو کہہ سکتے تھے: میں بتا کیا رہا ہوں اور آپ سُن کیا رہے ہیں۔۔۔اور اگر یہ نہیں تو اتنا تو کہہ ہی سکتے تھے: کیا آپ کسی کے اندر جھانکنا آتا ہے جو آپ پہ کوئی شرط عائد کی جائے؟ جب جھانکنا آجائے گا تو پھر کوئی شرط بھی عائد کر دی جائے گی۔

اُس نے سوچا جو بات نہیں کہی جاتی بعض اوقات اُس کی اہمیت اور وزن کہی ہوئی بات سے بھی بڑھا ہوتا لیکن اُسے تولے کون؟ جو لوگ کہی ہوئی بات ہی کو سُن رہے ہوں اُن سے ان کہی کے سننے کی توقع رکھنا۔۔۔ہوا میں مچھلی پکڑنے کے لئے کانٹا لگانے ہی کے برابر ہے۔

فرمایا: میری تجویز ہے کہ سلسلے کے حوالے سے آئندہ پچاس سال کی پلاننگ کر دی جائے۔اُس میں دس دس سال کے پانچ دور ہوں اور ہر دور پانچ پانچ سال کے دو حصوں پہ مشتمل ہو۔ایک وقت میں صرف ایک حصے کے پلان کو نافذ کیا جائے۔جب وہ پورا ہو جائے تو دوسرے حصے کو لے کر اُسے نافذ کیا جائے۔جب تک ایک حصہ پوری طرح نافذ نہ ہو جائے اُس وقت تک دوسرے حصے کو محفوظ رہنے دیا جائے۔

اگلے روز مراقبہ ہال کی اصل حدود دکھاتے ہوئے فرمایا یہ جگہ چھوٹی پڑ گئی ہے۔اب مسجد کی تعمیر جلد مکمل ہو جانی چاہئے۔ وہاں سے مسجد کی طرف چلے۔وہاں وہ سلطان بابا اور خالد تارڑ سے بات کر رہے تھے کہ اس اثنا میں اُس نے ایک ستون پہ ہاتھ رکھ کر جانے کیا سوچتے ہوئے زور لگایا تو متبسم ہو کر پوچھا۔ہلتا تو نہیں نا؟

شام کو وہ مسجد کی طرف گیا۔ لینٹر پڑ چکا تھا۔ تارڑ صاحب اس کی ترائی کر رہے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پھر باتوں باتوں میں اُن کے ہاتھ سے پائپ لے کر چھت کو پانی دینے لگا۔ تارڑ صاحب بنا کچھ کہے نیچے اترے۔۔۔ دیکھا کہ حضور تشریف لائے ہیں۔ اُسے دیکھ کر فرمایا۔ چلیں مسجد کی تعمیر میں آپ کا بھی ہاتھ لگ گیا۔

رات کھانے کے بعد وہ مراقبہ ہال میں اپنے مراد کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ دس ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اتنے میں رکشے کی آواز آئی۔ دیکھا امی حضور تشریف لائی ہیں۔ وہ کچھ دیر قیام کے بعد واپس گھر جانے لگیں تو آپ نے ناراضگی سے فرمایا۔ آپ اتنی رات گئے رکشے میں آئیں کیوں اور اب واپس جانے کی کیا ضرورت ہے صبح چلی جائیں۔ جب انہیں بضد دیکھا تو رات کی ڈیوٹی پر مامور ایک صاحب سے کہا انہیں گھر چھوڑ کر آئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو فرمایا۔ اس وقت میری اتنی اچھی روحانی کیفیت تھی۔ شیطان کا اور کچھ بس نہیں چلا تو ان کے کان میں پھونک ماردی اور یہ مجھے پریشان کرنے دوڑی چلی آئیں۔

پھر ایک پیر صاحب کی بابت بتایا کہ ایک دن انہوں نے اپنے پٹھان مرید سے کہا کہ سودا سلف اُن کے گھر دے آئے۔ وہ عقیدت سے سامان اُٹھائے اپنے پیر و مرشد کے گھر پہنچا۔ وہاں ایک خاتون نے اُن کا استقبال کیا۔ چیزیں جو وہ لے کر آیا تھا۔ انہیں دیکھ کر بہت شور کیا۔ یہ بھیجا ہے اُس مردودے نے۔ اُس کو کچھ پہچان نہیں کہ کیسی چیز خریدی جاتی ہے۔ اُس بڈھے کو جانے کب عقل آئے گی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ میرے مرشد کی بیوی ہیں اور بہت نک چڑھی۔ اس لئے خاموش ہو رہا لیکن جب وہ واپس اپنے مرشد کے پاس آیا تو تلملایا ہوا۔۔ لال بھبوکا ہو کر کہنے لگا۔ وہاں آپ کے گھر پہ ایک عورت نے آپ کے لئے گندی گندی بات بولا۔ اگر اجازت ہو تو میں اُس کا گلا دبادوں۔ پیر صاحب ہنس دیئے اور کہا۔ ارے بھائی تو کیوں میری ولائت کے پیچھے پڑتا ہے۔ آج مجھے یہ مقام اسی نیک بخت کو برداشت کرنے کے سبب ہی تو ملا ہے۔

فرمایا: مرشد کو مافوق الفطرت انسان نہیں سمجھنا چاہیئے۔ وہ بھی ایک عام انسان ہی ہوتا ہے جو کھاتا ہے، پیتا ہے، رفع حاجت کرتا ہے، اونگھتا اور سوتا ہے۔ یہ سمجھنا کہ وہ ہر وقت دور بین لگائے مریدوں کو دیکھتا رہتا ہے۔۔۔ درست نہیں۔۔ مرشد نہ ہوا کوک شاستر ہو گیا۔

مرید نے عرض کی لیکن آپ نے تو ایک جگہ خود فرمایا ہے کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ آپ پہ نظر رکھتے تھے اور آپ کی نگرانی فرماتے تھے۔

فرمایا: تربیتی پرو گرام کے دوران ضرورت ہو تو خصوصی نگرانی کی جاتی ہے ہمہ وقت والی بات تو نہ ہوئی نہ۔

نصیب یاوری کریں تو

جب آپ آرام کرنے چلے گئے تو وہ کچھ دیر ڈیوٹی والے بھائیوں کے ساتھ بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ ہنسی مذاق بھی ہوا، چائے کا دور بھی چلا، پھر سب سونے چلے گئے۔ اُس نے سونے کی کوشش کی۔ جب دیکھا کہ نیند نہیں آرہی تو چادر لے کر حرا میں جا کر مراقبہ کرنے بیٹھ گیا۔ اتنے میں آہٹ ہوئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ تاروں بھرے آسمان کے پیشِ منظر میں اُس کا مراد کھڑا اُسے دیکھ رہا ہے۔ وہ سمجھا اُس کی موجودگی کا شبہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے آواز دے کر پوچھا۔ کون ہے بھئی؟

مرید نے کھڑے ہو کر عرض کی۔۔۔ حضور میں ہوں۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔ مراقبہ کر رہے تھے؟

مرید نے کہنا چاہا۔ جی ہاں میں مراقبہ کر رہا تھا لیکن کہنے میں بات بدل گئی اور بولا نیند نہیں آرہی تھی سوچا حرا میں بیٹھ جاؤں۔

اُس کے مراد نے سہارا لینے کو ہاتھ بڑھایا تو اُس نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ انہوں نے حرا کے فرش پر اہرامی ڈھانچے کے نیچے بیٹھتے ہوئے اُسے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا۔ آپ بھی بیٹھ جائیں۔ وہ اُن کو اپنے اتنے قریب پا کر اپنے حواس میں کہاں تھا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اُس وقت وہ سانس بھی آہستہ لے رہا تھا کہ اُن کے لئے باعثِ زحمت نہ ہو۔ کافی دیر خاموش بیٹھ کر وہ اُس کی طرف جھکے اور اُس کے بائیں زانو پہ سر رکھ کر دائیں کروٹ لیٹ گئے اور مچھروں سے بچنے کو اپنے منہ پہ چادر ڈال لی۔

اُس وقت وہ صرف یہ چاہ رہا تھا کہ یہ لمحے یہیں تھم جائیں۔ارد گرد کوئی حرکت نہ ہو۔اُس کا مراد اُس کو کبھی اتنی قربت سے نوازے گا، یہ تو اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔بے شک وہ جس کو چاہیں جتنا نوازیں۔۔۔اگلے کی توقع سے بڑھ کر نوازیں۔

شب کے اُس پہر اک مرید ملگجے اندھیرے میں، روشن ستاروں بھرے آسمان تلے بنے ایک اہرامی ڈھانچے میں شمال رُخ بیٹھا اپنے زانو پہ سر رکھ کے لیٹے مراد کی پر سکون نیند پہ حیران بھی تھا اور مچھروں کی بھنبھناہٹ کے سبب متفکر بھی۔کراچی سے باہر مراقبہ ہال کی اُس کھلی فضا میں عموماً ہوا کم ہی تھمتی ہے لیکن اُس وقت اُس نے ہوا کو ساکت پایا۔وہاں صرف دو ہی آوازیں اُس کی سماعت تک راہ پا رہی تھیں۔۔۔گہری نیند میں سوئے مراد کے سانس کی آواز اور مچھروں کی بھنبھناہٹ۔ایک باعثِ راحت اور دوسری باعث کوفت۔

اک خیال نے اُس کی توجہ اس راحت و کوفت سے ہٹا دی۔جانے وہ عالم خواب میں کیا کر رہے ہوں گے؟ کہاں ہوں گے؟ ایک بے خودی اور بے کیفی کے عالم میں۔۔۔اُس نے سوچا۔۔۔جب کوئی بندہ کیف و خودی سے گزر جاتا ہے تو مخلوق خدا اُسکے قرب میں کیف و انبساط کیوں محسوس کرتی ہے؟ کاش یہ ہوا چلے کہ مچھر بھاگ جائیں۔لیکن وہاں اتنا نیچے ہوا کیسے آئے گی وہ تو اوپر سے ہی گزر جائے گی۔۔۔کچھ ایسی ہی باتیں اُس کے ذہن سے گزر رہی تھیں۔

پانچ دس منٹ بعد اُن کے سر میں جنبش ہوئی۔انہوں نے چادر ہٹاتے ہوئے سر کو اُس کے زانو سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔آرام مل رہا تھا لیکن مچھر بہت ہیں۔چلنا چاہیئے۔پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔اُس کے کندھے کا سہارا لے کر سیڑھی بہ سیڑھی چڑھ کر حرا سے باہر نکل کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔وہ بت بنا انہیں جاتے دیکھتا رہا۔گلاب کے پھولوں کے پاس سے ہو کر۔۔۔لان

اور برآمدے کے درمیان بنی روش پہ اپنے مخصوص انداز میں جھومتے ہوئے وہ اپنے کمرے تک پہنچے۔۔چق اُٹھائی اور کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔

اُس کو اپنی اس سعادت پہ فخر کی بجائے عاجزی اور انکساری کا احساس ہو رہا تھا۔انہوں نے اُس کو اتنا نوازا تھا کہ نوازشات اُس کو اپنی سکت سے بڑھ کر محسوس ہونے لگی تھیں۔اُس کو لگ رہا تھا کہ اُس کی پوری زندگی کی محرومیوں کو انہوں نے اُن دس پندرہ منٹوں میں دھواں بنا کر اڑا دیا ہو۔اُس نے خود کو اتنا شانت اور پر سکون کبھی نہیں پایا تھا۔ہر شے بے حقیقت اور ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی۔ایک پرانے ہندی گیت کے بول رہ رہ کر اُس کے اندر ابھرنا شروع ہو گئے۔۔

تو پیار کا ساگر ہے۔۔۔تری اک بوند کے پیاسے ہم۔۔۔۔

اُس نے خود سے کہا انہوں نے تُمھیں اپنے پیار کے سمندر میں غوطہ دے دیا اور کہنے والا اک بوند کو ترستا رہا۔

وہ چار پانچ روز وہاں مزید رہا۔اس دوران وہ جب بھی اپنے ہمراہ مراد کو دیکھتا اُس کے اندر یہی اشلوک ابھرنا شروع ہو جاتا۔ اور اس ابھرتی لہر کے دوش پہ تیرتا اُن کے قریب جانے کی بجائے اُن کے ارد گرد پروانہ وار منڈلاتا رہا۔

اُس کا باخبر مراد شام کے جھٹپٹے میں اپنے مریدوں کے حلقے میں بیٹھا بتا رہا تھا۔۔تاج الدین بابا اولیا ناگپوریؒ ایک بار ایک کھنڈر میں گئے۔کسی نے کہا۔وہاں سانپ ہے ادھر مت جائیں۔تو انہوں نے فرمایا۔اجی بہت انتظار کیا اُس نے۔اب اُس سے ملنے کا وقت آیا۔تین سو سال کم نہ ہوتے۔فرمایا روحانی بندے کے انتظار میں لوگوں کو صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔تب جا کر کہیں موقع ملتا ہے۔۔۔وہ بھی اگر نصیب یاوری کریں تو۔

فرمایا کسی روحانی بندے سے ایک بار گلے مل لو تو بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے، آدمی ساری زندگی اُس کیف کو نہیں بھول سکتا۔ لوگ اس کے اندر دور کرتے کرنٹ کو سہہ بھی نہیں سکتے اور اُس کی طرف کھنچتے بھی ہیں۔۔۔ پروانوں کی طرح۔

تاج الدین باباولیاؒ کے حوالے سے ایک واقعہ یہ بھی سُنایا، ایک صاحب جن کا نام عبدالصمد تھا۔۔اس چکر میں تھے کہ کسی طرح انہیں کشف مل جائے۔ تاج الدین باباولیا بیڑی پیتے تھے ایک روز بیڑی پیتے ہوئے انہوں نے بیڑی عبدالصمد کی طرف بڑھا دی اور کہا۔ یہ لو کشف۔ اُس نے اُس بیڑی کا ایک ہی کش لیا تھا کہ اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس کو کہا۔ جا اپنے علاقے میں جا۔۔۔ اور لوگوں کی خدمت کر۔

ایک دن ایک عورت جس کا بچہ گم ہو گیا تھا۔۔۔روتی پیٹتی عبدالصمد کے پاس گئی۔ انہوں نے اُس کی مدد کرنے کی بجائے اس کو ناپاکی کی حالت میں دیکھ کر ڈانٹ دیا کہ اُس حالت میں اُس کو اُن کے سامنے آنے کی ہمت کیسے ہوئی اور اُس کو وہاں سے ہٹا دیا۔ کسی نے اُس کی ممتا کی ماری کو کہہ دیا کہ ناگپور میں تاج الدین باباولیاؒ کے پاس جاؤ وہ تمہارا گمشدہ بچہ تمہیں ملوا دیں گے۔ وہ ناگپور پہنچی تو باباصاحبؒ کے سامنے جانے کی ہمت نہ کر سکی اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر رونے لگی۔

باباصاحب نے آدمی بھیج کر اُسے بلایا اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ عبدالصمد ایک لوٹا پانی ہوتا۔ ہم تاج الدین سمندر ہیں۔ اور پھر اُس طرف منہ کر کے جس سمت عبدالصمد رہتے تھے کہا۔ عبدالصمد You are suspended اور اُس کے ساتھ ہی عبدالصمد صاحب کی ساری کیفیت سلب ہو گئی۔

فرمایا تاج الدین باباولیاؒ کی والدہ انگریز تھیں۔ انگریزی اُن کی مادری زبان تھی۔ جن کو یہ بات معلوم نہیں وہ انہیں انگریزی بولتے سُن کر سمجھتے تھے کہ یہ بھی کرامت ہے۔

فرمایا۔ بھئی تاج الدین اولیاؒ جیسا ذہن قدرت تین ہزار سال میں ایک دفعہ ہی بناتی ہے۔ ویسے فضل الرحمان گنج مراد آبادی ،عبدالرحیم ،شرڈی کے سائیں بابا اور وارث شاہ ۔۔۔۔یہ سب عظیم روحانی لوگ ایک ہی دور میں آئے تھے۔

پھر ایک صاحب کی بابت اپنے والد حاجی انیس احمد انصاری صاحب سے سُنی ہوئی ایک بات یہ فرمائی کہ وہ صاحب

ایک پیسے کی مولیاں خرید لاتے۔ اور کھا کر پڑ رہتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ پیٹ میں پڑی رہتی ہیں۔ جب مرے تو ان کے سرہانے تلے دو ہزار آٹھ سو روپے دھرے تھے۔ آج کے حساب سے آپ اٹھائیس لاکھ سمجھیں۔

اپنے والد صاحب کی بابت یہ بات فرمائی۔ جب میں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے تعلق جوڑا تو یوں لگتا تھا کہ سب ہی مخالف ہو گئے ہیں۔ میرے والد نماز روزے کی پابندی میں بہت سختی فرماتے تھے۔ اس لئے سبھی سمجھتے تھے کہ وہ بہت زیادہ مخالفت کریں گے لیکن انہوں نے اگر حمایت نہیں کی تو مخالفت بھی نہیں فرمائی بلکہ انہیں پاس بٹھا کر ایک دو ذاتی واقعات سُنا کر سمجھایا کہ اب جب تم نے اس راہ پہ چلنے کا قصد کر ہی لیا ہے تو پھر دو باتوں کو پلے باندھ لو۔ اس راہ میں جو بھی مشکلات آئیں اُن سے گھبرانا نہیں اور دل ہارنا نہیں ورنہ ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ اور دوسری بات یہ فرمائی کہ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے مرشد کی بات کبھی نہیں ٹالنا۔ جو وہ کہیں جس قدر بھی ممکن ہو اُس پہ بلا چوں وچراں عمل کرنا۔

فرمایا میرے والد صاحب حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے بیعت تھے۔ جب اُن کے مرشد کریم نے شفقت فرمائی تو اُن کی کیفیات بننے لگیں لیکن ساتھ میں یہ ہوا کہ اُن کو غصہ بہت آنے لگا۔ وہ بات بے بات اکھڑ جاتے۔ باہر بس نہ چلتا تو گھر میں تند و درشت لہجے میں بات کرتے۔ ہماری والدہ نے ابا کی شکایت کر دی۔ دادا جان انہیں دو ایک بار تنبیہ فرمائی۔ اُنہوں نے کوشش کی لیکن قابو کھو دیتے نتیجتاً والدہ نے شکایت جاری رکھی تو ایک روز پاس بٹھا کر اُن کی پشت پہ ہاتھ پھیرا اور سب کیفیت سلب کر لی۔

والد صاحب کی اس بات سے سچی بات ہے مجھے حوصلہ ہوا اور تقویت ملی۔ماں باپ کو چاہیئے کہ وہ اپنی منوائیں لیکن جب دیکھیں کہ بچہ اب اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ اپنے بُرے بھلے کو سمجھنے لگا ہے تو پھر اُس کو سپورٹ کریں تو اس طرز عمل سے اولاد باغی نہیں ہوتی۔ماں باپ سمجھدار ہوں تو وہ اپنے بچوں کو خود اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے میں مدد دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے فیصلے خود کر سکیں۔

فرمایا۔ہماری والدہ بہت سمجھدار تھیں۔اگر کبھی کوئی بچہ دستر خوان پہ بیٹھ کر کہتا کہ میں یہ نہیں کھاؤں گا۔۔میں تو فلاں چیز ہی کھاؤں گا۔تو وہ اُس کو دستر خوان سے اُٹھا دیتی تھیں۔ تمہیں بھوک نہیں جب بھوک لگے گی تو کھا لینا۔ہاں بعد میں دوسرے تیسرے وقت اُس کی فرمائش پوری کرنے کو وہی چیز بنا دیتی تھیں۔ضد نہیں مانتی تھیں۔کرنے ہی نہیں دیتی تھیں۔۔۔ماننا تو دور کی بات ہے۔

مرید نے سوچا یہ ضد اور فرمائش میں جو باریک سا فرق ہے اگر کسی ماں کو سمجھ آجائے تو اُس کی اولاد کا حق ہے کہ وہ کامیاب و بامراد ہو۔یہاں سب کا حال اتنا بُرا ہو چکا ہے کہ وہ اللہ سے بھی اپنی ہی منوانے کی ضد کرتے،عمر کو ضائع اور زندگی کو روگی بنانے پہ تو آمادہ و تیار ہیں لیکن اس فرق کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرنا گوارا نہیں کرتے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ فرمائش کرنا بچے اور بندے کا حق ہے لیکن ضد کرنے والے بچے اور بندے اپنا خون جلانے،اپنا منہ نوچنے،اپنے کپڑے پھاڑنے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں؟فرمائش کر کے فرمائش پورا کرنے والے پہ چھوڑ دینے کا رویہ اپنائے رکھنے والے ضد کرنے والوں کی نسبت کس قدر اچھے لگتے ہیں اگر مائیں اپنے بچوں کو صرف یہی ایک بات سمجھا لیں تو مزید اور انقلاب کی ضرورت ہی نہ رہے۔

مرادِ کی چھوٹی سے چھوٹی بات میں کتنی گہرائی اور وزن ہوتا ہے۔۔۔وہ اُس کے ذہن کے اُن سب تاریک گوشوں کو منور کر دیتے۔۔۔جن کی بابت مرید خود بھی نہیں جانتا تھا بلکہ اکثر تو اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہاں کوئی ایسا خالی اور تاریک گوشہ بھی

موجود ہے جہاں روشنی ہونا ضروری ہے ورنہ تو وہ ٹھوکریں ہی کھاتا رہ جاتا۔ مرید حیرتوں سے دوچار ہوتا۔۔۔مزید۔۔۔اور کچھ اور۔۔۔ہل من مزید۔۔کا تاثر نشر کرتا اور وہ اُس کی پیاس دور کرنے۔۔۔اُس کی تشنگی مٹانے کو۔۔۔نڈھال ہونے کی حد تک کوشاں رہتے اور جب تھکن غالب آجاتی تو۔۔۔اچھا بھئی اب آپ آرام کریں۔۔۔کہہ کر اُٹھ جاتے۔

وہ سوچتا کہ انہوں نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ میں نے جو کچھ کہا اُس کو یاد رکھیں۔ میں نے آپ کی خاطر اتنا سر دُکھایا اب آپ یہ سب ضائع مت کر دینا۔۔۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتا کہ آخر وہ اپنے مریدوں سے کیا چاہتے ہیں؟ اُن کو اتنی محنت کر کے کیا ملا؟ اگر اب تک کچھ نہی تو پھر وہ کیا لالچ ہے جس کی خاطر وہ اُن پہ اتنی محنت کرتے ہیں؟ اب اتنی باتیں انہوں نے فرمائیں دانش و حکمت کے کتنے موتی اُن پہ وارے۔۔۔۔ مگر کیا وہ اُن کی توقع کے موافق کسی قابل ہو گئے؟ کبھی وہ ایسی باتوں کا جواب یہ دیتا کہ اللہ نے اُن کی ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے۔۔۔اور اس کا اجر انہیں اللہ خود ہی دے گا۔

کبھی وہ سوچتا اللہ کا یہ کیسا عجیب نظام ہے کہ پہلے ایک بندہ روحانی علوم سیکھنے کی خاطر اتنے جتن کرے، اتنے کشٹ اُٹھائے، اتنی جان مارے کہ پتہ پانی ہو جائے اور اگر نصیب یاوری کریں اور وہ کچھ سیکھ لے تو پھر اُن علوم کو برتنے اور استعمال کرنے میں ہلکان ہو۔ مریضوں کو دیکھنے، اُن کے دکھوں، تکلیفوں اور کرچی کرچی وجود کو سمیٹنے میں حضور جس قدر محنت کرتے ہیں ابھی اُس محنت کی تھکن اترتی نہیں کہ اپنے مریدوں کی ترقی اور بھلائی کی خاطر اُن کی تربیت سے نڈھال ہوتے ہیں اور اک وہ ہیں کہ وہی لٹھ کے لٹھ۔۔۔ کندہ ناتراش۔۔۔ کبھی اُسے اُن کی ہمت اور سکت سے حوصلہ اور توانائی ملتی اور کبھی وہ دکھی اور افسردہ ہو جاتا۔

اپنے شہر واپس آکر اُسے لگا کہ وہ اپنے وجود کا کچھ حصہ وہیں کراچی بھول آیا ہے۔ کبھی اُسے لگے کہ وہ ابھی تک پرواز میں ہے اور ابھی تک اُس کے پہیوں نے زمین کو نہیں چھوا۔ ایک عجیب سی بے خیالی، خالی پن اور لاتعلقی کی کیفیت رہی۔ رفتہ رفتہ ہفتہ دس

دن میں وہ اپنی دنیا میں واپس آیا۔ اپنے ارد گرد کے لوگوں، کاروباری تعلق داروں اور واقف لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا۔ سب نے ایک مشترکہ طور پہ یہ محسوس کی کہ وہ کچھ ٹھہراؤ اور سکون کا انداز اپنائے ہوئے ہے۔ اُس کی بیوی نے کئی بار برملا یہ تک کہا۔ ابا حضور نے آپ کو خوب سیدھا کر کے بھیجا ہے۔ وہ مُسکرا دیتا اور اتنا ہی کہتا۔ ہاں مجھے اور کوئی کہاں سیدھا کر سکتا تھا۔ چلیں آپ خوش تو ہوئیں اور وہ کہتی لو میں بھلا کب خوش نہیں ہوتی۔

دن، ہفتے اور مہینوں کو جیسے پر لگ گئے۔ وہ صبح اُٹھ کر کبھی نماز پڑھتا اور کبھی سستی ہو جاتی، جب نماز پڑھتا تو مراقبہ بھی کرتا۔ جب نماز میں سستی ہوتی تو کبھی مراقبہ کر لیتا اور کبھی اس میں بھی ناغہ کرتا۔ کالم نگاری بھی جاری تھی۔ ایک کالم لکھ لیتا تو اگلے چھ روز نئے کالم کے لئے موضوع اور مضمون کے انتخاب اور اُس کی ذہنی تیاری میں لگا رہتا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے مراد کی کسی نہ کسی تحریر کو پڑھتا۔ روحانی ڈائجسٹ آتا تو اُس کو لگتا کہ ایک فیڈر ہاتھ آ گیا ہے۔ یوں تو وہ اُسے پورا پڑھتا مگر اپنے مراد کی تحریروں کو پڑھنے میں اُس کو زیادہ مزہ آتا۔

مراقبہ ہال جاتا۔ وہاں نیاز بھائی کوئی نہ کوئی بات ایسی بتاتے جس سے اُس کو اپنے مراد کے حوالے سے کچھ نہ کچھ معلوم ہوتا رہتا۔ نیاز صاحب باباجی کو اکثر فون کرتے تھے اس لئے ہر جمعے اُن کے پاس باباجی کے حوالے سے سنانے کو کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ نیاز صاحب کئی پیروں فقیروں سے ملنے کے بعد باباجی ملے تھے اور کافی گہرے تقابلی موازنے کے بعد انہوں نے اُن کا دامن تھاما تھا اس لئے وہ اپنے مرشد کے کچھ بے طرح کا عشق کرتے تھے۔ اُن کو اپنے مرشد کریم کی تصاویر اتارنے کا بہت شوق تھا اور اُن کے پاس اُن کی تصویروں کا اچھا بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ اُسے ابھی اپنی اتاری ہوئی تصاویر دکھاتے اور وہ اپنے مراد کے ان گنت روپ دیکھ کر سوچتا کہ اللہ نے اُن کے لئے لوگوں کے دلوں میں محبت کے کیسے کیسے رنگ پیدا کئے ہیں۔

ایک روز اُس نے خالد نیاز سے فون پہ بات کی۔اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جیسے خالد نیاز کو اچانک کچھ یاد آیا اور اُس نے اُس سے دریافت کیا۔آپ کو ابا کا خط ملا؟اُس نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے بتایا کہ ابا نے اُن سے کہا تھا کہ وہ اُسے خط لکھیں گے۔اب وہ انتظار کرنے لگا۔میرا مراد مجھے خط لکھے گا۔اُنہوں نے یونہی کہہ دیا ہوگا۔پھر اس بات کو بھی کئی روز گزر گئے۔ایک روز اُس نے خالد نیاز کو پھر فون کیا اور کہا کہ بھئی ابھی تک تو مجھے ابا حضور کا کوئی خط نہیں ملا۔انہوں نے آپ سے کیا فرمایا تھا؟انہوں نے کچھ

انہوں نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کرتے ہوئے اتنا ہی کہا کہ جب انہوں نے کہا ہے تو وہ ضرور لکھیں گے۔پھر کہا کہ اُن سے غلطی ہو گئی کہ انہوں نے اس بات کا تذکرہ اُس سے کر دیا۔پھر وہ منت کرنے لگے کہ وہ کسی کو بات نہ بتائے۔

اُن کی باتیں سُن کر اُس کو کچھ عجیب سا لگا۔اُس نے یہ بات ذہن سے جھٹک دی۔کئی روز بعد ایک دن ڈاک میں اُسے اپنے مرادِ کا وہ خط ملا جس کا انتظار وہ گزشتہ ایک ڈیڑھ ماہ سے کر رہا تھا۔اُس نے خط کھولا۔لکھا تھا۔

عزیز گرامی قدر۔۔۔۔۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

الحمدللہ میں بمع متعلقین خیریت سے ہوں۔آپ،بچوں اور شاہین کے لئے دعا گو ہو۔

آج کل میری سوچ یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ میں نے کھانا کھایا۔میں دفتر گیا۔یہ میرے بچے ہیں۔یہ میری بیوی ہے۔میں سوتا ہوں۔میں بیدار ہوتا ہوں۔سوال یہ ہے کہ میرے اندر روح نہیں ہے۔میں کھانا نہیں کھا سکتا۔میرے اندر روح نہیں ہے تو

بیوی کا کوئی تصور نہیں ابھرتا۔ مردہ جسم کو کبھی دفتر جاتے نہیں دیکھا پھر مطلب یہی ہوا نا کہ میں نہیں بلکہ روح کھاتی ہے۔ روح پیتی ہے۔ روح سوتی اور جاگتی ہے۔ روح دفتر جاتی ہے اور وہاں سے گھر آتی ہے۔ اگر روح نہیں کھاتی۔ روح پیاس نہیں بجھاتی تو کوئی مردہ جسم لاش کیوں کچھ نہیں کھاتی، پیتی اور حرکت کرتی ہے؟

روحانی فرزند!

آپ مجھے بتائیں کہ میں پریشان کیوں ہوتا ہوں۔ جب میرا وجود فکشن ہے، وہ نہ کھاتا پیتا ہے۔۔۔ نہ اُس کے بچے ہوتے ہیں۔۔ نہ شوہر ہوتا ہے۔۔ نہ بیوی ہوتی ہے۔۔ تو مادی وجود کا واویلا کچھ معنی رکھتا ہے یا یہ صرف دھوکہ اور فریب ہے۔ جب مادی وجود کچھ نہیں کرتا۔۔ سب کچھ روح کرتی ہے تو ہم مادی وجود، مادی وسائل اور مادی تقاضوں کی تکمیل کے پیچھے کیوں جاتے ہیں؟ روح کی ذمہ داری کو اپنے ناتواں کندھوں پر کیوں اُٹھاتے ہیں۔ یہ تو روح کا کام ہے کہ اگر اُسے ہمارے وجود کی ضرورت ہے تو وہ اس وجود کی ضروریات کو پورا کرے۔ ہم اس مخمصے میں خود کو برباد کیوں کریں؟ میری دُعا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے۔ اور میری زندگی آپ سے گلے مل جائے۔ میں خوش ہوں اس لئے کہ میں نے مادی وجود کی بے بسی اور مجبوری کو سمجھ لیا ہے۔ مجھے زندہ رہنے کی خواہش کیوں ہو۔۔۔ جب مادی وجود پر ہر آن ہر لمحہ فنا ہے۔ میں ایک طفیلی سہارے پر کیوں آس لگاؤں؟

تمام عمر سہاروں پہ آس رہتی ہے
تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں

اللہ نگہبان

آپ کا روحانی باپ
خواجہ شمس الدین عظیمی

یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ

اُس نے خط پڑھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس خط میں تحریر کردہ باتوں کا وہ کیا مطلب لے۔ اُس نے خط کو بار بار پڑھا۔ کئی بار پڑھنے اور کئی دن سوچنے کے بعد اُس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ انہوں نے بلاکم و کاست، بغیر کسی فلسفیانہ گھماؤ پھراؤ اور بلا کسی تمہید کے اُس کو سیدھے سبھاؤ ایک بات تو یہ سمجھائی ہے کہ روح کی ذمہ داریاں روح ہی کو پوری کرنے دو۔۔۔اپنی ٹانگ بیچ میں مت اڑاؤ اور دوسرے یہ کہ جن سہاروں پہ تم تکیہ کئے ہو وہ فریب دینے کے پابند ہیں لہذا باز آجاؤ۔۔۔ورنہ تو تمہارا اللہ ہی نگہبان ہو۔

اس سے پیشتر اُس نے محبت اور شفقت کو الفاظ کے پردے میں ملبوس ہی دیکھا تھا اور وہ ممتا کو بھی شعور کی انہی محدود طرزوں میں ناپنے تولنے میں لگا رہتا تھا۔ اس خط میں انہوں نے اُس کے لئے اپنے دل میں موجود پیار کے اظہار اور دعوے کی بجائے ایک باپ کی سی آن اور شفقت پدری کے ساتھ اُس کو بالکل سامنے کی بات نہایت سلیس اور سادہ انداز میں تعلیم فرمادی تھی۔ روح کے تقاضوں اور اُس کی ضروریات کے حوالے سے ایک گہرا ادراک اُس کے اندر بیدار کرنے اور مادی جسم کی طرف سے توجہ ہٹانے کو اُس کو محبت، شفقت اور ممتا کا یہ ڈھنگ دکھا کر انہوں نے یہ بات بھی تعلیم فرمائی کہ فریب خوردگی جس کا وہ بہت ہی شاکی تھا۔۔۔ اُس سے بچنا خود اُسی کا فرئضہ ہے۔

اُس نے اس خط کو اتنی بار پڑھا کہ متن کے الفاظ اُسے حفظ ہو گئے۔ پھر وہ اس طرف متوجہ ہوا کہ جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ اُس پہ کیسے عمل پیرا ہو اور کون سے عملی اقدام کرنا واجب ہے۔ اُن کی کہی ہوئی بات کے حسن و خوبی کو محض سراہنے سے تو وہ مقصد کسی طور حاصل نہیں ہو سکتا تھا جس مقصد کے لئے انہوں نے وہ مرقومہ اُن کو ارسال فرمایا تھا۔

جب وہ اس طرف متوجہ ہوا تو اُسے محسوس ہوا کہ بات اتنی بھی آسان نہیں۔ اگر یہ بات اتنی ہی آسان اور سہل ہوتی تو انہیں اس کو کہنے کا اتنا اہتمام ہی کیوں کرنا پڑتا کہ اُس کو خط لکھ کر اس طرف متوجہ کرتے۔ رفتہ رفتہ اُس کو یہ اندازہ بھی ہونے لگا کہ انہوں نے اُسے ایک ایسی راہ پر ڈالنے کا اہتمام کیا ہے جو ادب و فلسفے کی نظریاتی مباحث کے میدانوں کی بجائے عمل کی وادیوں کی طرف جاتی ہے۔ اُس کے اندر کا تن آسان اور سہل پسند انسان بدکا اور بھڑک اُٹھا۔ اُس بھڑکے ہوئے راہوار کو بہلا پھسلا کر وہ اتنا آمادہ کر سکا کہ چلو اتنا کرتے ہیں کہ جب بھی وہ کھانا کھائے تو یہ سوچے کہ یہ تن کھا رہا ہے کوئی اور اُس کے مادی تن کو کھانا کھلا رہا ہے۔

یہ طے کر کے جب وہ کھانے پہ بیٹھا اور یہ بات دھیان میں آئی اور اس نے سوچا تو محسوس کیا کہ کھانا کھانے کا عمل سب غیر اختیاری طور پر ہو رہا ہے۔ بات کرتے کرتے وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ یہ بات جو اُس نے کہی وہ اُس نے کہی یا کسی نے اُس سے کہلوائی۔ تو اُس کو اندازہ ہوا کہ اُس کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اب سے دو منٹ بعد وہ کیا کہے گا۔ لیکن وہ پھر بھی بات جاری رکھتا۔

رفتہ رفتہ یہ بات اُس کا مشاہدہ بننے لگی کہ وہ جو کچھ کہتا، سنتا، دیکھتا اور کرتا ہے۔۔ اُس کے کرنے میں اُس کا ہاتھ حصہ لے رہا ہوتا ہے اور وہ عمل اُس سے خود بخود سرزد ہو رہا ہوتا ہے۔ اب اُس کو مزہ آنے لگا۔ وہ کہیں جاتا اور راستے میں اچانک کوئی جاننے والا مل جاتا تو وہ پہلے کی طرح اُس کو اتفاق ماننے کی بجائے یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگتا کہ وقت کی چلتی گراریوں میں وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کیسے آ گئے۔ اگر وہ وہاں سے ایک منٹ پہلے یا بعد میں گزر رہا ہوتا تو اُس کو وہ صاحب کیسے ملتے۔ اور اگر وہ وہاں سے ایک ساتھ گزرتے لیکن عین اُس لمحے وہ اُن کی طرف یا وہ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو وہ انہیں کیوں کر ملتا؟

ایک روز وہ اسی قسم کے خیالات کے بہاؤ کا لطف لیتا دفتر جا رہا تھا کہ راستے میں اُس کو ایک صاحب مل گئے۔ وہ اُس کے کراچی جانے سے قبل اُس کے دفتر ہی میں کام کرتے تھے۔ جب حالات نے کروٹ لی تھی وہ ہجرت کر کے کراچی چلا گیا تھا پھر وہاں

سے واپس آیا تو اس تمام مدت بعد آج اچانک اُن کو اپنے سامنے دیکھ کر اُسے اچھا لگا۔اُس نے اپنے واپس آنے کی خبر اور اطلاع دینے کے بعد اُن کا حال احوال پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی فیکٹری میں بطور جنرل منیجر کام کر رہے ہیں اور خوب ٹھاٹ میں ہیں۔ ایک دوسرے کا پتہ لے کر وہ اپنی اپنی راہ ہو لئے۔

ایک روز وہ اپنے کام کے سلسلے اُس کے دفتر آئے اور انہیں اپنی فیکٹری کا کام کرنے پہ آمادہ کیا۔ وہ اس کو منجانب اللہ انتظام سمجھ کر کام ملنے پہ خوش ہوتا۔۔۔اُس کا کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اُس روز اگر عین اُس لمحے جب وہ صاحب چلتی گاڑی میں اُس کے پاس سے گزر رہے تھے، اُن کی نگاہ اُس پہ نہ پڑتی تو وہ اُن کو علم ہی نہ ہوتا کہ وہ کراچی سے واپس آچکا ہے اور اُس کو ایسا کلائنٹ کیسے ملتا؟

پھر کام کے سلسلے میں اُسے کراچی جانا پڑا۔ کراچی پہنچ کر کام نپٹانے میں مصروف رہ کر شام ڈھلے وہ مراقبہ ہال پہنچ گیا۔ مراقبہ ہال پہنچ کر اُسے کچھ یوں محسوس ہوا گویا وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اپنے کمرے کے باہر چارپائی پہ بیٹھے مراد نے مرید کو دیکھا۔اُسے اپنی چھتنار شفقت اور مسکراہٹ سے نوازتے۔۔۔سرو قامت کھڑے ہو کر اُسے اپنی آغوش میں لیا تو وہ بے خود ہو گیا۔

سب کا باری باری پوچھا۔اُس کے گھر کی، کاروبار کی، بچوں کی، بیوی کی خیر و عافیت پوچھ کر نیاز صاحب قریشی صاحب اور دیگر سلسلے کے افراد کا پوچھا۔اُس نے انہیں بتایا کہ ماشاءاللہ وہ سب خیریت سے ہیں۔اس طرح وہ کام کے سلسلے میں وہاں آیا ہے۔ اللہ نے کراچی آنے کا بہانہ بنا دیا سو وہ آگیا ہے۔

تبسم ریز لہجے میں کہا۔جی ہاں۔جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے۔

کراچی مراقبہ ہال میں مسجد کی تعمیر کے مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ساتھ میں مراقبہ ہال کی عمارت کی تعمیر بھی آغاز ہو چکی تھی۔اُس نے مبارک باد دی کہ تعمیر کا کام ماشاءاللہ تیزی سے ہو رہا ہے۔

’’آپ نے دیکھا۔۔۔اللہ نے کرم کیا۔۔۔کام ہو رہا ہے۔۔۔قرضہ لینا پڑ گیا ہے۔‘‘ مراد نے جواب دیا تو مرید نے اپنے تجربات کی روشنی میں ازراہ تبصرہ کہا۔واقعی قرضہ کا بوجھ ہوتا ہے۔

ایک جھٹکے سے فرمایا۔اجی بوجھ ہوگا اللہ پر۔۔۔مجھ پر کاہے کا بوجھ؟اُس کا کام ہے۔۔۔وہ جانے قرضہ جانے۔۔۔بھئی ہمیں کام دیا ہے۔۔۔وسائل دیئے۔۔۔جب کام مکمل ہو جائے گا تو لوگ کہیں گے عظیمی صاحب نے کیا۔کرتا اللہ ہے نام بندے کا کر دیتا ہے۔بھئی وسائل اللہ ہی دیتا ہے۔حضور ﷺ تک نے ادھار لیا۔اپنے لئے نہیں لیا۔اللہ کے کسی کام کے لئے لیا۔اللہ نے اُسے چکا دیا۔اب جیسے بھی وہ چاہے۔

پھر نرمی اور پیار بھرے لہجے میں قرض کے حوالے سے بتایا کہ اللہ نہ اپنے ذمے کبھی کوئی قرض چھوڑتا ہے نہ فقیر کے۔۔۔نہ اچھا نہ بُرا۔۔۔ایک پورا نظام قائم ہے اس کے لئے۔اللہ کے بندے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔اللہ اُن کے ذمے بھی کبھی کوئی قرض نہیں چھوڑتا۔نہ اچھا نہ بُرا۔لیکن ہم اللہ پہ چھوڑیں تو سہی۔ہم اللہ پہ چھوڑتے نہیں تو وہ بھی کہہ دیتا ہے۔چلو ٹھیک ہے جیسے تم راضی۔

یہ بات بھی فرمائی کہ قرض لینا نہیں چاہیئے۔۔۔اس سے یقین متاثر ہوتا ہے لیکن یہ گھر کا سودا سلف وقتی طور پر ادھار آنا قرض کی تعریف میں نہیں آتا۔

پھر لاتعلق ہونے اور جذبات میں نہ آنے کی بابت بات کرتے ہوئے فرمایا۔ حضور قلندر باباولیاءؒ نے بتایا تھا کہ نوع انسانی میں دوافراد کی عمریں سب سے زیادہ ہوئیں۔ حضرت لوطؑ اور افراسیاب اور دونوں کا طریقہ یہ تھا کہ اگر خبر ملتی کہ بیٹا ہوا ہے تو کہتے یہ کون سی بڑی بات ہے، سب ہی مخلوق کی اولاد ہوتی ہے اور اگر کہا جاتا کہ بیٹا مر گیا تو کہتے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ سب ہی کی اولاد مرتی ہے۔ یعنی وہ ہر حال میں جذباتی طور پر لاتعلق اور Indifferent رہتے تھے۔

بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ انسان میں بارہ کھرب خلیات ہوتے ہیں۔ جن میں سے دو کھرب صرف ذہن سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی میں ان میں سے ڈیڑھ دو سو سیلز ہی چارج ہوتے ہیں جینئس (نابغہ) لوگوں میں یہ تعداد سوا دو سو تک ہو جاتی ہے۔ روحانی لوگوں میں یہ تعداد کروڑوں اربوں میں ہوتی ہے۔ صرف ایک ہستی حضور ﷺ کی ذات اقدس کے تمام سیل چارج تھے۔

مرید نے پوچھا کہ زیادہ سے زیادہ سیلوں کو چارج کرنے کی ترکیب کیا ہے؟

فرمایا۔ ان کاموں سے بچیں جن سے سیل ڈسچارج ہوتے ہیں۔ غصہ اور شک روشنیوں کو ضائع کر دیتے ہیں جن سے سیل چارج ہوتے ہیں۔ کبر اور خواہش اقتدار غصہ کی بنیادی وجوہ ہیں۔ برسوں کی ریاضت ایک بار غصہ کرنے سے ضائع ہو جاتی ہے۔ جب غصہ آتا ہے تو آدمی کے اندر سے اللہ نکل جاتا شیطان داخل ہو جاتا ہے۔

زیادہ سونے سے بھی یہ سیل چارج نہیں ہوتے۔اسی لئے کہتے ہیں ڈھائی پونے تین گھنٹے سے زیادہ سونے والا مومن ہو ہی نہیں سکتا۔

مرید نے دریافت کیا اور یہ یاحیُّ یاقیّوم کے ورد سے بھی اس ضمن میں کوئی فائدہ ہوتا ہے۔

فرمایا۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ شمس الدین احمد انصاری، خواجہ شمس الدین عظیمی بن جاتا ہے۔یہ ورد اتنی کثرت سے کرتا تھا کہ مجھے اس کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ بیت الخلا جاتا تو منہ پہ کپڑا باندھتا کہ وہاں پڑھنے سے باز رہوں۔

اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا تو اُٹھ کر نماز کے لئے چل دیئے۔مرید ہمراہ ہی تھا۔۔۔مرید نے دریافت کیا۔۔۔یہ حوریں ہوتی کیسی ہیں؟

فرمایا۔ان کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں اُن کی پتلی کے گرد سرخ ڈورا ہوتا ہے۔اُن میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ عام آدمی تو اُن کی نگاہوں کی تاب ہی نہیں لا سکتا۔جب میں نے پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے بھی زور کا جھٹکا لگا تھا اور میں لڑکھڑا گیا تھا۔

نماز کے بعد مراقبہ۔مراقبے سے فارغ ہو کر سیر کرنے نکل کھڑے ہوئے۔مرید ساتھ چلتے ہوئے انجانے میں قدرے آگے نکل گیا تو فرمایا۔کبھی مرشد سے آگے نہیں چلتے، مرشد کے بائیں طرف نہیں چلتے۔ہمیشہ پیچھے چلتے ہیں یا دائیں طرف رہ کر چلتے ہیں۔مرید نے اس کی حکمت جاننا چاہی تو فرمایا۔بائیں طرف دل ہوتا ہے اور فرشتوں کی آمدورفت رہتی ہے۔

اس کے بعد کافی دیر خاموش رہے۔مرید کو بالآخر ایک سوال سوجھ ہی گیا۔اُس نے دریافت کیا کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ صابن سے ہاتھ کیوں نہیں دھوتے تھے۔

فرمایا۔اُن کی طبیعت میں نفاست بہت تھی۔چربی ہوتی ہے اور وہ بھی جانے کس کس جانور کی۔وہ گرم پانی سے ہاتھ دھو کر تولیے سے پونچھ لیتے تھے۔ہاتھ بھی کافی دیر تک دھوتے تھے۔انہیں اچھا لگتا تھا۔۔۔ہاتھوں کو دھونا۔

ٹہلتے ہوئے پلٹے تو وہ تیزی سے اُن کے دائیں طرف ہونے کو ہٹا تو لڑکھڑا گیا۔پھر سنبھل کر ان کے ہمراہ ہو لیا۔پھر موقع غنیمت جانتے ہوئے عرض کی۔حضور یہ میرا کام بھی بس ایک ہوائی سا کام ہے؟یعنی کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں۔فرمایا۔بھئی کون سا کام ہے جو ہوائی نہیں؟کہنے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ یک دم ہر کام کی بے ثباتی ذہن میں اترتی چلی گئی۔اُس کو کئی لوگوں کا خیال آیا جنہیں فوجی تربیت گاہ کا کول سے کامیاب ہونے کے باوجود نوکری سے نکلنا پڑا تھا،کئی لوگ یاد آئے جن کا چلتا کاروبار،چلتی ہوئی فیکٹریاں بیٹھ گئی تھیں۔،وکیلوں کا خیال آیا جو ہفتوں مہینوں سائلوں کا انتظار کرتے وقت گزارتے تھے۔

واپس مراقبہ ہال پہنچنے تک پھر مزید کوئی بات نہ ہوئی۔گیٹ کے قریب لگے سرس کے سُرخ پھولوں سے لدے درخت کو دیکھ کر فرمایا۔یہ استقبال کر رہے ہیں۔یہ گلدستے لئے انتظار میں رہتے ہیں۔ذہن میں خیال گزرا کہ یہ سب حضور ہی کے منتظر رہتے ہوں گے ورنہ مریضوں،ضرورتمندوں اور حاجت مندوں کا کوئی استقبال کہاں کرتا ہے۔اُن کا انتظار تو بالکل نہیں ہوتا۔

مراقبہ ہال میں داخل ہو کر اپنے کمرے کے سامنے اہتمام سے بچھی چارپائی پر جا کر تشریف فرما ہو گئے۔چند اصحاب جو اسی تاڑ میں تھے رفتہ رفتہ پہلے قریب ہوئے پھر پاس آ کر بیٹھ گئے۔پھر ایک صاحب مزید قریب ہوئے اور آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگے۔حضور اُن کی طرف جھک کر اپنا کان اُن کے قریب کر کے اُن کی بات سنتے رہے۔پھر اُن کو اُسی طرح جھکے جھکے کچھ سمجھایا اور پھر سر کو ۔۔۔بس ٹھیک۔۔۔کے انداز میں ہلایا اور سیدھے ہو بیٹھے۔وہ پیچھے ہٹے تو دوسرے صاحب آگے بڑھے اور پہلے والے صاحب کی طرح اپنا بپتا سُنا کر اُن سے ہدایت لے کر پیچھے ہٹ گئے۔پھر ایک خاتون نے کھسک کر جگہ بنائی اور اپنے مسائل کی بات کی۔حضور نے

کوئی مشورہ دیا۔انہوں نے دھیان سے سُننے کی بجائے اپنی کسی دشواری کا تذکرہ کیا۔آپ نے دوبارہ اُن کو کچھ کہا۔اُنہوں نے پھر اپنی بات کہی۔اس پہ قدرے بلند آواز سے کہا۔۔آپ فکر نہ کریں اللہ خیر کرے گا۔جیسا میں نے کہا ویسے کریں۔سب ٹھیک ہو جائے گا اور سیدھے ہو کر پیچھے ہو تکیے سے ٹیک لگالی۔اُس خاتون نے اپنی بات جاری رکھی۔فرمایا۔بس اب آپ جائیں اور ویسا ہی کریں جیسا میں نے کہا ہے۔

اتنے میں ایک صاحب نے جگہ بنائی اور کھسک کر قریب ہو گئے۔حضور دوبارہ سیدھے ہوئے اُن کی طرف جھکے، بات سُنی، مشورہ دیا، انہوں نے کچھ اور پوچھا سمجھایا۔وہ پیچھے ہٹے تو ایک اور۔وہ پیچھے ہوئے تو ایک اور۔۔۔اور یوں سلسلہ دراز ہوتے ہوئے عشاء کی اذان ہونے تک جاری رہا۔

اذان ختم ہوئی تو فرمایا۔تاج الدین بابا اولیا ناگپوری جب کسی کو نماز پڑھتے دیکھتے تو کہتے جھوٹا ہے۔یعنی بن دیکھے گواہی دے رہا ہے۔وہ اکثر اذان اور نماز کی بابت فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔بھئی جب تم نے اللہ کو نہیں دیکھا۔اُس نے رسول ﷺ کو نہیں دیکھا تو گواہی کیسے دے رہے ہو؟

مرید نے سوچا کہ اب اللہ کو دیکھنا تو تبھی ممکن ہے جب بندے کی باطنی نگاہ کام کرتی ہو اور جب بندے کو دکھتا ہو گا تبھی تو وہ دیکھے گا۔پھر دوسرا خیال اُس کو یہ آیا کہ حضور نے یہ جو کہا تھا کہ اُن کی بیعت کی شرائط میں یہ بات شامل تھی کہ کسی کے اندر نہیں جھانکنا۔اس نے سوچا۔اب دکھتا ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ نہ دیکھے۔سوچ گہری ہوئی اور الفاظ کا جامہ پہن کر سوال بن گئی کہ جب ایک چیز نظر آرہی ہو تو اُسے کیسے نہ دیکھیں۔

اپنے داہنی طرف ایک درخت کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا۔ آپ یہ درخت دیکھ رہے ہیں؟ مرید نے اُس درخت کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ تو اُسے دکھاتے ہوئے۔۔۔ اُس درخت کی طرف منہ موڑ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ کیا اب وہ درخت انہیں نظر آرہا ہے؟ مرید نے نفی میں سر ہلایا تو فرمایا۔ اسی طرح آپ بھی مت دیکھیں۔۔۔ نظر ہٹالیں۔۔۔ قصداً مت دیکھیں۔ اگر نظر پڑ جائے تو ہٹالیں۔

کچھ توقف کے بعد فرمایا بھئی کیا دیکھیں گے؟ یہی نا کہ لوگ آپ کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ شوہر کے پاس بیٹھی بیوی۔۔۔ شوہر کو کوس رہی ہے، بچے دل ہی دل میں باپ کو بُرا کہہ رہے ہیں، ملنے جلنے والے بظاہر کچھ کہہ رہے ہیں اور اندر بالکل ہی کچھ اور۔ آدمی یہ سب کب تک دیکھے گا۔ وہ تو پاگل ہو جائے گا۔

مرید کو گھراچر کا لگتے دیکھ کر مرہم لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ بھئی ایک پردہ ہے اللہ کی صفتِ ستار العیوبی کا سو پڑا ہی رہے تو بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ میں ذوقی شاہؒ کے ایک جملے کا بہت معترف ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کامل مرشد وہ ہے جو مرید کو ساری کائنات کی سیر کروادے مگر دیکھنے کچھ نہ دے۔ پھر چند ساعت بعد فرمایا۔ دیکھنے صرف اُس وقت دے جب وقت آچکا ہو۔

ظالم اور جاہل

رات کھانے کی گھنٹی بجی تو مرید نے دریافت کیا۔ یہ گھنٹی کی آواز اتنی دور تک کیوں پھیلتی ہے؟ مرید نے اٹکل پچو عرض کیا، کہ گھنٹی کی چوٹ سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ارتعاش کی لہریں چاروں طرف پھیلتی ہیں اور دور تک جاتی ہیں۔

فرمایا۔۔یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ دور تک کیوں جاتی ہیں؟ منہ سے نکلی آواز اتنی دور کیوں نہیں جاتی؟ مرید نے بہت سوچا مگر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے حضور کو دیکھا۔ انہوں نے کوئی جواب دینے کی بجائے۔۔ ہو گا کچھ۔۔ کے انداز میں کندھے اچکا دیئے اور کھانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اب کھانے کے لئے دستر خوان مراقبہ ہال کے جنوب مغربی کونے میں بنے کچن کے ساتھ صفہ کی جگہ ابھرتی عمارت کے پہلو میں بنے کمرے کے قریب اک چبوترہ نما جگہ پر لگنا شروع ہو چکا تھا۔ گیٹ کے پاس کا کمرہ مکمل طور پر استقبالیہ بنا دیا گیا تھا۔ گیٹ کے اندر اُلٹے ہاتھ جوتے اتارنے کی جگہ بن چکی تھی اور وہاں دیوار کے ساتھ جوتے رکھنے کے لئے کبوتروں کے کابک جیسا خانوں والا شیلف رکھ دیا گیا تھا۔ کبوتروں کے کابک کی جگہ ایک کمرہ بن چکا تھا۔ جس پر باہر تالا ہونے کی وجہ سے وہ یہ نہیں دیکھ سکا اُس کمرے کو کس مصرف کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

مراقبہ ہال کے اندر اور باہر لگے درخت کارکنوں کی روز و شب محنت اور مراقبہ ہال کے صحت افزا ماحول کی بدولت کچھ زیادہ ہی جلد بڑے ہو چکے تھے۔ مراقبہ ہال کی سجاوٹ کا حصہ بننے کی انہیں شاید اُس سے کچھ زیادہ ہی جلدی تھی جتنی مراقبہ ہال بنانے والے کو۔

وہاں دالان نما برآمدے کے ساتھ ایک کنواں بن چکا تھا۔ جس سے نکلنے والے پانی کی بابت ٹیسٹ رپورٹ کے مطابق اُس میں معدنی اجزاء کی فراوانی کے سبب اُس کا نام ''آبِ شفا'' تجویز ہوا اور گیٹ کے سامنے سڑک کے پار ایک سبیل بھی اسی نام سے تعمیر کر دی گئی تھی۔

کھانے کے بعد ہلکی پھلکی باتوں کا دور چلا۔ چند ایک لطیفے سُنا کر سب کو ہنسنے کا موقع فراہم کیا۔ لطافت اور بشاشت باہم دگر گھل مل کر لطف وانبساط کی اُن لہروں کو جنم دے رہی تھیں جو آدمی کو جنت کے ماحول کا عادی بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ مرید نے سوچا یہ سب ایک بندے کے طفیل ہے اور ان کا مراد نہیں کہہ رہا تھا۔ بھئی میں تو آپ لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور جہاں خوشی ہو وہاں تھکن اور بیماری کا کیا کام؟ اب آپ سعیدہ کو ہی دیکھ لیں کسی نانی دادی لگتی ہی نہیں۔

پھر بڑے حضرت جی کا ایک واقعہ سنایا کہ اک بار کراچی میں گدھا گاڑی کی ریس دیکھنے گئے۔ وہاں دوڑ شروع ہونے سے پیشتر کسی سے کہا کہ وہ فلاں گاڑی اول آئے گی اور جب وہی گاڑی دوڑ میں آگے نکلنے لگی تو خوشی سے اچھل پڑے۔ تالیاں بجا بجا کر کہتے تھے۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہی گاڑی جیتے گی۔ فرمایا دراصل یہ لوگ بچوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ اُن میں تصنع اور بناوٹ بالکل نہیں ہوتی۔ جب بناوٹ ہوگی تو بچپنا نہیں آسکتا۔

پھر ایک واقعہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا سنایا۔ ایک بار وہ کچھ ساتھیوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ بس دیکھی تو دوڑ پڑے اور خالی نشستیں پکڑ کر ہاتھ ہلا ہلا کر بچوں کی طرح سب کو بلانے لگے کہ جلدی آجائیں۔

مرید نے حضور ہی کا کہا ہوا ایک جملہ یاد کیا کہ روحانیت بچپن کی طرف واپسی کے سفر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ان روحانی لوگوں کو یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ساتھ ہی اُس نے سُنا۔ آپ فرما رہے تھے۔۔۔ لوگ کیا کہتے ہیں۔۔ یعنی ہر وقت

یہی دھڑ کا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ بھئی اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ لوگ آپ کے عامل ہو گئے اور آپ اُن کے معمول۔ لوگوں کی پرواہ ایک حد تک ہی کرنا چاہیئے۔

فرمایا دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ عامل اور معمول۔ ایک آدمی بیس ہزار افراد کا عامل ہوتا ہے۔ جب آپ کسی کو کہتے ہیں۔ السلام علیکم۔ اب اگر اُس نے ردِ عمل کا اظہار کیا اور جواب میں کہہ دیا۔ وعلیکم السلام۔۔۔ تو وہ آپ کا معمول بن گیا۔

پھر بات کا عملی مظاہرہ یوں فرمایا کہ جب آپ نے کہا کہ چلیں آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے اور اُٹھ کھڑے ہوئے تو اُن کے ساتھ سبھی اُٹھ گئے۔ کھڑے ہو کر سب کے ہاتھ غیر ارادی طور پر ناف کے اوپر پہنچ گئے اور ایک ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈیوٹی پر متعین اصحاب میں سے دو ایک فاصلہ دے کر پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ اُس کے ذہن میں جملہ گونجا۔۔۔ باادب، با ملاحظہ، ہوشیار۔۔۔۔ قلندر دوراں۔۔۔ مثل قلندر بابا اولیا۔۔۔ خانوادہ سلسلہ عظیمیہ کی شاہی سواری آ رہی ہے۔۔۔ شاید فرشتے کچھ ایسا ہی پکار رہے ہوں۔۔۔ اُس نے سوچا۔

اگلے روز جب مراقبہ ہال کے معمولات سے فارغ ہو کر حضور دفتر جانے کو گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ مرید نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اُسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ آپ چلیں گے؟ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔ لیکن منہ سے کہا۔۔ زہے نصیب۔۔۔ کیوں نہیں۔ فرمایا۔ آئیں بیٹھیں لیکن پہلے جا کر جوتا پہن لیں۔ وہ کھلکھلاتا ہوا جوتا پہننے دوڑا۔ دروازے سے ٹکراتے ہوا بچا۔۔ ایک جوتا پہنا اور دوسرا پیر میں اٹکا کر باہر کو دوڑا۔ سب اُس کی کیفیت سے محفوظ ہو رہے تھے۔

گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اُس نے حضور کی گود میں رکھا بیگ لے کر پیچھے سیٹ پر رکھنے کا کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو کندھے کی حرکت سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔ جی نہیں۔۔۔ یہیں ٹھیک ہے۔۔۔ بھئی مال عرب۔۔۔ پیش عرب پھر قدرے گردن موڑ کر کہاا۔ ویسے اس میں مال کی بجائے۔۔۔۔ کچھ حسینوں کے خطوط ہی ہیں۔

مرید کو اُن کے انداز نے اتنی جرات دی کہ بے ساختہ اُس نے پوچھا۔۔ اور حضور و تصویر بتائیں؟

ہنستے ہوئے فرمایا۔ وہ ہم نے آستانے میں لگائی تھی لوگوں کو اعتراض ہوا تو اتروا کر اپنے سرہانے لگالی۔

پھر حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے سنائے ہوئے اشعار میں سے اک شعر سنایا۔

ہائے اُس رنگین چہرے کا نظام　　　　بتکدے کی صبح اور میخانے کی شام

فرمایا۔ بھئی ہم ہیں تو حسن پرست ہمیں جو مولوی صاحب قرآن پڑھاتے تھے۔ وہ اس بات پہ ناراض ہوتے تھے کہ میں اتنی جلدی سبق کیوں یاد کر لیتا ہوں۔۔۔ وہ جتنا سبق دیتے۔۔ میں چار پانچ مرتبہ پڑھتا اور وہ مجھے یاد ہو جاتا۔ وہ ایک آدھ رکوع دے دیتے۔۔۔ میں پانچ چھ مرتبہ پڑھتا وہ مجھے یاد ہو جاتا۔ مولوی صاحب یہ دیکھ کر بہت ناراض ہوتے وہ مجھے یوں بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔۔ وہ تھے بھی تو ذرا پکے رنگ کے۔

اسی طرح نوجوانی میں ایک ریڑھی والے نے۔۔۔ جو چھریاں قینچیاں وغیرہ بیچا کرتا تھا۔۔۔ اپنی ریڑھی میرے حوالے کی کہ ذراا سے دیکھنا۔ اتنے میں دو خواتین آئیں۔ قینچیاں دیکھیں۔ اُن کی قیمت دریافت کی۔ میں اُن میں سے ایک کو دیکھنے میں ایسا مگن

ہوا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب وہاں سے گئیں۔ جب ریڑھی والے نے آکر دیکھا تو کئی قینچیاں غائب۔۔ وہ نہ جانے کب انہیں اڑا لے گئیں اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔

حامد صاحب۔۔ جو گاڑی چلا رہے تھے۔۔ سے کہا۔ راستے میں بینک آئے گا وہاں رُکنا ہے۔

بینک کے قریب پہنچ کر گاڑی رُکی۔ آپ اُتر کر بینک کی طرف بڑھے تو وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔۔ اُس کو اُن کے ہمراہ بینک کے اندر جانا چاہیئے یا نہیں؟ اُس نے حامد صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارہ چشم و ابرو سے اُسے حضور کے ہمراہ اندر جانے کو کہا تو وہ اُن کے پیچھے پیچھے بینک میں داخل ہو گیا۔

اُس کے اندر بینکوں کے حوالے سے ایک عجیب سی کیفیت تھی، یہ خوف یا رعب سے کچھ ہٹ کر تھا۔ بینک میں داخل ہوتے ہی وہ کچھ تیکھا سا ہو جاتا تھا۔ احتیاط کے باوجود عملے کے کسی نہ کسی رکن سے تکرار ہو جانا عام بات تھی۔ اُس نے کاغذ یوں کیوں رکھا۔۔ اتنی دیر کاہے کو ہوئی۔۔۔ وہ صاحب وہاں پان کیوں کھا رہے ہیں۔۔۔ وہ کونے میں بیٹھا کلرک فارغ کیوں بیٹھا ہے۔۔۔ کہیں وہ اس کے پیش کردہ چیک میں کوئی غلطی نہ پکڑ لے۔۔۔ وہ بلا وجہ کڑھتا۔۔۔ وہ کچھ بہت ہی خاص توجہ کا طالب ہوتا تھا یا یہ اُس کے اندر کہیں کسی چھپے ہوئے خوف کا شاخسانہ تھا یا اُس کے اندر کا احساسِ کمتری یا کوئی اور پیچیدہ نفسیاتی مسئلہ وہ اس کو حل نہیں کر پا رہا تھا۔

بینک میں داخل ہو کر آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کسی نے اُن کو توجہ نہ دی۔ اکیلا ہوتا تو وہ اسی بات پہ بھڑک چکا ہوتا۔ لیکن پہلے کے کسی بھی وقت میں اور وقت کے اُس لمحے میں یہ فرق تھا کہ پہلے کبھی اُس کا مراد اُس کے ہمراہ نہ تھا۔ آپ نے اِدھر اُدھر بیٹھے گپیں مارتے لوگوں کے بیچ راستہ بناتے ایک میز پر جا کر کسی صاحب کا پوچھا۔ میز پر براجمان صاحب نے اک شانِ استغنا سے اُن

کی طرف دیکھا۔ پان کی پیک سے بھرے منہ کو چلاتے ہوئے اشارے سے کہا۔۔ وہ کہیں گئے ہیں۔ اب اُس کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔ اُس کے مراد سے وہ اس طرح بات کرنے کی جسارت کیسے کر رہا ہے۔ اُس کو بُرا لگنا شروع ہو گیا تھا۔ جس بندے کے ہاتھ چومنا لوگ اپنی سعادت اور فخر سمجھتے ہیں وہ اُن سے ایسا سلوک کرنے کی جسارت کیسے کر سکتا تھا کہ انہیں کوئی عام سا سائل سمجھے۔

اُس نے دیکھا کہ اُس کے مراد نے سہارا لینے کے لینے کے انداز میں میز پہ ہاتھ کی انگلیوں کو یکے بعد دیگرے اُٹھا کر تال دینے کی طرح میز کو بجایا۔ وہ صاحب میز پہ جھکے اور میز کے نیچے سے ڈسٹ بن نکال کر پیک کو وہاں منتقل کیا اور نہایت شستہ اردو میں کہا۔ معاف کیجیئے۔۔۔ منہ میں پان تھا۔۔ اور پھر بتایا کہ جن صاحب کو انہوں نے پوچھا ہے وہ کسی کام سے کہیں جا چکے ہیں۔ حضور نے انہیں بتایا کہ انہیں فلاں فارم درکار ہے۔ اُن صاحب نے پورے کاروباری اخلاق کو بروئے کار لا کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ وہ تو انہی کے پاس ہوتے ہیں۔ آپ کل کسی کو بھیج کر منگوا لیجیئے۔۔۔ کل وہ آپ کو مل جائیں گے۔

وہاں سے پلٹے تو ایک کمرے میں جھانکا پھر دوسرے کمرے میں اور پھر باہر نکل آئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے تو فرمایا۔ سود کا کاروبار کرنے والے اداروں میں جاؤ تو عجیب سی کوفت اور گھٹن ہوتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جہاں سارا نظام ہی سود پہ چل رہا ہو وہاں ان اداروں سے واسطہ تو پڑے گا ہی۔

اُس کے بعد خاموشی رہی۔ اُن کی بات سُنتے ہی اُس کے انداز کا اتنا پرانا مسئلہ یک دم تحلیل ہوتا چلا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ماضی میں اُس نے بینک سے کسی دوست کو قرضہ لے کر دیا تھا اور اُس کے نتیجے میں جو کوفت اور اذیت اُس کو ہوئی تھی، اُس کا یہ تیکھا پن اُس کا ایک غیر فطری ردِ عمل تھا۔ بات فہم سے ہو کر ادراک کا حصہ بن جائے تو شعور میں پڑی اٹکیں صاف ہوتی چلی جاتی ہیں۔ شاید وہ

اُسے اصلاح ہی کی خاطر اپنے ساتھ وہاں لائے تھے تاکہ جس گرہ جو کبھی وہ نادانستگی میں لگا کر کستا چلا جا رہا تھا وہ ڈھیلی کر دی جائے۔ اب وہ گرہ اتنی ڈھیلی ہو گئی تھی کہ اصولاً اُس کو کھل کے وہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا۔

وہاں سے وہ روحانی ڈائجسٹ کے دفتر پہنچ گئے۔ حامد صاحب انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ روحانی ڈائجسٹ کے دفتر میں آپ نے معمولات کے کچھ کام نپٹائے۔ وہ اِدھر اُدھر تانک جھانک کرتا رہا پھر ایک پرانا رسالہ اُٹھا کر اُس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اتنے میں مرشد کریم کے منجھلے صاحبزادے حکیم سلام عارف صاحب تشریف لے آئے۔

وہاں سے فارغ ہو کر اُن کے ہمراہ اُن کے دفتر پہنچے۔ دوپہر ہو چلی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر دفتر پہنچ کر سلام عارف ابا سے اجازت لے کر چلے گئے۔ آپ نے اپنے بیگ سے کاغذات نکالے اور کام میں جت گئے وہ سامنے والی کرسی پہ بیٹھا انہیں خطوط کے جواب لکھتا دیکھتا رہا۔ وہ خط اُٹھاتے تو اُن کی نظر دائیں سے بائیں کی بجائے اوپر سے نیچے تیرتی چلی جاتی۔ وہ خط کو اُلٹتے اسی رفتار سے پڑھتے اور خط کو ٹرے میں رکھ کر قلم پکڑتے اور لکھنا شروع کر دیتے۔ کبھی کبھار لکھتے لکھتے رُکتے اور خط کو اُٹھا کر ایک نظر دوبارہ دیکھتے اور لکھنے کا دوبارہ آغاز ہو جاتا۔

بیچ میں ایک بار کرسی کھسکا کر پیچھے کی۔۔۔۔ اُٹھ کر الماری تک گئے کوئی چیز تلاش کی۔۔۔ دیکھ کر اُسے واپس رکھا اور کرسی پہ بیٹھ کے پھر کام میں منہمک ہو گئے۔ اس دوران انہوں نے لکھتے ہوئے نگاہ اوپر کر کے اُس کو ایک دو بار ہی دیکھا تھا۔ وہ کام میں اتنے کھوئے ہوئے اور اتنے منہمک تھے گویا اس کی موجودگی ناموجودگی کے برابر تھی۔

اتنے میں سلام عارف واپس آئے تو انہیں کہا۔ ارے بھئی ان کی تواضع کو کچھ لائیں اور جیب سے پیسے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ آپ بھی ساتھ ہی چلے جائیں یہ علاقہ آپ نے نہیں دیکھا ہوا ذرا گھوم پھر کر دیکھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اُس کے وہاں بیٹھنے سے اُن کے کام میں ہرج ہو رہا تھا اس لئے انہوں نے اُس کو وہاں سے ہٹانے کا اہتمام کیا ہے۔

جب وہ واپس آئے تو آپ کام سے فارغ ہونے کو تھے۔ جو چیزیں وہ لائے اُن کو دیکھا۔ کچھ پھل لیا اور کہا۔ بس آپ کھائیں۔ اب کچھ دیر لیٹوں گا۔ اُس نے عرض کی کہ اگر آپ نے سونا ہو تو وہ باہر چلا جائے۔ فرمایا۔۔ نہیں میں کچھ دیر لیٹ کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بیٹھیں۔ پھر سلام عارف سے کہا بھئی انہیں چائے پلوائیں۔ دفتر میں ایک طرف کوچ پہ دراز ہو گئے۔ سر اپنے بازو پہ رکھا اور پہلو کے بل لیٹ گئے۔ اُس نے کرسی قدرے موڑ کر اپنا رُخ اُن کی طرف کر لیا اور سر جھکائے چائے پیتا رہا۔ اُس کو احساس تھا کہ وہ اُن کی نگاہوں کے حصار میں ہے۔ وہ اُسے دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اُن کی توجہ کی لہریں وہ اپنے اندر دور کرتے محسوس کر رہا تھا اور اُس کے وجود کا ایک ایک ذرہ اُن لہروں کو اپنے اندر سمیٹ رہا تھا کہ اچانک فرمایا۔

تکوین والے اچھائی یا برائی کے چکر میں نہیں پڑتے۔۔۔ پڑے تو گئے۔

اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ میرے ایسے نبی ہیں جن کے کہنے پر میں بارش برساتا ہوں بلکہ فرمایا کہ میرے ایسے بندے ہیں جن کے کہنے پہ میں بارش کرتا ہوں۔ یہ بندے ہی تکوین والے ہیں۔ دراصل اچھائی یا بُرائی کا تصور نبیوں نے دیا ہے۔ اللہ اگر کسی چیز کو متعین فرماتا ہے تو وہ فطرت میں شامل ہو جاتی ہے۔ جیسے اللہ نے کھانا کھانا مخلوق کے لئے متعین فرمایا تو اُس کو مخلوق کی فطرت میں شامل کر دیا یعنی مخلوق کے لئے کھانا پینا لازم ہو گیا۔

پھر ہنسی کے لہجے میں کہا۔ اللہ نے انسان کو کھانے کے ذریعے اپنا محتاج بنا رکھا ہے تاکہ مخلوق کو احساس رہے کہ کوئی اُس کو رزق فراہم کر رہا ہے۔

مرید نے کہیں بہت دور اٹکا ہوا ایک سوال اپنے ذہن کی سطح پہ طلوع ہوتے دیکھا تو عرض کی حضور یہ شکر کیا ہے؟ شکر کیسے کیا جائے؟

فرمایا۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت کو استعمال کرنا۔۔ شکر ہے۔۔ منہ سے شکر ہے کہنا یا شکر الحمد للہ کہتے رہنا اور عطا کی گئی نعمت۔۔۔ خواہ کو کوئی چیز ہو یا صلاحیت۔۔۔ اُس کو استعمال نہ کرنا۔۔ اُس کو ضائع کرنا۔۔ شکر کرنے کا حق ادا نہ کرنا ہوا۔

پھر خود کلامی کے سے انداز میں فرمایا۔ اللہ کی عظمت اور اُس کے کمالات کی کوئی حد ہی نہیں اور نہ ہی کوئی اُن کی معرفت کا حق ادا کر سکا ہے۔ یہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود۔۔۔ سب انسانی ذہن کی رسائی کے انداز اور اندازے ہیں ورنہ در حقیقت میں تو ان باتوں کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور موقع سے فائدہ اُٹھانے کو پوچھا۔ حضور یہ جو روحانی ڈائجسٹ میں حضور بابا قلندر اولیاؒ کے ہاتھ سے بنے ہوئے نقشے شائع ہوئے ہیں وہ کسی کے کام کیسے آ سکتے ہیں جب تک اُن کی وضاحت کے لئے کہی گئی بات بھی ساتھ نہ ہو۔ اور پھر اپنی بات کی وضاحت کو وہ رسالہ سامنے کرتے ہوئے عرض کی کہ اب جیسے یہ کن فیکون کے نیچے کل اور جزو لکھا ہوا ہے۔ تو اسے دیکھ کر کوئی کیا سمجھے گا جب تک وہ الفاظ جو اُس وقت حضور نے اُس کی وضاحت کو ارشاد فرمائے تھے ساتھ میں نہ ہوں۔

اُسے کی بات سنتے ہوئے حضور پہلو سے کمر کے بل ہوئے اور ایک ٹانگ کو کھڑا کر کے دوسرے پاؤں کو گھٹنے پہ رکھ کر اُسی طرح لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر اُس کے ہاتھ سے رسالہ لیا اور دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی لکھے ہوئے الفاظ پہ رکھتے ہوئے اُسے دکھایا۔ وہ کرسی چھوڑ کر کوچ کے قریب ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور کہنیاں کوچ پہ ٹکا اُن کے سینے کے اوپر پکڑے ہوئے رسالے کی اُس تحریر کو دیکھنے لگا جہاں انہوں نے انگشت شہادت کی بجائے تیسری انگلی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے کان اُن کے منہ سے محض تین چار انچ ہی دور تھے۔ وہ تحریر کی بجائے اُن کی انگلی اور ناخن کی ساخت دیکھ رہا تھا۔

بھئی اللہ میاں کے ذہن میں جو کچھ تھا وہ سب کن سے وابستہ ہے۔۔۔اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ فیکون ہے۔۔۔اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ کن کا جزوی مظاہرہ ہی تو ہے۔ وہ بات کو سماعت کے پیالے میں بھرتا اُن کی انگلی کو کن فیکون پہ جاتے اور فیکون سے کن پہ پھیرتے دیکھتے دیکھتے خیالوں میں جانے کہاں سے کہاں نکلتا چلا جا رہا تھا کہ انہوں وہ آیت دکھاتے ہوئے اس کی شرح فرمائی جس میں اللہ نے اپنی امانت کو پہاڑوں، سماوات اور ارض کو پیش کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔

فرمایا۔ اول تو انسان کو اس امانت کو اُٹھانے کا کہا ہی نہیں گیا تو اُس نے یہ امانت بڑھ کر خود سے کیوں اُٹھائی۔۔۔ یہ جہالت ہوئی۔ دوسرے یہ کہ انسان خود زمین کے شعور یا ارضی شعور کا ایک حصہ تھا۔ جب زمین نے انکار کر دیا تو انسان یعنی زمینی مخلوق میں سے ایک فرد نے اقرار کیوں کیا۔۔۔ یہ ظلم ہوا۔

مرید پہ حیرت کا اک باب وا ہوا اور وہ دروازے سے گزر کر فہم و آگہی کے صحن میں اترتا چلا گیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ دوزانو ہوا اور پکار اُٹھا۔ حیرت ہے یہ آیت میں نے اتنی بار پڑھی لیکن کبھی دھیان میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ اسکا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔

فرمایا۔ ہم قرآن کو پڑھتے ہی کب ہیں؟ ہم تو اس سے محض شادی نکاح کے مسائل ہی کا پتہ چلاتے ہیں۔

پھر کہا کہ ہر مذہب شخصیت پرستی ہی کا آئینہ دار ہے۔لوگ شخصیت سے لگاؤ ہی کے سبب نظریات کو اپناتے اور لے کر اُٹھتے ہیں۔اس کے بعد انہوں نے قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں بتایا کس طرح اُس نے بہااللہ سے ایک ہی ملاقات کے بعد اپنے پیر و مرشد کے لئے اُن کے نام سے علیحدہ مذہب 'بہائی مذہب' کی بنیاد رکھی۔ وہ انتہائی حسین و جمیل اور قابل تھی۔ایسی شعلہ بیان مقررہ،خطیب اور شاعرہ تھی کہ اُس نے ایران کے طول و عرض میں آگ لگادی۔اُس مذہب کے تمام اصول وضوابط اسی کے مرتب کردہ ہیں۔

فرمایا اُس مذہب میں عبادات زیادہ نہیں ہیں۔ وہ دعاؤں پہ ہی زور دیتے ہیں۔ان کی عبادت گاہیں کھلی اور کشادہ ہوتی ہیں۔ عام طور پر سمندر کنارے یا کسی پہاڑی مقام پر بناتے ہیں۔امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے تحت پوری دنیا کے لئے جس مذہب کا انتخاب کیا ہے وہ بہائی مذہب ہی تو ہے۔

اسی طرح چین میں ایک نبی گزرے ہیں لیو شاؤ چی۔ جب انہیں کوئی بندہ نہ ملا تو انہوں نے ہجرت کی ٹھانی اور گدھے پہ سامان لاد چل دیئے۔ شہر سے باہر چونگی والے نے ان سے دریافت کیا تو بتایا کہ یہاں کوئی میری بات ہی نہیں سُنتا لہذا میں ہجرت کر رہاہوں۔اُس چونگی والے نے کہا اگر میں آپ کی بات سنوں تو کیا آپ میرے پاس ٹھہرنا پسند فرمائیں گے۔

فرمایا لیو شاؤ چی کا مذہب اور اُس کی تعلیمات اُسی ایک چونگی والے کی بدولت باقی ہے۔

اسی طرح ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک چونگی والے کے یہاں قیام پذیر ہوئے تو یہودی علما نے انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ حضرت عیسیٰؑ نے پوچھا۔ وہ کیوں؟ تو انہوں نے کہا ہمارے آپ کے اختلافات اپنی جگہ مگر آپ اتنے عالم فاضل ہو کر ایک جاہل کے گھر قیام کریں یہ علم کی توہین ہے اور یہ بات ہمیں گوارا نہیں اور پھر یہ چونگی والا کوئی اچھا آدمی بھی نہیں۔ یہ تو ایک

بہت ہی بُرا آدمی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا جانتے ہو کہ محرر بُرا آدمی ہے اور یہی تو میرا مشن ہے کہ مجھے بُروں کو ٹھیک کرنا ہے اور ان کی اصلاح کرنا ہے۔

اسی طرح جب حضرت عیسیٰ علیہ اسلام پناہ کی تلاش میں تھے وہ ایک گھر میں داخل ہوئے۔ وہ گھر ایک طوائف کا گھر تھا۔ جب اُس نے جانا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو اُس نے اُن کے پاؤں دھوئے۔ اُن کے بالوں میں کنگھی کی اور پھر رات گئے انہیں پچھلے دروازے سے نکال دیا۔ کہتے ہیں اس کا نام بھی مریم تھا۔

اُس کے بعد حضور نے آنکھیں موند لیں۔ وہ پیچھے ہٹ کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ پانچ دس منٹ بعد پوچھا۔ کیا وقت ہوا ہے؟ مرید نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ ساڑھے چار ہو چکے ہیں۔ سُن کر اُٹھ بیٹھے۔ واش روم گئے۔ کہا ذرا گھر تک چلتے ہیں۔

دفتر سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے مسجد غوثیہ تک آئے وہاں ایک ریڑھی والے سے کچھ پھل خریدا۔ پھر ایک رکشے میں بیٹھ کر اُسے کہا کہ گولڈن گیٹ (نارتھ ناظم آباد) چلیں۔ رکشے میں اپنے مراد کے ساتھ بیٹھے مرید نے سوچا کہاں روح کے علوم، تکوین کی باتیں اور کہاں یہ زمین یہ کراچی میں چلتے اک رکشے میں بیٹھے مراد اور مرید۔ اس نے چاہا وہ کچھ بات کرے۔ ذہن کو ٹٹولا تو اُسے شانت اور خالی پایا۔ پھر بھی پوچھا۔ حضور یہ روحانی سفر کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ وہ بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔

شاید اب تشریحات کا وقت ختم ہو چکا تھا اور تشریفات کا دور آغاز ہونے کو تھا۔

ڈی-۳۲ کے سامنے رکشے سے اتر کر دروازے پہ لگی کال بیل کو دبایا۔ ایک بچے نے دروازہ کھولا اور انہیں دیکھ کر نہال ہو گیا۔ ابا کہہ کر اُن کا ہاتھ تھاما اور پہلو سے لگا۔ انہوں نے اُس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا اور پھل اُسے پکڑا دیئے۔ وہ دوڑتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ پکڑ کر دیکھا۔ وہ بند تھا۔ اُسے رُکنے کا کہہ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ کچھ ساعت بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اُسے اندر مدعو کیا۔ آپ یہاں بیٹھیں۔۔۔ کہہ کر اُسے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ وہی ڈرائنگ روم تھا جہاں وہ پہلی بار پراچہ صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ اُس وقت کی کیفیات کا تاثر اُس کے ذہن میں لہرایا۔ نرم و دبیز قالین اور اس کے ہم آہنگ رنگ پردے اُس وقت یہاں نہ تھے۔ اُس وقت مراقبہ ہال بھی تو نہ تھا اور مسجد تو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ ڈائننگ ٹیبل تک جانے میں جہاں وہ عید کے دن بیٹھا تھا۔ اُس وقت وہ جوتوں سمیت اندر آیا تھا اور آج جوتے اتار کر۔ طور پہ جب اللہ نے موسیٰ سے جوتے اتروائے تھے تو اُن کو پکار کر کہہ دیا تھا موسیٰ جوتے اتار کر آگے آؤ۔ یہاں اُس نے قالین کے احترام میں جوتے اتارے تھے۔ اسی لئے تو تمہیں یہاں آگ بھی نظر نہیں آ رہی۔ اُس کے شعور نے سرگوشی کی۔ یہ درست نہیں۔ تم نے اللہ کے ایک بندے کے احترام میں جوتے اتارے ہیں اور جتنی روشنی تمہیں یہاں نصیب ہوئی ہے دعا کرو کہ تم سمیٹ سکو۔ اُس کے ضمیر نے شعور کو آنکھیں دکھائیں۔

بات کی سچائی کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ سائیڈ ریک پہ رکھے رسائل اور شیلف میں رکھی کتب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہاں کوئی ایسی خاص کتاب اُس کو نظر نہ آئی جس میں وہ دلچسپی لیتا اور تو اور وہ خود اُس بندے کی اپنی کوئی کتاب وہاں موجود نہ تھی جس کی کتب کو کتب بین علوم کا اک خزانہ اور کتب فروش سکہ رائج الوقت کہتے تھے اور جو اُن کتب کا خالق تھا۔

خالق اپنی مخلوق سے دیگر مخلوقات کی خدمت تو لیتا ہے لیکن خود لا احتیاج ہونے کے ناطے اُن سے بے نیاز ہے اُسے اُن سے خود اپنی تو کوئی خدمت نہیں کرانی ہوتی اور نہ ہی کبھی کوئی اپنے خالق کی کوئی خدمت کر سکا ہے۔ وہ اُسے سامنے رکھ کر کیا کرے گا۔ خیال کی لہر ہلکے ہلکے اُس کے شعور میں پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے دیوار پہ لٹکے طغرے پہ نگاہ مرکوز ہونے باوجود اُسے دیکھنے کی بجائے من کے پانیوں کی گہری جھیل کی سطح پہ چلتی خیال کی لہروں سے بنتے دائروں کو دیکھنے لگا ہوا تھا۔ ایک دائرے سے توجہ ہٹ کر دوسرے دائرے پہ مرکوز ہوتی چلی گئی۔

جب دنیا کا پورا نظام اوپر والوں کے ہاتھ میں ہے، اہلِ تکوین اتنے با اختیار اور طاقتور بھی ہیں تو پھر دنیا کا آج جو حال ہے کیا یہ بھی اُن کی پالیسی کا کوئی حصہ ہے؟ جب اُن کے پاس اتنا بڑا ڈنڈا ہے کہ اگر کوئی بندہ غلط کام کرتا ہے، کسی کا دل دکھاتا ہے، کسی کی حق تلفی کرتا ہے تو وہ اُس کو اُس کے نتائج بھگتنے پر مجبور کر دیتے ہیں تو پھر یہاں یہ آوے کا آوا ہی کیوں بگڑا ہوا ہے۔ لوگ مشکلات، کشاکش، پریشانی، بے چینی اور بے سکونی کے اندھیروں میں بھٹکنے پر کیوں مجبور ہیں؟ خیال کی اس لہر نے اُسے ایسی اُدھیڑ بُن میں ڈال دیا تھا جس کا کوئی سرا اُس کو ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

وہاں کوئی آہٹ بھی نہیں ہوئی لیکن وہ چونک اُٹھا۔ اُس کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ سامنے دروازے سے اُس کا مراد اندر داخل ہو رہا تھا۔ فکر کی لہروں کے نقوش کو پڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ہمارے یہاں تو یہ کہا جاتا ہے زیادہ سوچنے سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

آئیں چلیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑا تو ہو ہی چکا تھا۔۔۔ یہ سُنتے ہی دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے سے نکل کر برامدے کی روش پہ پہنچ کر حضور نے کہا۔ وہ خود ہی بند کر لیں۔ اُس نے ایک طرف ہو کر انہیں بڑھنے کو راہ دی اور ساتھ ہو لیا۔

گیٹ سے نکل کر سڑک پہ پہنچ کر انہوں نے کہا۔ یہاں سب کچھ بگڑ چکا ہے کہ اسے پوری طرح ختم کرنے کے بعد دنیا کو از سر نو بنانا پڑے گا۔ مگر کیا کیا جائے۔ وہ بھی تو رحمت اللعالمین ہیں۔ سب ان کی اولاد کی طرح ہیں۔ وہ یہ سب ختم کرنے کی اجازت کیوں دے دیں۔ حالانکہ اوپر والے کئی بار یہ تجویز اُن کو دے چکے ہیں لیکن وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔

لیکن حضور یہ سراسر تضاد نہ ہوا؟ یہ سب انتہائی متضاد باتیں لگتی ہیں۔ انہوں نے اُس کی بات سُن کر اُس سے کوئی سوال نہ کیا کہ وہ کس تضاد کی بات کر رہا ہے۔ انہوں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

جی ہاں۔ یہ تو ہے۔۔۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ اور کہے۔ فرمایا۔ شعور میں تضاد ہوتا ہے۔

اُس نے سوچا درست فرمایا۔ شعور میں ہی تو تضاد ہوتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ایک بار اُس کے ایک دوست نے خود اُس کی بابت تبصرہ کرتے ہوئے اسے مجموعہ اضداد بتایا تھا۔ اُس وقت اُس کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزری تھی اور آج تک وہ متعدد بار اس بات پہ الجھ چکا تھا۔ آج اُس کی اتنی دیرینہ پھانس کو اتنی صفائی سے نکال دیا گیا تھا کہ اُس کو محسوس تک نہ ہوا کہ کیا ہو گیا۔ اُس کے مراد نے دورانِ طبابت جراحی کے تمام کمال از بر کئے تھے تو ہر قسم کے مریض اُن کے تعاقب میں رہتے تھے۔ گلی کا موڑ مڑتے اُس کے ذہن کا ایک اور اریب سیدھا ہو چکا تھا۔ وہاں سے باہر مین سڑک پہ آ کر وہ ٹیکسی میں بیٹھے اور مراقبہ ہال کی طرف روانہ ہو لیے۔ جہاں سرس کے درخت سُرخ اور زرد پھولوں کے گلدستے لئے اُس کے مراد کی راہ تک رہے تھے۔

راستے میں مرید نے سوچا جہاں اتنی پھانسیں نکل رہی ہیں اک خلش سی اور بھی صاف ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اُس نے عرض کی۔ ’’حضور بعض اوقات والدہ سے ترشی سے بات کہہ بیٹھتا ہوں جبکہ حکم ہے کہ والدین سے اف بھی نہ کہو۔ فرمایا۔ اول تو

نہیں کرنا چاہئے مگر ہو جائے تو کچھ دیر بعد ماں کے کندھے پکڑ کر۔۔۔اُس کے کندھے پکڑ کر ہلکا سا دبا کر دکھایا کہ یوں۔۔۔اور کہہ دیں۔میں معافی چاہتا ہوں۔۔۔ماں نے کیا کہنا ہے۔وہ تو معاف کر ہی دیتی ہے۔

فرمایا۔غلطی یا گناہ پر ندامت اللہ کو بہت پسند ہے بندہ اللہ کو اسی لئے تو عزیز ہے کہ وہ غلطی کرتا ہے اور اس پہ ندامت سے توبہ کرتا ہے۔صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے عرض کی۔کتنا اچھا ہوتا کہ ہم سے غلطی ہوتی ہی نہ۔حضور ﷺ نے بہت ناراضگی سے فرمایا کہ اگر تم غلطی نہیں کرو گے تو اللہ تمہیں مٹا کر ایسی قوم کو سامنے لے آئے گا جو غلطیاں کرنے والی ہو اور اُس پہ نادم ہوتی ہو۔فرشتے اور انسانوں میں اسی بات ہی کا تو فرق ہے کہ انسان گناہ کرتا ہے اور نادم ہوتا ہے۔غلطی ہو جائے تو توبہ تائب میں لگ جانا چاہئے۔غلطی پر اصرار نہیں کرنا چاہئے یہ حضرت آدم کا ورثہ ہے۔

مراقبہ ہال پہنچے تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔نماز اور مراقبہ کے بعد کھانا کھایا۔۔۔حضور نے کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا۔اُس رات شاید اُس کا پیٹ کچھ زیادہ ہی بھر گیا تھا۔اس لئے کچھ خمار محسوس کرتے وہ بھی جلد ہی سونے چلا گیا اور کچھ حضور بھی ملنے کے لئے آئے ہوئے لوگوں سے بات کرنے کے بعد آرام کرنا چاہ رہے تھے۔

صبح مراقبے کے لئے آستانے میں جاتے ہوئے اُس نے مرشدِ کریم کو آتے دیکھا تو مودب ہو کر آستانے کا دروازہ کھول کر پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔پاس آئے تو اُس نے سلام کیا۔سر کی خفیف سی حرکت سے سلام کا جواب دیتے۔اندر داخل ہوئے۔وہاں موجود سبھی سرو قامت اُٹھ کھڑے ہوئے۔اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر چادر کو گھما کر اپنے گرد لپیٹا اور مراقب ہو گئے۔

مراقبے کے بعد سیر کے لئے جانے لگے تو حامد صاحب حضور کے ساتھ ہو لیے۔اُس نے ساتھ جانے کی خواہش کے باوجود نہ جانے کیوں ارادہ ترک کر دیا اور وہ اکیلا ہی ٹہلتا رہا۔ناشتے کی گھنٹی بجنے سے پہلے ہی وہ کچن کے پاس پہنچ گیا۔کچن میں ڈیوٹی پر موجود

ایک صاحب نے اُس سے چائے کا پوچھا۔اندھا کیا چاہے۔۔۔ایک پیالی چائے۔۔۔ کہہ کر اُس نے چائے کی پیالی لی اور وہیں بیٹھ کر پینے لگا۔۔چائے پینے کے دوران اِدھر اُدھر باتوں میں اُس نے صبح سویرے دیکھے ہوئے چند نہایت خوبصورت پرندوں کی بابت انہیں بتایا۔وہ اُن کو اُن کے رنگوں اور سریلے پن کی بابت بتا رہا تھا کہ انہوں نے اُس کو بتایا کہ مرشد کریم نے کچھ بھائیوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ وہاں سے کوؤں کو مار بھگانے کا کچھ انتظام کریں کیونکہ یہ ایک بدمعاش پرندہ ہے اور دوسرے پرندوں کو مار بھگاتا ہے۔

چند روز تو وہ چھرے والی بندوق لئے اُن کا تعاقب کرتے رہے پھر کسی نے مشورہ دیا کہ چوہے مار دوائی آٹے میں ملا کر ان کوؤں کو کھلائی جائے۔انہوں نے بتایا کہ اُس سے اور کچھ ہوا یا نہیں ایک عجیب بات مشاہدے میں آئی۔ جنہوں نے وہ آٹا کھایا۔جب یہ محسوس کیا کہ وہ کچھ غلط چیز کھا بیٹھے ہیں وہ جیسے تیسے ہوا نیم کے درخت تک گئے اور نیم کی نبولیاں اور پتے کھانا شروع کر دیئے۔ ایک دو کوے جن کی حالت زیادہ ابتر تھی۔۔۔اُن کو باقی کوے نبولیاں اپنی چونچ میں لا لا کر کھلاتے رہے۔اتنے کوؤں میں سے صرف ایک ہی مرا باقی سب ٹھیک ہو گئے۔

پھر؟اُس نے دلچسپی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا اُس کے بعد تو گویا سب ہی کوّے مراقبہ ہال کے گرد ہو گئے۔انہوں نے جو شور کیا وہ تو کیا۔ پھول توڑ توڑ کر لاتے۔۔۔پانی میں ڈالتے، جیسے انہوں نے باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا ہو ہمارے خلاف۔۔ یہ تالاب سرس کے ان پیلے پھولوں سے بھر دیتے۔آنے جانے والوں پہ جھپٹنے لگے۔انہوں نے اتنا اودھم مچایا کہ بس کیا بتائیں۔

پھر کیا ہوا؟ پھر یہ ہوا کہ حضور اباجی نے کہا کہ مرے ہوئے کوّے کھمبوں اور درختوں پہ لٹکا دیں۔جب چند مرے ہوئے کوّے درختوں اور کھمبوں پہ لٹکائے تو یہاں امن ہوا۔اُس کے بعد سے یہاں کوّے کم ہو گئے ہیں،اس لئے چھوٹے پرندوں کو ادھر آنے کا حوصلہ ہو جاتا ہے۔ورنہ یہ بدمعاش تو کسی چھوٹے موٹے پرندے کو اپنے علاقے میں آنے کہاں دیتے ہیں۔

کچھ دیر بعد دیکھا کہ ابا حضور حامد اور رشید صاحب کے ہمراہ آرہے ہیں۔ وہ مہندی کی باڑھ اور وہاں لگے بوگن ویلیا کے پودوں کے پاس رُکے۔اُن کی کانٹ چھانٹ کے بارے میں اُن کو کچھ بتا رہے ہیں۔ چند قدم آگے آکر وہاں تعمیر کے لئے بنائے عارضی حوض پہ چھت ڈال کر اُسے آئندہ کے لئے ذخیرہ آب کے لئے مختص کرنے کا حکم دیا۔ چھت ڈالنے سے پہلے اُس کے گرد بنی چاردیواری کو مضبوط اور پختہ کرنے اور اُس کو موجودہ سطح سے تین چار فٹ اونچا کر کے پھر چھت ڈالنے کا کہا اور فرمایا۔۔اس سے آپ کو بیٹھنے کے لئے ایک چبوترہ بھی مل جائے گا۔

کچن کے ساتھ بنے ڈائننگ روم میں آئے۔ فرش پہ چٹائی بچھا کر اُس پہ پلاسٹک کی ایک لمبی سی شیٹ ڈالی گئی تھی۔اُس پہ پلیٹیں وغیرہ رکھ جا چکی تھیں۔

دستر خوان پہ بیٹھنے کے بعد حضور نے مکھیاں دیکھ کر تبصرہ کیا۔شوہروں کو چاہئے کہ مکھیاں مارا کریں اور بیویوں کو مچھر مارنے چاہئیں۔ بھئی آپس میں لڑنے جھگڑنے سے تو یہی بہتر ہے کہ کوئی تعمیری کام ہی کر لیا جائے۔

ناشتے کے دوران قدرے خاموشی رہی۔ پھر کہیں سے ایک بات کہی گئی۔ دوسرے نے کوئی سوال پوچھ لیا۔ابا حضور نے لوگوں کو ایک آزاد، غیر جانبدار اور حقیقت پسندانہ طرز فکر سے آراستہ کرنے کو خانقاہی نظام کے اندازِ تعلیم کے مطابق ذہن سازی کا جو بیڑا اُٹھایا ہوا ہے۔ اُس میں کسی کو زاہد خشک بنانے کی بجائے ایک شگفتہ اور خوش گوار مزاج کا حامل بندہ بنانا۔۔۔روحانی علوم سکھانے سے کہیں زیادہ اور کٹھن کام ہے۔اس کے لئے اس سے زیادہ دشوار طریقہ اور کیا ہو گا کہ آپ جو کہیں وہ خود کر کے دکھائیں اور مسلسل دکھاتے چلے جائیں کہ کوئی کب تک آپ کی مثال سے اجتناب کرے گا۔ کبھی نہ کبھی تو اُس کو یہ خیال آ ہی جائے گا کہ جو کام میرے مرشد نے کیا۔۔۔کیا وہی مجھے بھی کرنا چاہئے اور جو کام انہوں نہیں کیا۔۔۔تو وہ کام میں کیوں کروں۔

رفیق اعلیٰ اور شجر ممنوعہ

ایک بار کوئٹہ سے آئی ہوئی ایک خاتون نے کوئی بات دریافت کی تو فرمایا کہ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو جو میں کہتا ہوں آپ وہ ضرور کرتیں۔ آپ ایک طرف تو مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ کوئٹہ سے چل کر آتی ہیں اور دوسری طرف جو میں کہتا اور کر کے دکھاتا ہوں وہی آپ سے ہو نہیں پاتا تو پھر میں کیا سمجھوں؟ میں نے آپ سے کہا کہ غصہ نہ کیا کریں لیکن آپ سے اتنا سا کام نہیں ہو پا رہا کہ آپ میری خاطر ہی اس سے باز آجائیں۔

بات سُنتے ہوئے اُس کو لگا کہ کہہ تو خاتون کو رہے ہیں لیکن اُن کا اصل مخاطب ہر وہ بندہ ہے جس کے کان تک اُن کی آواز پہنچ رہی ہے اور اُس وقت وہاں اس کے سوا شاید ہی کوئی اور اُن کی طرف متوجہ تھا۔ اب کوئی اس سے زیادہ کیا کرے؟ خدا کا واسطہ لوگ مانتے نہیں، ماں باپ کو اس قابل نہیں جانتے کہ اُن کی بات پہ عمل کریں۔ اساتذہ کرام کی بات پہ اس لئے توجہ نہیں دیتے کہ وہ خود کون سا اُس پہ عمل پیرا اور کاربند ہیں۔۔۔ تو انہوں نے اپنا واسطہ اور مثال دے کر اُسے غصہ سے منع فرمایا ہے۔

اُن کے اندازِ تربیت کی ایک خاص ادا جو اُس بہت توجہ سے نوٹ کی وہ یہ ہے کہ وہ پہلے اشاروں کنایوں میں بندے کو اُس کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اگر اُس کو اتنی طاقت کا احساس ہی نہ ہو تو پھر صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ بھئی اس خامی کو دور کر لو۔ اور یہ کام وہ بار بار کرتے ہیں اور اگر پھر بھی کوئی اس پہ آمادہ نہ ہو یا اپنی خامی کو دور کرنے کی کوشش ہی نہ کرے تو پھر اُن کا لہجہ دوٹوک ہوتا چلا جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں وہ یہ بھی جتاتے رہتے ہیں کہ اگر آپ کو روحانی علوم یا روحانیت سے کوئی دلچسپی ہے تو پہلے برتن صاف کریں تاکہ اُس میں دودھ ڈالا جا سکے۔ یعنی اگر اخلاقی، اور علمی طور پر آپ اس قابل نہیں کہ اللہ کی مخلوق سے اپنے روابط درست اور

استوار رکھ سکیں تو آپ اس قابل کیسے اور کیوں کر ہو سکتے ہیں کہ آپ کو روحانی علوم جیسی بیش بہا دولت سے سرفراز کر دیا جائے۔ جایئے پہلے خود کو درست کریں جب آپ مخلوق خدا کے قابل ہو جائیں گے تو اللہ بھی مل ہی جائے گا۔

ایک صاحب نے دُعا کے لئے درخواست کی تو فرمایا۔ آپ کو اپنی والدہ سے دعا لینی چاہیئے۔ ساتھ میں دلجوئی اور پردہ داری کو یہ بھی کہا۔ اللہ تعالیٰ اولاد کے حق میں ماں کی دُعا کو بہت سُنتے ہیں۔ پیر و مرشد کی دُعا سے بھی زیادہ۔ اب اگر پھر بھی کوئی جا کر اپنی والدہ کا کندھا دبا کر یہ نہ کہہ سکے کہ امی مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دیں تو اُس کا کوئی کیا کر سکتا ہے۔

اسی طرح جس نے جو بات پوچھی اور جتنی پوچھی اتنی ہی بات کا جواب دیں گے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے پوچھا کہ اس بیماری کا کیا علاج ہے اور آپ نے وجوہات اور اسباب گنوا کر علاج بتایا ہو۔ یا یہ کہ کسی نے کسی بیماری کا تذکرہ کر کے اُس کے اسباب و علل پوچھے ہوں اور وہ علاج بتانے بیٹھ گئے ہوں۔ فالتو بات نہ خود کہیں گے اور نہ ہی کبھی کسی اور کو یہ جرات ہوتی ہے کہ وہ فالتو بات اُن کے سامنے کہہ سکے۔ ہاں سیکھنے سکھانے کے لئے آپ کچھ بھی دریافت کریں کتنی ہی لایعنی بات دریافت کریں۔۔ اگر اُس میں ایک فیصد بھی آپ کے بھلے کی کوئی بات ہو گی تو ضرور راہنمائی فرما دیں گے ورنہ خوبصورتی سے ٹال دیں گے کہ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بات آپ کے بھلے کی نہیں۔

ایک بار مرید نے دریافت کیا کہ وہ روحانی اصطلاحات کی ڈکشنری مرتب کرے تو کیسا رہے گا۔ پوچھا۔ اس سے ہو گا کیا؟ مرید نے کافی اندازے لگانے کے بعد خود ہی کہہ دیا۔۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ آپ نے اُس سے یہ نہیں کہا۔ تو پھر ایسا کرنے کا کیا فائدہ بلکہ فرمایا۔ بھئی جب وقت آئے گا تو اللہ یہ بھی کروا دے گا۔

دستر خوان سے اُٹھنے سے پیشتر حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا بتایا ہوا ایک تمثیلی واقعہ سُنایا۔

ایک بار ایک بوڑھا بندر شہر آیا۔انسانوں کی اتنی بستی اُس نے اس سے بیشتر کبھی نہ دیکھی۔ وہ کئی روز اِدھر اُدھر گھوما پھرا۔جب وہ واپس جنگل پہنچا تو چھوٹے بڑے سب اُس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور پوچھا کہ تم نے شہر میں کیا کیا دیکھا۔وہ بتاتا رہا کہ اُس نے ایسی ایسی عمارتیں دیکھیں۔۔رنگ برنگی روشنیاں دیکھیں۔گاڑیاں دیکھیں شاپنگ مال دیکھے۔ایک بندر نے اُس سے پوچھا۔یہ بتاؤ کہ تم نے وہاں سب سے عجیب بات کیا دیکھی؟اُس نے کہا۔مجھے ایک بات پہ بہت حیرت ہے۔انسان گھروں میں رہتے ہیں۔جب صبح ہوتی ہے تو مادہ اور اس کے بچے نر سے خوب لڑتے خوخو کرتے ہیں۔۔اُسے نوچتے کھسوٹتے ہیں۔وہ تنگ آکر گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔لیکن جب شام ہوتی ہے تو گھر واپس آجاتا ہے۔جونہی گھر میں داخل ہوتا ہے مادہ اور بچے اُس کے گرد ہو جاتے اور پھر خوخو۔اس سوال پوچھنے والے بندر نے کہا۔اُس کے پیر میں ضرور رسی بندھی ہو گی۔بوڑھا بندر بولا۔یہی تو مجھے بھی حیرت ہے۔میں نے کوئی رسی وسی بھی نہیں دیکھی لیکن وہ پھر بھی واپس آجاتا ہے اور روزانہ یہی ہوتا ہے۔

سبھی سننے والے ہنس پڑے تو فرمایا۔یہ واقعہ انہوں نے کبھی کسی کتاب میں تو نہیں پڑھا یہ ضرور حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا طبع زاد ہو گا۔اتنا کہہ کر وہ اُٹھ گئے۔ سبھی کھلکھلاتے ہوئے ادب سے کھڑے ہو گئے۔کمرے سے باہر نکلے تو اُس نے ایک چہل پہل سی دیکھی۔معلوم ہوا آج قلندر شعور کی کلاس ہو گی اور حضور مرشدِ کریم خود لیکچر دیں گے۔

اب وہ اس چکر میں چکرانا شروع ہوا کہ کسی طرح اُسے اس کلاس میں بیٹھنے کی اجازت مل جائے۔اُس نے منصور الحسن سے بات کی۔ منصور کا تعلق پشاور ہی سے تھا اور وہ اُس سے پشاور ہی میں متعارف ہوا تھا۔وہ نہایت مخلص اور عقیدت مند کارکنان میں سے ہیں۔انہوں نے صاف ہی کہہ دیا جو حضور فرمائیں گے۔ ہم کون ہوتے ہیں آپ کو منع کرنے والے یا اجازت دینے والے۔اُس

نے جاکر مرشدِ کریم سے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے فرمایا۔ہاں ہاں۔۔کیوں نہیں۔۔۔آپ منصور بھائی سے کہہ دیں۔

کلاس میں داخل ہوا تو پینتیس چالیس طلبا دورویہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے حضور کا انتظار کر رہے تھے۔منصور صاحب کلاس کے مانیٹر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ہلکی پھلکی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔منصور وائٹ بورڈ پہ تاریخ اور سبق کا عنوان لکھ رہے تھے کہ ایک طالب علم نے۔۔۔حضور آرہے ہیں۔۔۔کہا تو پوری جماعت کا ماحول یک دم ہی تبدیل ہو گیا۔اُس کو تقدیس کا لفظ دھیان میں آیا۔مرشدِ کریم آکر کرسی مدرس پہ تشریف فرما ہوئے۔منصور نے کتاب کھول کر اُن کے سامنے میز پہ رکھی۔آپ نے اُن سے کچھ دریافت کیا۔اُنھوں نے بتایا اور ٹھیک ہے کا اشارہ پا کر وہ اپنی نشست پہ جاکر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر سکوت کے بعد لیکچر کا آغاز ہوا۔آپ نے بتایا کہ انسان خوشی کے بارے میں ان نابیناؤں جیسا وطیرہ رکھتا ہے جو ہاتھی سے واقف نہ تھے اور اُسے ٹٹول کر اُس کے بارے میں اندازے لگا رہے تھے۔خوشی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان خوشی سے واقف ہی نہیں۔خوشی تو جنت کی ایک کیفیت ہے جو بدلتی نہیں۔متغیر نہیں۔۔۔لامتغیر ولا متبدل ہے۔تغیر میں خوشی نہیں ہوتی۔ زندگی ایک کیفیت ہے اور کیفیت کے سوا کچھ نہیں جس میں ہر لحظہ تغیر واقع ہوتا ہے۔اس کیفیت میں وہ عنصر جس میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔۔خوشی ہے۔حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا فرمان ہے۔انسان اگر شعوری کیفیات و واردات سے آزاد ہو کر بے کیف ہو جائے تو یہ اصل خوشی ہے۔

اب یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ اس طرح ممکن ہے کہ ہمارے لئے ہمارا جسم اہم ہے۔ہم زندگی کو جسم سے منسلک سمجھتے ہیں۔ لاشعور ہمیں ہمارے جسم کے بارے میں اطلاع فراہم کرتا ہے اور یہی اطلاع شعور ہے۔۔خوشی اور غم۔۔۔کسی چیز سے ہماری

Attachment کی مناسبت سے ہوتا ہے۔آپ کسی کو اپنی مرضی سے ۵ ہزار روپے دے دیں۔۔آپ کو دُکھ نہیں ہوتا۔۔بلکہ بعض اوقات خوشی ہوتی ہے۔لیکن اگر آپ سے ۵۰۰ روپے کھو جائیں۔۔۔تو وہ آپ کو بھول کر نہیں دیتے یعنی آپ نے ۵۰۰ روپے سے اپنا تعلق شعوری طور پر ختم نہیں کیا۔۔اس لئے دُکھ ہوا۔

ایک آدمی جس کی عمر ۲۰ سال ہے اُس کی زندگی کا ہر لمحہ انسانی جسم سے تعلق اور دلچسپی کی داستان ہے۔۔۔جسم بیمار ہوتا ہے تو یہ محض ایک کیفیت کا اظہار ہے۔جسم تو محض ایک ذریعہ ہے کسی وجود کے اظہار کا۔۔۔جیسے کوئی تقریر کرے اور آواز لاؤڈ سپیکر سے آرہی ہو تو لاؤڈ سپیکر نے تو تقریر نہیں کی نا۔

جسم انسانی بے اختیار ہے۔شعور اگر اطلاع فراہم نہ کرے تو جسم اس لاؤڈ سپیکر کی طرح ہے جس پر کوئی تقریر نہ کی جارہی ہو۔جسم کی بنیاد شعور ہے اور شعور کی بنیاد کہیں سے موصول ہونے والی اطلاع ہے۔جسم بعض اوقات اطلاعات سے بلند ہو جاتا ہے جیسے سونے کی حالت۔

اس جیتی جاگتی تصویر یعنی اس جسم کی اپنی کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہے۔اس جیتی جاگتی تصویر یعنی اس جسم کو کوئی ایجنسی متحرک رکھے ہوئے ہے اور اس ایجنسی کا نام شعور ہے۔محض شعور ہی کی بنیاد پر زندگی کا تسلسل جاری ہے۔

جب شعور عالم ناسوت کی زندگی سے عارضی طور پر رشتہ منقطع کر لیتا ہے اور دوسرے عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔۔تو وہ اس مصدر اطلاعات کے قریب ہو جاتا ہے جو انسان کی اصل ہے اور اس عالم میں چونکہ کوئی تغیر نہیں ہے۔۔اس لئے وہ جو اطلاعات موصول کرتا ہے وہ براہ راست موصول کرتا ہے۔

لیکچر کے بعد شام تک مرشد کریم نظر نہ آئے۔ اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں ہیں تو وہ اُن سے ملنے اُن کے کمرے میں جا پہنچا۔ یہ وہ کمرہ نہ تھا جہاں وہ پہلے آ چکا تھا۔ یہ پہلے کمرے کی مشرقی سمت درمیان میں ایک برآمدہ چھوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس پہ کوئی تختی نہ تھی۔ اس کمرے کے ساتھ ملحق ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا جسے ابا حضور اور اُن کے مہمانوں کے لئے چائے بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کچن کا چارج خالہ صدیقہ کو دیا گیا تھا۔ وہ کچن کے علاوہ مراقبہ ہال سٹور کی دیکھ بھال کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہیں۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ اجازت طلب کی اور اندر داخل ہوا۔

کمرہ سادگی اور نفاست کا آئینہ دار تھا۔ کہیں کوئی چیز بے ترتیب نہ تھی۔ کمرے میں واحد فرنیچر ایک تخت پوش تھا۔ جس پہ فرش پہ بچھائے گئے قالین اور دیوار پہ آویزاں پردوں سے میچ کرتی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اُس نے کہیں کوئی شکن نہ دیکھی۔ نہ کمرے میں بچھی چادر پہ، نہ تکیے پہ اور نہ ہی صاحب کمرہ کے ماتھے پر۔

آپ سامنے کھڑکی کے نیچے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اردگرد کوئی کاغذ یا کتاب نہ تھی۔ وہ سلام کر کے اُن کے سامنے دروازے کی طرف پشت کر کے زمین پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

انہوں نے دریافت کیا۔ آپ کو ہمارا لیکچر کیسا لگا؟ مرید کیا عرض کرتا۔ اُس کو تعریف کا ہر لفظ چھوٹا، بے معنی اور نامناسب لگا۔۔۔ اُس نے چاہا کہہ دے کہ ندرت اور حقیقت کا اک خوبصورت امتزاج۔۔۔ علم و معرفت۔۔۔ آگہی اور وجدان کی آبیاری۔۔۔ کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔۔۔ لیکن یہ سب اُن کے سامنے کہنے میں جانے کیا امر مانع ہوا، اور اپنی بے بضاعتی پہ اُس نے سر جھکاتے ہوئے اتنا ہی کہا۔ لاجواب!

فرمایا ایک ان پڑھ پڑھے لکھے باشعور افراد کو پڑھانے بیٹھ جاتا ہے۔ مرید کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے لجاجت سے عرض کی۔۔۔ حضور ایسا تو نہ کہیں۔۔۔۔ یہ تو ہماری خوش بختی اور سعادت ہے۔ فرمایا یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے آپ جیسے شعور والے تعلیم یافتہ لوگ مل گئے ہیں۔

اُس نے تغیر کے حوالے سے ایک سوال پوچھنے کی اجازت طلب کی اور کہا۔ "کل یوم ھو فی شان" کا کیا مطلب ہوا؟

فرمایا۔ ایک بچہ ہے۔ آپ نے اُس کا نام شمس الدین رکھا۔ تو کیا یہ نام میرا ہو گیا؟

مرید نے کہنا چاہا تو اور کس کا ہوا آپ ہی کا تو ہوا۔ لیکن جانے وہ کون سا زاویہ نظر عطا کرنے والے ہیں۔ اس لئے وہ خاموشی سے اُن کو تکتا رہا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ پہلے سے بنے ہوئے سانچے میں اُن کی بات نہیں بیٹھ رہی تو فرمایا۔ بھئی نام ایک پرائی چیز ہے۔ انسان کا اپنا تو کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ اُس کا نام تک اُس کا اپنا نہیں۔ ماں باپ نے نام رکھا۔۔۔ بچے کے ساتھ لکھا ہوا تو نہیں آیا نا۔۔۔ اب بچپن گزرا۔۔۔ جوانی آئی۔۔۔ جوانی گئی۔۔۔ سب کچھ بدل گیا۔۔۔ نام وہی کا وہی رہا۔۔۔ جب بچہ کا سب کا سب بدل گیا اور نام وہی کا وہی رہا تو یہ کیا ہوا؟

مرید کیا کہتا۔ اُسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے چاہا کہہ دے کہ نام تو قائم رہا نا۔۔۔ لیکن وہ اب اتنا تو سمجھنے لگ گیا تھا کہ جب مرشد بات کرتا ہے اور۔۔۔۔ اگر وہ بات جو وہ کہہ رہا ہو۔۔۔ فہم میں جگہ نہ بنا رہی ہو تو۔۔۔ یہ مرید کی اپنی کج فہمی کے سبب ہی ہوتا ہے۔ شعور ایسی بات کو سمجھنے میں ہی تو مزاحمت کرتا ہے جو اُس کو درست کرنے والی ہو۔ وہ ٹک ٹک دیدم کی تصویر بنا انہیں دیکھ رہا تھا۔

بھئی یہ سب فکشن ہوا۔۔ مفروضہ ہوا۔۔ یاد رکھیں حقیقت بدلتی نہیں۔۔۔اُس میں تغیر نہیں ہوتااور جس میں تغیر ہے وہ سب فکشن ہے۔۔۔ فکشن کے سوا کچھ نہیں۔ اصل میں نام رکھنا ہی ساری گڑ بڑ کا سبب ہے۔

فرمایا۔ انما امرہ، اذاارادہ شیاً۔۔۔یعنی جب اُس کا امر کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کو حکم دیتا ہے، ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ یعنی اللہ کن نہیں کہتا۔۔۔اُس کا امر کن کہتا ہے۔۔۔ یہاں اللہ نے خود کو الگ کر لیا ہے۔ یعنی تغیر ذات میں نہیں ہوتا۔ صفات میں ہوتا ہے۔ صفات کا تغیر ہی رنگینی کائنات کا سبب اور یہ سب فکشن ہی تو ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہر بات صاف ہوتی چلی گئی کہ اپنا نام کیوں اپنا نہیں ہوتا اور نام تو محض ایک علامت ہے۔۔ ایک لیبل ہے ڈبے پہ لگا ہوا۔۔۔ جس میں فطرت کبھی کچھ کبھی کچھ ڈالتی چلی جاتی ہے۔۔ اس نام کے حامل بندے میں کتنا تغیر ہو چکا ہے۔۔۔ ہو رہا ہے۔۔۔ یا آئندہ کبھی ہو گا۔ اس لئے سب فکشن ہے اور بے حقیقتی ہے۔ حقیقی تو یہاں کچھ بھی نہیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ بے ثباتی کے درست ادراک کے لئے اگر یہ بنیادی بات وہ نہ سمجھتا تو وہ کبھی کچھ بھی نہ سمجھ سکتا۔ اُسے لگا وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہے اور وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ اس کو یقین ہو چلا کہ اب وہ غیر حقیقی کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرے گا۔

اُس کا مراد اُس کی کیفیات کو سمجھنے میں مستعد اور اُس کی مدد کو تیار۔۔۔ کہہ رہا تھا۔ یہ یقین بھی ایک کیفیت ہے۔۔۔ بے یقینی بھی ایک کیفیت ہے اور کیفیت اطلاع میں معنی پہنانے کو کہتے ہیں۔

پھر مزید وضاحت کو ارشاد فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غور و فکر سے بتوں کی بے چارگی کا سراغ لگایا۔ بتوں کی بے چارگی دیکھ کر انہوں نے اپنے رب کی تلاش میں غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ ستارہ دیکھ کر کہا۔ یہ میرا رب ہے مگر جب وہ غروب ہو گیا

تو کہا۔ نہیں۔۔۔ غروب ہونے والی چیز میرا رب نہیں ہو سکتی۔ چاند دیکھا تو کہا۔ گھٹتی بڑھتی شے میرا رب نہیں ہو سکتی۔ پھر سورج دیکھ کر فرمایا۔ ڈوب جانے والا میرا رب کیونکر ہو سکتا ہے۔۔۔ یعنی اب اُن کو لا متغیر کی تلاش ہوئی۔ اُس ذات سے دوری ہونا جو گھٹتی بڑھتی نہیں۔۔۔۔۔ بے یقینی ہے اور اُس کا قرب ہی یقین ہے۔

تقرب الٰہیہ یہ یقین عطا کرتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ انسان کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب انسان کو یہ بات سمجھ آجاتی ہے تو وہ پُر یقین ہو جاتا ہے۔

وسوسوں کا تعلق بے یقینی سے ہے اور وسوسہ سے بے یقینی پیدا ہوتی ہے۔ بے یقینی نفرت کو جنم دیتی ہے اور نفرت انتقام پیدا کرتی ہے۔ انتقام غصہ پیدا کرتا ہے اور غصہ کرنے سے جسمانی نظام میں ٹوٹ پھوٹ ہونا لازم ہوتا ہے۔ اس ٹوٹ پھوٹ سے دماغ متاثر ہوتا ہے اور انسان کا ہر قدم اندھیروں کی طرف اُٹھتا ہے۔ وسوسہ شیطان کا عمل دخل ہے۔ ذہن میں یقین ہے تو اندیشہ نہیں ہوگا۔ اندیشہ نہیں ہوگا تو بے یقینی اور اس سے جڑے لازمی نتائج بھی نہیں ہوں گے۔

اُس سے دریافت کیا۔ آپ کی عمر اب کتنی ہے۔۔۔ اور پیشتر اس کے وہ لب کشائی کرتا فرمایا۔۔ چالیس تو ہوگی۔۔۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو فرمایا جس اللہ نے چالیس سال تک آپ کی حفاظت کی وہ اب نہیں کرے گا۔۔ یقین کا پیٹرن جتنا ارفع ہوگا خوف اور غم سے اسی قدر نجات ہوگی۔ آپ جتنا اللہ کے قریب ہوں گے اُتنا ہی آپ پُر یقین ہوں گے۔

اور پھر یہ کہہ کر موضوع کو لپیٹ دیا کہ انسان ساٹھ کا ہو کر بھی آئندہ پانچ سال کے لئے متفکر رہتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ جس نے اُسے ساٹھ سال تک کھلایا وہ اُس کو مزید پانچ دس سال اور بھی کھلا ہی دے گا۔ اگر اللہ نے اُسے فاقے ہی مارنا ہوتا تو اُسے ساٹھ

سال تک کیوں کھلایا۔۔۔پہلے ہی کیوں نہ مار دیا۔انسان کے پیچھے تو دیکھتا ہی نہیں۔۔۔یہ دولت اور اولاد تو خود اپنے وجود کے لئے کسی کی محتاج ہیں۔ان سے کیسی توقعات۔یقین روحانیت ہے۔شیطنت شک اور بے یقینی کے سوا اور کچھ نہیں۔

پھر بات کو ایک دوسرے زاویے سے سمجھانے کو فرمایا۔کسی کا نام رکھنا ہی تو غلط ہے۔نام رکھنے سے ہی تو ساری گڑ بڑ ہوتی ہے۔نام رکھ کر ہم اُسے محدود کر دیتے ہیں۔اُس کو مخصوص نظریات کی حدود میں قید کر دیتے ہیں۔اس لئے تو حضور ﷺ نے اللہ سے دُعا کی تھی کہ مجھے رفیق اعلیٰ سے ملا دے یعنی اللہ اور ہے اور رفیق اعلیٰ اور۔۔۔۔بھئی اللہ نام ہے لہذا اس کی حدود ہوئیں جبکہ رفیق اعلیٰ صفت ہے نام نہیں۔یعنی حضورؐ اللہ کو حدود سے ماوراء عالم میں ملنا چاہتے تھے۔

مرید نے بات سن کر خود کو اُن سے اتنا قریب محسوس کیا کہ پہلی ملاقات پہ جو خلش رہ گئی تھی وہ سامنے لانے میں اب کوئی امر مانع نہ ہو سکتا تھا۔اُس نے پوچھا۔حضور یہ شجر ممنوعہ کیا ہے؟

فرمایا۔نافرمانی کا درخت ہے۔پھر اپنی بات کی وضاحت کو کہا۔ایک نافرمانی کے بعد دوسری نافرمانی اور پھر تیسری نافرمانی کا ہونا۔۔۔یعنی نافرمانی کا شاخ در شاخ پھیل کر درخت بن جاتی ہے۔

جیسے سدرۃ المنتہیٰ۔۔۔۔بیری کا وہ درخت جو بہت ہی گھنا اور بڑا ہو۔دراصل یہ سب مثالیں ہیں بات کو بیان کرنے کے لئے۔جیسے سمندر کو بیان کرنا ہو تو کہتے ہیں۔۔۔پانی ہے۔۔۔۔پانی میں بڑی بڑی لہریں اُٹھتی ہیں۔ساحل سے ٹکرا کر واپس پلٹ جاتی ہیں۔۔یعنی ایک بڑی چیز کو بیان کرنے کے لئے اُس کو چھوٹی چھوٹی اشیا سے واضح کیا جاتا ہے۔اسی طرح سدرۃ المنتہیٰ انتہائی گھنا، بڑا

اور وسیع درخت لامحدودیت کا سمبل ہے لیکن اپنی تمام تر لامحدودیت کے باوجود محدود ہی ہے۔ اس سے آگے قاب قوسین ہے۔۔۔یعنی فاصلہ نہیں رہا۔ جب فاصلہ نہیں رہا۔۔ تو خدوخال اور ڈائمینشن (ابعاد) بھی نہ رہے۔۔ اسپیس بھی نہیں رہا۔

فرمایا تصوف میں بیان کردہ مختلف لطائف بھی خلا کے مختلف نام ہیں۔ خلا میں کوئی درجہ بندی نہیں ہوتی یعنی گریڈیشن نہیں ہوتی یہ سب اصطلاحی نام یعنی Technical Term ہیں۔

تصوف کی کتابوں میں اکثر لطائف کا نام ہی بتایا گیا ہے۔ امداد اللہ مہاجر مکی کی لکھی ہوئی کتاب بہت عمدہ کتاب ہے لیکن اُس میں لطائف کے رنگ مختلف بتائے گئے ہیں۔ پھر فرمایا دراصل لطائف اُس طرح نہیں ہیں جس طرح بتایا جاتا ہے۔ یہ سب لوگوں کو بات سمجھنے اور سمجھانے کے طریقے ہیں۔

مرید نے نظریہ رنگ و نور کے حوالے سے بات کی تو فرمایا۔ روحانی علوم کے تین شعبے ہوتے ہیں۔۔۔اجمال، تفصیل اور اسرار۔ اجمال خلاصہ کو کہتے ہیں۔ آپ اسے کتاب کے دیباچے سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔۔ تفصیل۔۔۔یہ کتاب کا پورا متن ہوا اور اسرار۔۔۔کتاب کا مفہوم ہوا۔

اجمال کے معلمین گروہِ جبرائیل جیسے مقرب فرشتے ہیں، تفصیل حضور ﷺ خود پڑھاتے ہیں اور اسرار اللہ تعالیٰ۔ اجمال خلاصہ ہے اور تفصیل اور اسرار تعلیمات ہیں۔ علم لدنی میں اللہ تعالیٰ جس بندے کو خود ہی منتخب کر کے اُسے جو چاہیں تعلیم کر دیں۔

نظریہ رنگ و نور روحانی علوم کا خلاصہ نہیں ہے۔ یہ خلاصے اور تفصیل کے بین بین ہے۔

قلندر باباؒ اولیاؒ نے اسرار کو مغیباتِ اکوان کا نام دیا ہے۔یعنی غیب کے سسٹم کا Analysis خلاصہ۔۔۔ سمری ہوا، تفصیل Detail کو کہہ لیں تو اسرار کسی سسٹم کے پیچھے کام کرنے والی مقصدیت ہی قرار پاتی ہے۔

حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی تعلیمات ساٹھ سال کی عمر سے شروع ہوں گی۔ حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کی اپنی تعلیمات ساڑھے تین سال میں مکمل ہو گئی تھیں۔

مرید سے رہا نہ گیا اور اُس نے پوچھا۔"اور آپ کی۔"

نہایت معصومیت سے کہا۔۔ابھی تک تو شروع نہیں ہو سکیں۔

وہ کیوں؟۔۔۔اُس نے استعجاب سے کہا۔

بھئی سلسلے کے کاموں سے فرصت ہو گی تو اوپر والے پڑھائیں گے۔۔۔ پھر عجب سے لہجے میں کہا۔۔"حضور قلندر بابا اولیاؒ ہیں نا۔۔۔ان معاملات کو وہ خود ہی دیکھ لیں گے۔

مرید نے اسمائے الٰہیہ اور تدلّی کے بارے میں حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کی اس تعریف کی بابت کہ تدلّی اسمائے الٰہیہ کی تشکیل کا نام ہے۔۔۔ پوچھا تو فرمایا۔دراصل حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ نے بات کو سمجھانے کے لئے لوح و قلم میں مشاہداتی طرزوں سے ہٹ کر لکھا ہے۔ورنہ تو تدلّی ہی خدا ہے۔اللہ تعالیٰ کو ہی تدلّی کہیں گے۔

مرید نے رال ٹپکاتے ہوئے مشاہداتی طرزِ فکر کے حصول کا طریقہ دریافت کیا تو فرمایا۔

''آپ لگے رہیں۔۔۔اپنے وقت پہ ہو جائے گا۔۔ پھر کہا کہ بھئی اپنا شکار خود ہی مار کر کھانا چاہئے۔ ہتھیار دوسرے کا ہو اور شکار اپنا مارا ہوا ہو تو اُس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔۔۔ پھر کچھ سوچ کر فرمایا۔ ویسے دوسرے کا ہتھیار ہو تو آدمی احتیاط کرتا ہے۔

پھر اچانک دریافت کیا۔۔۔آپ نے ایم اے کتنے سالوں میں کیا۔ عرض کی۔ سولہ سال میں۔ فرمایا۔ یوں سمجھیں کہ ابھی تو آپ کو اس راستے پہ آئے سولہ ماہ ہی ہوئے ہیں۔ روحانیت تو لا محدودیت کا سفر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ روح کو قلیل علم دیا گیا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اللہ کا علم لا محدود ہے تو لا محدود کا جزو بھی لا محدود ہی ہو گا۔

اپنے مرشد کریم کے سامنے سے ہٹ کر اُس نے اپنے ذہن کو ٹٹولا تو اُس کو کسی قدر مزید اجلا اور نکھرا پایا۔ الجھے ہوئے پُر پیچ سوال کچھ ایسے مدہم اور دھندلے ہو چکے تھے گویا کسی نے پنسل کی تحریر کو ربڑ سے مٹا دیا ہو۔ اب وہ پڑھنے میں تو نہیں آ رہے تھے لیکن نشانات قلم کی صورت اُن کی یاد باقی تھی۔

اس ملاقات کے بعد مرشد کریم کے قریب جانا اور باتیں سننے کی سعی کرتا۔ اکثر وہ اُسے مریضوں میں گھرے ہوئے ملتے۔ یا لوگ اُن سے اپنے مسئلے مسائل دریافت کرے ہوتے۔ وہ اخلاقاً دور رُک جاتا۔ کبھی کبھار وہ دیکھتا کہ کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں جن کو حضور با قاعدہ الگ وقت دیتے۔ بعد میں ایک بار فرمایا یہ کسی نہ کسی کی سفارش کروا کر وقت لینے والے افراد ہیں۔ کبھی بڑے صاحبزادے بھائی جان و قاری یوسف یا ان کے اہلِ خانہ، سلام عارف اور امی حضور اُن کے پاس ہوتے۔ ایک بار دفتر میں دیکھا کہ سب سے چھوٹے برخوردار شاہ عالم اپنی درسی کتاب کا سبق ابا سے پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے کاپی پہ کچھ لکھ کر دکھایا تو فرمایا۔ یار اپنی رائٹنگ تو ٹھیک کرو۔ شاہ عالم اُس وقت آٹھویں کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔

باقی سب روٹین ویسا ہی چلتا۔۔ علیٰ الصبح نماز۔۔۔ نماز کے بعد مراقبہ۔۔۔ مراقبہ کے بعد درس۔۔درس کے بعد سیر کو روانہ ہوتے اور باقی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ وہ کبھی اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا اور کبھی وہاں آئے لوگوں سے ملنا ملانا ہوتا۔ پھر ناشتہ ہوتا۔ کبھی اباؒ اُن کے ساتھ ناشتہ کرتے اور کبھی خالہ صدیقہ ابا حضور کا ناشتہ اُن کے کمرے میں لے جاتیں۔ ناشتے پہ منصور بھائی سے چہلیں ہو جاتیں۔ وہ بھی مزہ لیتے اور سننے والے بھی لطف اندوز ہوتے۔ کبھی کبھار وہ اُن سے مرشد کریم کے حوالے سے کوئی بات سنتا۔۔ وہ اپنے ذاتی واقعات بتاتے۔۔۔ سلسلے میں کیسے آنا ہوا۔۔۔ کیوں آئے یا پھر مرشد کریم سے سنی ہوئی کوئی بات بتاتے۔

کامران باسط کو حضور نے دفتری امور اور مراقبہ ہال کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دے رکھی ہے۔ وہ انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کبھی وہ اُن کے پاس جا بیٹھتا۔ وہ اُس سے ابا حضور سے سنی تازہ بات کی بابت پوچھتے۔۔ اُن کو بات سُنا کر اُسے بھی اچھا لگتا۔ وہ خالد نیاز کے بہت اچھے دوست ہیں اس حوالے سے بھی اکثر دونوں میں بات ہوتی رہتی۔ وہاں عادل اسماعیل سے بھی بات چیت ہوتی رہتی۔ وہ سب اُس کو اس لئے وقعت دیتے کہ مرشد کریم نے اُس کی غیر حاضری میں چند ایک بار اُس کو اچھے الفاظ میں یاد کیا تھا۔

اُس روز منصور بھائی نے اُس کو بتایا کہ آج پھر قلندر شعور کی کلاس ہے اگر آپ آنا چاہیں۔ اُسے حیرت ہوئی۔ یہ پورا ایک ہفتہ اتنی جلد کیسے گزرا کہ اُسے احساس تک نہ ہوا۔ نہ بیوی بچے یاد آئے نہ کاروبار کا دھیان آیا۔ اُس نے حیرت کے اظہار کی بجائے چہل کے انداز میں کہا۔ تم پھر کہو گے ابا حضور سے پوچھ کر آئیں۔ رہنے دو بھائی۔ اُسے مزید حیرت ہوئی جب منصور نے یہ کہا۔ ابا نے آپ کے لئے خصوصی اجازت دی تھی۔۔۔ سو وہ اجازت اُس وقت تک Valid ہے۔ جب تک وہ اسے خود کینسل نہ کر دیں۔ پھر

شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔۔اوراس خصوصی رعایت کو کینسل کروانے کے لئے آپ کو کوئی خصوصی غلطی کرنا ہوگی اوراگر آپ سے ہوچکی ہے اور ہمیں معلوم نہیں تو آپ ہمیں بتادیں۔ہم حضور کو بتادیں گے۔

اُسے یاد آیا کہ ایک بار عرس پہ پشاور کے دوستوں کا قافلہ مراقبہ ہال پہنچا اور وہ سب ابا حضور سے مل رہے تھے تو ابا نے منصور صاحب کو گلے لگاتے ہوئے فرمایا تھا۔۔ چھوٹے سے بڑے آدمی ہیں۔قدو قامت میں وہ بھلے ہی مختصر سہی اپنے مرشد کی عقیدت کے حوالے سے وہ واقعی بہت بڑے ہیں۔سٹیٹ بنک میں اُن کی ملازمت اور کراچی پوسٹنگ میں اُن کی اصل غایت ہی یہ تھی کہ وہ اپنے مرشد کریم کے قریب رہ سکیں۔اُن کی اس خواہش کو مرشد کریم نے پورا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔انہوں نے اپنی رہائش پہلے تو مراقبہ ہال میں ہی رکھی اور پھر ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے سے پہلے مراقبہ ہال کے سامنے ہی گھر لے لیا۔

کلاس روم میں داخل ہو کر وہ ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ حضور تشریف لائے اور لیکچر ارشاد فرمایا کہ اس دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے حواس سے واقف ہوتا ہے۔اُس کی سماعت الست بربکم کی آواز سے متحرک ہونے والی سماعت ہوتی ہے۔آپ دیکھیں کہ چندروز کے بچے کے قریب آپ اخبار کھولیں اس کی سرسراہٹ سے بھی بچہ بدک جاتا ہے۔لیکن اُس کی نظر ایک جگہ ٹکی رہتی ہے۔یعنی پہلے سماعت متحرک ہوتی ہے اُس کے بعد کہیں جا کر بصارت کام کرتی ہے۔

زندگی ایک طرف ارتقا کرتی ہے اور دوسری طرف ریکارڈ ہوتی ہے۔جوں جوں شعور آگے بڑھتا ہے اس کا ایک ریکارڈ بنتا چلا جاتا ہے۔

پھر آپ نے بتایا کہ سب مظاہر کے پس پردہ ایک ہی روح کام کرتی ہے۔روح ہر نوع کے لئے معین کی گئی مقداروں کے مطابق اُس کو بناتی اور چلاتی ہے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا کہ خوشی اور غم دو کیفیتوں کے نام ہیں۔ایک بات جو آپ کے لئے بہت ہی بڑی خوشی کی بات ہے وہی کسی اور کے لئے ناخوشی اور دکھ کی بات ہو سکتی ہے۔

خوشی اور غم کو روحانی آنکھ سے دیکھنے والے کو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سب معنی پہنانے کا کھیل ہے اور معنی پہنانے والی ایجنسی ہمارا ذہن ہے اگر وہ وصول ہونے والی اطلاع میں درست معنی پہناتی ہے تو اُس کے نتیجے میں خوشی کی کیفیت مرتب ہوتی ہے اور غلط اور تخریبی معنی پہنائے جاتے ہیں تو ناخوشی اور تکلیف مقدر بن جاتی ہے۔

لیکچر وقت پہ شروع کرکے وقت مقررہ پہ ختم کرتے ہوئے آپ کلاس روم سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے تو مرید بھی آپ کے ساتھ ہو لیا۔آپ جا کر اپنے کمرے کے برآمدے میں بچھے تخت پوش پہ بیٹھ گئے تو وہ اجازت لے کر تخت پوش کے قریب ہو کر فرش پہ بیٹھ گیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنے مراد سے کچھ کہتا۔۔۔اُن سے قلب و نظر کی صفائی کے مجرب اور آزمودہ طریقے دریافت کرتا چند ایک اصحاب اور بھی آکر بیٹھ گئے۔سب انہیں دیکھ رہے تھے۔انہوں نے پہلے ٹوپی اتاری۔ وہ ایک طرف رکھی۔وہاں رکھے کاغذات پہ سرسری نظر ڈالی۔ پھر پیر سمیٹتے ہوئے اوپر ہو کر بیٹھ گئے اور دیوار سے لگے تکیے سے ٹیک لگالی۔

ایک صاحب آگے بڑھے انہوں نے کوئی ذاتی سا مسئلہ دریافت کیا۔آپ نے انہیں اُس کا کوئی حل بتایا۔پھر سب کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ ایک بار ایک مینڈک جو دریا کنارے رہتا تھا۔سیلاب میں بہہ کر کسی گاؤں کے کنویں میں گر گیا۔وہاں کنویں کے مینڈک اُس کے گرد جمع ہو گئے۔وہ اُن کو کنویں سے باہر کی دنیا کی کھلی فضاؤں کے بارے میں بتانے لگا۔اُس نے کہا کہ وہاں ہم دریا میں میلو میل تیرتے پھرتے، طرح طرح کے مناظر دیکھتے اور اُن سے لطف لیتے تھے۔کنوئیں کے مینڈکوں نے اُس سے پوچھا یہ دریا کیا ہوتا ہے، یہ طرح طرح مناظر سے کیا مراد ہے اور یہ میلوں میل کسے کہتے ہیں۔اُس نے انہیں سمجھانے اور اپنی بات کی وضاحت

کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ کنوئیں کا مینڈک بولا کتنی دور؟ اور پھر اُس نے چھلانگ لگائی اور پوچھا۔۔ کیا اتنی دور؟ وہ دریائی مینڈک بولا۔۔ ارے نہیں بھئی۔۔۔ اس سے کہیں زیادہ دور تک۔۔۔ کنوئیں کے مینڈک نے دوبارہ کوشش کی اور پہلے کی نسبت لمبی زقند لگا کر پوچھا۔ کیا اس سے بھی زیادہ دور۔۔۔ تو اُس دریائی مینڈک نے کہا۔۔ رہنے دو بھائی۔۔۔ تم نہیں سمجھو گے۔۔۔ یعنی جس نے کھلی فضا دیکھی ہی نہ ہو وہ اُس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔

مرید کو اُس دریائی مینڈک پہ بہت ترس آیا۔ اُس نے سوچا ایک تو بے چارہ دریا سے دور کنوئیں میں گرا اور اوپر سے کوئی اُس کی بات سمجھ کے نہیں دے رہا تو اُس پہ تو دوہری قیامت ہی گزرے گی۔ اگر وہ خود کو کنوئیں کا مینڈک مان لیتا تو باہر کی دنیا سے کیسے واقف اور روشناس ہو سکتا ہے۔ کیا محض باہر کی دنیا کی کھلی فضاؤں کا تذکرہ سنتے رہنے سے ہی وہ باہر کی دنیا کو دیکھ بھی لے گا۔ اُس کے ذہن میں ایک خیال ابھرنا شروع ہوا اور پھر وہ خیال ایک جھکڑ کی مانند اُس کے اندر تلاطم مچاتا چلا گیا۔

مرشد کریم اُن کو یہ سمجھانے کی تگ ودو کر رہے ہیں کہ محض باتیں سنتے رہنے سے کبھی کسی کی رسائی کھلی اور آزاد فضاؤں تک نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔۔۔ اس کے لئے قدم بہ قدم انچ انچ کر کے کشش ثقل کے خلاف کنوئیں کی منڈیر کی طرف سفر کرنے کی کوشش اور جدوجہد کرنا لازم ہے۔ ان باتوں سے نشان منزل تو لیا جا سکتا ہے۔ ان باتوں سے اشتیاق اور تجسس کو درکار مہمیز تو لگائی جا سکتی ہے لیکن پہلے کسی میں یہ صفات ہوں تو سہی۔ مرید کے اندر اُٹھتی آندھی کے بگولوں کو سبک سر بنانے کو مراد کہہ رہا تھا۔

ایک بار ایک صاحب نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے کہا کہ آپ خواجہ صاحب پہ اتنے مہربان اور مشفق کیوں ہیں؟ اس پہ حضور نے انہیں کہا۔ آپ مسجد قدسیہ۔۔۔ جو وہاں سے قریب ہی ہے۔۔۔۔ کے باہر کھڑے ہو کر بھیک مانگ کر دکھا دیں۔۔۔ وہ

صاحب تو یہ کہہ کر کہ ہم سمجھ گئے۔۔۔خاموش ہو گئے۔ مگر مجھے اس بات کا علم ہوا تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر کبھی حضور نے مجھ سے کہہ ہی دیا تو کیا میں یہ کام کر بھی پاؤں گا؟ چنانچہ میں جا کر مسجد کے باہر کھڑا ہو گیا اور بھیک مانگنے لگا۔ اگلے روز وہ پیسے جو اس طرح اکٹھے ہوئے اُن میں کچھ اور پیسے شامل کر کے دیگ پکائی اور لوگوں میں تقسیم کر دی۔

مرید کے ذہن میں آئی کہ انانیت اور کم ہمتی دونوں سے پیچھا چھڑائے بغیر کنوئیں کی عمودی دیوار پہ پیر جمانا ناممکن ہی ہو گا تبھی تو انہوں نے پہلے اسی بوجھ کو ختم کرنے کی فرمائش کنایتاً کی۔ براہ راست تو وہ کہتے ہی رہتے ہیں لیکن شعور اُس کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے۔۔۔اب وہ اس طرح فرما رہے ہیں کہ شاید بات شعور کو اسی طرح کچھ قائل کر لے کہ وہ کمر ہمت باندھ ہی لے۔

مذہب کے حوالے سے وہ کبھی کبھار کچھ اس انداز سے تبصرہ کرتے کہ اُس کے حوالے سے لوگوں کے سطحی زاویہ نظر کی قلعی کھل جائے۔ اُس وقت بتایا کہ مذہب کو بھی دکانداری ہی بنا دیا گیا ہے۔ یہ دکانداری ہی تو ہے کہ مندر ہو، چرچ ہو یا مسجد تعمیر کرتے ہیں۔۔اُس کو خوب بناتے اور سنوارتے ہیں۔ خود سادہ رہ لیں گے مگر اُس کی سجاوٹ اور بناوٹ میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ دکان جو ہوئی کہ کہیں گاہک نہ بھاگ جائے۔

ایک دوسرے کی مسجد میں پڑھی گئی نماز کو بھلے ہی فاسد قرار دے دیں ایک دوسرے کا پڑھایا ہوا نکاح کبھی باطل نہیں قرار دیں گے۔ اپنے سسٹم کو بچانے کے لئے بھرپور قربانی دیں گے۔ کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو صبح عین وقت پر اذان دے رہے ہوتے ہیں۔

ایک پنڈت نے جب دیکھا کہ قربانی کا وقت نکلا جا رہا ہے اور بلی چڑھانے کو کچھ دستیاب نہیں تو اُس نے خود اپنے ہی گلے پہ چھری پھیر لی کہ اُس کا سسٹم بچ جائے۔

ہندو کا مطلب ہے بے وفا محبوب، ظالم، دغا باز۔۔۔ یہ نام محمود غزنوی نے بھارت کے باسیوں کو اُن سے اپنی نفرت کے سبب دیا تھا۔ اُس نے سندھ کے دوسری طرف کے علاقے کو ہند کہا اور یہی رائج ہو گیا۔

فرمایا شیخ اکبر ابن عربی ابدال تھے۔ اپنی کتاب فتوحات مکیہ انہوں نے ملاؤں کو ستانے کے لئے لکھی تھی کہ اگر ہمت ہے تو اسے سمجھ کر دکھاؤ۔ میں نے ایک بار حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے پوچھا کہ حضور آپ کو اس کتاب کی سمجھ آتی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا ہمیں تو سمجھ آتی ہی ہے لیکن جو صرف خواص ہی کو سمجھ آئے تو اُسے لکھنے کا کیا فائدہ؟

ایک صاحب کی بابت بتایا کہ انہوں نے ایک گھوڑا خریدا۔ اُس کا نام دُلدُل رکھا۔ وہ اُسے خوب بنا سنوار اور سجا کر محرم کے جلوسوں میں لے جایا کرتے۔ لوگ عقیدت میں اُسے چومتے چاٹتے اور پیسے ڈالتے۔ اُس نے ایک سیزن میں پینتیس چالیس ہزار روپے کمائے بعد میں اُس نے کراچی میں کئی دکانیں خرید لیں۔

فرمایا۔ انسان میں بھی زمین ہی کی مانند تین حصے پانی ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان کو یہ صلاحیت ودیعت کر دی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں ایڈجسٹ کر سکتا ہے۔ پانی میں فطرتاً جلال نہیں ہوتا لہذا انسان میں بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اگر انسان کی ساخت میں جلال شامل ہوتا تو اُس میں آگ زیادہ ہوتی۔ مائع کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ جیسے پلاسٹک کو پگھلا کر مختلف سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ رنگ۔۔۔ہر ارنگ ہے۔یہ ہر ارنگ ہی زندگی اور جمال ہے۔جمال ہی اللہ ہے اور اللہ ہی جمال ہے ۔اللہ میں غصہ یا جلال نہیں اگر ہوتا تو ہر طرف سُرخ رنگ کی زیادتی ہوتی۔آسمان کو دیکھ لیں، سمندر کو دیکھ لیں۔۔۔جلال کی سُرخی کہیں نہیں۔۔پھولوں کو دیکھیں۔۔۔اُن میں ترتیب اور رنگ آفرینی جمال نہیں تو اور کیا ہے؟ جمال ہی جمال کا پھیلاؤ ہے ہر سو۔۔ہر سمت۔

اور پھر یہ کہہ کر محفل برخاست کر دی کہ اب میں کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔۔۔کچھ آرام کر لوں۔۔اور پھر دونوں پاؤں تخت پوش سے نیچے لٹکا کر زمین پہ رکھے اور دونوں ہاتھوں سے تخت پوش کے کناروں کو پکڑ کر ان سب کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کرنے لگے۔جب دیکھا کہ لوگ وہاں سے جانے کی بجائے اُٹھ کر قدرے پیچھے ہٹ کر وہیں کھڑے ہو گئے ہیں تو اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔شاید وہ وہیں لیٹ کر آرام کرنا چاہ رہے تھے لیکن لوگوں نے اُن کی بات سمجھنے میں کوتاہی کی تو وہ وہاں سے ہٹ گئے تاکہ حکم عدولی پہ ہونے والی پکڑ سے انہیں بچایا جا سکے۔

اگلے روز درس میں علم اور اُس کی اہمیت کی بابت ارشاد فرما کر کہا کہ اولاد باپ کی قدر نہ کرے اور باپ کی دولت کی قدر کرے۔۔۔کس قدر عجیب بات ہے۔بھئی دولت تو آپ کو ہی ملے گی آپ باپ کی قدر کریں۔

مرید کو لگا کہ اصل مخاطب وہ ہے۔کیوں کہ اُس نے کل ہی کسی سے باتوں کے دوران یہ کہا تھا کہ مرید کو اپنے مرشد کے علوم سے دلچسپی رکھنی چاہئے۔اُس کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ مرشد کیا کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے۔ان سب باتوں سے اُن کو کیا لینا دینا۔انہوں نے کس خوبصورتی سے اُس کو جتائے بغیر اس کی سوچ کی اصلاح فرمائی کہ جب وہ اُن کو ابا کہتا ہے تو اُن کے

علوم تو اس کو ملیں گے ہی لیکن اُس کو اُن کی قدر کرنے میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔ باپ کی دولت کی قدر باپ سے زیادہ کی جائے تو طرزِ فکر میں کجی، خامی اور ناپختگی ہی کی علامت ہوئی۔

پھر فرمایا کہ پوری کائنات طبقاتی تقسیم ہے۔ اس میں زون ہیں۔ لوگ گروہوں میں رہتے ہیں۔ گروہ بندی کے بغیر گزارا بھی نہیں۔

پھر حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کے حوالے سے فرمایا کہ قیامت اور روزِ حشر میں بھی لوگ اپنے اپنے گروہوں میں اکٹھے ہوں گے۔ حساب کتاب کے بعد جب لوگوں میں آہ و فغاں مچے گی تو اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے کہ یہ کیسا شور ہے؟ مقرب بارگاہ اولیا اور فرشتے عرض کریں گے۔ حضور آپ کے بندے۔۔۔ آپ کی مخلوق۔۔۔۔ تکلیف میں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے ہم نے ان کو صحیح بات سے آگاہ نہیں کر دی تھا۔ عرض کی جائے گی۔ بس جی غلطی ہو گئی ہے۔۔ نادانی میں۔

فرمایا حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ نے یہ بڑی عجیب بات فرمائی کہ اللہ کسی کو دوزخ میں نہیں ڈالیں گے۔۔ کہیں گے۔ اچھا جاؤ ۔۔۔ ہٹو یہاں سے۔۔۔ اور جنتی لوگ خود ہی جنت کی طرف چل دیں گے اور دوزخی دوزخ کی طرف۔۔ اللہ تعالیٰ کسی کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔۔ لوگ خود ہی دوزخ کا انتخاب کریں گے اور پھر دوزخ میں جا کر لوگ چیخ و پکار کریں گے اور واویلا مچائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئے گی اور دریافت کیا جائے گا۔ اب کیا ہے؟

عرض کیا جائے گا کہ آپ کی مخلوق تکلیف میں ہے۔

فرمایا۔ یہ سُن کر اللہ جہنم کو ٹھنڈا ہونے کا حکم دیں گے اور جہنم کی آگ سرد پڑ جائے گی۔

ناشتے کے بعد دستر خوان سے اُٹھتے ہوئے۔ مرشد کریم نے اُس سے دریافت کیا۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟ اُس نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو آج پشاور کے لئے روانہ ہو جاؤں۔ کچھ ساعت توقف کے بعد ارشاد ہوا۔ ہاں ٹھیک ہے۔

وہ نہا دھو کر تیار ہو کر الوداعی ملاقات کے لئے حضور کے کمرے کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ حضور اپنے پہلے والے کمرے میں ہیں۔ اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ڈاکٹر ممتاز اختر اور اُن کے ساتھ ایک دو افراد اور بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ بھی اسی روز واپس جانے سے پہلے اباسے ملنے آئے تھے۔ سلام کر کے وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ حضور صدری اور دھوتی پہنے بیٹھے تھے جو کہ اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ نہانے کی تیاری میں کوئی بات بیان فرما رہے تھے۔ بات کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ جی ہاں۔ یہ بھی ایک بات ہے۔

حضور نے کاٹ دار لہجے میں فرمایا۔ یہاں پر کوئی بات بھی محض ایک بات نہیں ہوتی۔ پھر قدرے نرم لہجے میں کہا۔ یہ تو مقصود صاحب کو پشاور جا کر پتہ چلے گا کہ انہوں نے جو باتیں سُنیں اُن کی وجہ سے اُن کے علم میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔

پھر فرمایا۔ ٹھیک ہے تو پھر آپ کو ہم یہیں پہ خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔۔ اور اُٹھ کر پہلے ڈاکٹر صاحب اور اُن کے ہمراہی سے الوداعی معانقہ کیا۔ وہ احترام سے گلے مل کر پیچھے ہٹے۔ حضور نے اُسے کھڑا دیکھ کر بانہیں پھیلاتے ہوئے فرمایا۔ آئیں۔۔ آئیں۔۔ آپ بھی آئیں۔۔ وہ معانقہ کر کے پیچھے ہٹا تو دوبارہ بازو کھول کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔۔ چلیں دوبارہ مل لیں۔ وہ دوبار گلے مل کر پیچھے ہٹا تو آپ نے پھر بانہیں پھیلا دیں۔ مسکراتے ہوئے پوچھا اور ملنا ہے؟ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور انہوں نے اُسے بانوں میں بھر لیا۔ وہ جتنی دیر اُن کے سینے سے لگا رہا اُسے بے خودی، بے کیفی اور بے وزنی کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ جب انہوں نے اُسے پیچھے ہٹایا تو اُس کے پورے وجود پہ ایک فروتنی، عاجزی اور انکساری طاری تھی۔ آنکھیں عطا کے خمار سے بوجھل ہو کر

جھکی ہوئی تھیں۔ جسم میں جیسے ہر ہڈی تحلیل ہو چکی تھی۔ وجود کو سیدھا رکھنے کی جدوجہد کرتے اُسے یوں لگ رہا تھا گویا وہ گیلی مٹی کا اک پتلا ہے جواب گرا کہ تب گرا اور وہ کسی بھی لمحے وہیں زمین پہ ڈھیر ہو جائے گا۔ کمرے سے باہر آ کر ڈاکٹر صاحب نے اُس سے رخصت ہونے سے پہلے تبصرہ کرنے کے انداز میں اُسے مطلع کیا۔ اب حضور آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اُس وقت ذہنی طور پہ وہ کچھ ایسی حالت میں تھا کہ اُس نے ڈاکٹر ممتاز اختر کی بات سنی لیکن کچھ محسوس نہ کیا۔ جی ہاں اُن کا کرم ہے۔۔۔ کہہ کر وہ انہیں خدا حافظ کہنے کچھ دور اُن کے ہمراہ چلا اور جب وہ چلے گئے تو وہ بھی پشاور ہو لیا۔

فیض سے کیا مراد ہے؟

پشاور پہنچ کر ائیر پورٹ سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے گھر واپس پہنچنے کی خوشی کے جوش کی بجائے اپنے اندر ایک سناٹا سا پھیلا ہوا محسوس کیا۔ جانی پہچانی سڑکوں اور عمارتوں کو وہ دیکھ تو رہا تھا لیکن شناسائی کی کوئی لہر اُس کو گدگدا نہیں رہی تھی۔ بیوی بچوں سے ملا۔۔۔ وہ اس کے اتنے دن بعد واپسی پہ جس خوشی اور مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔۔۔ وہ اُس کے ردِ عمل میں مسکرا تو رہا تھا لیکن اندر سے کہیں بہت دور رہ کر۔

تین چار روز وہ گھر میں لیٹا کراچی میں اپنے مراد کے سنگ گزرے لمحات کو، اُن کی کہی باتوں کو دل ہی دل میں دہراتا رہا۔ مراقبہ ہال میں بیتی کیفیتوں کو یاد کرتا رہا۔ بیوی نے دریافت کیا کہ وہ دفتر کیوں نہیں جا رہا تو اُس نے کہا کہ کل سے وہ ضرور جائے گا۔۔ آج رہنے دو۔۔۔ بیوی نے قدرے اچنبھے سے اُس کو دیکھا اور پھر۔۔۔ ہو گا کچھ۔۔۔ کے انداز میں کندھے اچکا کر چل دی۔ وہ ضرور سوچ رہی ہو گی یہ دفتر سے ناغہ کرنے والا تو نہیں۔۔

اگلے روز سے اُس نے دفتر جانا شروع تو کر دیا لیکن اندر سے وہ اک لاتعلقی سی محسوس کرتا رہا۔ اگر کوئی کام نہیں بھی ہو رہا ہوتا تو اُس کو کچھ زیادہ فکر محسوس نہ ہوتی اور اگر کوئی کام مکمل ہو جاتا تو پہلے کی مانند اُس پہ خوش ہونے کی بجائے محض اطمینان کا اظہار کر کے رہ جاتا۔ کوئی دوست آتا تو اُسے جتاتا۔۔ کیا بات ہے کہیں کھوئے کھوئے سے ہو۔۔ نہیں۔۔۔ بس یونہی تمہیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ وہ اُس سے کراچی کی بابت پوچھتے۔ بس ٹھیک ہے۔۔۔ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ وہ چاہتا تو تھا کہ انہیں اپنے مراد سے سُنی اور سیکھی باتیں بتائے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جانے وہ کیسا محسوس کریں۔۔۔ خاموش رہتا۔

لگ بھگ ایک ڈیڑھ ماہ کچھ اسی طرح کی کیفیت میں گزار کر ایک دن اُس نے فون پہ مرشد کریم سے بات کی۔ اُس نے سلام دُعا کے بعد عرض کی کہ لکھنے پڑھنے پہ طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

فرمایا۔ صدیوں کا غبار نکل رہا ہے تو خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ پھر دریافت کیا کہ کام کاج کیسا ہے؟ اُس نے عرض کی شکر ہے۔۔ گزارا ہو رہا ہے۔۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ کام کچھ بڑھ جائے۔

فرمایا۔ یہ بھی کوئی امتحان ہوگا۔ سب بہت بہتر ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ غصہ سے بچیں۔ اُس نے کہا۔ اپنے طور پر وہ کوشش تو بہت کرتا ہے کہ غصہ نہ آئے۔ ٹینشن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ غصہ بھی ٹینشن ہی کی وجہ سے آتا ہے۔

پھر سلسلے کے حوالے سے فرداً فرداً دریافت کیا۔ اُس نے نیاز صاحب کی چارسدہ پوسٹنگ اور پشاور مراقبہ ہال کی تعمیر کے مکمل ہونے کی بابت مطلع کیا تو فرمایا۔ یہ نیاز بھائی کے لئے بہت بہتر ہو جائے گا۔ اُس نے عرض کی کہ پشاور کے دوستوں نے بہت خلوص سے۔۔۔ بہت خوبصورت جگہ بنائی ہے جب آپ پنڈی آئیں تو پشاور بھی تشریف لائیں۔ فرمایا۔ ہاں پنڈی سے پشاور کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ پھر شاہین اور بچوں کو دعا اور پیار کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ فون بند کرنے کے بعد اُس نے اپنے اندر چہل اور چلبلاہٹ کی بجائے سناٹے اور ٹھہراؤ کو گہرا ہوتے اور پھیلتا محسوس کیا۔

پہلے جب کبھی وہ مرشد کریم سے فون پہ بات کرتا تو وہ کتنا ہی اداس اور افسردہ کیوں نہ ہوتا۔۔۔ وہ خوشی سے بھر جایا کرتا۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے۔ جب انہوں نے پہلی بار اُسے دُعا دیتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔۔۔ اُس وقت اُسے لگا تھا جیسے خوشی کا ایک ایسا پیڑ اس کے اندر اُگ آیا ہے جو ہر گزرتے لمحے بڑھتا اور پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ وہ ہر وقت خوشی کے احساس سے سرشار رہنے لگا تھا۔ اب یہ ٹھہراؤ اور سکون۔۔۔ اس کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ شاید وہ خوشی کے مفہوم کو اسی قدر سمجھا تھا کہ وہ خوشی کو

اک قہقہ بردار مسرت کے روپ میں خود پہ ہمہ وقت طاری دیکھنے کا متمنی تھا۔ اب جب وہ خوشی کی اصل سے واقف ہو رہا تھا تو اُس کو عجیب سالگ رہا تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کیفیت میں رہنے کا عادی ذہن بے کیفی کی لذت سے ابھی آشنا نہ تھا۔ مرشد کامل نے اُس کو یہ بات کچھ اس انداز سے تعلیم فرمائی کہ اب یہ کیفیت اُس پہ وارد ہو کر اُس کے ذہن کو اُس بات کا خوگر بنا رہی تھی جو بات اُس کو سمجھائی اور سکھائی گئی تھی۔

اس نتیجے پہ پہنچ کر اُس کو قدرے طمانیت کا احساس ہوا تو اُس نے سوچا کہ مرشد کریم سے بات کر کے یہ تو ہوا کہ اُس کو کسی نتیجے پہ پہنچنے میں مدد ملی۔ اب اُس کو اس بات پہ بھی کوئی حیرت نہ ہو رہی تھی کہ بظاہر اُس نے ایسی کوئی بات کہی بھی نہ تھی جس سے اُس کے اندر کی بات ظاہر ہوتی اور انہوں نے بھی اُس کے مسئلے پہ براہ راست کوئی بات نہیں کہی تھی۔ بظاہر سرسری اور رسمی سی باتوں کے بعد وہ اپنے اندر سکون اور ٹھہراؤ میں اضافہ ہی دیکھ رہا تھا۔

ایک دو روز میں وہ زندگی کے بہاؤ میں اسی طرح بہنے لگا جیسا کہ پہلے بہہ رہا تھا۔ لیکن اب اُس بہاؤ کو وہ اپنی مرضی سے موڑنے کی خواہش اور کوشش کرنے کی بجائے اُس کے ساتھ بہنے میں زیادہ لطف لینے لگا تھا۔

تقریباً ایک ماہ بعد خالد نیاز نے قلندر شعور کے نئے انگریزی ایڈیشن چھپنے کی اطلاع دی۔ تو وہ کھل اُٹھا۔ جس ملک میں طبع زاد کتب کا ایک ایڈیشن سالوں میں ختم نہ ہوتا ہو وہاں ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن سال بھر میں آ جانا۔۔۔ خوشی ہی کی بات تھی سو وہ خوش ہو رہا تھا۔ اُسی شام اُسے نیاز صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا حضور انگلینڈ جا رہے ہیں۔ اُس نے فون کیا اور کہا کہ اُس نے سُنا ہے کہ وہ انگلینڈ جا رہے ہیں۔ فرمایا۔ جی ہاں اس بار وہاں چھ ہفتے قیام رہے گا۔ پھر اُس نے کتاب کے بارے میں بات کی اور کہا کہ اس کا کور سادہ لیکن شاندار ہے تو فرمایا۔ یہ انگلینڈ کے حساب سے چھپی ہیں۔ وہاں نہ تو گرد ہوتی ہے اور نہ دھول اور پسینہ۔ وہاں ایسی ہی کتاب

چاہئے۔اُس نے انہیں مبارک باد پیش کی تو اُسے دُعا دیتے ہوئے فرمایا۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔آپ کو برکت دے،آپ کے کام میں برکت دے،آپ کو مزید روحانی علوم عطا فرمائے اور اُن کا مزید ذوق و شوق عطا فرمائے۔

فون بند کرنے کے بعد کئی روز تک وہ سرشاری کے کیف کا جھولا جھولتا رہا۔ پھر اس پینگ کو ایک اور ہلارا اُس وقت ملا جب اُسے منصور الحسن کا خط ملا۔خط میں انہوں نے ڈھیروں مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ مرشد کریم نے انگلینڈ سے واپس آکر مرکزی مراقبہ ہال میں قلندر شعور کی کلاس لی ہے تو اپنے انگلینڈ کے دورہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں انگریزوں کے ہاتھ میں قلندر شعور کی نئی کتاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مقصود صاحب کی روح خوش ہو رہی ہو گی۔ میں تو وہاں تھا ہی مجھے تو خوشی ہو ہی رہی تھی۔ پھر اُس کے لئے دُعا فرمائی کہ اللہ انہیں برکت عطا فرمائے انہوں نے سلسلے کے کام کو آگے بڑھانے میں میری مدد کی ہے۔

ایک دن وہ اپنے دفتر پہنچا تو اقبال قریشی صاحب کو وہاں موجود پایا۔وہ سلسلے کے ایک مخلص رکن اور مرشد کریم کے عاشقوں میں سے ایک ہیں۔انہیں دیکھ کے اُسے خوشی ہوئی۔انہوں نے اُسے بتایا۔ سلسلے میں آنے سے پہلے میری سوچ یہ تھی کہ اللہ کی اس کائنات کو چلانے میں کہیں نہ کہیں۔۔۔کچھ نہ کچھ میرا بھی کردار ہے۔۔۔میں نہیں کروں گا تو یہ کام کیسے ہو گا۔ لیکن مرشد کریم نے اب کچھ ایسا ذہن بنا دیا ہے کہ میں یہ سمجھ گیا ہوں کہ اس کائنات کو اللہ ہی چلا رہا ہے اور میں تو اُس کو اسے چلاتے ہوئے بھی نہیں دیکھ پا رہا تو میرا دل اور حصہ کیسا۔اب میں دیکھتا ہوں کہ میں نہ بھی کروں تب بھی وہ کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ وہ دیر تک اُن کی اس بات سے محظوظ ہوتا رہا۔

انہوں نے باتوں باتوں میں اُس سے پوچھا کہ کیا وہ کراچی جائے گا؟ کس سلسلے میں ؟اُس نے دریافت کیا۔انہوں نے بتایا کہ بابا جی کی چھوٹی صاحبزادی حنا کی شادی ہے۔ نیاز صاحب اور وہ مرشد کریم کو بابا جی ہی کہتے ہیں۔اُس نے کہا اگر اُسے مدعو کیا گیا تو وہ ضرور جائے گا لیکن اس طرح جانا کہیں غلط ہی نہ ہو جائے۔اُن کے لئے کسی کوفت کا باعث بننے کے خیال سے ہی اُس کو ہول آتا تھا۔

شام کو وہ گھر پہنچا تو اُس کی بیوی نے اُس کو حنا کی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ دکھایا۔وہ دیر تک اُس دعوت نامہ کو دیکھتا رہا۔اُس نے دل ہی دل میں اپنے مراد کو تھینک یو اور بیوی سے شادی میں شرکت کی تیاری کرنے کا کہا۔

معلوم ہوا کہ نیاز بھائی بھی کراچی جا رہے ہیں تو پروگرام یہ بنا کہ وہ سب ایک ہی دن ایک ہی ٹرین سے کراچی جائیں۔ ساتھ بھی رہے گا اور گپ شپ بھی۔اُس نے یہ بات فوراً مان لی۔اب اُس نے اپنے اندر ایک تبدیلی یہ نوٹ کی تھی کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی بجائے سلسلے کے بہن بھائیوں کے ساتھ بات چیت کرنا اُسے بھاتا تھا۔ شاید اس لئے کہ سب ایک دوسرے کی عزت کرتے ، ہم ذہن ہونے کے سبب ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھتے تھے۔ایک مشترکہ بندھن میں بندھے ہونے کے سبب ایک سی باتیں کرتے یا پھر یہ کہ اب وہ خود کو ایک گروہ ہی مانتے تھے۔

لاہور سے آگے جب ٹرین کی رفتار ہموار ہو گئی اور وہ آمنے سامنے بیٹھے ایک ادبی و شعری محفل گرما رہے تھے کہ ٹکٹ چیکر آیا۔ گہری رنگت، ڈھیلی ڈھالی وردی، کھوئی کھوئی آنکھوں والا۔۔۔ کام کو ایک طرح کی بے گار سمجھ کر کرتا۔۔۔ ٹکٹ چیک کرتے ہوئے اُس نے اُن کی باتیں سنتے ہوئے پہلے تو ایک لقمہ دیا، پھر اجازت ہے۔۔۔اور۔۔۔بھائی صاحب ذرا جگہ دیں کہہ کر اُن کے ساتھ ہی آن بیٹھا۔ شروع میں اُسے اُس کا وہاں بیٹھنا گوارا خاطر ہوا۔۔۔ لیکن جب اچانک ہی اُس نے حج کا لغوی مطلب اجتماعی غور و فکر بتایا تو سب یک دم ہی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اُس نے حج کو حجت سے جوڑتے ہوئے کہ اللہ تعالی نے اس اجتماع المسلمین کو سال میں ایک بار اس لئے فرض کیا تا کہ ہم ایک بار مل بیٹھ کر اجتماعی طور پر ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کر کے پورا سال اُس کے مطابق چلیں اور پھر اگلے سال نہ صرف سالِ گزشتہ کی کارگزاری کا جائزہ لیں بلکہ آئندہ اُن غلطیوں سے اجتناب کی سبیل کریں جو اس سال ہو چکی ہوں۔ اسی لئے یہ کہا گیا کہ جو حج کر لیتا ہے اُس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گناہ اس لئے معاف نہیں ہوتے کہ آپ کچھ مقامات کی Site Seeing کے اہل ہیں۔ یہ سوچ اللہ کے نظام انصاف سے ایک بھیانک مذاق کے علاوہ کچھ نہیں۔۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے۔

اب اُن کو اُس سے اتنی دلچسپی محسوس ہونے لگی کہ وہ اُس سے کچھ مزید سننے کے لئے آمادہ و تیار تھے۔ اُس نے اُس سے دریافت کیا۔ آپ کے نزدیک تسبیح کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ اُس نے اُس کی بات کا جواب دینے سے پہلے اپنی سگریٹ جو دوران گفتگو بجھ گئی تھی دوبارہ سلگائی۔ شاید اس طرح وہ سوچنے کو درکار وقت حاصل کر رہا تھا۔ ایک دو کش لے کر جب اُس نے محسوس کیا کہ اب وہ جلدی نہیں بجھے گی تو اُس نے کہا۔۔ ڈیوٹی۔۔۔ ڈیوٹی کرنا ہی تسبیح ہے۔

وہ منتظر تھے کہ اتنی تیاری کے بعد اب وہ کوئی تقریر کرے گا لیکن اُس نے بات ختم کر کے ایک دو کش لئے اور انہیں اشعار سنانے لگا۔ کافی دیر بعد جب گاڑی آہستہ ہونے لگی اور ڈبے میں کچھ ہلچل بیدار ہوئی تو وہ چونکا۔ ارے رحیم یار خان آ گیا۔ میری ڈیوٹی یہاں تک ہی تھی۔ جب وہ اُن سے اجازت لے کر جانے لگا تو اُن سب نے کھڑے ہو کر اُس سے ہاتھ ملایا۔ وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

اُس کے جانے کے بعد سب اُس کے بارے میں سوچ رہے تھے اور بات بھی کر رہے تھے۔ اُس نے سوچا اتنا قابل آدمی اور اجلے ذہن کا مالک، شعری ذوق اور جمالیاتی حس رکھنے والا بندہ سارا دن کیسے کیسے لوگوں کو دیکھتا اور سہتا ہے۔ کراچی پہنچ کر وہ اپنے

مراد سے اس کے بارے میں ضرور بات کرے گا اور انہیں اُس کی سُنی ہوئی بات بتا کر اُن سے ان باتوں کی تصدیق کروائے گا۔ اور پھر وہ یہ اندازہ کرنے میں لگا رہا کہ بھلا وہ اس کی بابت کیا کہیں گے۔

اچانک اُس نے خود سے پوچھا پہلے تو تم خود ہی سارے فیصلے کر لیا کرتے تھے اب اس بندے کی اتنی اچھی بات ماننے کے لئے بھی تم اُن سے بات کرنا کیوں ضروری سمجھ رہے ہو؟ اُس نے ٹرین سے باہر تیز رفتاری سے گزرتے مناظر کو بے دھیانی سے دیکھتے ہوئے جوابی جملہ سوچا۔ پہلے میں کسی کو باپ بھی تو نہیں مانتا تھا اور پھر خود ہی اپنی بات پہ خود کو داد دینے کو مسکرا دیا۔

کراچی سٹیشن پر اتر کر انہیں احساس تو یہ ہوا کہ وہاں پشاور کی نسبت سردی بالکل ہی نہیں ہے کیونکہ ایک سویٹر میں انہیں پسینہ آ رہا تھا لہذا اُنھوں نے اپنے کوٹ اور جیکٹیں اتار کر ہاتھوں میں زائد سامان کی طرح اُٹھا لئے۔ راستے میں نیاز صاحب نے تجویز کیا کہ ایک گاڑی میں سامان کے ساتھ ایک صاحب سیدھے مراقبہ ہال چلے جائیں اور دوسری گاڑی میں وہ راستے میں ڈی۔ ۳۲ میں رُک کر۔۔ حضور باباجی سے مل کر۔۔۔ مراقبہ ہال پہنچیں۔ سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔

جب وہ ڈی۔ ۳۲ پہنچے تو حضور گھر کے اندر تشریف فرما تھے۔ انہیں اندر آتا دیکھ کر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن سے گلے ملنے کے بعد خواتین کے سر پہ ہاتھ رکھ کے اُن کے سلام کا جواب دیتے فرمایا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ گورے گورے لوگ کہاں سے آ گئے۔ سبھی کھل اُٹھے۔ کچھ اپنے سچ مچ گورے ہونے کے سبب اور کچھ اپنے معنوی طور پر گورا ہونے کا سمجھتے ہوئے۔

سب اُن کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ خیر و عافیت، سفر کیسا گزرا۔ پوچھنے کے بعد فرمایا۔ زندگی بھی تو ٹرین کا ایک سفر ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس ٹرین سے جو اک بار اتر جائے دوبارہ اس پہ سوار نہیں ہو سکتا۔

مرید نے ٹرین میں ملنے والے ٹکٹ چیکر کا بتایا تو فرمایا۔۔۔جی ہاں۔۔ایک سے ایک پڑا ہے۔

پھر تسنیم بھابھی اور شاہین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ حنا بہت نصیب والی بچی ہے۔ اس کی شادی پر جتنے لوگ آئے ہیں اس سے پیشتر کسی بچے کی شادی پہ نہیں آئے۔

پھر انہیں گھر پہ ہی رُکنے اور قیام کرنے کا کہا اور حمیرا بھابی سے نیاز بھائی اور اُن کے لئے ایک ایک کمرے میں فرشی بستر لگانے کا کہا۔ شاہین اور تسنیم بھابھی حمیرا بھابھی کا ہاتھ بٹانے کو اُٹھ کر اُن کے ہمراہ چلی گئیں۔

شاہین کی بابت تبصرہ کیا۔ یہ تو دودھ پینے والی لیلیٰ ہیں۔ پھر اُس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ ٹھپہ اوپر سے لگا ہوا آیا ہے۔ مرید نے ہنس کر کہا جی ہاں مجھ پر شاہین کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ مسکراتے ہوئے کہا۔۔جی ہاں۔۔میاں تو بیوی کا غلام ہی ہوتا ہے۔

گھر میں خواتین کو صفائی کرتے دیکھ رہے تھے۔ فرمایا۔ بڑا گھر اس لئے بھی بہتر نہیں ہوتا کہ خواتین کو ہر روز ہفتہ صفائی منانا پڑتا ہے۔ بھئی یہ سب پاور کی وجہ سے ہی ممکن ہوا ہے اللہ جب ایک کام کرواتا ہے تو ہم ذہن لوگ ملوا دیتا ہے۔

شادی کے بارے میں کہا کہ خوشی کو شادی کہتے ہیں مگر یہ خوشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہتی۔ اندیشوں اور وسوسوں سے دھندلا جاتی ہے۔ اگر آدمی روٹین میں چلتا رہے تو شادی کی خوشیاں ماند نہیں پڑتیں۔

پھر ایک بات یہ ارشاد فرمائی۔ ہم منافقت بہت کرتے ہیں۔ سب بُرائی کو چھپاتے ہیں۔ بھئی جب ایک بات کو بُرا جانتے ہو تو اُسے کرتے ہی کیوں ہو؟ اصل میں انسان برائی کو نہیں اپنی کمزوری کو چھپاتا ہے۔ اخفا کو ارتقا سی لئے تو کہا گیا ہے۔ انبیاء کرام کے یہاں اندر اور باہر سب ایک سا ہے۔ اگر مکھن چُرایا تو وہ بھی سامنے اور اگر گوپیوں کا بانسری بجا کر رجھایا تو وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ حضور

ﷺ کی زندگی میں بھی سب کچھ لوگوں کے سامنے ہی رہا۔ تیرہ شادیاں بھی۔ اگر اپنوں نے عقیدت میں کچھ نہیں کہا تو غیروں یعنی کفار اور یہودیوں نے کیوں نوٹس نہیں لیا۔ خیر اب تو اسے کسی اور وجہ سے اچھالا جاتا ہے۔

فرمایا باہر کے لوگوں میں منافقت نہیں ہوتی۔ وہ بُرائی کو بُرائی ہی نہیں سمجھتے اس لئے جو کچھ کرتے ہیں سرِ عام کر لیتے ہیں۔ میں نے ایک بار ایک صاحب سے انگلینڈ میں کہا کہ ماں کی خدمت کیا کرو۔ اُس نے صاف کہہ دیا۔ میں اُس سے ناراض ہوں۔ میں اُس کی خدمت کیوں کروں؟ منافقت نہیں کی۔

مرید نے عرض کی جب سب ہی منافقت کر رہے ہیں تو ہمارے لئے کون سا راستہ رہ جاتا ہے؟ کیا ہم بھی منافقت کریں؟

فرمایا۔ انبیائے کرام کا طرزِ عمل ہی بہتر راستہ ہے۔

مرید نے سوچا کہ بُرائی کو چھپانا منافقت ہوئی اور خوبی کو بڑھا کر بیان کرنا شیخی اور کبر ہوا تو پھر اخفا کا ارتقا سے تعلق کیسے بنا؟ پیشتر اس کہ وہ دلیل کا سہارا لے کر اپنے منہ سے ادا کرتا۔ فرمایا۔ ابھی بتایا نا کہ کمزوریوں کو چھپانا ہی ارتقا کا سبب بنتا ہے اور یہی لوح و قلم میں بھی لکھا ہے۔

مرید نے عرض کی۔ جب منافقت چھوڑ دیں تو لوگ سیدھی بات کہنے کے چکر میں سختی اور تند خوئی کا شکار ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کم از کم وہ کوئی منافقت تو نہیں کر رہے۔ کیا یہ طرزِ عمل مناسب ہے؟

ناگواری سے فرمایا۔۔ یہ تو منافقت سے بھی زیادہ بری بات ہے۔ یہ تو کبر ہو گیا۔ منافقت کا مواخذہ نہیں لیکن کبر کا ہے اور بہت سخت ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مرید نے بتایا لوگوں کا ہے اور بات اپنی سُنا کر کچھ رعایت چاہ رہا ہے۔ اس لئے بجائے کوئی رعایت

دینے کے اُس کی سوچ میں موجود خامی کی نشاندہی کرنے کے بعد اس کی بیماری کا علاج تجویز کرتے ہوئے کہا۔اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی دھیمی آواز میں بات کرے۔۔دوسروں کو حقیر نہ جانے۔

اتنے میں کھانے پہ بلایا گیا۔ مرشد کریم اُٹھے اور کہا آئیں نیاز بھائی۔۔۔اسلام کا چھٹا رکن ادا کر لیں۔ کھانے کی وہی میز جہاں ایک عید کے دن اُس کا مرِاد سر جھکائے اپنی پلیٹ میں رکھے چند چنے کے دانوں کو انگلیوں سے سمیٹ کر نوالے کی صورت پکڑنا چاہ رہا تھا کہ اک اجنبی نے اُن کی سرپرستی کی درخواست کی تھی اور آج وہ اُن کے گھر میں بلائے ہوئے مہمان کی طرح اُن کی میز بانی سے سرفراز ہو رہا تھا۔اُس نے سوچا۔اتنا بہت سا پانی بھلے ہی پلوں کے نیچے سے بہہ گیا ہو۔۔۔اُس نے بھی تو اتنا بہت سا فاصلہ طے کر ہی لیا ہے۔۔۔۔اک اجنبی اور انجان سے۔۔۔اک مہمان ہونے تک کا فاصلہ۔۔احساس تشکر کے ابلتے چشمے کے نمکین پانی کو آنکھوں کی راہ بہنے سے روکنے کے لئے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نیاز صاحب کے بند جانے کب کے ٹوٹ چکے تھے وہ رومال سے آنکھیں پونچھتے۔۔ مرشد کریم کی اپنی طرف بڑھائی ڈش کو تھام رہے تھے۔

مرید نے چھٹے رکن کی بابت جاننے کی خواہش کی تو بتایا۔ کہ ایک فقیر کے پاس ایک مفتی صاحب آئے۔ بتایا کہ وہ حج پہ جا رہے ہیں۔ فقیر نے مفتی صاحب سے دریافت کیا؟ آپ نے اسلام کے کتنے ارکان پورے کیے۔انہوں نے کہا حج ہو جائے گا تو پانچوں پورے ہو جائیں گے۔ فقیر نے دریافت کیا۔ لیکن چھٹے رکن کا کیا ہو گا۔پہلے تو وہ سٹپٹائے پھر کہا کہ اسلام کے کل پانچ رکن ہیں۔ فقیر نے اپنی بات پہ اصرار کیا اور کہا کہ پانچ نہیں چھ ارکان ہیں اور سب سے ضروری یہ چھٹا رکن ہی ہے۔ مفتی صاحب جز بز ہوتے وہاں سے اُٹھ گئے اور پھر حج پہ روانہ ہو گئے۔حج سے واپسی میں وہ جہاز سے سمندر میں گر گئے۔ جہاز والوں کو اُن کے گرنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔وہ تیرتے ہوئے ایک ویران جزیرے تک پہنچ گئے۔وہاں آدم نہ آدم زاد۔

اِدھر اُدھر پھرتے انہیں دو ایک دن ہو گئے۔۔۔وہاں نہ کھانے کو کچھ اور نہ پینے کو۔ تیسرے دن ایک بندہ خدا نظر آیا۔ انہوں نے اُسے پکارا۔اُس سے کچھ کھانے کو پوچھا۔وہ رُکا اور پوچھا۔ کھانے کے عوض کیا دو گے۔اُن کے پاس تھا ہی کیا۔جو کچھ ساتھ تھا وہ تو جہاز میں رہ گیا تھا۔اُس بندے نے ایک روٹی کے عوض اُن سے اُن کی زندگی بھر کی نیکیوں میں سے نصف اپنے نام لکھوالیں۔ روٹی کھا کر جب پیاس بھڑکی تو وہی بندہ پھر سامنے آیا اور باقی نصف نیکیاں بھی اپنے نام لکھوا کر انہیں پانی کی ایک چھاگل دے کر وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں سے گزرتے ایک جہاز والوں نے انہیں اُس ویران جزیرے سے اُٹھا لیا۔ جب وہ فقیر سے ملے تو فقیر نے اُن سے چھٹے رکن کی بابت دریافت کیا۔جب مفتی صاحب نے اپنی بات پہ اصرار کلیا تو انہوں نے اپنے تکیے کے نیچے سے اُن کے ہاتھ کی وہ تحریر جو انہوں نے روٹی اور ایک چھاگل پانی کے عوض لکھ کر دی تھی نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی اور کیا۔ یہ ہے چھٹا رکن۔

فرمایا غریب آدمی کا کیا ہے۔بے شک اُس کا ایمان خرید لو۔رہا حضور ﷺ کے متعلق یہ تصور کہ خدانخواستہ وہ کوئی غریب آدمی تھے۔۔۔ بالکل درست نہیں۔۔۔اُس دور میں کسی کے پاس اگر ایک بھی اونٹنی اپنی ہوتی تو اُسے ایک اچھا خاصا متمول انسان سمجھا جاتا تھا۔ حضور ﷺ کے پاس تو ایسی کئی اونٹنیاں تھیں۔اپنے وقت کی پانچ نادر روزگار اونٹنیاں تھیں۔آج کل کی رولس رائس گاڑیاں ہی سمجھیں اور پھر ایک سے ایک اعلیٰ تلوار تھی۔ کوئی دو شاخہ تو کوئی دو دھاری۔اُن میں سے بعض کے دستے جڑاؤ تھے اُن میں ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ ترکی کے عجائب گھر میں آپ ﷺ کی ایسی کئی اشیاء آج بھی رکھی ہوئی ہیں۔نہ جانے انہیں کیسے آب دی گئی تھی کہ آج تک اُن پر زنگ نہیں لگ سکا۔انہیں دیکھ کر بھی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ حضور ﷺ ایک غریب آدمی تھے۔۔تو اُس کی مرضی۔۔ لیکن یہ بات ہمیں تو سمجھ نہیں آتی۔۔جب اُس دور کے کپڑے آج تک محفوظ ہیں تو اُن کی کوالٹی کا

بھی تو کچھ اندازہ ہوتا ہی ہے نا۔اب جس دور میں کپڑا ہی عام نہ تھا اُس دور کا اُن سے منسوب جبہ ودستار دیکھیں وہ مخمل ہی تو ہے۔اب ظاہر ہے کہ کوئی غریب آدمی مخمل کہاں پہن سکتا ہے۔

پھر حضور ﷺ عود کا عطر استعمال فرماتے تھے۔آج کل عود کی لکڑی پینتیس ہزار ریال فی کلو ہے۔یہ لکڑی اُس وقت بھی عرب میں تو ہوتی نہیں تھی۔ہندوستان سے ہی آتی ہو گی۔ظاہر ہے جب حضور ﷺ خود اتنا قیمتی عطر استعمال کرتے تھے تو دوسروں کو بھی دیتے ہوں گے۔مہمانوں کے وفود آتے تھے۔۔۔سب اصحاب صفہ اُنہی کے مہمان تھے۔۔۔یہ سب غریبی میں کہاں ممکن تھا؟

اُس زمانے میں چھت ہونا ہی اسٹیٹس کی علامت تھا۔بدو تو آج بھی خیموں میں ہی رہتے ہیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے کھانے کے برتن اور کٹلری چین سے آتی تھی۔یہ سب باتیں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب میں تحریر کی ہیں۔لیکن ہم پڑھتے ہی کب ہیں؟پڑھ لیں تو سمجھتے ہی کتنا ہیں۔

فرمایا۔اللہ نے کائنات اسٹیٹس پر بنائی ہے۔آپ جس اسٹیٹس پر قائم ہو جائیں گے اللہ اُس کے مطابق وسائل فراہم کر دیتا ہے۔

بتایا کہ پورا قرآن فعلن فعلن فعل کے وزن پر ہے اور پھر سورہ کوثر کی تلاوت کر کے اُس کی تقطیع کر کے بتایا۔مرید نے حیرت سے کہا۔یہ تو عجیب بات معلوم ہوئی۔شفقت سے فرمایا۔مجھے خود حضرت قلندر بابا اولیاؒ نے بتائی تھی۔بھئی ساڑھے تئیس سال تک ایک ہی وزن میں بات کہنا۔۔معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔پھر بتایا کہ روحانی ڈائجسٹ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔جس میں

قرآن میں ۱۹ کے ہندسے کے کمالات کا تذکرہ تھا۔ جیسے ۱۱۴ سورتوں کا حاصل ضرب ہونا۔ الفاظ کی تعداد کا ۱۹ سے مکمل تقسیم ہونا وغیرہ۔

مرید کو خیال گزرا کہ قلب انسانی سے لے کر کائنات تک ہر شے کی دھڑکن میں بھی تو ایک آہنگ، ایک سر اور ایک تال ہے۔۔۔ وہ بھی شاید فعلن فعلن فعل ہی کی عنایت کے وزن پر ہو۔۔۔ تبھی تو پورا قرآن اسی وزن میں نازل کیا گیا ہے۔

کھانے کی میز سے اُٹھے تو فرمایا۔ میرے بڑے بھائی مولانا ادریس احمد انصاری اور اُن کی بیگم صاحبہ کو لینے ایئرپورٹ جانا ہے آپ سفر سے آئے ہیں تھکے ہوئے ہیں۔ آپ کچھ آرام کر لیں۔ واپسی پہ ملاقات رہے گی۔

شادی والے گھر میں جو افراتفری اور ہڑبونگ دیکھنے کے ہم اس قدر عادی ہیں کہ اس موقعے پر ہر بے ترتیبی اور بے نظمی کی یہ توجیہہ بہت کافی جانتے ہیں کہ شادی والا گھر ہے ایسا تو ہوتا ہی ہے۔۔۔ لیکن اُس کو اس قسم کی کوئی بات وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر کام ہو رہا تھا۔ حضور سب سے مل رہے تھے سب کو اُن کی خواہش اور توقع کے مطابق کوئی نہ کوئی بات بھی بتا رہے تھے۔ اُس نے کمرے میں لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

نیم غنودگی میں اُسے خیال آیا کہ لوگ کہتے ہیں سب کو خوش نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ اس بات کی سند اور دلیل میں یہ تک کہہ دیا جاتا ہے کہ سب کو تو اللہ خوش نہیں رکھ سکتا تو ہم آپ کیا رکھیں گے۔۔۔ اس لئے صرف اپنی خوشی کا خیال رکھو۔۔ اُس نے سوچا لیکن اُس کے مرشد کریم کے ارد گرد جتنے بھی لوگ اُس نے دیکھے ہیں وہ سب ہی اُن سے خوش ہی ہیں۔۔ اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ خود خوش رہنا جانتے ہیں اور خوشی ایک ایسی چیز ہے جس کو جتنا بانٹا جائے وہ اُسی قدر بڑھتی اور پھیلتی ہے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ دوسروں کی خوشی کا خیال رکھتے ہیں۔ اس بات کو سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادی میں اتر کر کہیں کھو گیا۔

اچانک اُس نے دیکھا کہ وہ ایک عالی شان محل کے شاہی دربار میں موجود ہے ہر طرف ایک چہل پہل اور رونق کا سماں ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ شاہی سواری آرہی ہے۔ سب ادب سے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو چکے ہیں۔ کوئی اُسے ٹہوکا دیتا ہے کہ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہو جائے۔ وہ اس کو نظرانداز کر دیتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ بادشاہ سلامت قریب آجائیں تو وہ اُٹھ کھڑا ہو گا۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ شاہی بگھی سے کوئی اور نہیں خود اُس کا مراد اتر رہا ہے۔ وہ ہڑ بڑا کر اُٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ اسی کمرے میں تنہا سچ مچ کھڑا ہوا ہے۔ نیند سے عالم بیداری میں منتقل ہو چکا ہے۔ خواب میں محسوس کی گئی کیفیت اُس کے حواس پہ اس قدر طاری تھی کہ وہ بیداری میں بھی اُسی طرح ادب سے کھڑا تھا۔

یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ خواب سے بیدار ہوا ہے۔۔۔ لیکن محض آنکھ کھلنے کی بجائے خود کو مودب اور ایستادہ پانا۔۔۔ وہ دروازہ کھول کر باہر کی طرف نکلا۔ ہال کمرے میں کوئی نہ تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ لان کی طرف کا دروازہ کھول کر مین گیٹ کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر کہ سامنے سے مرشد کریم آرہے ہیں۔۔ اُس کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔۔ یک دم مودب ہو کر ایک طرف ہٹتے ہوئے اُس نے دروازہ کھول کر اُن کو اندر جانے کی راہ دی۔ مہمانوں کو ساتھ لئے وہ اندر داخل ہوئے اور وہ اک عالم حیرت میں اپنی کیفیت اور اس تجربے پہ سوچتا باہر لان میں پڑی ایک کرسی پہ جا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد شاہین باہر آئی اور بتایا کہ نیاز بھائی اور بھابھی کسی سے ملنے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ شام کو واپس آنے کا کہہ کر گئے ہیں۔ پھر بتایا کہ ابا حضور اُسے اندر طلب فرما رہے ہیں کہ آکر چائے پی لیں۔

مرشد کریم کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے انہیں اپنے بھائی کی تواضع کرتے دیکھ رہا تھا۔ ادریس صاحب بزرگانہ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ اُن کی بات سُن کر سر ہلا دیتے۔ امی حضور اور حمیرا بھی مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ بچے بھی

اپنے تایا جان کے پاس سعادت مندی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہر ایک کے ساتھ شفقت بھرا سلوک فرما رہے تھے۔۔ خاندان کے لوگوں میں وہاں وہی ایک غیر تھا لیکن کوئی وہاں اُسکی موجودگی کا نوٹس لے رہا تھا اور نہ ہی کوئی برا منا رہا تھا۔

نکاح کی تقریب سے پیشتر پھول اور اشیائے خورد و نوش کی خریداری کے لئے روانہ ہوئے تو اُسے اپنے ہمراہ آنے کا کہا۔ حیدری سے نمکین دال سوئیاں وغیرہ خرید کر دکاندار کو ادائیگی کی۔ جب اُس نے بقایا رقم واپس کی تو اُس میں کچھ ریزگاری اور دو تین انتہائی میلے نوٹ شامل تھے۔ آپ ریزگاری لینے کو ہاتھ پھیلا چکے تھے۔ جونہی اس کے ہاتھ میں پکرے میلے نوٹ دیکھے تو جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور اسی ہاتھ سے وہاں رکھے نمکو کے تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔۔ ان پیسوں کی یہ دے دیں۔

میلے نوٹوں نے طبیعت میں جو تکدر پیدا کیا اُس سے نمٹنے کا سلیقہ دیکھ کر مرید عش عش کر اُٹھا۔ اگر آپ چاہتے تو دکاندار سے کہہ کر نوٹ تبدیل بھی کروا سکتے تھے لیکن اس سے دو باتیں ہوتیں ایک تو دکاندار پہ اُن کی نفاست طبع کا حال کھلتا اور دوسرے ہو سکتا ہے کہ دکاندار کے پاس نئے نوٹ نہ ہوتے۔۔۔ انہوں نے دونوں ہی صورتوں کو ایک سیکنڈ کے کسی ایک حصے میں جانچا، تولا رد کیا اور ایک اور شے بدلے میں طلب کر لی۔ جتنی دیر میں دکاندار نے مطلوبہ شے تول کر اُن کے حوالے کی۔ آپ نے فقط اتنا فرمایا۔ یہ نوٹ جانے کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھوں سے گزرتے ہیں۔

سامان کے تھیلے اُس نے پکڑے اور وہاں سے پھولوں کی دکان کا رخ کیا۔ جتنی دیر میں پھول پیک ہو رہے تھے ارشاد فرمایا۔ جن شہروں میں پھولوں کا کاروبار ہوتا ہے وہاں کے لوگ خوشحال ہوتے ہیں۔ پھولوں کا کاروبار لوگوں کے ذہنی رجحان کی علامت ہوتا ہے۔ یورپ کے کئی شہروں کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ وہاں کے لوگوں میں جمالیاتی ذوق اور فطرت سے لگاؤ یہاں سے کہیں

زیادہ ہے۔ جونہی دیکھا کہ دکاندار اُن کی بات سُن کر اُن کی طرف متوجہ ہے تو اُسے مخاطب کر کے دریافت کیا۔۔ کیوں بھئی کراچی کے لوگ بھی خوشحال ہیں نا۔۔ اُس نے کہا۔ سب تو نہیں۔۔ فرمایا۔۔ جی ہاں سب تو نہیں۔۔۔ اور آگے بڑھ گئے۔

ایک ٹھیلے والے سے بھاؤ دریافت کر کے پھل لئے۔ پیسے دینے کو جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے تو ساتھ میں کاغذ کی ایک پرچی بھی آگئی۔ اُس پرچی کو پڑھ کر پھاڑتے ہوئے فرمایا۔۔ اللہ تو بغیر کسی حساب کے دیتا ہے اور بندہ حساب کتاب میں لگا رہتا ہے۔ مرید نے اپنی سوچ کی روشنی میں عرض کیا۔ انسان مصروف رہنے کو ایسا کرتا ہے۔

فرمایا۔ یہ کیا مصروفیت ہوئی۔۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ انسان اپنے لئے سانس گنے۔۔ اس میں احتیاط کرے گا تو عمر میں کچھ اضافہ ہی ہو جائے گا۔۔ یہ روپے پیسے گننا کہاں کی مصروفیت ہوئی۔۔۔ ہر قدم پہ ایک سبق۔۔۔ ہر لحظہ ہے مومن کی نئی ان۔۔

مرید نے دریافت کیا۔۔ حضور یہ فیض سے کیا مراد ہے؟

فرمایا۔ لوگ نہ جانے فیض کسے کہتے ہیں۔ فیض سے مراد رنگ چڑھنا، اگر کسی پہ کسی کا رنگ چڑھ گیا تو یہ فیض ہوا۔۔۔ ویسے طرزِ فکر میں تبدیلی ہونا ہی فیض ہے۔۔ لیکن یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کسی پہ چند چھینٹے اُس رنگ کے پڑ گئے جیسے کوئی ہاتھ دھو کر جھٹک دے اور چند قطرے آپ پہ آن گرے۔۔۔ ویسے لوگ تو فائدے کی بات کو ہی فیض مانتے ہیں۔

مرید نے دُعا کی کہ اللہ اُس کو اپنے مراد کا فیض نصیب فرمادے۔

واپسی پہ مرید نے چوتھی بین الاقوامی روحانی کانفرنس جو حیدر آباد میں ہونا تھی کی بابت انگریزی میں مقالہ پیش کرنے کی اجازت مانگی تو فرمایا۔ ہاں، ہاں، ہاں کیوں نہیں۔۔ ورائٹی ہو جائے گی۔۔ پھر اُس نے موضوع کی بابت دریافت کیا تو فرمایا۔۔ آپ

لوح و قلم کے حوالے سے ہی کچھ کہیں۔۔۔ بھئی بندے کو ایک لائن پکڑنی چاہئے۔۔اور پھر آپ کی تو یہی لائن ہے۔۔یہی بہتر رہے گا۔

گھر پہنچ کر حضور تقریب میں شامل ہونے والے مہمانوں سے ملنے جلنے میں مصروف ہوگئے۔جب طاہر جلیل صاحب دُلہا بنے اہلِ خانہ کے ہمراہ آئے۔۔۔تو مرشد کریم نے استقبال کیا۔انہیں اور ان کے ہمراہ آنے والے مہمانوں کو ہار پہنائے گئے۔۔۔ نکاح کی تقریب ہوئی۔۔۔باراتیوں اور مہمانوں کی تواضع کے بعد بیٹی بابل کا گھر چھوڑ گوجرانوالہ رخصت ہوگئی۔سب سے چھوٹی بیٹی کے گھر سے جانے کے بعد اُس کے بابل نے اُس کی جدائی کو جس طرح محسوس کیا وہ سب نے دیکھا۔اُن کے افسردہ ہونے سے وہاں سب ہی پہ مردنی چھاگئی۔ڈولی اُٹھنے کے بعد تو یوں بھی گھر جیسا ویرانہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

صبح مراقبہ گھر ہی پہ ڈرائنگ روم میں ہوا۔مراقبے کے بعد ارشاد ہو یہ کیسے پتہ چلے کہ پہلے دن نہیں بلکہ رات پہلے تھی؟ مرید نے عرض کی۔۔اس کے لئے تو دو دلائل دیے جا سکتے ہیں۔پہلی دلیل تو یہ ہے کہ قمری تاریخ شام کو سورج ڈھلنے کے بعد آغاز ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ بائیبل میں آتا ہے کہ خدا نے کہا روشنی اور روشنی ہوگئی۔۔۔یعنی پہلے تاریکی اور رات ہی تھی روشنی کو اللہ نے بعد میں تخلیق کیا۔

فرمایا۔جی ہاں۔۔۔اب یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں کیا ہیں؟

فرمایا۔دراصل یہ دونوں خلا ہیں۔دن میں رات نکالتے ہیں اور رات میں سے دن۔ادھیڑ لیتے ہیں دن پہ سے رات اور رات پر سے دن۔۔۔یعنی اُدھیڑ اور بن رہے ہیں۔ہاتھ سے ادھیڑنے کے عمل کا اشارہ کر کے دکھاتے ہوئے پوچھا اگر کسی بننے ہوئے

کپڑے یا سویٹر کو ادھڑیں تو کیا بچے گا؟

مرید نے کہنا چاہا۔۔۔دھاگہ باقی بچا لیکن خاموش رہا۔ فرمایا۔۔ کچھ نہیں۔۔ یعنی کچھ باقی نہیں بچا۔۔ بھئی سب خلا ہے۔۔ خلا میں ایک قسم کے حواس بھر جاتے ہیں تو وہ دن کہلاتا ہے اور جب دوسری قسم کے حواس بھر جاتے ہیں تو رات کہلاتی ہے۔ یہ دن اور رات دراصل حواس کی سپیڈ کے نتیجے میں بنتے ہیں اور دونوں ہی دھوکا ہیں۔ جب حواس کی رفتار کم ہو جاتی ہے تو دن کہلاتا ہے اور جب حواس کی رفتار تیز ہو جاتی تو اُس کو رات کہہ دیتے ہیں۔ یہ سب لطائف وغیرہ بھی خلا ہی تو ہیں۔۔۔ کہہ کر بات ختم کر دی۔

اتنے میں شاہین نے چائے پیش کی۔ چائے میں چینی ڈالتے ہوئے چینی کے چند دانے پیالی سے باہر طشتری میں گرے تو فرمایا۔ گھروں میں صفائی، خلوص اور سلیقہ ہونا ضروری ہے۔ آپ سے چینی پیالی سے باہر گر جاتی ہے آئندہ نہ گرے۔ دراصل آپ کو کبھی کسی نے یہ بتایا نہیں۔

پھر کہا کہ ایک بار حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے کسی سے فرمایا۔ خواجہ صاحب تو سوئی ہیں۔ فرمایا یہ بات سُن مجھے کچھ رنج سا ہوا کہ میں اتنا حقیر ہوں۔ جب حضور کو خبر ہوئی تو فرمایا۔ ارے بھئی میرا مطلب یہ تھا کہ خواجہ صاحب ہر طرح کے حالات سے گزر جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سوئی سے مخمل سی لو۔۔۔ ٹاٹ سی لو۔۔۔ وہ ہر قسم کے کپڑے سے گزر جاتی ہے۔

اسی نشست میں یہ بات بھی فرمائی کہ قرآن میں جن اشیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب انسان کے لئے مفید ہیں اور اُس کو فائدہ دیتی ہیں۔ زیتون کو دیکھیں اس کے تیل میں کولسٹرول نہیں ہوتا۔ زیتون کا تیل انگلیوں پہ لگ جائے تو صرف پانی سے ہاتھ دھو لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ صابن کے بغیر بھی ہاتھ صاف ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس کے تیل کو جلائیں تو وہ دھواں نہیں دیتا۔ اسی طرح شہد کی مکھی کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ اُس کو وحی کی جاتی ہے۔۔ یعنی جب ہم شہد کھاتے ہیں تو وحی کی مقداریں ہی تو کھاتے ہیں اور اس کے

نتیجے میں وحی کو سمجھنے والا ذہن بنتا ہے۔ ہم یوں بھی تو مقداریں ہی تو کھاتے ہیں۔ یہ مقداریں ہی تو ہیں جن کی وجہ سے ایک چیز دوسری سے مختلف ہو جاتی ہیں۔

نمک اور سنکھیا دونوں سفید ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ دراصل ان کی وولٹیج میں فرق ہوتا ہے۔
فرمایا مختلف لوگوں میں مختلف وولٹیج کی لہریں کام کرتی ہیں۔ بعض اوقات آدمی کسی روحانی آدمی سے گلے ملتا ہے تو ساری زندگی

اُس کیف کو یاد کرتا ہے۔ ایک دوسرے سے گلے ملنے میں یہ لہریں ایک دوسرے میں منتقل ہوتی ہیں۔ بعض لوگ پوری طرح گلے نہیں ملتے۔ دراصل انہیں جھٹکا لگتا ہے اُن میں وولٹیج کی کمی ہوتی ہے اور جب وہ کسی سے گلے ملتے ہیں تو انہیں جھٹکا لگتا ہے۔

بچوں میں بڑوں کی نسبت وولٹیج زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے انہیں گلے لگانے سے زیادہ سکون ملتا ہے یوں لگتا ہے جیسے باقاعدہ کوئی چیز اندر جا رہی ہو۔ آپ بچے کو سینے پہ لٹائیں تو نیند آجاتی ہے۔ گالی دینے سے یہ وولٹیج ضائع ہوتی ہے۔

فرمایا۔ الصبح اُٹھنے کا ایک بڑا فائدہ اس وولٹیج کا زیادہ ہونا بھی ہے۔

شاہین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ نیند کی خوب پکی ہیں۔

عرفان کی بابت بات کرتے ہوئے فرمایا۔ ایک بار حضور ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا تم نے مجھے دیکھا۔

حضرت علی نے فرمایا۔ جی ہاں میں نے آپ کو بدر میں دیکھا۔

فرمایا۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا۔

فرمایا۔ میں نے آپ کو احد میں دیکھا۔

فرمایا۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا۔۔ پھر کہا اچھا۔۔ آؤ اب دیکھو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ تاب نظارہ نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

فرمایا یہ تو ذکر ہے حضرت علی جیسی برگزیدہ ہستی کا۔۔۔ جنہیں حضور ﷺ کا اتنا قرب حاصل رہا۔۔۔ داماد رسول ﷺ ہیں۔۔۔ اُن کی تربیت خود حضور ﷺ نے فرمائی۔۔۔ مگر وہ بھی نہیں دیکھ سکے۔۔ بھئی عرفان کی کوئی حد ہی نہیں۔۔۔۔ جتنا بھی ہو جائے کم ہی رہتا ہے۔

مرید نے عرض کی۔ حضور مرشد کو اپنے ہمراہ لے جانے کا کیا طریقہ ہے؟

فرمایا۔ مرشد کو اپنے دل میں بسانے اور ہمراہ لے جانے کا طریقہ قرب ہی ہے اور قرب بھی ذہنی قرب۔ بعض لوگ قریب رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے آشنا نہیں ہو پاتے بعض لوگ دور رہ کر بھی قریب رہتے ہیں۔ اگر فاصلے حائل نہ رہیں تو ذہنی قرب ہی اصل قرب ہے۔

فرمایا۔ حضرت اویس قرنیؒ اس قرب کی وہ اعلیٰ ترین مثال ہیں جو نوع انسانی آج تک پیش کر سکی ہے۔ بڑے پیر صاحب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ علم کی اور حضرت اویس قرنیؒ عشق کی وہ اعلیٰ ترین مثالیں ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔

شاہ عالم نے آکر ناشتے کی بابت پوچھا تو اُٹھ کر باہر کو چل دیئے۔ مرید ہمراہ تھا۔ ناشتے کے لئے گھر کے قریب کی دکانوں سے خریداری کر کے پلٹ رہے تھے تو فرمایا۔ یہاں کے لوگوں میں Civic Sense نہیں ہے۔ باہر کے ممالک میں کوئی زیبرا کراسنگ پہ پاؤں رکھتا ہے تو ٹریفک وہیں رُک جاتی ہے۔ مرید نے تبصرہ کیا۔ یہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہے۔ فرمایا۔۔ وہاں کون سا سبھی پڑھے لکھے ہیں۔۔۔ یہ تعلیم کی نہیں تربیت کی کمی ہے۔

ناشتے کی میز پر حکیم سعید کا تذکرہ فرمایا۔ آج سے چار سال پہلے کی بات ہے۔ ایک بار دواخانے کے سلسلے میں اُن کے دفتر گیا۔ اُن کے اکاؤنٹنٹ میرے جاننے والے تھے۔ اُن کے پاس گیا تو وہ بیٹھے چیک لکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ میاں کیا کر رہے ہو؟ بتایا کہ بیواؤں کی امداد کے چیک لکھ رہا ہوں۔ اُس وقت وہ ایک کروڑ روپے کے چیک اس مد میں سالانہ لکھتے تھے۔ پھر فرمایا۔ خیرات کرنے والوں کی بابت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مطلع کر دیتا ہے کہ وہ بندہ انہیں عزیز ہے۔

پھر ایدھی کی بابت بتایا کہ وہ لوگوں سے خیرات لے کر لوگوں پہ ہی صرف کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ مرید نے تبصرہ کیا۔ اُس میں درشتی اور سختی ہے اور اُس کی زبان بھی سخت ہے۔ فرمایا۔ اُس کام کی نوعیت جو ایسی ہے۔ یہ اُس کے کام کی نوعیت کے باعث ایسا ہے۔

بھابھی تسنیم نے یاحَیُّ یاقَیُّوم کے ورد کے فوائد کا پوچھا تو فرمایا۔ اس سے دماغ کے سیل چارج ہوتے ہیں۔۔ مردہ سیلوں کو نئی زندگی ملتی ہے۔

پھر آگے جھک کر اُسے دیکھا اور کہا۔۔ آپ تو گورے ہو گئے ہیں۔۔۔ کیا ایمکس لگاتے ہیں۔

پھر عورتوں کے سنگھار کا ذکر چلا تو فرمایا۔ بھئی یہ عورتوں کی ہمت ہے گھنٹوں میک آپ میں صرف کر لیتی ہیں۔ پھر مسکرا کر مرید سے دریافت کیا۔ آپ بیٹھ سکتے ہیں تین چار گھنٹے۔

مرید نے شہہ پاکر کہہ دیا۔۔۔جی ہاں کیوں نہیں۔۔اگر میں بھی میک آپ کرنا شروع کر دوں تو۔۔۔

فرمایا۔ آج کل کے لڑکوں نے ایسے بال رکھے ہوئے ہیں اور اوپر سے ایسی چال چلتے ہیں گویا کوئی خاتون ہو۔

مسکرا کر طرح دیتے ہوئے فرمایا۔ لوگ چار ہزار روپے خرچ کر دیں گے۔ دس روپے کے پھولوں کے گجرے خرید کر نہیں دیں گے۔ آپ دس روپے کے گجرے ہفتے میں ایک بار گھر لائیں۔ بیوی خوش ہو جائے گی۔ بیوی کو خوش کرنے کو چالیس روپے ماہانہ کا نسخہ ہے۔

پھر یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر چل دیئے کہ باتیں بہت ہو گئی ہیں اب کچھ کام بھی ہو جائے۔

اُس کے بعد کئی روز لگاتار سفر میں رہا۔ پشاور کے لئے واپسی ہوئی۔۔۔راستے میں گوجرانوالہ رُک کر طاہر جلیل صاحب کے گھر اُن کے ولیمے میں شرکت کی۔ وہاں پہ مرشد کریم کو دور ہی دور سے دیکھتا رہا۔ وہاں سے حضور تو لاہور کے لئے روانہ ہو گئے اور پشاور جانے والے پشاور۔

پشاور پہنچ کر ایک روز وہ ایک صاحب سے ملنے یونیورسٹی گیا اور اُن سے روحانی علوم پہ پی ایچ ڈی کرنے کی بابت مدد اور راہنمائی کا خواستگار ہوا۔ انہوں نے اُسے ہمراہ لیا اور ایک اور صاحب جو یونیورسٹی اساتذہ کی تنظیم کے صدر بھی تھے کے پاس لے گئے۔ وہاں انہوں نے اُس سے دریافت کیا آپ کس مضمون میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں؟

اُس نے عرض کی سپر یچول سائنسز میں ایک استہزائیہ ہنسی کے ساتھ پوچھا۔ یہ سپر یچول سائنسز کیا ہوتی ہیں؟

مرید نے سوال کے استہزا کو پیتے ہوئے اُن سے عرض کی۔ کچھ ویسی ہی جیسی آپ کی یہ سوشل سائینسز ہیں۔

اس جواب کو شاید انہوں نے گستاخی پر محمول کیا۔ اُس کے بعد جتنی دیر بھی وہ وہاں رُکے وہ اُس کے ساتھی سے ہی پشتو میں گپ شپ کرتے رہے۔

دو ماہ بعد وہ عرس اور روحانی کانفرنس میں شرکت کے لئے دوبارہ کراچی پہنچ گئے۔ روحانی کانفرنس کی تیاریاں اپنے نقطہ عروج پر تھیں دعوتنامے چھپ کر آ چکے تھے۔ سوونیئر تیار ہو رہا تھا۔ وزیر اعلیٰ سندھ تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ گورنر سندھ کا خصوصی نمائندہ آ رہا تھا۔ یہ روحانی کانفرنس حیدر آباد میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے عرس سے ایک روز پہلے ہو رہی تھی۔ اس لئے ساتھ ساتھ عرس کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ کراچی اور بیرونِ کراچی سے آنے والے سلسلے کے تمام بہن بھائیوں کو حیدر آباد لے جانے اور رات کو واپس لانے کا انتظام کیا جا رہا تھا بسوں اور ویگنوں نے مرکزی مراقبہ ہال سے روانہ ہونا تھا اور واپسی پہ وہیں آنا تھا۔

حیدر آباد کی روحانی کانفرنس

مرید کراچی پہنچا۔ مراقبہ ہال میں اپنے مراد کو نہ پا کر وہ ڈی۔ ۳۲ پہنچ گیا۔ آپ مریض دیکھ رہے تھے۔ مریضوں سے توجہ ہٹا کر ملے اور انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا کہا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو بھائی جان و قاری یوسف اور مسعود طارق بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن دنوں مسعود طارق حکومت سندھ کے مشیر کے عہدے پر تھے۔ حیدر آباد میں روحانی کانفرنس کے انتظامات میں وہ بھائی جان کے ساتھ کوشاں تھے۔ اُس وقت کارڈوں پہ مدعوین کے نام لکھے جا رہے تھے۔

جب حضور تشریف فرما ہوئے تو ایک کارڈ لے کر دیکھا۔ پھر وہ کارڈ اُسے تھماتے ہوئے پوچھا۔ کیسا ہے؟ مرید نے گریس فل کہا تو بتایا کہ اس پہ تاریخ درج ہونے سے رہ گئی تھی پھر بعد میں پرنٹ کروائی ہے۔۔۔ اس طرح یہ کارڈ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔

شاہین نے حضور سے ان کی علالت کی بابت دریافت کیا تو فرمایا۔ کبھی کسی کو اُس کی بیماری یاد نہ کروائیں۔ یہ بُری بات ہے۔ بلکہ اگر کوئی بیمار نظر بھی آئے تو اُسے کہیں۔ ماشاءاللہ اب تو آپ پہلے سے بہتر ہیں۔

مرید نے پشاور یونیورسٹی جانے اور وہاں پیش آمدہ صورتِ حال سے آگاہ کیا تو فرمایا یہ تو جہالت سے بھی آگے کی کوئی چیز ہوئی۔ بھئی اگر آپ کو معلوم نہیں تو خاموش رہو۔ باہر سپر یچول سائنسز پہ کتنا کام ہو رہا ہے۔ انہوں نے ان علوم کی الگ درسگاہیں اور یونیورسٹیاں بنالی ہیں اور آپ ہیں کہ اپنی یونیورسٹیوں میں اس کا نام سُننا گوارا نہیں کر رہے۔

مرید نے عرض کی کہ وہ چاہتا کہ حضور قلندر باباولیاءؒ پہ پی ایچ ڈی کے معیار کی ایک کتاب تیار کرے۔۔۔اُس پہ ڈگری ملے نہ ملے۔۔کم از کم کتاب تو تیار ہو جائے گی نا۔

بہت جوش سے فرمایا۔ملے گی۔ملے گی کیوں نہیں۔۔۔بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔۔جب شاہ ولی اللہؒ پہ پی ایچ ڈی ہو سکتی ہے تو حضور قلندر باباولیاءؒ پہ کیوں نہیں ہو سکتی؟۔۔پھر فرمایا۔۔یہ قوم ہے ہی نالائق۔۔اب اقبال پہ اتنا کام ہوا تو کیا ہوا؟

صبح سویرے۔۔وقت سحر۔۔۔لطیف بھائی اپنی سوزوکی وین میں مرشد کریم کو مراقبہ لے جانے ڈیوٹی پہ حاضر ہوئے۔۔وہ وین میں پیچھے بیٹھنے لگا تو مرشد کریم نے اُسے اپنے ہمراہ اگلی نشست پہ بیٹھنے کو کہا۔باہر کی سردی میں ٹھٹھرنے سے بچاؤ کا احساس اور مرید کا اپنے مراد سے چپک کر بیٹھنے کی سعادت کا اعزاز اُس نے کچھ دیر تو اس احساس کا لطف لیا پھر میاں مشتاق احمد صاحب کی بیگم کی خواہش کے حوالے سے اُن کی بیٹی کے رشتے کے لئے غلام عباس گل کی بات کرنے کی اجازت طلب کی تو پہلے عباس گل کی بابت دریافت کیا کہ وہ کون ہیں کیا کرتے ہیں اور پھر فرمایا۔آپ عباس سے کہیں کہ وہ اپنے گھر والوں کو میاں صاحب کے یہاں بھیجے۔ جب میاں صاحب مجھ سے بات کریں گے تو پھر دیکھیں گے۔

فرمایا۔لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ دن بدن سنگین ہو رہا ہے۔اللہ رحم کرے۔لڑکیاں لکھ پڑھ کر لڑکوں سے آگے نکل رہی ہیں اور اُن کے پائے کے لڑکے ملتے نہیں۔روایات اور خاندانوں کا شیرازہ بکھرنے سے یہ مسئلہ بہت ہی گھمبیر صورت حال اختیار کرتا چلا جارہا ہے۔بھئی اس میں خود عورتوں کا اپنا بھی قصور ہے۔ایک پڑھا لکھا۔۔ایم اے۔۔بی اے لڑکا ان پڑھ۔۔مڈل یا میٹرک لڑکی سے نبھاہ کر لیتا ہے لیکن لڑکیاں چاہتی ہیں کہ اُن کا شوہر اُن سے زیادہ قابل اور زیادہ پڑھا لکھا ہو۔

پھر ازراہ تبصرہ ارشاد فرمایا۔ ساس عورت کا سب سے بُرا روپ ہے۔ایک عورت آئی اور اپنی بہو کے بارے میں کچھ کہنے لگی۔میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ کی بات نہیں مانتا۔وہ کہنے لگی۔۔آپ میری بات تو سنیں۔میں نے اُسے کہا کہ میں نے جو نظریہ قائم کیا ہے وہ میں نے اپنی دادی،اپنی والدہ اور اپنی بیوی کو دیکھ کر قائم کیا ہے۔میں اُس نظریئے کو محض آپ کی بات سُن کر کیسے بدل ڈالوں۔

کانفرنس کے حوالے سے فرمایا۔ ہم ایک دن کے لئے کتنے روز ہلکان ہو رہے ہیں۔اللہ نے بھی کائنات بنانے سے پہلے کروڑوں سال سوچا ہوگا۔ کتنی ہی بے شمار ڈائیاں بنانا پڑی ہیں۔دل کی ایک ڈائی، جگر کی دوسری ڈائی، آنکھ کی تیسری ڈائی۔۔۔مرید نے دریافت کیا۔کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ہر قسم کے سیل کے لئے الگ ڈائی ہے۔۔۔فرمایا۔جی ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔

بتایا کہ اقبال کو بٹوارے سے بہت فائدہ ہوا۔وہ کیسے ؟جب ہندوستان نے غالب کو اپنا قومی شاعر بنایا تو پاکستان کو اقبال کو اپنانا پڑا۔اقبال اس طرح غالب کی وجہ سے بڑے بن گئے ورنہ اقبال کو کوئی جانتا بھی نہ۔۔اب بھی کتنے لوگ ہیں جو اقبال کو پڑھتے ہیں حالانکہ اقبالیات کے نام سے الگ شعبے تک بنائے گئے ہیں یونیورسٹیوں میں۔

مراقبہ کے بعد سیر کے دوران مرید سے گورنر سندھ کے دفتر سے موصول ہونے والے پیغام کی بابت پوچھا کہ اُس نے سلسلے کے حوالے سے کچھ کہا کہ نہیں۔مرید نے عرض کی۔اُس نے سلسلے کے حوالے سے تو خیر کچھ نہیں کہا البتہ خواجہ شمسالدین عظیمی کی بابت بہت سی اچھی باتیں کی ہیں۔

پھر لوگوں کی اپنے لئے محبت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس کانفرنس کے اخراجات کے لئے لاکھ ڈیڑھ لاکھ خرچ فاروق صاحب نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔میں نے اُن سے کہا بھی کہ ابھی آپ کا کاروبار نیا نیا ہے مگر وہ مانے نہیں۔فرمایا کہ لوگوں کی محبت

کو دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ مرنا تو ہے۔اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ لیکن لوگوں کا کیا ہو گا؟ لگتا ہے لوگوں کو تیار کر کے تصرف کر کے جانا ہو گا۔

پھر مرید کو ڈھارس دیتے ہوئے فرمایا۔ بھئی تیار رہنے سے بھلا میں کونسا مر ہی جاؤں گا۔ مگر تیار تو رہنا ہی چاہئے۔

پھر فرمایا کہ مرشد کے وصال کے بعد کوئی بھی فیصلہ جلدی نہیں کرنا چاہئے۔ پھر حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے وصال کے بعد کے واقعات سُناتے ہوئے فرمایا۔ بدر صاحب ہیں تو بیورو کریٹ۔۔۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لے کر محسن صاحب کو بٹھا دیا۔۔۔ حالانکہ لوگوں نے مجھے کہا بھی کہ یہ تو طے کرو کہ کجاور ہیں یا سجادہ نشین۔۔۔ لیکن ہم اپنے غم میں تھے۔۔ میں اپنے حواسوں میں تھا ہی کب۔۔۔۔ وہ اپنی کر گزرے۔۔۔ اُس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔

فرمایا۔ پیرو مرشد کے پردہ فرمانے کے بعد کوئی بھی فیصلہ جلدی نہیں کرنا چاہئے۔ دو تین ماہ لگتے ہیں آدمی کو اپنی جگہ پر آنے میں۔ بہت ضروری فیصلے بھی چہلم کے بعد کرنے چاہیئں۔ اُس وقت جذباتی حالت ہوتی ہے۔ ہوشیار لوگ اُس وقت فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ مجھ سے بھی یہی غلطی ہوئی تھی۔ محسن صاحب کو خانقاہ بٹھانے کے فیصلے پہ میں نے ہاتھ نہ اُٹھایا تو بعد میں یہ تو کہہ ہی سکتا تھا کہ آپ کے انتخاب میں میری کوئی رائے شامل نہ تھی۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے کل ۲۹ مرید بنائے اُن میں بھی پڑھے لکھے لوگ نہ ہونے ہی کے برابر تھے۔ کوئی ترکھان تو کوئی لوہار۔

پھر بدر صاحب کا واقعہ سُنایا کہ میں اُن سے ملنے چلا گیا۔ تو انہوں نے گھنٹہ بھر انتظار کروایا۔ میں نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ بھئی میں تو اپنے پیر بھائی سے ملنے آیا تھا۔ ڈپٹی سیکریٹری سے نہیں۔ مجھے آپ سے نہ کوئی کام تھا اور نہ کوئی غرض یا لالچ۔ اس پر انہوں نے معذرت کی۔ مجھے جانے کیا سوجھی میں اُن سے تذکرہ قلندر باباؒ اولیاؒ کی اشاعت کے بارے میں مشورہ مانگ بیٹھا۔ انہوں نے اگلے دن جواب دینے کا کہا۔ میں گھر آکر انتہائی پریشان اور بے چین کہ میں نے مشورہ مانگا ہی کیوں۔ پھر رات کے تین بجے کے قریب ایک روشنی سی چمکی۔ ذہن میں خیال آیا کہ تمہیں حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ کب کہا تھا کہ تم اُن سے مشورہ کر لیا کرو۔

ایک بار بدر صاحب نے بُلایا۔ میں چلا گیا۔ کہنے لگے میں نے آپ کو حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا ایک پیغام دینا ہے۔ میں نے کہا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں حضورؒ سے رابطہ کر سکوں تو اُن میں تو اتنی طاقت ہے کہ وہ مجھے براہ راست اپنا پیغام دے سکیں۔ میں آپ سے نہیں سنوں گا۔ اس لئے آپ کسی اور موضوع پر بات کریں۔ انہوں نے بہت کہا مگر میں نے نہیں سنا۔ شاید وہ کہنا چاہتے تھے کہ میں مزار پہ نہ آیا کروں۔

بدر صاحب نے ایک بار مجھے ایک رقعہ دیا کہ ٹی وی کے پروگرام کے لئے اسلم اظہر سے مل لوں۔ میں رقعہ لے کر چلا گیا۔ پہلے تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کے پاس میں نہیں آیا۔۔ یہ رقعہ آیا ہے اور اسی لئے آپ نے مجھے اندر بلایا ہے۔ آپ نے مجھے نہیں اس رقعے کو بلایا ہے۔ میں نے نہ تو آپ سے ملنے کی درخواست کی ہے اور نہ ہی آپ نے مجھے اندر بلایا ہے۔ بہر حال کہنے لگے میں آپ کو پانچ منٹ دیتا ہوں۔ روحانیت پہ پروگرام کے حوالے سے بات شروع ہوئی تو میری تعلیمی قابلیت پوچھی اور کہا آپ کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہم آپ کو وقت کیسے دیں؟ میں نے کہا۔ آپ مجھے بتائیں فیثا غورث، تھربل، میکس پلانک، ایڈیسن اور آئن سٹائن وغیرہ کس یونی ورسٹی کے پڑھے ہوئے تھے؟ اور یہ کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی یونی

ورسٹی سے نہیں پڑھتے لیکن یونیورسٹیاں اُن کے بارے میں لوگوں کو پڑھاتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں اُن میں سے ایک ہوں جن کے بارے میں یونیورسٹیاں پڑھایا کریں گی۔ آپ فی الحال ماہرین کا ایک بورڈ بٹھالیں اگر میں اُن کو مطمئن کر دوں تو آپ میرا پروگرام چلادیں ورنہ نہیں۔ انہوں نے اگلے روز بلایا۔ مجھے بخار تھا مگر میں جا پہنچا۔ انہوں نے کہا آپ ہمارے لئے ڈرامے لکھیں۔ میں نے کہا یہ میری لائن ہی نہیں اور آ گیا۔

پھر جمیل الدین عالی سے ملاقات کی بات سُنائی کہ ایک بار جب میں بی بی سی ٹی وی کے ایک پروگرام کی ریکارڈنگ کروانے گیا تو وہاں عالی صاحب بھی آ گئے۔ پروڈیوسر نے مجھ سے کہا۔۔ آپ انہیں پہلے موقع دے دیں۔ میں نے کہہ دیا ٹھیک ہے۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ پہلے انہیں فارغ کر دیں۔۔ عالی صاحب اڑ گئے۔ میں کیمرے کے سامنے بغیر میک اپ نہیں جاؤں گا۔ اس وقت وہاں میک اپ والا بھی نہیں تھا۔ چناچہ کسی خاتون کے پرس سے میک اپ کا کچھ سامان برآمد کیا گیا اور انہوں نے اپنا میک اپ خود ہی کیا۔

بعد میں ملاقات ہوئی تو اُن کے شعر۔۔۔

سات سُر سات رنگ ہیں آٹھویں کی تلاش ہے

کے بارے میں میں نے اُن سے کہا۔۔ واہ۔۔ کیا عارفانہ کلام ہے۔۔۔ کہنے لگے کیا واقعی؟

میں نے کہا جی ہاں۔۔۔ یہ سات سر سات آسمانوں کی طرف اشارہ ہے اور آٹھویں کی تلاش کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ مجھے اللہ کی تلاش ہے۔ بہت خوش ہوئے اور کہا۔۔ کبھی ملنے ضرور آئیں۔

سیر کے بعد ناشتہ پہ انگلینڈ سے آئے ہوئے نعیم قادری صاحب ، سعیدہ خاتون ، حفیظ بٹ صاحب اور نثار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نعیم بھائی اپنے زوردار قہقوں کو اپنے مرشد کے سامنے بھی اچھالنے سے نہیں رُکتے۔ انہیں شوق ہے کہ وہ اپنے مرشد کو کوئی اچھا سا لطیفہ سُنا کر اُن سے داد لیں۔ لیکن لطیفہ مکمل کرنے سے پیشتر وہ پہلے خود ہنسنا شروع کر دیتے اور لطیفہ سننے والا اُن کو ہنستے دیکھ کر اُن کا ساتھ دینے کو لطیفہ سُنے بغیر ہی ہنسنے لگتا۔

ناشتے کے بعد بسوں اور کوچز میں بیٹھ کر حیدر آباد روانگی ہوئی۔ مرشد کریم فاروق صاحب اور مسعود طارق کے ہمراہ گاڑی میں روانہ ہوگئے۔ راستے میں بحرین مراقبہ ہال کے نگران عماد ملک سے بات لطیفوں اور چٹکلوں سے شروع ہو کر جملے بازی پہ منتج ہوئی۔ وہ اس سے پیشتر بھی ایک بار اپنے مراد کے ہمراہ حیدر آباد مراقبہ ہال جا چکا تھا۔ وہاں کے انچارج ممتاز علی صاحب سے اُس کی اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ انہوں نے وہاں مراقبہ ہال میں مہمانوں سے ایک ایک پودا بھی لگوایا تھا۔

جب وہ سب کے ہمراہ بس سے اترا تو ممتاز علی نے کہا دیکھیں آپ کے لگائے ہوئے پودے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اُس نے پودوں کو دیکھا اور اُس سے پہلے وہاں ہونے والی تعمیر کو سراہا۔ کانفرنس کے لئے شامیانوں قناتوں سے وسیع و عریض آڈیٹوریم بنایا گیا تھا۔ دوپہر کھانے کا وقفہ ہونے تک کے پہلے سیشن میں مقررین کے مقالات پیش ہو رہے تھے۔ اردو سندھی اور انگریزی میں مقالات پیش کرنے والوں نے روحانی علوم اور حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے حوالے سے کافی معلومات بہم پہنچائیں۔ انگلینڈ سے آنے والے ایک مقرر نے کہا اگر آج ہم نے یہ علوم یہاں نہ سیکھے تو کل انہی علوم کو سیکھنے ہمیں یورپ اور امریکہ جانا پڑے گا۔

اُس سیشن میں نہ تو مرشدِ کریم سٹیج پر تشریف فرما تھے اور نہ ہی مہمانِ خصوصی وزیر اعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ۔ کانفرنس کی کاروائی بھائی جان حکیم وقار یوسف چلا رہے تھے۔ احتشام الحق نظامت کے جوہر دکھانے میں مصروف تھے۔ جب اُس کا نام پکارا گیا تو

اُس نے سوچا کتنا اچھا ہوتا کہ مرشدِ کریم بھی اُس کا مقالہ سنتے۔ وہ اپنا مقالہ پڑھ کر سٹیج سے نیچے اتر کر آڈیٹوریم میں بیٹھنے کی بجائے باہر لگے مختلف شہروں میں قائم مراقبہ ہالوں کے سٹالز دیکھنے چلا گیا۔ دوسرے سے تیسرے سٹال کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ مسعود بھائی اپنی بھاری بھر کم وجود سمیت آکر اُس سے لپٹ گئے اور کہا مرشد کریم نے آپ کا مقالہ بہت پسند فرمایا۔ اُس نے بے یقنی سے انہیں دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ انہوں نے بتایا کہ مرشد کریم اپنے کمرے میں اجلاس کی کاروائی کلوز سرکٹ پر دیکھ بھی رہے تھے اور سُن بھی۔ جب آپ مقالہ پڑھ رہے تھے تو بہت پسند گی سے فرمایا۔ انگریز بھی ایسی انگریزی کہاں بولتے ہوں گے جیسی میرے عظیمی بچے بول رہے ہیں۔

تعریف کس کو اچھی نہیں لگتی اور پھر یہ تو اُس کے مراد کی طرف سے اُس کی توصیف تھی۔ جن کی خوشنودی کے لئے لوگ کیا کیا اور کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔۔۔ اُس نے انگریزی میں سوچا۔ اگر میں مغرور ہو جاؤں تو یہ کچھ اتنا غلط نہ ہوگا۔ مسعود بھائی کو شکریہ کہتے ہوئے وہ اُن سے لپٹ گیا۔ اتنے میں شہزاد صاحب مائک پکڑے اُس کے تاثرات ریکارڈ کرنے آگئے۔ انہوں نے چند ایک باتوں کے بعد جب یہ کہا کہ آپ روحانی کانفرنس کے موقع پر کوئی پیغام کی قدر نہ کی اس کو مجھ جیسا بندہ بے نوا کیا پیغام دے۔ میرا پیغام یہی ہے کہ پہلے اُس پیغام کو سمجھو پھر کوئی دوسرا پیغام لینا۔

کھانے اور نماز کے بعد جب مہمان خصوصی تشریف لے آئے تو کانفرنس کے دوسرے حصے کی کاروائی کا آغاز ہوا۔ اب حضور مرشدِ کریم بھی اسٹیج پر متمکن تھے۔ لگ بھگ بارہ سو افراد مرشدِ کریم جناب خواجہ شمس الدین عظیمی خانوادہ سلسلہ عظیمیہ کو سننے تیار و منتظر تھے۔ وقار یوسف نے مرشد کریم کو دعوتِ خطاب و اظہار خیال دی تو آپ نے بات کا آغاز کرنے سے پہلے نہایت

شگفتہ پیرائے میں فرمایا۔ بھائی جان نے سب سے فرمائش کی کہ بات مختصراً کہی جائے۔ اب پتہ نہیں وہ بھول گئے یا انہوں نے جان کر مجھے کھلی چھٹی دے دی ہے۔ وہاں موجود سبھی حاضرین قہقہ لگا کر اس لطیف پکڑ کی داد دی۔

آپ نے وزیر اعلیٰ سندھ کا خیر مقدم کیا اور کہا۔ میں اولیا کرام کی سرزمین پہ منعقد ہونے والی اس روحانی کانفرنس میں ان کی حکومت اور دور اقتدار میں امن و سکون کی دُعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خاص صلاحیت عطا کی ہے اس لئے اس بات کا اظہار کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ ہمیں اولیااللہ کی ارواح کی سرپرستی حاصل ہے بلکہ میں اولیااللہ کی ارواح کو دیکھ سکتا ہوں جو یہاں تشریف لائی ہیں۔

ہم دُعا کرتے ہیں کہ عبداللہ شاہ صاحب کا دور طویل ہو۔ آج یہاں ہر زبان بولنے والے مختلف ملکوں کے رہنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہاں سے اُٹھنے سے پہلے یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہم سب اس صوبے میں آپس میں بھائی بہنوں کی طرح رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کے لوگ آپس میں بھائی بہنوں کی طرح اتحاد، اتفاق اور پیار محبت سے رہیں۔ ہم کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے۔ یہ حضور ﷺ کا مشن ہے۔

آپ دیکھیں جب حضور ﷺ مکہ میں بطور فاتح داخل ہوئے تو انہوں نے معافی کے دروازے کھول دیئے۔ لاکھوں کروڑوں سال کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی آدمی کسی ملک میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا ہو اور وہاں پر خونریزی نہ ہوئی ہو۔ ہم تو حضور ﷺ کی امت ہیں۔۔۔ ہمیں حضور ﷺ کی طرزِ فکر اختیار کرتے ہوئے، معاف کرنا، خوش اخلاق ہونا اور دوسری برائیوں سے اجتناب کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔۔۔ اور یہ سب ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہم مادیت کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائیں۔ مادیت ہمارے استعمال کی چیز ہے۔ یہ دنیا آپ کے لئے بنائی گئی ہے نہ کہ آپ کو اس دنیا کے لئے بنایا گیا ہے۔

پوری کائنات ہی گروہی اور اور طبقاتی تقسیم ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی گروہ سے وابستہ ہے۔ اچھے لوگوں کے اپنے گروہ ہوتے ہیں۔ اگر بندہ اپنی صلاحیتوں پہ قائم ہو جائے تو وہ گروہ کو نہ بھی ڈھونڈے تو گروہ اُسے ڈھونڈ لیتا ہے۔

اُس کے بعد آپ نے اپنے موضوع پہ بات کا آغاز فرماتے ہوئے کہا۔ روحانیت کا اصل منشا یہ ہے کہ انسان خدا کے قریب ہو جائے۔ خدا کی موجودگی کے احساس سے سرشار رہے۔ پھر آپ نے بتایا کہ انبیا علیہ السلام کے درجات اُن کے اللہ سے قرب کی علامت ہیں۔ جیسے آدم علیہ السلام کا مقام پہلا آسمان، موسیٰ علیہ السلام کا چوتھا اور ابراہیم علیہ السلام کا چھٹا یعنی وہ عرش سے کچھ ہی نیچے ہیں۔

فرمایا کہ انسان چاہے اللہ کی کسی ایک ہی صفت کا عرفان حاصل کر لے ہم اُس کو عارف کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ کی کسی ایک صفت کا عارف بھی عارف ہوتا ہے اور گیارہ لاکھ صفات کا عارف بھی عارف ہی کہلائے گا۔

روحانیت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ مادیت کو استعمال کرو مگر اُس کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بناؤ۔ اگر ہم روحانی اقدار کو اپنا لیں۔۔۔ اپنی روح کو تلاش کر لیں تو ہم شاندار گھروں میں رہتے ہوئے۔۔۔ قیمتی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے۔۔۔ یہ بات یاد رکھیں کہ یہ سب ہمیں اللہ نے عطا کی ہیں تو ہم روحانی اقدار کو تلاش کر لیں گے اور ہمیں دنیا کی ہر نعمت حاصل ہو جائے گی۔

عبداللہ شاہ صاحب نے پہلے تو لکھی ہوئی تقریر پڑھی پھر کہا کہ میں نے یہاں آنے سے پیشتر اپنے سیکریٹری سے بھی پوچھا اور اپنے مشیر جناب مسعود طارق سے بھی دریافت کیا کہ رسمِ دنیا ہے کہ جب کسی محفل، کانفرنس یا سیمینار میں جاتے ہیں تو لوگ کچھ

نہ کچھ توقع بھی کرتے ہیں کہ ہم اُن کے لئے کچھ کر سکتے ہوں تو بتائیں۔ لیکن مجھے دونوں حضرات نے یہی کہا کہجناب خواجہ صاحب آپ سے کچھ نہیں لیں گے اور نہ ہی وہ کبھی کسی سے کچھ مانگتے ہیں۔ اُن کی اس بات سے میں بہت متاثر ہوا ہوں اور اب میں اُن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اپنی دعاؤں سے نوازیں۔

اُس کے بعد انہوں نے مرشدِ کریم سے دست بستہ دُعا کی درخواست کی۔ آپ نے دُعا کی بھی اور کروائی بھی۔

رات چنا صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ کھانے کے بعد چہل قدمی کے لئے باہر نکلے تو فرمایا۔ جب اللہ نے آپ کو کسی کام کا اہل بنایا ہوا اور آپ یہ کہیں کہ بھئی ہم بھلا کس قابل ہیں۔۔۔ تو کیا خدانخواستہ اللہ غلط کہتا ہے۔ جب آپ کسی کام کرنے کے قابل بنادیئے جاتے ہیں تبھی تو وہ کام آپ کے حوالے کیا جاتا ہے۔ اب اگر ہم کسی کام کو کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور پھر بھی اُسے نہ کریں تو اسے سوائے کفران کے کیا کہا جائے گا۔ یہی تو ظلم ہے۔

فرمایا۔ بعض لوگوں میں ضد ہوتی ہے اور وہ ڈٹ جاتے ہیں کہ یہ کام ہے۔۔۔ یہ ہو گا کیوں نہیں۔۔۔ پھر یہ بھی ہے اور وہ کہ جب آپ کوئی کام اللہ کے لئے کر رہے ہوں تو یہ ضد اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ میں کوئی اپنے لئے تھوڑے ہی کر رہا ہوں۔ یہ سب تو اللہ کا کام ہے۔۔۔ یہ ہو گا کیوں نہیں۔۔۔ نتیجہ یہ کہ کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اُس وقت نیاز صاحب فاروق صاحب اور دو اصحاب اور بھی ساتھ تھے مرید نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس وقت روئے سخن کس کی طرف ہے۔۔۔ لیکن کچھ طے نہ کر سکا۔

پھر آپ نے اولاد کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بات کی اور ان کی تعلیم و تربیت پہ خرچ کرنے پہ بہت زور دے کر فرمایا۔ اولاد کی تربیت پہ خرچ کرنے سے کبھی نہیں گھبرانا چاہئے۔ پیسے بنک میں جمع رکھنے کے طرزِ عمل پہ کڑی تنقید کی اور کہا بھلا اس کا کیا

فائدہ کہ پیسے بنک میں رکھے ہیں۔نہ جانے لوگ پیسے جمع کرتے ہی کیوں ہیں۔پھر دھیمے سے لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ انسان کا شعوران سہاروں کے بغیر چلتا بھی تو نہیں۔

پھر قلندر باباولیآؒ کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے بتایا تھا کہ جو پیسہ خود کھالیا،جو اولاد پہ صرف کرلیا،دوستوں کو کھلادیااور اللہ کی راہ میں خرچ کردیا وہ استعمال ہو گیا باقی سب ضائع گیا۔

فرمایا۔پیسہ کمانے کے لئے دماغ کا استعمال کیا جاتا ہے۔دماغ استعمال نہ کیا جائے تو پیسہ نہیں کمایا جاسکتا۔۔پھر کئی مثالیں دیں کہ کس طرح لوگوں نے ایک جگہ سے مال خرید کر دوسرے کے حوالے کرکے پیسہ کمایااور بنکوں سے سرمایا لے کر پیسہ بنایا۔

عرس کی صبح مراقبہ کے بعد تمہید کے طور پر ارشاد فرمایا۔

میں تیس سال سے روحانیت کے موضوع پہ لکھ اور بول رہا ہوں۔میری پوری زندگی روحانیت کے گرد گھوم رہی ہے۔تقریباً ہر موضوع پہ اتنا کچھ لکھا ہے اور کہا ہے کہ اب کوئی بات کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یہ تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔لیکن پھر یہ سوچ کے کہ لوگوں کو کون سا یاد رہا ہو گا ایک بار پھر بتانے بیٹھ جاتا ہوں۔

پھر اصل موضوع کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔دیکھا جائے تو زندگی کا ہر رُخ دو رخوں سے مل کر بنتا ہے۔جہاں خوشی ہو گی وہاں ناخوشی بھی ہو گی۔اس لئے ضروری ہے کہ خوشی کا وہ مفہوم سمجھیں جس کے ساتھ ناخوشی کا پہلو نہیں ہے۔ایسی خوشی جس کے ساتھ ناخوشی نہ ہو وہ سرور کی کیفیت ہے۔انسان میں کام کرنے والی مقداروں میں توازن ہو تو جو کیفیت بنتی ہے وہ سرور کے علاوہ کچھ نہیں۔سرور کی کیفیت کے لئے ضروری ہے کہ انسان کسی سے توقعات نہ رکھے۔۔۔توقعات کو توڑ ڈالیں۔

ہر ذی روح مقداروں پہ قائم ہے۔ان مقداروں میں کمی بیشی سے خوشی اور غم کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ مقداروں کے حوالے سے دیکھیں تو مرد میں ایک طرح کی مقداریں کام کرتی ہیں اور عورت میں دوسری طرح کی۔اب وہ دور آنے ہی والا ہے جب عورتوں کی حکومت قائم ہو جائے گی کیونکہ مردوں میں حکومت کرنے اور اقتدار میں رہنے والی مقداریں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ عورتوں کو یہ اقتدار اس لئے مل رہا ہے کہ مردوں نے اُس پہ بہت زیادتیاں کی ہیں۔اُن کی منڈیاں لگایا کرتے تھے۔اُن منڈیوں میں عورتوں کی خرید و فروخت کے معیار اُن کی رنگت، جسمانی خدوخال، صحت اور نوجوانی ہوا کرتے تھے۔ آج بھی فینائل کے ڈبے پر عورت کی تصویر لگا کر اُسے باتھ روم میں رکھا جا رہا ہے۔ ہر دس ہزار سال بعد کا یا کلپ ہوتی ہے۔ پہلے اقتدار عورتوں کے پاس تھا۔ جب انہوں نے مردوں پہ زیادتیاں کیں تو مردوں کے پاس اور اب پھر عورتوں کے پاس ہو گا۔ اگر عورتوں نے زیادتیاں نہ کیں اور عدل سے کام لیا تو یہ اقتدار اُن کے پاس رہے گا ورنہ نہیں۔

ہمیں چاہئے کہ ہم آنے والے دور کی تیاری کریں۔ اپنی بیٹیوں کو تیار کریں۔ اگر ہم اس میں ناکام رہے تو آنے والے دور میں۔۔۔عورتوں کے اقتدار میں۔۔۔ہمارا کوئی حصہ نہ ہو گا۔ بیٹیوں کی تربیت اس طرح کریں کہ وہ آنے والی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکیں۔اُن کو ہر کام کرنے کا حوصلہ دیں۔ انہیں بتایا جائے کہ بدتمیزی کا جواب کیسے دیا جاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پہ انہیں چانٹا مارنا آنا چاہئے۔

درس کے بعد خواتین کے چہرے جوش سے تمتمائے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک خاتون کو دوسری کو کہتے سُنا۔۔۔اب ان مردوں کو پتہ چلے گا۔۔۔جب عورتیں ان کی منڈیاں لگائیں گی۔ دوسری نے بجائے اُس کی تشنہ خواہش کی تائید کرنے کے بجائے

اُسے ٹوکا اور کہا اگر ہم نے بھی وہی کچھ کیا جو مردوں نے کیا تو پھر ہم میں اور اُن میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اُس نے چاہا کہ وہ اُس بہن کو سلام کرے جس نے مرشد کے پیغام کو اتنے احسن انداز میں سمجھا تھا۔ لیکن وہ ہجوم کے سبب دیکھ نہ پایا کہ وہ کون تھیں۔

عرس کا دن حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے مزار پہ حاضری دینے، پھول اور چادریں چڑھانے میں گزار کر زائرین نماز مغرب تک مراقبہ ہال واپس آ چکے تھے۔ عرس کے موقع پہ لنگر میں حلیم پیش کی جاتی ہے۔ کوئی بتا رہا تھا کہ اگر تین بار لنگر کا کھانا کھا کر دُعا کی جائے تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ اُس نے اس بات کو سُن کر اسے خوش عقیدتی کا شاخسانہ قرار دیا لیکن بعد میں ایک دفعہ مرشد کریم نے اس بات کی تصدیق فرمائی کہ لنگر کھانے سے فقیر کے اندر کام کرنے والی روشنیاں یقین کو تقویت دیتی ہے۔۔۔ اور تو اور بے روزگاروں کو روزگار مل جاتا ہے۔ بیماریوں سے نجات اور صحت ملتی ہے۔ پریشانیوں سے چھٹکارا اور وسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔

لنگر کے بعد آپ نے اپنے روحانی بچوں، مریدوں، زائرین اور عقیدت مندوں سے خطاب فرمایا۔ اپنے خطاب میں طرز فکر میں تبدیلی پیدا کرنے اور لوگوں کو وہ زاویہ نظر حاصل کرنے پہ ابھارا جس سے بندہ اللہ کے قریب ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

روشن نظر و گداز دل دوستوں، میرے روحانی سفر میں شریک قافلے کے لوگو، سلسلہ کی ترقی اور ترویج کے لئے اللہ نے ہمیں ایک سال مزید عطا کیا۔ ہم نے جس راستے پر بھی قدم بڑھایا۔۔ اُس میں ہر قدم پہ ہمیں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا تعاون رہا۔ ہم سب شاہد ہیں کہ جب بھی کسی نے سلسلہ کی ترویج کے لئے کوئی قدم اُٹھایا اُسے وسائل کی کمی نہیں رہی۔۔۔ سلسلے کے افراد پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم وسائل کے محتاج نہیں۔۔۔ بلکہ وسائل ہمارے محتاج ہیں۔۔۔ اگر ہم نے اپنے ظرف کے مطابق چھوٹا کام پسند کیا تو ہمیں چھوٹے کام کے لئے وسائل فراہم ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور اگر ہم نے حوصلہ کر کے بڑے کام میں ڈالا تو

ہمیں اُس کے لئے وسائل فراہم ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں ابھی ارادہ نہیں کیا جب وہ ارادہ کریں گے تو اللہ اُن کے لئے بھیٔ وسائل فراہم کر دے گا۔

زمین و آسمان کے اندر جو کچھ بھی ہے۔۔۔ وہ سب اللہ کے فرمان کے مطابق۔۔۔ انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ وسائل بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ سلسلہ کے افراد تو خصوصاً اس سعادت سے نوازے گئے ہیں۔۔۔ کیونکہ وہ ایسے باپ کی اولاد ہیں جس کے اشارے پر کائنات چلتی ہے۔۔۔ جس کے اشارے پر اللہ بھی نظریں جمائے ہوتا ہے۔۔۔ کہ میرا بندہ کہتا کیا ہے؟

لوگ وسائل کی کمی کا شکار ہوتے ہیں مگر سلسلہ کے افراد اپنے باپ کی وجہ سے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں کرتے۔ وسائل میں سب کچھ شامل ہے۔ ملائکہ عنصری ہوں، ملائکہ سماوی ہوں، حاملانِ عرش یا ملائے اعلیٰ۔۔۔ جب کوئی بندہ اللہ کے لئے قدم اُٹھاتا ہے تو ان سب کی ڈیوٹی ہے کہ وہ اُس کے لئے کام کریں۔

سوال یہ ہے کہ ایک بندہ گھر نہیں بنا سکتا۔۔۔ وہ مسجد بنا لیتا ہے۔۔۔ مراقبہ ہال تعمیر کرتا ہے۔ جو کتاب نہیں لکھ سکتا ۔۔۔ وہ کتابیں لکھ ڈالتا ہے۔ ہمارے ہاں وسائل زیرِ بحث آتے ہی نہیں۔ نہیں بھئی۔۔۔ اللہ کے لئے کام بھی کریں اور وسائل کے محتاج بھی رہیں۔ اللہ کی اس بے پایاں رحمت کی وجہ کیا ہے؟ وسائل عام آدمی کو بھی دستیاب ہیں۔۔۔ ہوا کی مثال لیں۔۔۔ یہ ایک خود کار نظام ہے۔ سب کو میسر ہے۔ انسان کو چلانے کے لئے آکسیجن درکار ہے۔۔۔۔ وہ اُسے ملتی رہتی ہے۔۔ غذائی ضروریات کے لئے زمین موجود ہے۔ اگر زمین سخت ہو جائے تو ایک دانہ بھی دستیاب نہ ہو۔ آپ کو نظر آئے گا کہ یہ سب وسائل انسان کے تابع ہیں اور سب کو بلا امتیاز فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

بنیادی ضرورتیں ہیں مثلاً چھت، کھانا، کپڑا۔۔۔اللہ ان کے لئے ایسے وسائل پوری طرح فراہم کرتا ہے جن سے یہ ضرورتیں پوری ہوتی رہتی ہیں۔۔۔ پھر بھی کچھ لوگ وسائل کی کمی کا شکوہ کرتے ہیں۔ایک گروہ وہ ہے جو وسائل استعمال کرتا ہے مگر غور نہیں کرتا۔دوسرے گروہ کے لوگ ان پر غور کرتے ہیں۔

اللہ نے انسان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا۔اپنی مرضی سے زندہ رکھتا ہے اور جب تک چاہتا ہے زندہ رکھتا ہے۔۔۔تو اس کا مطلب ہوا کہ انسان کو زندہ رکھنا قدرت کی مجبوری ہے۔استغنا کا مطلب ہے کہ وسائل کی محتاجی کا تصور ختم ہو جائے۔انسان جب تک وسائل کے گورکھ دھندے میں پھنسا رہتا ہے۔وہ اللہ کے قریب نہیں ہو سکتا ہے۔روحانیت میں اس بات کی پریکٹس کرائی جاتی ہے کہ یہاں سب کچھ۔۔۔دروبست۔۔۔اللہ ہی اللہ ہے۔

سلسلہ میں وسائل کی محتاجی نہ ہونا، پابندی نہ ہونا، اللہ کے کرنے میں وسائل کی کمی نہ ہونا۔۔۔یہ سب مسلسل تجربہ ہے تاکہ کارکنوں میں یقین کا پیٹرن بن جائے۔

پھر کراچی، لاہور، اٹک، حیدرآباد اور چنیوٹ کے مراقبہ ہالوں کے بننے کی مثالیں دے کر فرمایا۔اگر کہیں کامیابی نہیں ہوئی تو وہاں کے کارکنوں کے یقین کا پیٹرن درست نہیں۔۔۔اُن کی کاوشوں میں نقص ہے۔سونے اور مٹی میں کیا فرق ہے؟ دونوں مٹی ہیں۔سونے کو اہمیت اللہ نے نہیں انسانوں نے دی ہے۔سلسلے کے ہر بندے کو یہ تجربہ کروادیا جاتا ہے کہ وہ وسائل کا نہیں اللہ کا محتاج ہے۔جب وہ وسائل کا محتاج نہیں رہے گا تو وہ اللہ کے قریب ہو جائے گا۔

پھر سورہ اخلاص کی شرح فرما کر کہا۔اللہ کے برعکس مخلوق احتیاج رکھتی ہے۔ مخلوق محتاج ہوتی ہے۔ کیا یہ وسائل کی محتاجی نہیں کہ باپ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ مخلوق کا ایک نہ رہ سکنا بھی محتاجی ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا تھا کہ اللہ کی ان پانچ صفات میں سے چار صفات ایسی ہیں جن کے لئے انسان بے بس ہے۔ لیکن ایک صفت یعنی وسائل کی محتاجی نہ ہونا کو انسان اپنا سکتا ہے۔۔۔یعنی ایک ایجنسی ایسی ہے جس کے ذریعے وہ خود کو اللہ کے ساتھ وابستہ کر سکتا ہے۔

انسان غور کرے کہ اگر وہ اللہ کے ساتھ وابستگی رکھنا چاہتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ کیسے وابستہ ہو سکتا ہے۔اللہ کے وابستگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ وسائل کی محتاجی سے آزاد ہو جائے۔اس کے لئے تجربہ ہونا اور بار بار ہونا ضروری ہے۔لا محالہ اس تجربے کے بعد یہ ذہن بن جائے گا کہ جب اللہ چاہے گا کام ہو جائے گا۔۔۔اس طرح انسان میں استغنا پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کی شعوری زندگی پہ لاشعوری زندگی غالب آجاتی ہے۔

ہر آدمی کبھی ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے۔بچے میں نہ کوئی انا ہوتی ہے اور نہ ہی اپنی کوئی سوچ۔۔یعنی ہر بچہ وسائل کی فراہمی سے آزاد ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ والدین کے دل میں بچوں کی محبت نہ ڈالے تو اُن کی پرورش میں کتنی دشواری ہو۔۔۔میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچے کو تو ایک گھنٹے تک ٹہلا سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے کے بچے کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔۔کیوں؟

کیونکہ اللہ نے اس بچے کو والدین کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔۔کیونکہ اللہ اُن کے دل میں اس بچے کے لئے۔۔۔۔جو اُن کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔۔۔محبت ڈال دیتا ہے۔

پھر ایک بھنگن کا قصہ سنایا کہ کس طرح وہ ایک انتہائی کالا کلوٹا بچہ سب سے زیادہ حسین و جمیل بچے کے طور پر اُٹھالاتی ہے کیونکہ وہ اُس کا اپنا بیٹا ہوتا ہے۔

پھر فرمایا۔ بچہ وسائل کے نام سے واقف ہی نہیں ہوتا۔ انسان بنیادی طور پر وسائل کا پابند نہیں ہے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے۔ اُس کے اندر لاشعوری حرکات کم اور شعوری حرکات بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ وہ ذہن جو وسائل کا پابند ہے ہو۔۔۔ وہ وسائل بنانے والے کی طرف نہیں جاسکتا۔۔۔ یاد رکھیں تعویز نہیں۔۔۔ تعویز لکھنے والے کا ذہن کام کرتا ہے۔ تعویذ بھی ذہن کی ایک حرکت ہی تو ہے۔ آپ کام کے ارادے سے ایک لکیر کھینچ دیں اگر ذہن کی حرکت میں یکسوئی اور توانائی ہے تو کام ضرور ہو گا۔ انسان یقین کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

حضورؒ نے مجھ سے فرمایا۔ کوئی آدمی جب تک دل سے نہ چاہے وہ مر نہیں سکتا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ ملک الموت بھی انسان کے شرف کے باعث اس کا غلام ہے۔ اگر اُس کے مارنے کا حق مان لیا جائے تو انسان کا شرف ختم ہو جائے۔

پھر بہاؤالدین زکریاؒ کا واقعہ سنایا کہ ایک صاحب نے ملاقات کے لئے وقت مانگا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ مصروف ہیں تو ایک رقعہ لکھ کر اُن کے پاس بھجوایا۔ رقعہ پڑھ کر آپ نے اُس کو کہلوایا کہ آدھ گھنٹے بعد آئیں۔ آدھ گھنٹے بعد وہ وصال فرما گئے۔ تجہیز و تکفین کے بعد کسی کو خیال آیا کہ وہ رقعہ کھول کر دیکھا جائے۔ رقعہ دیکھا۔۔ اس میں لکھا تھا۔

بڑی سرکار نے یاد فرمایا ہے۔ میرے لئے کیا حکم ہے۔ فقط ملک الموت

پھر غوث علی شاہ صاحبؒ کا کافر شاہ کا بیان کردہ واقعہ سُنا کر فرمایا۔ یعنی موت بھی مجبور ہے کہ پوچھ کر روح قبض کرے۔ انسان نے اپنے شرف کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ اُسے کبھی شرف محسوس نہیں کیا۔۔۔ جب آپ اپنے شرف کو اہمیت نہیں دیتے۔۔۔ تو آپ خود کو اشرف المخلوقات کے دائرے سے نکال لیتے ہیں لیکن تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ انسان کو وسائل پھر بھی میسر رہتے ہیں۔ انسان خود ہی اپنے لاشعور کو رد کر کے شعور کو غالب کر لیتا ہے۔

حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ صدر الصدور ہیں۔۔۔ وہ چاہتے ہیں کہ سلسلے کے ہر فرد کو اس بات کا مشاہدہ ہو۔۔ ہر عظیمی علم میں راسخ ہو۔۔ کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ روحانی علم میں یقین بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور علم ہی یقین ہے۔ علم یوں تو تمام سلسلوں میں ہے لیکن عظیمیہ سلسلے میں اس لئے زیادہ ہے کہ امام سلسلہ علیم کی صفت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ گھر میں اگر علم ہو تو گھر کے سارے بچے علیم ہو جائیں گے۔

آپ مشاہداتی علم سیکھیں۔ جب آپ کہیں کہ اللہ ہے تو آپ کو اللہ نظر آنا چاہئے۔ شہادت تبھی معتبر ہوتی ہے۔۔۔ جب عینی ہو۔۔ تو ہم کیوں اپنے اندر وہ صفت پیدا نہیں کرتے۔۔۔ علم الیقین سے آگے بڑھ کر مشاہداتی نظر ہے۔ ایمان کا مطلب ہی مشاہداتی نظر رکھنا ہے۔ کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا کہ اُس نے اللہ کو نہیں دیکھا۔ آپ ماضی کی طرف پلٹیں ۔۔ عالم ارواح میں ۔۔۔ ابھی حواس بھی پیدا نہیں ہوئے۔۔۔ اللہ نے ارواح کو مخاطب کر کے کہا۔۔۔ الست بربکم۔۔ حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ نے ترجمہ کیا۔ کیا میں۔۔ تمہارا رب نہیں ہوں۔۔۔ اللہ کی یہ آواز مخلوق میں سماعت پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ تجسس میں اُس نے دیکھا کہ اللہ میاں سامنے ہیں اور قوت گویائی کے زیر اثر اُس نے اقرار کیا۔۔ جی ہاں۔۔۔ آپ ہمارے رب ہیں۔

بچہ پیدا ہوتا ہے تو کچھ نہیں دیکھتا۔ شعوری نظر بالکل فکشن ہے۔ ربوبیت کا مطلب ہے۔۔ وسائل پیدا کرنے والی ذات۔۔ اگر انسان نے دیکھا تو سب سے پہلے اپنے رب کو دیکھا۔۔ سُنا تو سب سے پہلے اپنے رب کو سُنا۔۔۔ بولا تو اُس کی ربوبیت کے اقرار میں۔

روح کی بنیاد پا کر ہی انسان۔۔۔ انسان بنتا ہے۔ وہ چیز جو مسلسل گھٹ رہی ہے وہ مادی زندگی ہے اور جس پستی کی بنیاد پر ہی جسم کھاتا پیتا لکھتا پڑھتا ہے۔۔۔ جب ہم ادھر متوجہ ہی نہیں تو ہم روح کی تحریکات سے بھی واقف ہو ہی نہیں سکتے۔ یقین کے پیٹرن کے لئے ضروری ہے کہ وسائل کی پابندی نہ رہے۔ یاد رکھیں۔۔ وسائل ہمارے پیدا ہونے سے پہلے موجود تھے اور مرنے کے بعد

بھی موجود رہتے ہیں انسان کو اس تھوڑی سی زندگی میں کوئی اختیار حاصل نہیں۔۔اگر کوئی اختیار حاصل ہے تو وہ بھی اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔

جس طرح یہاں اس دنیا میں وسائل ہیں ویسے ہی اُس دنیا میں بھی وسائل ہیں۔۔۔انسان اس دنیا میں آتا ہی اُس وقت ہے جب اُس نے اس دنیا کے مادی وسائل کی محتاجی کو قبول کیا۔۔انسان نے جب جنت میں حکم عدولی کی۔۔۔ جنت میں یقین کا جو پیٹرن تھا اُس کے اندر شک اور وسوسہ غالب ہوا۔۔۔ایک ایسی کیفیت غالب آگئی جس میں نہ ٹھہراؤ ہے نہ قرار ہے نہ قیام ہے۔یقین کے کمزور ہونے کا نام شعور ہے۔اس کا علاج وہی ہے جو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے متعین فرمادیا ہے۔

اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم حضور ﷺ کی طرزِ فکر کے مطابق یقین کا پیٹرن بن جائیں۔ہم اسی زندگی میں رہتے ہوئے جنت کی زندگی میں لوٹ جائیں۔۔۔جس طرح آدم اور حوا اللہ کو دیکھتے تھے ہم بھی اللہ کو دیکھ سکیں۔۔۔ہم اللہ کو دیکھ چکے ہیں تو ہم اللہ کے دوست بن جائیں۔ہمارے بڑے۔۔۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ اللہ کے ایسے دوست ہیں ہیں جہاں مشیت بھی اُن سے پوچھ کر مقرر ہوتی تھی۔اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کے تحت کائنات بنتی ہے بگڑتی ہے۔کائنات میں زندگی کی لہریں دوڑتی ہیں۔

آپ سب تشریف لائے۔میری خوشی پوری ہوئی۔۔۔۔میرا دل چاہتا ہے کہ ہم سب حضور ﷺ کے مشن کو پھیلانے میں اپنا اپنا کردار ادا کریں۔

یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جن پر غور و فکر کے نتیجے میں بندہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور بندے میں ایک سرور کی کیفیت ہو جاتی ہے۔ہمیں حضور ﷺ کے لختِ جگر کے طفیل شعوری غلبے سے نکل کر لاشعوری کیفیت میں داخل ہونے کی سعادت نصیب ہو اور ہم اللہ سے قرب کا ایسا تصور عام کر دیں جس کے مطابق بندہ اللہ سے سرگوشی کرتا ہے۔

کوئی نبی کسی ایک گروہ کا نبی نہیں ہوتا۔۔۔ نبی پوری کائنات کے لئے نبی ہوتا ہے۔۔ حضور قلندر باباولیاءؒ حضور ﷺ کا تمثل ہیں۔۔۔اُن کا عکس ہیں۔ حضور قلندر باباولیاءؒ کا ورثہ ہمارا ہے۔ ہم سعید ہیں۔۔۔۔ ہم پر انعام ہوا ہے۔ کتابوں میں پڑھا ہے کہ بعض بزرگوں کو زندگی میں ایک بار ابدال کی زیارت کر لینے سے بزرگی ملی اور ایک بار مصافحہ کر لینا درجات میں بلندی کا باعث سمجھا جاتا تھا۔

اگر ہمارے اندر وسوسے ہیں۔۔۔۔ شکوک ہیں۔۔۔ تو ہم ناخلف ہیں۔

اللہ آپ کو۔۔۔ اللہ کو پانے کی جدوجہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔۔۔ آمین۔۔

پھر شکریہ کہہ کر تقریر ختم فرمادی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ سماعت اور بصارت کے علاوہ ورائے حسیاتی فیڈنگ (Feeding) کے اثرات سب شرکائے مجلس کے چہروں پہ واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ اب یہ فیڈنگ کس کس طرح اور کب کب اپنے اثرات دکھائے گی یہ تو وقت بتائے گا لیکن وہاں سب ہی پُر امید و پُر یقین تھے کہ جلد اور بہت موثر انداز میں۔

صبح مراقبے اور درس کے بعد سیر کے دوران ہمراہیوں سے فرمایا۔ ماشاءاللہ بہت اچھی کانفرنس ہوئی۔ اس کے دوررس اثرات ہوں گے۔ اب وہاں کے لوگ سلسلے کے نام سے اجنبیت محسوس نہیں کریں گے۔ کسی نے ممتاز علی کی تعریف کی کہ انہوں نے بہت اچھا انتظام کیا۔ ہنستے ہوئے فرمایا۔۔۔ آپ اُس کا یقین دیکھیں۔۔۔ چڑی جتنا دماغ ہے۔۔۔ لیکن روحانی کانفرنس کروا دی۔۔۔ میں ڈانٹتا رہا۔۔۔ مگر اُس کی ایک ہی بات رہی۔۔۔۔ ہو جائے گا۔۔۔۔ اور وہ بالآخر ہو ہی گیا۔

مرید نے عرس پہ آئے ہوئے لوگوں کے ہمراہ فرشتوں کی تعداد کو ذہن میں رکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔۔ کس قدر فرشتے آئے ہوں گے۔

فرمایا۔۔جی ہاں۔۔۔ یہاں تو تل دھرنے کو جگہ نہ رہی ہو گی۔۔ تہہ در تہہ ہوں گے۔

مرید نے ایک سوال پوچھا۔ کیا ہیجڑوں میں بھی عارف باللہ لوگ ہوئے ہیں۔

فرمایا۔ بہت بڑے بڑے عارف گزرے ہیں اُن میں۔۔ پھر تبصرہ کیا۔ آج کل یہ لوگ کچھ کم ہی نظر آتے ہیں۔

اس بار انگلینڈ سے آئے ہوئے ڈاکٹر ممتاز کو روحانی تربیتی ورکشاپ کے انعقاد کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ وہ اپنی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ دو ڈھائی سو افراد اس ورکشاپ میں شرکت کے لئے اپنے نام رجسٹر کروا چکے تھے۔ اس ورکشاپ میں دس دس افراد کے گروپس قلندر شعور کتاب کے منتخب عنوانات پہ مل بیٹھ کر غور کریں گے۔۔۔ آپس میں بات چیت اور غور و فکر میں معاونت کے لئے ہر گروپ میں ایک ایک کوارڈینیٹر بھی مقرر کیا گیا تھا۔ زیادہ تر افراد کو ورکشاپ کے آئیڈیا کی ندرت کے سبب تجسس ہو رہا تھا۔

منتظمین نے ورکشاپ کے طریقہ کار کی وضاحت کے بعد خانوادہ سلسلہ عظیمیہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کو شرکا کی فکر و نظر کی راہنمائی کے لئے دعوت خطاب دی۔

خیر مقدمی کلمات کے بعد اپنے خطاب میں آپ نے فرمایا۔

اللہ نے لقمان کو حکمت دی تاکہ وہ اُس کو استعمال کرے۔ وہ لوگ جو اللہ کی دی ہوئی بصیرت اور صلاحیت کو استعمال کرتے ہیں اُس کا فائدہ انہی کو ہوتا ہے اور جو اُس پر غور و فکر نہیں کرتے وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ جو قومیں اپنے اندر تبدیلی چاہتی ہیں وہ غور و فکر

کرتی ہیں۔ آج کی ورکشاپ اس بات کی ضمانت ہے کہ لوگ اللہ کی دی ہوئی بصیرت و صلاحیت استعمال کرنے کی سمت قدم بڑھا چکے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک علمی، مشاہداتی اور تجرباتی سلسلہ ہے۔ علم ہی کی وجہ سے انسان دوسری مخلوقات سے ممتاز ہے۔ یہ سب ایجادات بھی علم ہی کے باعث سامنے آئی ہیں۔

لوگوں نے ذہنی یکسوئی کے ساتھ جستجو اور تلاش کے ساتھ جب بھی کوشش کی کامیاب ہوئے اور جو لوگ وقت کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور وقت ضائع کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اس ورکشاپ کے انعقاد کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم اپنے اندر کھوج لگا کر اپنی صلاحیتوں کو متحرک کریں پیغمبروں کی طرزِ فکر پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہیں خصوصی علم عطا ہوا ہے۔ اس خصوصی علم کی ایک قسم یہ ہے کہ آدم زاد کو کس طرح ممتاز کیا جائے۔

شریعت انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کرنے کا ذریعہ ہے۔ شریعت نے انسانوں کو سماجی اور معاشرتی قوانین دیئے۔ ایک زمانہ تھا کہ آدم زاد اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ انسان بھی جانوروں کی طرح عریاں رہتا، درندگی کا مظاہرہ کرتا اور غاروں اور بلوں میں رہتا تھا۔ پھر اللہ نے انسانوں کو برتر کرنے کے لئے اپنے نبی بھیجے جنہوں نے انسانوں کو یہ علم دیا کہ انسان ایسی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے جو اُس کو حیوانوں سے ممتاز کرنے کا سبب ہیں۔ جنہوں نے اُن کی بات سُنی وہ حیوانی سطح سے بلند ہو گئے۔ آج بھی ایسی قومیں موجود ہیں۔۔۔ جیسے ریڈ انڈین اور افریقہ کے مردم خور وحشی قبائل۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایسے انسان موجود ہیں جو حیوانی سطح سے بلند نہیں ہیں۔

ہم انشاء اللہ ایسا انقلاب برپا کر دیں گے جس میں نوعِ انسانی مجبور ہو جائے گی کہ وہ اپنے مقصد حیات کو تلاش کرے۔ اللہ نے سلسلے کے افراد کو جو صلاحیتیں بخشی ہیں۔ قلندر بابا اولیا کی تعلیمات نے اُن کو جو نکھار بخشا ہے کہ وہ اقوام عالم میں سرفراز ہوں

گے۔اس کے لئے وقت کی پابندی لازم ہے۔ مذاہب عالم میں وقت کی اہمیت کو نہ سمجھنے والی اقوام تباہ ہو گئیں۔ جن اقوام نے وقت ضائع نہیں کیا۔۔ وہ ممتاز اور سرفراز ہوئیں۔ علم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وقت ضائع نہ کریں۔ وقت کے درست استعمال کی اہمیت سے آگاہ ہوں۔ اس کی افادیت کو سمجھیں۔ اُس کا سلیقہ سیکھیں اور اُس کے ساتھ ساتھ اخلاق، مروت اور ایثار سے کام لیں۔۔۔ خود غرضی اور حسد کے شر سے پناہ لیں۔ خود غرضی نہ ہو گی تو ایثار پیدا ہو گا۔۔۔ تنظیم ہو گی جو اجتماعیت کے لئے ضروری ہے۔ شعور کی بالیدگی کے مطابق اپنے بھائی کے لئے محبت اور ایثار ہو۔۔۔ کبر و نخوت نہ ہو۔۔۔ خود سپردگی ہو۔

ہمیں چاہئے کہ قرآن کے علم کے مطابق اُن صلاحیتوں کو جاری و ساری کریں جو کائنات کی تکوین کے فارمولوں کی بنیاد ہیں۔ یاد رکھیں جو خود سپردگی یا Dependence ہونے سے آگاہ نہیں وہ تکوین میں آ ہی نہیں سکتا۔ حضرت موسیٰؑ کے قصے میں وہ بندہ جس کے پاس موسیٰؑ چل کر گئے تھے۔۔ خود سپردگی سے ہی ہم تکوینی علوم کو حاصل کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

پھر فرمایا۔ میں ایک نثری شاعر ہوں اور خوش ہوں کہ میری کتابوں کو بھرپور داد اور پزیرائی ملی۔ مصنف کی یہ بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اُس کی تصانیف کو اُس کی زندگی میں ہی سمجھ لیا جائے۔

ورکشاپ دو روز جاری رہی۔ شریک ہونے والوں نے متفرق تاثرات کا اظہار کیا۔ کم لوگوں نے اس کی افادیت سے انکار کیا۔ البتہ بعض افراد کو غور و فکر کا یہ انداز اپنے نئے پن کے سبب کچھ غیر مانوس سا لگا اور انہیں یہ سہل محسوس نہیں ہوا تھا۔ بیشتر نے اس کو پُر لطف تجربہ بتایا۔

دو ایک دن بعد مراقبہ ہال کی رونقیں سمٹ گئیں۔۔۔ یادوں کی سطح بلند ہو گئی۔ مہمانوں کے آرام کے لئے دریوں کے نیچے

بچھایا گیا بھوسہ اٹھوا کر جلایا جا رہا تھا۔ کارکنان بستر، دریاں سمیٹ رہے تھے۔ وہ مراقبہ ہال سے باہر خاشاک کے ڈھیر سے بلند ہوتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا کہ کسی نے کہا۔ مرشد کریم آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوا تو مرشد کریم، فضل الرحمان قریشی صاحب، قادری صاحب، لطیف بھائی اور چند دیگر افراد کھرے تھے۔ معلوم ہوا کہ جن افراد نے سلسلے کے لئے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔۔۔ کوئی قابل تقلید خدمت کی ہے یا بے لوث خلوص اور ایثار سے مہمانوں کی دیکھ بھال کی ہے۔۔۔ مرشد کریم اُن کو اپنی خوشنودی کے اظہار کو توصیفی سند سے نوازیں گے۔

ایک توسیفی سرٹیفیکیٹ غلام رسول قادری صاحب کے ہاتھوں میں پکڑ کر مراد نے اُس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا کہ وہ سرٹیفیکیٹ وصول کرے۔۔۔ حیرت سے کھلے منہ اور پھٹی انکھوں سے مرید نے انہیں دیکھا۔ انہوں نے قادری صاحب کو بتایا۔ انہوں نے لوح و قلم کو انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

اُس نے حواس باختگی میں سرٹیفیکیٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ پھیلایا تو مرشد کریم نے اُس کا بازو پکڑ کر اُسے قادری صاحب کے دائیں طرف دھکیلتے ہوئے۔۔۔ اُسے اُن سے مصافحہ کر کے سرٹیفیکیٹ وصول کرنے کے آداب بتاتے ہوئے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ وہاں موجود سب ہی افراد تالیاں بجا رہے تھے۔ قادری صاحب اپنی ضعیف العمری کے سبب عام طور پر کسی کے سہارے کھڑے ہوتے تھے۔ اُس وقت بھی کسی نے انہیں تھاما ہوا تھا۔ اُن کی عمر نوے سال سے زائد تھی۔ مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے اُس کو شاباش دی اور کہا۔ بھئی آپ تو حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی فوج کے جرنیل ہیں۔

پھر لطیف بھائی کو اتنے مہمانوں کو لنگر اور کھانا کھلانے اور اس کام کو ایک عرصے سے لگاتار کرتے رہنے پر سند توصیف سے نوازا گیا۔ تیسرے سرٹیفیکیٹ کے لئے سعید بھائی کا نام پکارا گیا۔ وہ اُس وقت بھی جھاڑو پکڑے گیٹ کے پاس درختوں سے گرے پتے سمیٹ رہے تھے۔ مراقبہ ہال اور مسجد کی دیکھ بھال کا انتظام کرنے پہ مرشد کریم نے سند پسندیدگی سے نوازا تھا۔

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ نے سلسلے کی خدمت میں خلوص اور ایثار کی فرمائش کی تھی اور جن لوگوں نے انہوں نے مناسب سمجھا سراہ دیا۔ لیکن اولیت اور استغنا کا لطف اُس کے رگ و پے میں خون کے ساتھ گردش کرتا محسوس ہوا۔ اُس نے مرشد کریم کو تشکر و اطمینان سے بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔

پشاور سے آئے ہوئے دوست خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ یہ اعزاز پشاور کے حصے آیا ہے تو فرمایا۔ مقصود صاحب تو کراچی کے آدمی تھے مگر اعزاز پشاور کے حصے میں آگیا۔

وہ اُسے لوگوں سے مبارک باد وصول کرتے چھوڑ کر وہاں سے چل دیئے۔ اُن کے وہاں سے ہٹتے ہی پورا مراقبہ ہال خالی ہو گیا۔ اُس نے ایسا کب سوچا تھا۔۔۔ ایسا کب چاہا تھا۔۔ بن چاہے۔۔۔ بن مانگے انہوں نے اُس کو اتنا نوازا کہ اُس کی تنگی دامان کا احساس ہونے لگا تھا۔ شام ہونے تک وہ خوشیوں کے گھڑ اُٹھائے۔۔۔ مسرتوں کے راگ پہ۔۔۔ رگ و پے میں ہونے والی جھنجھناہٹ کی تال پر۔۔۔ من ہی من میں رقص کناں رہا۔

اُس نے خود سے مخاطب ہو کر باآواز بلند کہا۔ میاں تمہیں تمہارے مرشد کی دُعا لگ گئی ہے۔ انہوں نے اُسے خوش رہنے کی دُعا دی تھی اور تب سے خوشیوں نے اُس کے گھر کی راہ دیکھ لی تھی۔ ایک دن کسی نے اُس سے فون پہ بڑے مرے ہوئے لہجے میں

پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے ؟اُس نے خوشی اور مسرت کے اظہار کو کہدیا۔الحمد اللہ میرے یہاں تو خوشیاں رقص کر رہی ہیں۔چند روز بعد انہی صاحب نے فون کر کے پوچھا۔آپ کے ہاں جو مجرا ہو رہا تھا ختم ہو گیا ہے یا ابھی جاری ہے ؟

اُس نے سوچا وہ خوشی کو ترسا ہوا تھا۔۔۔مرشد کریم نے کیف و سرور کو اُس کے اندر اس طرح بھر دیا ہے کہ جنم جنم کی ترساہٹ ختم ہو گئی ہے۔

قرآن الہامی طرزِ کلام

شام کی نماز اور مراقبے کے بعد مراقبہ ہال کے باہر ٹہلتے ہوئے اُس نے مرشد کریم سے اُن کی کتاب نظریہ رنگ و نور کا ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی تو اس میں بار بار کی گئی کانٹ چھانٹ پہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔اس (کانٹ چھانٹ کی) وجہ سے اس کتاب کا سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کیونکہ تشریحی جملے نکل گئے۔ پھر قلندر باباولیاؒ کی بابت بتایا کس طرح انہوں نے لوح و قلم انہیں دکھائی تو انہوں نے ابتدائی آٹھ صفحات یہ کہہ کر کاٹ دیئے کہ ان کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا۔ ہم نے کچھ اس لئے کاٹ دیا کہ اس کی تکرار محسوس کی اور کچھ اس لئے کہ اس کا تشریحی انداز مختصر ہو جائے۔اس سے پوری کتاب ہی مختصر ہو کر رہ گئی۔ پھر کتاب کے آخری باب کی بابت کہا کہ اُسے دیکھ کر تو خصوصاً یہ لگتا ہے کہ ہم نے یہ پورا باب ہی کہیں سے نقل کر دیا ہے۔اس میں دو چار صفحے بھلے ہی زیادہ ہو جاتے لیکن ہمیں اُس میں اپنی بات بھی ڈال دینا چاہئے تھی۔ سب کچھ قاری کے ذہن پر بھی نہیں چھوڑ دینا چاہئے۔انسان کے شعور کی کمزوری یہ ہے کہ وہ بات کو ٹکڑوں میں سمجھتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ وہ بات کو سمجھنے کے لئے اُس کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

قرآن میں بھی تکرار ہے۔انسان کا شعور تکرار کے بغیر بات کو سمجھتا ہی نہیں۔ قرآن الہامی طرزِ کلام ہے۔ حضور ﷺ نے قرآن عربی میں پیش کیا لیکن عربی پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا حالانکہ بہت سے موقعوں پر اس کی ضرورت بھی پڑی۔ وہ خطوط پر اپنی انگوٹھی سے مہر لگاتے تھے۔ مرزا غلام احمد نے اسی بات سے تو فائدہ اُٹھایا قرآن میں خاتم ہے اور خاتم کا مطلب ہے انگوٹھی یعنی حضور ﷺ انبیا کرام میں انگوٹھی کے نگینے کی مانند ممتاز ہیں۔ بس زیر زبر سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو گیا۔ علم سینہ ان خرابیوں سے محفوظ ہوتا ہے۔ علم سینہ کی طرزِ علم منتقل کرنے کا یہی فائدہ ہے کہ آپ ایک بات کا کوئی دوسرا مطلب نہیں لیتے۔ جو کہہ دیا وہی اس کا مطلب

ہوتا ہے اور وہ اپنے جیسے ہی انسان کو بتایا جاتا ہے۔ ایسا انسان ساری زندگی نہ ملے تو اُسے سینے میں بھرے پھرتے رہیں اور جاتے ہوئے ساتھ لے جائیں۔

فرمایا نظریہ رنگ و نور کی تشریح ہونا چاہئے۔ مرید نے اس بات کی وضاحت کی درخواست کی تو فرمایا۔ پیرا گراف نقل کر کے تشریح کرنا تفسیر ہوا۔ جو بھی آپ کے ذہن میں آئے اُسے لکھیں تو یہ تشریح ہوگی۔ تفسیر نہ کریں۔ جب سے قرآن کی تفسیر لکھی جانے لگی ہے مسلمانوں پہ انحطاط اور زوال آگیا۔ دراصل انسان آرام پسند ہے اس لئے خود غور و فکر نہیں کرتا اور جب تفسیر پڑھتا ہے تو قرآن پیچھے چلا جاتا ہے اور تفسیر کرنے والے کا ذہن سامنے آجاتا ہے۔

مولانا مودودی کی تفسیر کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ جب لوگ اُن کی تفسیر پڑھتے ہیں تو قرآن سے دھیان ہٹ جاتا ہے۔ اب ہم قرآن کو نہیں بلکہ مولانا کو پڑھتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ جو کچھ بھی اس کتاب کے مطالعہ سے ذہن میں آئے لکھ لیا کریں۔

پھر گوتم بدھ کی بابت فرمایا۔ گوتم بدھ نے اسی لئے کوئی کتاب نہیں چھوڑی کہ کوئی نہ کوئی تحریر ہوگی نہ لوگ ایک سے زیادہ مطلب نکالیں گے۔۔۔ نہ فرقے بنیں گے۔ تحریر ہو تو ایک آدمی ایک مطلب نکالتا ہے اور دوسرا آدمی دوسرا مطلب لیتا ہے۔ گوتم بدھ نے اسی لئے اپنی تعلیمات کو علم سینہ بنادیا نہ تحریر ہوگی۔۔۔ نہ تفرقہ ہوگا۔ یہ مذہب بہت ہی پُر امن مذہب ہے۔ گوتم بدھ چونکہ شہزادہ تھا اس لئے وہ پڑھا لکھا تھا لیکن اس کے باوجود اُس نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ علم کو بطور علم سینہ منتقل کرنے کا بندوبست کیا۔ اُن کے پیروکاروں میں بڑے بڑے پکے لوگ ہیں۔ اُس کے ہاں سٹوپا کے بڑے راہب کو بھکشو کہتے ہیں۔

پھر ایک صاحب کا نام لے کر فرمایا۔ وہ تھائی لینڈ گئے تو ایک بھکشو سے ملے۔ جب اُس کو انہوں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا حوالہ دیا تو انہوں نے بتایا کہ اس وقت وہ دنیا کے سب سے زیادہ عظیم انسان ہیں کیونکہ اُن کے گرد روشنیوں میں دیگر رنگوں کے علاوہ سنہرا رنگ بہت نمایاں ہے جو سلطنت اور حکومت کا رنگ ہے۔ انہیں یہاں تک بتایا کہ آپ عظیمی صاحب کے قریب ہیں۔

سیر سے واپسی پر مراقبہ ہال پہنچے تو برامدے میں بچھے تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ منتظر تھے۔ انہیں وہیں بلا لیا۔ اُن سے بات چیت ہو رہی تھی کہ عرفان صاحب نے آکر بتایا کسی کا فون ہے۔ آپ اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ فون پر بات کرتے ہوئے فرمایا کہ نام رکھنے کے لئے پہلے دن جو بھی نام ذہن میں آتا ہے وہ اپنے نقوش بچے کے ذہن پر چھوڑ جاتا ہے۔

پھر کسی اور کا فون آگیا۔ کھانے کی گھنٹی بجی تو خالہ صدیقہ نے آکر کہا کہ اب آپ سب جائیں اور کھانا کھائیں ابا حضور آرام کرنا چاہ رہے ہیں۔

اگلے روز اُس نے واپس آنا تھا اور وہ اس تاڑ میں تھا کہ واپسی سے پیشتر ملاقات ہو جائے۔ ناشتے کے بعد وہ اور شاہین دونوں حضور کے کمرے میں جا پہنچے۔ فرمایا آج آپ مت جائیں۔ عرض کی۔۔۔ جو حکم۔۔۔ جا کر ٹکٹ تبدیل کروا لیتا ہوں۔

فرمایا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اگر ائیر پورٹ جانا ہی پڑ رہا ہے تو پھر یوں بھی آج نہیں تو کل تو جانا ہی ہے۔ دراصل اس روز کراچی میں ہڑتال تھی۔ اس وجہ سے رُکنے کا فرما رہے تھے۔

فرمایا۔ آپ نے غصہ کرنا ترک نہیں کیا۔

عرض کی۔۔۔ کچھ تو فرق پڑا ہے۔

فرمایا۔ہاں فرق تو ہے۔۔۔ پھر کہا بعض اوقات اونچا بولنا ضروری ہو جاتا ہے۔لوگ اس کے بغیر مانتے بھی تو نہیں۔ لیکن آپ کوشش کریں کہ میری طرح ہو جائیں۔۔۔ جیسے پانی۔ اب مجھے غصہ آتا ہی نہیں۔ غصہ کرنا ہو تو پہلے باقاعدہ منصوبہ بناتا ہوں۔۔۔یوں ڈانٹوں گا۔۔اتنا غصہ کروں گا۔۔۔یہ کہوں گا۔۔وہ کہوں گا۔

فرمایا آج کل منیر صاحب اور دبئی والوں پہ غصہ ہونے کا پروگرام بنا رہا ہوں کہ انہوں نے ورکشاپ میں شرکت کیوں نہیں کی۔انہوں نے پیسے کو علم پہ فوقیت دی۔یہ اُن کے انچارج کی غلطی ہے۔ بھئی میرا آپ کا رشتہ ہی علم کا ہے۔آپ کو اُسی کی قدر نہیں تو مجھے آپ سے کیا لینا۔ پھر فرمایا۔اب مجھے اپنی جگہ جم کر بیٹھ جانا چاہیئے۔ جس نے آنا ہو وہ چل کر خود آئے۔ میں نے تو دبئی والوں کو کہہ دیا ہے کہ میں نہیں آ رہا۔آپ ہیں کہ مجھی کو دوڑا دوڑا کر ہلکان کئے دے رہے ہیں۔اس سے کئی ہونے والے کام متاثر ہو رہے ہیں۔ یہاں روحانی یونیورسٹی کا منصوبہ چل رہا ہے آج کل ساری ساری رات اُس کے نقشے بناتا ہوں۔۔۔ یہاں اُس کا کیمپس ہو گا۔۔ وہاں ہوسٹل ہو گا۔لوگ خزانے کی حفاظت کرتے ہیں لیکن آپ مجھی کو ہر جگہ آگے کرتے ہیں۔مجھے پیچھے رکھیں اور خود آگے بڑھیں۔اس طرح سلسلہ زیادہ تیزی سے پھیلے گا۔

فرمایا۔یہ سب استغنا کی طاقت سے ہی تو مظہر بن رہا ہے۔جب یہ تجربہ بار بار ہوتا ہے کہ یہ کام تو نہیں ہونا تھا۔۔۔یہ کیسے ہو گیا۔۔۔تو استغنا پیدا ہوتا ہے۔گھر کا بننا، مراقبہ ہال قائم ہونا۔۔ پھر اتنے بہت سے مراقبہ ہال تعمیر ہو جانا۔۔۔لکھا پڑھا نہ ہونے کے باوجود کتابیں لکھنا۔جب روحانی ڈائجسٹ کا ڈیکلریشن فارم بھرا تو تعلیم کے خانے میں لکھ دیا۔۔۔ علم لدنی فرمایا جب اوپر سے کام ہونا ہو تو کوئی نہیں دیکھتا کہ کیا لکھا ہے اور کیا نہیں۔

جب آپ اُٹھنے کو تھے تو شاہین نے اُس کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ابا۔۔۔ یہ وہاں پشاور میں مراقبہ ہال جانے میں اکثر ناغہ کر جاتے ہیں۔ مسکرا کر کہا۔ آپ کے پاس تو رہتے ہیں نا۔ پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ اگر یہ نہیں جاتے تو آپ انہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ پھر اُس کو مخاطب ہو کر مراقبہ ہال کی زمین کی بابت دریافت فرمایا۔ اُس نے حالات بتائے تو کہا۔ ابھی وقت نہیں آیا ہو گا۔ وقت بہر حال ایک بہت بڑا فیکٹر ہے۔

مرید نے عرض کی جب وقت ہی سب کچھ ہے تو پھر ہم کیوں چیں بچیں ہوتے ہیں؟

فرمایا۔ ہمارا مشاہدہ جو نہیں۔ جب لوح محفوظ سے عکس چل پڑتا ہے تو اُس کو اب مظہر تو بننا ہی ہے۔ آج نہیں ہو گا تو کل ہو جائے گا۔

اُس نے سوچا کہ وہ مرشد کریم سے اپنی ایک پریشانی کا تذکرہ کر ہی دے۔ وہاں پشاور مراقبہ ہال میں ایک بھائی نے اس کی بابت کچھ ایسی بات کہہ دی تھی جو اُسے ناگوار گزری تھی۔ اُس نے وہ بات انہیں بتا دی۔

بات سُن کر حضور کا لہجہ تن گیا۔ فرمایا۔ مقصود صاحب در اصل آپ ایک جذباتی انسان ہیں اور آپ میں انتہا پسندی بھی بہت ہے۔ وہ اُن کے اس انداز تکلم کا شناسانہ تھا۔ وہ سیدھا ہو کر دو زانو بیٹھ گیا۔ تو حضور نے اپنے لہجے کی تان کو قدرے کم کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ انتہا پسندی ذاتی معاملات کی حد تک تو درست ہے بلکہ فائدہ بھی دیتی ہے مگر جہاں دوسرے involve ہو جائیں وہاں انتہا پسندی نقصان دہ ہو جاتی ہے۔۔۔ جذباتیت یہ ہے کہ آپ دوسروں سے توقعات رکھتے ہیں۔۔۔ توقعات نہیں رکھنی چاہیئں۔ دوسروں سے توقعات ہی کے سبب آپ کو اُن پر غصہ آتا ہے۔ آپ دوسروں کی ذہنی سطح پر اتر کر بات کرنا سیکھیں۔

کچھ توقف کے بعد اسی مدھر اور میٹھے سے لہجے کو بحال کرتے ہوئے جو آپ کے مزاج کا خاصہ ہے۔۔۔فرمایا۔جب کوئی آدمی آپ کی توقع پر پورا نہ اترے تو نظر انداز کر دیا کریں۔۔۔ہو سکتا ہے کہ اُس میں سکت نہ ہو۔اگر ایک آدمی میں ایک کام کرنے کی سکت ہی نہیں تو آپ اُس سے وہ کیونکر لے سکتے ہیں؟ آپ خود دو سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔۔۔اب اگر آپ دوسروں سے بھی دو سیڑھیاں چڑھنے کی توقع رکھیں تو یہ کوئی درست بات نہ ہوئی۔۔۔اور پھر یہ بھی تو ہے کہ سیڑھیاں تو ایک ایک کر کے چڑھنا چاہیئں کیونکہ وہ بنائی ہی ایسی جاتی ہیں۔۔۔اگر دو سیڑھیوں کے برابر ہی فاصلہ طے کروانا ہوتا تو دو سیڑھیاں بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ایک ہی سیڑھی دو کے برابر بنا دی جاتی۔اب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی میں ایک سیڑھی چڑھنے کی بھی سکت نہ ہو۔پھر مثال دیتے ہوئے کہا۔میں نے طاہر جلیل کو خود پہ قیاس کرتے ہوئے اُن کو مراقبہ ہال شروع کرنے کا کہہ دیا۔۔اب وہاں کوئی آتا ہی نہیں۔۔یہاں تو ہم تیس سال سے کام کر رہے تھے۔۔۔یہاں سر جانی تک لوگ آجاتے ہیں۔وہاں یہ مسئلہ ہو گیا۔۔۔مجھے وقار بھائی جان نے کہا بھی کہ آپ دوسروں کو خود پہ قیاس نہ کیا کریں۔

پھر لہجے میں شفقت کی مٹھاس گھولتے ہوئے فرمایا۔اس بار جب میں غصے کے بارے میں تقریر کر رہا تھا تو میرے ذہن میں مخاطب آپ ہی تھے۔تقریر ہوتی تو کسی ایک آدھ ہی کے لئے ہے۔۔سُناسب کو دیا جاتا ہے تاکہ اجتماعی فائدہ ہو جائے۔

پھر غصے سے بچنے کی تاکید فرماتے ہوئے کہا۔غصے کا اصل سبب۔۔کبر ہے۔آپ خود کو بڑا سمجھیں گے تو لامحالہ دوسروں پہ غصہ آئے گا۔۔۔آپ دوسروں سے توقع رکھیں۔۔۔آپ کو غصہ آئے گا۔آپ کو مجھ پر غصہ کیوں نہیں آتا۔۔۔آپ خود کو بڑا نہیں سمجھتے۔۔۔آپ مجھ سے توقع بھی نہیں رکھتے۔اس لئے آپ کو مجھ پہ غصہ بھی نہیں آتا۔

پھر کہا آپ کے اندر ایک بہت بڑا مولوی چھپا ہوا ہے۔۔۔اب تو خیر بہت کم ہو گیا ہے۔اُسے نکالیں۔

مرید نے عرض کی مولوی سے آپ کی مراد شک ہی نا؟

فرمایا۔جی ہاں۔۔شک ہی تمام پریشانیوں کی اصل جڑ ہے۔

پشاور پہنچ کر کئی دن تک اُس کو اپنے ارد گرد کا جانا پہچانا ماحول اجنبی اجنبی سا لگا۔قربت مراد کی روشن ساعتوں اور شاداب لمحات کو یاد کرتا۔۔۔۔وہ اس فرق کو سمجھنے میں لگا رہتا کہ اُن کے قریب وسوسے، اندیشے اور خدشات کیوں نہیں آتے اور یہاں آکر رفتہ رفتہ ان کی شدت میں اضافہ کیوں ہوتا چلا جاتا ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ جب وہ ایک یکسو بندے کے قریب ہوتا ہے تو وہ اُن کی مقناطیسیت کی حصار میں ہونے کے سبب ان چیزوں سے محفوظ ومامون ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ یہاں پر اُس کے ارد گرد کے ماحول میں رچی بے یقینی اور لوگوں کے وسواس کی لہریں اُس کو اپنی لپیٹ میں لئے رہتی ہیں اس لئے وہ ان وسواس اور اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو جاتا ہے۔۔۔۔پھر وہ سوچتا کہ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خود بھی یکسوئی کے اُس درجے کو حاصل کر لے جہاں یہ سب کچھ اُس کی کیفیات پہ اثر انداز نہ ہو سکے۔۔۔۔جواب میں اُس کے اندر اُس کی ذہن کی سکرین پر ایک روشن ہیولا جھلملاتا اور اُس کو مخاطب ہو کر کہتا۔۔۔ بالکل ہو سکتا ہے تم اپنی توجہ اور دلچسپی کو ان کی طرف مرکوز رکھو تو تمہارے اندر بھی ایک ایسا مضبوط حصار بن جائے گا جو ایسی تمام چیزوں کے لئے سدراہ اور فصیل پناہ ہو گا۔

چاند رات پہ اُس نے کراچی فون کیا۔ حضور مرشد کریم گھر پہ ہی تھے۔ مرید نے عید مبارک کہا تو فرمایا۔ عید تو آپ کو ہی مبارک ہو۔۔ میں تو چاند میاں ہوں۔۔ مجھے تو چاندرات مبارک کہیں۔۔۔ بھئی عید میاں تو آپ ہیں۔ وہ جھوم ہی تو اُٹھا۔ پھر بتایا کہ عید کی نماز وہیں مراقبہ ہال سے ملحق میدان میں پڑھی جائے گی۔ ہنس کر فرمایا۔۔ مجھے پیش امام بنا دیا ہے۔۔ مرید نے عرض کی۔۔۔اور کیا خطیب نہیں؟ تو بتایا کہ اس موقع کے لئے ایک عصا بھی تیار کیا ہے۔ چھ فٹ لمبا عصا۔۔۔ باقاعدہ خراد مشین پہ بنوایا

ہے کہ جب میں منبر کی دوسری سیڑھی پہ کھڑا ہوں تو کان کی لو کے نیچے تک آئے۔۔چار پائی کے پائے جتنی تو موٹائی ہے اُس کی۔۔۔ یوں محسوس ہوا گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام والا عصا ہی پکڑا دیا ہو۔

پھر دریافت کیا۔موسم کیسا ہے؟

عرض کی۔ یہاں بارش ہوئی ہے۔

فرمایا۔یہاں تو بہت سخت گرمی ہے۔

عرض کی۔اللہ کرے وہاں بھی بارش ہو جائے۔

فرمایا۔ہم اتنے خوش نصیب کہاں۔ عربی میں کہاوت ہے۔۔۔ قاسم المحروم یعنی تقسیم کرنے والا محروم رہتا ہے۔ بھئی ہم تو یہاں سے بارش بنابنا کر آپ کے دیس بھیجتے ہیں۔

مرید نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔۔ تقسیم کرنے والے کو اجر و ثواب جو ملتا ہے۔۔۔

استفہامیہ لہجے میں فرمایا۔اجر و ثواب؟ گویا کہہ رہے ہوں اس کی حقیقت بھی جانتے ہو میاں۔

عید پہ وہ لوگوں سے ملتا۔۔۔ خود کو عیدو میاں کہتا۔۔۔اُس دن اور اُس کے بعد بھی کئی روز تک اسی ترنگ میں مست رہا۔ موسم بہار چھایا کلیاں اور شگوفے پھوٹے پھر موسم کا مزاج بدلا اور گرمی آئی۔ایک روز نیاز صاحب نے بتایا کہ حضور باباجی پندرہ بیس

روز بعد انگلینڈ جا رہے ہیں۔اُس نے کراچی فون کر کے کامران باسط سے بات کی اور کراچی آنے کی اجازت چاہی۔انہوں نے ابا حضور سے پوچھا اور کہا۔آپ بسر و چشم تشریف لائیں۔

اگلے روز وہ اپنے مراد کے گھر کراچی پہنچ گیا۔ حضور گھر کے اوپر منزل پہ کھانے کے کمرے میں فرش پر دستر خوان پہ بیٹھے ہوئے تھے۔وہ کمرے میں داخل ہوا تو دونوں ہاتھ فرش پہ ٹیک کر اُٹھے۔اُسے سینے سے لگایا۔پھر کھانا کھانے کا حکم دیا۔وہ خود کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔کھانے کے دوران حال احوال دریافت کیا۔پشاور مراقبہ ہال کی بابت پوچھا۔نیاز بھائی کی خیر و عافیت معلوم کی۔جب اُس نے کھانا کھالیا تو فرش سے اُٹھ کر صوفے پہ دراز ہو گئے۔وہ صوفے کے قریب ہو کر قالین پہ بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔وہ سر جھکائے مودب بیٹھا اُن کی قربت کی لہروں کو اپنے اندر سمیٹتا رہا۔پھر اُس نے انہیں بتایا کہ ایک دوست نے اُس کو جوتے بنانے کا کارخانہ لگانے کو کہا ہے وہ اس کام کو کوریا کی ایک فرم کے تعاون سے کرنا چاہ رہا تھا۔

دریافت کیا۔پروجیکٹ کا تخمینہ کیا ہے؟

اُس نے بتایا۔بارہ کروڑ روپے۔

پوچھا۔اس کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟

اس نے بتایا کہ ایک کورین کمپنی سے جوائنٹ وینچر ہوگا۔ کمپنی بنے گی۔اُس میں سات لوگ ڈائریکٹر ہوں گے۔جن میں سے تین کورین ہوں گے۔مشینری وہ لائیں گے۔چراٹ کے قریب زمین کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔جن صاحب کی زمین ہے انہیں زمین کی مالیت کے برابر کمپنی حصص دیئے جائیں گے۔نقد ادائیگی نہیں کرنا ہوگی۔پھر مشینری اور زمین کو بنکوں کے پاس گروی رکھ

کر سرمایا لیں گے اور جب جوتے تیار ہوں گے تو سارا مال کوریا ایکسپورٹ کیا جائے گا۔ ہمیں صرف انفراسٹر یکچر اور انتظامی عملہ دینا ہوگا۔ منافع کی شرح طے ہے۔ ان شاءاللہ کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوگا۔

فرمایا۔ آپ انہیں بتادیں کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔

اُس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہیں دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے دائیں کہنی صوفے کے بازو پہ ٹکائے، دایاں پاؤں بائیں ران کے نیچے رکھے ہوئے بائیں پیر کو پھیلائے، ایک طرف جھکے نیم دراز تھے۔ شاید اُس نے غلط وقت پہ بات کہہ دی ہے۔ یہ اُن کے قیلولہ کا وقت ہے۔۔ شاید مراقبے میں ہیں۔۔ انہیں تکتا رہا۔

وہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ انہوں نے جو فرمایا ہے۔۔ اُس کا مطلب کیا ہے۔ اُس نے سوچا کہ وہ دریافت کریں گے کہ کبھی اُس نے جوتا بنایا ہے؟ اُس نے اس بات کے جواب میں یہ بات عرض کرنا طے کیا تھا کہ وہ تو کمپنی کا چیف ایگزیکٹو ہوگا، کوالٹی کنٹرول کے لئے کورین ایکسپرٹ ہوں گے، اُس کو جوتے بنانے کے تجربے کی بجائے انتظامی صلاحیت کی ضرورت ہوگی۔ اُس نے تو محض منتظم کے طور پر مختلف شعبوں کی کارکردگی پہ نظر رکھنا ہوگا اور اُن میں ہم آہنگی کو یقینی بنانا ہوگا۔ لیکن انہوں نے تو بالکل ہی ایک الگ بات کہہ کر اُس کو مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ وہ کافی دیر تک الجھتا رہا کہ وہ اس کا کیا مطلب لے۔ انہوں نے منع فرمادیا ہے یا اجازت مرحمت فرمائی ہے؟

کچھ دیر بعد آپ نے آنکھیں کھولیں اور بڑی رسانیت سے فرمایا۔ مقصود صاحب لوح و قلم کا انگریزی ایڈیشن ختم ہوگیا ہے۔

اُس نے عرض کی۔ مبارک ہو۔

فرمایا۔اب نیاایڈیشن آئے۔یہ تو جیسے تیسے بھی ہو ختم ہو ہی گیا۔۔۔بک کر ہوایابٹ کر ہوا۔۔بہر حال ہو گیا-پھر خالد نیاز کے خلوص کی تعریف کی اور فرمایا۔خلوص ہی سب کچھ ہے۔اللہ نے اپنی تعریف بیان کر کے اُس سورت کا نام ہی سورہ اخلاص رکھا ہے۔۔۔خالص ہونا۔۔مخلص ہونا بہتی بڑی سعادت ہے۔کوئی اللہ سے بڑھ کے مخلص نہیں۔مخلص بندوں کو اللہ کی یہ صفت حاصل ہوتی ہے۔

پھر فرمایامیں انگلینڈ واپس آکر کتابوں کی تقسیم اور اشاعت سے متعلق ایک ادارہ قائم کروں گا۔میں نے اکرام شہابی صاحب کو کہہ دیاہے کہ وہ میرے واپس آنے تک لاہور سے کراچی شفٹ ہو جائیں۔

اُس نے انہیں بتایا کہ سلام عارف بھائی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ انگریزی کتب کا الگ سے ایک اشتہار شائع کیا جائے۔۔۔کتابوں کی دکانوں پہ چارٹس کی صورت آویزاں کیا جائے۔تو فرمایا۔کتاب مارکیٹ میں نہ ہو اور آپ اشتہار دے دیں تو کتاب بیٹھ جائے گی اور پھر کسی طور اُسے اُٹھایا نہیں جاسکتا خواہ آپ ایک کروڑ روپے خرچ کر دیں۔'مستانی' کے ساتھ یہی تو ہوا۔ایک دفعہ پٹ گئی تو گئی۔

مرید نے لوح و قلم کے نئے انگریزی ایڈیشن میں فرہنگ شامل کرنے کی بات کی تو فرمایا۔یہ سہرا آپ کے سر حضور قلندر باباؒاولیاءؒ نے باندھ دیاہے۔۔۔اب آپ جو چاہے کریں۔

مرید نے جسم مثالی اور(Aura)اور نسمہ کا تصور اپنے ذہن میں واضح نہ ہونے کی بابت کہاتو فرمایا۔

جسم مثالی نہ تو Aura ہے اور نہ ہی ایسٹرل باڈی۔۔۔ایسٹرل باڈی وہ جسم ہے جو خواب میں نکلتا ہے۔ آپ اُسے ہمزاد کہہ سکتے ہیں۔۔۔اگر تو ہمزاد اطلاعات کو درست اور صحیح انداز میں قبول کرتا ہے تو وہ مسلمان ہمزاد ہے ورنہ شیطانی ہمزاد ہوا۔ روشنیوں کا بنا جسم جو اس مادی جسم کے ارد گرد ہوتا ہے نسمہ ہے اور جب نسمہ کا ایک عکس سا کہیں پڑتا ہے اور ایک جھماکا سا ہوتا ہے تو یہ اوراہوا۔ ویسے خواب میں جو جسم متحرک ہوتا ہے حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ نے اُسے ہیولی کہا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ خواب میں متحرک ہونے والا جسم۔۔۔ جسم مثالی ہے۔ اور احقیقت میں نسمہ کا اظہار اور اُس کا مظاہرہ ہوا۔ یعنی جیسے کرنٹ گزرتے ہوئے اسپارک کرتا ہے تو کرنٹ نسمہ ہوا اور اسپارک اس کا اوراہوا۔

پھر فرمایا۔ روحانیت سیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ حضور ﷺ کے دور میں ۲۵ فیصد لوگ روحانی لوگ تھے جبکہ آج کل ساڑھے گیارہ لاکھ افراد میں سے کہیں جا کر ایک آدمی روحانی بنتا ہے۔ پھر اُن ساڑھے گیارہ لاکھ روحانی بندوں میں کوئی ایک آدھ بندہ ہی منزل پاتا ہے۔

مرید نے بات سُن کر مایوس ہونے کے انداز میں منہ بسورتے ہوئے عرض کی۔ حضور آپ نے تو مقابلہ اور بھی سخت کر دیا ہے۔ یہ تو کھربوں میں سے ایک آدھ بندہ ہی ہوا۔

فرمایا۔ اللہ بلاشبہ سب کو ہی روحانی بندہ بنا سکتا ہے۔۔۔۔آپ مساعی تو کریں۔۔۔۔اللہ کی قیمت تو لگائیں۔۔۔ پھر کچھ توقف کیا اور کہا۔۔۔ معلومات ہونا ایک بات ہے۔۔۔اس کو تجرباتی طور پر کرنا ایک بالکل ہی دوسری بات ہے۔ ایک آدمی الیکٹرونک کے بارے میں کتنی ہی معلومات رکھتا ہوا گر وہ ایک ٹی وی نہیں بنا سکتا تو اُسے سائنسدان نہیں کہہ سکتے۔ معلومات کا پریکٹیکل استعمال جاننا بھی تو ضروری ہے۔

پھر ارشاد ہوا کہ روحانیت پہ کتابیں لکھ لینا، مضامین لکھ لینا، اس کی بابت تقریریں کر لینا کوئی روحانیت نہیں ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بندے کو روحانیت کے بارے میں معلومات حاصل ہیں۔

فرمایا بعض افراد بتاتے ہیں کہ انہیں خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اور یہ بات ان کے ساتھ اکثر ہوتی ہے۔ فرمایا یہ اتنا آسان ہوتا تو اولیا کرام بیس بیس سال کی پتیسا کیوں کرتے۔ دراصل عقیدت کی وجہ سے اُن کا ذہن بن جاتا ہے اور وہ جو دیکھنا چاہتے ہیں دیکھ لیتے ہیں۔۔۔ یکن در حقیقت حضور ﷺ کی زیارت ہونا۔۔ ایک بالکل ہی الگ صلاحیت ہے اور اُس کو بیدار کرنے میں سالوں لگتے ہیں اور اکثر کو سالوں بعد بھی کامیابی تبھی ہوتی ہے جب نصیب یاوری کریں۔۔۔ ورنہ لوگ تو اسی بات کا شکر کرتے ہیں کہ انہوں نے کوشش تو کی۔

ملازمہ نے آ کر چائے کا پوچھا تو فرمایا۔ ہاں یہیں لے آئیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی بابت بتایا کہ وہ اللہ سے اتنے قریبی تعلق کے باوجود عوام کے معمول کے پابند تھے۔ بیمار ہوتے اور عوام کی طرح علاج ہوتا۔ اس تمام تر قربت کے باوجود عوام کے معمول سے گزرے۔ ایک طرف اتنی نیاز مندی اور دوسری طرف اتنا ناز کہ اپنی بات منوانے کو دنیا چھوڑنے پر مصر ہو گئے حالانکہ بالتصدیق انہیں دنیا میں ۲۰۰۶ء تک رہنا تھا۔ اللہ میاں بہت ہی بڑے ہیں۔ ماننے پر آئیں تو پہاڑ جتنی بات مان لیں۔۔۔ نہ مانیں تو چیونٹی جتنی بات نہ مانیں۔

آسمان پر جب ہم نے دو تلواریں دیکھیں اور حضور سے ان کے بارے دریافت کیا تو فرمایا کہ آئندہ دنیا کے نقشے کی کیا صورت ہو گی۔ ایک شہر میں کتنی آبادی ہو گی۔ کتنے شہروں کا صوبہ ہو گا۔ ہندوستان کا نقشہ کیا ہو گا۔۔۔ پاکستان کا نقشہ کیا ہو گا۔ پھر بتایا کہ کراچی فواروں کا شہر ہو گا۔۔ ان پہاڑیوں پہ باغ لگیں گے۔

چائے آئی۔اُس نے سنہرے نقش و نگار سے آراستہ نفیس سی پیالی میں چائے ڈال کر سنہرے رنگ کے نازک سے چمچ سے اُس میں چینی ہلاتے ہوئے مرشد ہی کا فرمایا ہوا جملہ دل ہی دل میں دہرایا۔ فقیر بھی بادشاہ ہی ہوتے ہیں۔اُس نے چائے پیش کی تو پیالی تھامتے ہوئے فرمایا۔غریب آدمی کا ذہن چھوٹا ہوتا ہے۔وہ اپنی محدود سوچوں کے سبب محض اپنی ضرورتوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ وہ دوسروں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔وہ کسی کو کھلانے پلانے پر کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ بھئی غریب آدمی کا کیا ہے۔۔بے شک اُس کا ایمان خرید لو۔

فرمایا۔میرے اور اکا رنگ سنہرا ہے۔جب میں نہا کر نکلتا ہوں تو حضور قلندر بابا اولیاءؒ مجھے آواز دے کر بلاتے ہیں۔خواجہ صاحب! ادھر آیئے۔۔۔یہاں بیٹھیں۔۔۔میں ننگے بدن اُن کے قریب بیٹھ جایا کرتا اور مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتے۔

مرید نے اپنی پرانی الجھن کا تذکرہ کیا کہ سلسلے کے افراد کا ذہن تو پیرو مرشد کی طرف لگا رہتا ہے۔۔۔اُن کو اپنا ذہن مرشد کے تابع رکھنا یوں بھی لازم تو پھر یہ جو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنے خط میں غیر جانبدارانہ ذہن رکھنے کی بات فرمائی ہے اس کا کیا مطلب ہوا۔۔۔وہ بات سلسلے والوں کے لئے تو نہیں ہو سکتی۔

فرمایا۔۔۔حضور قلندر بابا اولیاؒ نے اپنے اُس خط میں بڑی باریک بات فرمائی ہے۔مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا ذہن اپنے پیرو مرشد کی طرف رکھے کیونکہ پیرو مرشد کی طرزِ فکر غیر جانبدار طرزِ فکر ہوتی ہے اور مرید کو وہی طرزِ فکر تو منتقل کیا جانا اصل مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب مرید اپنا ذہن استعمال کرنے کی بجائے اپنے مرشد کی طرزِ فکر اپنانے کی طرف متوجہ رہے۔

اُس نے ناناتاج الدین باباولیاناگپوریؒ کے حوالے سے کہ جب انہوں نے پتے سے کیڑا بننے کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔۔۔جب زندگی زندگی سے گلے ملتی ہے تو جاندار اشیاء وجود میں آتی ہیں۔۔۔پوچھا یہ زندگی زندگی سے کیسے گلے ملتی ہے؟

اچھا سوال پوچھے جانے کی مسرت کا اظہار پورے چہرے پہ پھیلتی مسکراہٹ سے فرماتے ہوئے کہا۔زندگی دورخوں کا نام ہے اور یہ دونوں رخ مل کر ہی زندگی تشکیل دیتے ہیں۔جب ایک رخ دوسرے رخ سے ملتا ہے۔۔۔اُس میں جذب ہو جاتا ہے تو زندگی وجود میں آتی ہے۔جب حضور ناناصاحبؒ کی نگاہ پتے پر جم جاتی تھی تو اُن کی زندگی والا رخ پتے میں چھپی زندگی کے دوسرے رخ سے ہم آغوش ہو جاتا تھا اور یوں پتے میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی اور پتہ زندگی کی کوئی سی شکل وصورت اختیار کرلیتا۔

اُس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے حضور ناناصاحب کے لنگڑے کی ٹانگ ٹھیک کرنے کے واقعہ میں کئے گئے الفاظ کہ جب انسان چھپ رہا ہوتا ہے اور اُس کی چھپائی میں گڑبڑ ہو جائے تو لنگڑے لولے چھپنے لگتے ہیں۔۔کی وضاحت کی درخواست کی۔

فرمایا: دراصل انسان ہر آن چھپ رہا ہے۔یوں پرنٹنگ ہو رہی ہے اور ہر ہر حرکت، ہر بار نئی تصویر کی صورت چھپ رہی ہے۔اگر پرنٹنگ میں خرابی ہو تو ظاہر ہے کہ چھپنے والی تصویر خراب ہو جائے گی۔یہ خرابی کاغذ پر سلوٹ پڑنے کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈائی میں کسی حرف کے ٹوٹنے کی وجہ سے ہونے والی خرابی کی مانند ہوتی ہے اس لئے پرنٹنگ درست نہیں ہوتی۔ہر تصویر کے لئے الگ سے کن کا ریکارڈ بجتا ہے تو وہ تصویر چھپتی ہے۔عارف مشین کو روک کر وہ ٹوٹا ہوا حرف نکال کر وہاں صحیح حرف لگا کر پھر سے مشین چلا دیتا ہے۔اب جو پرنٹنگ ہو گی تو صحیح انسان چھپنا شروع ہو جائے گا۔

مرید نے کن کے ریکارڈ کے بجنے کی بابت استفسار کیا تو فرمایا۔ یوں سمجھیں کہ ہر تصویر کو حرکت میں لانے کے لئے علیحدہ سے کن کہا جاتا ہے۔

پھر ارشاد فرمایا۔ حضور نانا صاحبؒ اگر کسی کو فکر معاش سے آزاد کرنا چاہتے تھے وہ کر سکتے تھے بلکہ کر بھی دیا کرتے تھے۔ پھر بڑے پیر صاحب شیخ عبدلقادر جیلانیؒ کی بابت بتانے لگے کہ یزید کے دور کے بعد اہل بیت یا تو قتل کر دیئے گئے یا پھر وہ چھپ گئے۔ انہوں نے جنگلوں بیابانوں کی راہ لی۔ حضرت اعظمؒ کے دور تک روحانی لوگ سامنے آنے سے کتراتے رہے۔ حضرت غوث اعظمؒ نے خانقاہی نظام کو باقاعدہ جاری فرمایا اور یہی۔۔۔'سب ولیوں کی گردن پر میرا قدم'۔۔۔کا اصل مفہوم ہے۔ حضور غوث اعظم عبدالقادر جیلانیؒ۔۔۔۔اب وزیر حضوری ہیں۔ مولوی اگر کسی سے ڈرا۔۔۔تو وہ حضورؒ سے ہی ڈرا۔ بھئی وہ تو سزا دے دیا کرتے تھے۔ مثلاً درس کے دوران آسمان پر چیل نظر آئی اور اُس نے کوئی آواز نکالی۔ پہلے تو انگلی کے اشارے سے اُسے منع فرمایا۔ جب اُس نے دوبارہ آواز نکالی تو انگلی کے اشارے سے اُس کو یہ کہتے ہوئے کاٹ کر رکھ دیا۔۔۔تو پھر بولی۔۔۔

آپ دیکھ لیں انہیں آج تک گیارہویں والی سرکار اور غوث اعظمؒ کہہ کر اُن کا تذکرہ کیا جاتا ہے خواہ وہ کسی روحانی مسلک کے لوگ ہوں یا متعصب مولوی ٹائپ کے ہوں۔

پھر ایک واقعہ اُن کی بابت سُنا کر تخلیقی نظام میں اُن کی عملداری کی وضاحت فرمائی۔ ایک بار ایک عورت جس کے شوہر کو پھانسی کی سزا ہو چکی تھی اُن کے پاس آئی اور مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے کہہ دیا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔ تم گھر جاؤ۔ اب ہوا یہ کہ اُس کے شوہر نے پھانسی کی کوٹھری میں خواب میں دیکھا کہ اُس کو پھانسی دی جارہی ہے اور پھانسی پانے کے بعد وہ مر گیا ہے۔ اُس کی لاش اُس کے لواحقین کو دی جارہی ہے اور وہ رو رہے ہیں۔ غرضیکہ پھانسی کا پورا عمل خواب میں دیکھ کر وہ بیدار ہوا۔ کچھ دیر

بعد بادشاہ کا حکم موصول ہوا کہ اُس کی سزا معاف کر دی گئی ہے اُس کو رہا کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ سُن کر مرید نے پس پردہ کام کرنے والے نظام اور طریقہ کار کی وضاحت کی درخواست کی تو فرمایا۔

حضور غوث پاکؒ نے وہ سزا جو اُس کا مقدر تھی۔۔۔اُس کو خواب میں لاگو کر دیا۔ یعنی اُس کو اُن سب مراحل سے بیداری کی بجائے خواب میں ہی گزار کر۔۔۔اُس کی سزا بھی پوری کرا دی اور اُس کو بچا بھی لیا۔ دراصل وہ کائناتی واقعات، معاملات کی ترتیب اور اُس کی ردل بدل پر قادر تھے۔ اس کی مثال فلم میں ایڈیٹنگ سے دی جاسکتی ہے۔ اِدھر کا منظر اُدھر کر دیا۔ اُدھر کا ٹکڑا کاٹ کر ادھر لگا دیا اور وہ فلم دوبارہ وہیں سے چلا دی۔ بھئی یہ بہت ہی بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔۔۔آپ بھی کیا قصے لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔آئیں چلیں۔۔۔۔کہتے ہوئے اُٹھ گئے۔

دروازے تک وہ اُس کے ساتھ آئے اور اُسے کہا۔ آپ باہر چلیں میں آتا ہوں۔ وہ گیٹ کے پاس پہنچ کر رک گیا اور ذہن میں آج کی نشست کی بابت سوچتا اپنے مراد کے باہر آنے کا منتظر رہا۔ کچھ دیر بعد وقار بھائی جان حضور کے ہمراہ باہر آئے۔ وہ کسی بات پہ جز بز ہو رہے تھے۔ حضور انہیں کچھ سمجھا رہے تھے۔ روش پہ رک کر کچھ دیر بات کرنے کے بعد گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے اُس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہیں گاڑی چلاتا دیکھنا اُس کے لئے ایک خوشگوار حیرت تھی۔ بھائی جان وہیں رُک کر انہیں گاڑی ریورس کرتے دیکھتے رہے جب گاڑی گیٹ باہر نکل گئی تو بھائی جان نے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے گیٹ بند کر دیا تو حضور نے تبصرہ فرمایا۔

یہ سارا سلسلہ ہی پرائیویسی کا ہے۔ ہمیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ ہم تو ہیں ہی ننگے۔۔۔کوئی ہمیں کیا ننگا کرے گا۔
شاید بھائی جان مہمانوں کے یوں بے دھڑک گھر کے اندر چلے آنے پر جز بز ہو رہے تھے اُس نے اندازہ لگایا۔

کراچی کی شاہراہوں کی بے ہنگم ٹریفک میں انہیں اتنے سکون سے گاڑی چلاتے دیکھ کر اُسے وہ گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی جو ایک ڈرائیور کو پسنجر سیٹ میں بیٹھ کر عموماً ہوتی ہے۔ نارتھ ناظم آباد سے ناگن چورنگی کی سیدھی سڑک پہ جہاں ہر گاڑی انہیں اوور ٹیک کرتی گزر رہی تھی۔ کچھ دیر تو خاموشی رہی پھر فرمایا۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ مجھے بلدیہ کراچی کا چیرمین بن جانا چاہیئے۔ اب میں اس سوچ میں لگ گیا کہ آخر یہ خیال کیوں آیا؟ دراصل ہر خیال کی کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ جب بہت سوچا تو عقدہ کھلا کہ اب مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ میں ایک کروڑ لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھ سکوں۔۔۔ اس صلاحیت نے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہی یہ خیال مجھ میں پیدا کیا تھا۔

اسی دوران ایک گاڑی جو ہم سے آگے جا رہی تھی اُس نے اشارہ دیئے بغیر یو ٹرن لینے کے لئے گاڑی موڑ دی۔ آپ نے ہارن بجایا۔۔ اُس گاڑی والے نے پلٹ کر بڑی تند نگاہوں سے ہمیں دیکھا تو فرمایا۔ آپ نے دیکھا اُس نے کیسی زہریلی نظروں سے ہمیں دیکھا۔

پھر بات کو اسی نہج پہ بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھتے ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ دیکھنے سے زور پڑتا ہے۔ اگر دس افراد آپ کو دیکھ رہے ہوں تو آپ کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔

پھر بتایا کہ جب وہ ارتکاز کی مشقیں یعنی شمع بینی وغیرہ کیا کرتے تھے تو نگاہ کی طاقت سے کاغذ کو زمین سے اتنا اُٹھا لیتے تھے۔ ہاتھ سے ایک فٹ کے قریب بلندی کا اشارہ کرتے ہوئے۔ آپ اس سے اندازہ کریں کہ آنکھوں سے اتنی طاقتور لہریں خارج ہوتی ہیں۔ یہ ایکس ریز کیا ہیں۔۔۔۔ یہی تو ہیں۔۔۔ آدمی کے آر پار ہو جاتی ہیں اور جب پچاس آدمی بیٹھے آپ کو گھور رہے ہوں تو آپ ہی بتائیں کیا حشر ہو گا۔

پھر فرمایا۔ فقیر کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی روشنی ہوتی ہے۔ایک چمک سی ہوتی ہے جس میں نیلاہٹ ہوتی ہے۔

مراقبہ ہال قریب آیا تو فرمایا۔ اگر یہاں پانی نہ نکلتا تو میں لاہور جانے اور وہاں شفٹ ہونے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ویسے بھی لاہور ایک علمی پسِ منظر رکھتا ہے۔

پھر بتانے لگے کہ اب یہاں سے کوچز چلنا شروع ہو رہی ہیں۔ایک تو عمارت بننے اور اب ٹریفک کا شور ہونے سے یہاں کی کیفیات میں فرق پڑ گیا ہے۔ وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔

پھر بجلی کے کھمبے دکھا کر کہا۔ان لوگوں نے بہت ہی تعاون کیا۔ ورنہ یہاں بجلی آنے میں ابھی بہت وقت لگتا۔

مراقبہ ہال پہنچ کر گاڑی سے اتر کر اُسے مخاطب ہو کر کہا۔اب آپ چل کر ان درختوں اور پودوں سے ملیں۔ وہ اُن کا بیگ اُٹھائے کمرے تک ساتھ آیا۔ کمرے میں تخت پوش پر بیگ رکھ کر باہر جارہا تھا تو دریافت کیا۔ آپ کب تک یہاں رُکیں گے ؟

اُس نے اُن کے انگلینڈ کے پروگرام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا۔جب تک آپ یہاں ہیں۔۔۔۔۔ مسکرا کر سر ہلایا اور کمرے میں رکھے فائلوں کے بستے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہ لگ بھگ دس روز وہاں مراقبہ ہال رہا۔ صبح مراقبہ کے بعد درس میں شامل ہوتا۔اب مراقبہ آستانے کی بجائے مسجد میں ہونا شروع ہو چکا تھا۔ نماز فجر کے بعد باجماعت مراقبہ ہوتا۔ شام کو نماز مغرب کے بعد مراقبہ ہوتا اور کبھی اس کو نماز عشاء کے بعد کیا جاتا۔ جمعہ کو مریض دیکھے جاتے۔ اتوار کو قلندر شعور کی کلاسیں ہوتیں۔

اب جمعہ کو صبح سویرے نماز کے فوراً بعد ٹوکن تقسیم ہوتے۔ پہلے آیئے۔۔۔ پہلے پایئے کی بنیاد پر پچاس ٹوکن مردوں کو اور بعد از جمعہ اتنے ہی خواتین میں تقسیم کئے جاتے۔ ٹوکن پانے والے خواتین و حضرات کو حضور خود دیکھتے۔ جن لوگوں کو ٹوکن نہ ملتے اُن کو انعام صاحب اور حضور کے دیگر معاونین دیکھتے۔ جن لوگوں کو حضور دیکھ کر علاج تجویز کر دیتے اُن کی راہنمائی کے لئے اُن کے تجویز کردہ علاج کی تشریح کے لئے سلسلے کے بھائی بہن۔۔۔ خواتین کے لئے خواتین اور مردوں کے لئے مرد رضاکار۔۔۔ موجود رہتے۔

روحانی ڈائجسٹ اور اخبارات سے آنے والی ڈاک کے سینکڑوں لفافے روزانہ کھول کر انہیں فائل میں لگا کر مرشد کریم کے ملاحظہ کے لئے رکھنے کے کام میں بھی رضاکار مستعدی سے تعاون کرتے۔ اب حضور خطوط کا جواب خود لکھنے کے بجائے خطوط پڑھ کر اُن پر مختصر جواب دیتے اور دفتر کے معاونین میں عادل اسماعیل اور اُن کے ساتھی ان کی ہدایات کی روشنی میں مفصل جواب لکھتے، اُن کو متعلقہ لفافوں میں بند کر کے حوالہ ڈاک کر دیتے۔ اُن دنوں اوسطاً تین سو خطوط روزانہ نمٹائے جا رہے تھے یعنی نو سے دس ہزار پریشان لوگوں کے دکھوں کا مداوا سالانہ کرنے کا ایک انتظام تو یہ تھا۔

سلسلے کے بہن بھائیوں کے خطوط اور پیغامات اس کے علاوہ ہوتے۔ کامران باسط اپنی ٹیم کے ساتھ دفتر کے امور کو احسن طور پر چلانے کے ساتھ مراقبہ ہال کے تمام امور کے نگران بھی ہیں۔ اُن کو تمام شعبوں کے مابین ہم آہنگی کو یقینی بنانے کا فریضہ بھی سونپا گیا ہے۔ مہمانوں کی رہائش اور دورانِ قیام ان کی دیکھ بھال بھی انہی کی ذمہ داری ہے۔ ملکی اور بیرونِ ملکی مراقبہ ہالوں سے مرکزی مراقبہ ہال کا رابطہ رکھنا۔۔۔ اُن کی طرف سے موصولہ رپورٹوں اور دیگر امور کو حضور کو پیش کرنا بھی انہی کی ذمہ داری

ہے۔ مرکزی مراقبہ ہال کے مالی امور کی انجام دہی حضور کے کہنے کے مطابق کرنا بھی انہی کے ذمے ہے۔ تعمیراتی کاموں میں درکار سامان کی فراہمی سے لے کر لنگر کے لئے درکار سودا سلف تک سبھی کچھ انہی کے حوالے ہے۔

شعبہ نشر و اشاعت میں حامد بھائی اور اُن کی ٹیم سرگرم عمل ہیں۔ مراقبہ ہال میں کتب کے اسٹال لگوانا۔۔۔وہاں سلسلے کی کتب کی فراہمی کو یقینی بنانے کے ساتھ اب اُن کو روحانی لائبریریوں کے امور کی دیکھ بھال کا فریضہ بھی حوالہ ہو چکا ہے۔ وہ ابا حضور کے لیکچرز اور تقاریر کی کیسٹیں بھی تیار کروا رہے ہیں۔

ٹیلیفون کے ذریعے جانے کتنے لوگوں کو راہنمائی اور دستگیری سے نوازا جاتا ہے۔ جب حضور موجود ہوں تو لوگوں کا رش لگا رہتا۔ جب حضور موجود نہ ہوں تو استقبالیہ کاؤنٹر پہ پیغامات موصول کر کے ان پہ حضور کی رائے اور حکم کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔

نیوٹن کی کشش ثقل

مرکزی مراقبہ ہال کے ارد گرد کئی عظیمی بہن بھائیوں نے پلاٹ لے لئے ہیں۔اُن میں سے چند ایک نے اپنے لئے مکانات کی تعمیر مکمل کرلی ہے اور کچھ کر رہے ہیں اور باقی ان شاءاللہ اپنے وقت پہ کر ہی لیں گے۔ عرفان صاحب اور احمد جان کے علاوہ کم ہی لوگ ایسے تھے جن سے وہ صورت آشنائی اور سلام دُعا سے زیادہ مراسم بڑھا سکا تھا۔

غفار بھائی حضور قلندر باباؒاولیاء کی رباعیات پنجاب کی مخصوص لے میں ترنم کے ساتھ پڑھتے تو اک سماں بندھ جاتا۔۔۔وہ اتنا ڈوب کر اتنے شغف اور محبت سے پڑھتے کہ کوئی کن رس نہ بھی ہو۔۔۔داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مراقبہ ہال میں قیام کے دوران جب حضور چاہتے اُس کو اُن سے بات کرنے،اُن کے ہمراہ سیر پہ ساتھ ہونے یا دستر خوان پہ ساتھ بیٹھنے کا موقع مل جاتا۔اُس دوران وہ کوئی ایک آدھ بات دریافت کر لیتا۔۔۔۔ورنہ جو وہ کہہ دیتے وہ اُس کو اپنے حافظے میں سمیٹنے کی تگ ودو میں لگا رہتا۔ باقی وقت وہ کبھی اِدھر بیٹھ جاتا تو کبھی اُدھر۔۔۔ کبھی اُس کے ساتھ تو کبھی اس کے ساتھ۔۔۔سب ہی اُس کو مرشد کریم کی شفقتوں کے سبب محبت اور اخلاق سے ملتے۔کچھ اپنی سناتے کچھ اُس کی سنتے۔

کبھی کبھار اراکین مراقبہ ہال اپنی فراغت کے لمحات میں اُسے بھی شامل کر لیتے۔ ہلکی پھلکی گپ شپ کبھی کبھار جملے بازی سے ہوتی لطیفے بازی پر ختم ہوتی۔ایک روز اُس نے چار پانچ دوستوں کو ایک لطیفہ سنایا۔سب نے لطف لیا۔

شام کو مغرب سے کچھ پہلے حضور مراقبہ ہال تشریف لائے۔ سناٹا رونق میں تحلیل ہو گیا۔ آپ اپنے کمرے میں گئے۔ باہر تشریف لائے اور لان میں چارپائی ڈلوا کر بیٹھ گئے۔ اُس نے موقع دیکھا اور پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی دیکھا دیکھی باقی اصحاب بھی آکر وہیں گھاس پہ بیٹھ گئے۔ حضور نے گرمی کی شکایت کی۔ ایک پیڈسٹل فین لگا ہوا تھا۔

فرمایا۔ یہ گرمی مجھی کو زیادہ محسوس ہو رہی ہے یا واقعی کچھ زیادہ ہے۔ پھر ایک پنکھا مزید لگانے کو کہا۔ جب تک پنکھا آتا فرمایا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کو بھی گرمی بہت ستاتی تھی۔ بھئی ہم تو جنتی لوگ ہیں شاید اسی لئے گرمی برداشت نہیں ہوتی۔

فرمایا۔ کراچی میں بھی برف باری ہونی چاہئے۔

مرید نے سوچا کہ کراچی ایک ساحلی علاقہ ہے یہاں برف باری کیونکر ہو سکتی ہے۔ ادھر اُس کے خیالات کو سننے والے نے جھٹ کہا۔ جب لندن میں برف باری ہو سکتی ہے تو یہاں کیوں نہیں۔۔۔ وہ بھی تو ایک ساحلی علاقہ ہے۔

پھر بتایا کہ مسجد اور مراقبہ ہال عمارت کی تعمیر کے چکر میں دھوپ میں رہنے سے میرا رنگ خراب ہو گیا ہے۔

دوسرا پنکھا آگیا تو کچھ قرار آیا۔ مرید کو دیکھتے ہوئے۔۔۔ دریافت کیا۔ آپ کا رنگ کبھی ہلکا بھی ہوتا یا ایسا ہی رہتا ہے۔ اُس نے کہا کبھی کبھی انیس بیس بلکہ ساڑھے انیس بیس ہی فرق پڑتا ہے۔

فرمایا۔ حسن کے سارے شاہکار سانولے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ اور ادھر رام کرشن جی سے لے کر راسپوٹین تک۔۔۔ اور ادھر بلقیس سے لے کر قلوپطرہ تک سبھی سانولے تھے۔

پھر وہی لطیفہ جو اُس نے انتہائی بھونڈے اور بیہودہ الفاظ میں سنا کر لڑکوں سے داد لی تھی۔۔۔۔ حضور نے سنانا شروع کیا۔ سب نے اُس کو دیکھا۔ آپ نے وہی لطیفہ اتنے مہذب الفاظ میں سنایا کہ وہ عش عش کر اُٹھا۔ انہوں نے اس کو نفاست، شائستگی اور تہذیب۔۔۔ بنا کچھ کہے تعلیم کی۔ ایک کثیف بات کو شائستہ انداز میں بیان کرنے کے ہنر سے آگاہ کیا۔

پھر بتایا کہ سردی آکسیجن کی کمی کا نام ہے اور آکسیجن کی کمی ثقل Gravity میں بھی کمی کر دیتی ہے۔ دیکھیں نا سردی میں ہم کتنے وزنی کپڑے پہنے پھرتے ہیں لیکن گرمی میں ایک چادر اُٹھانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ خزاں آتی ہے تو پت جھڑ سے آکسیجن کی مقدار کم ہو جاتی ہے تو سردی آجاتی ہے۔ پھر جب بہار آتی ہے اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہو جاتا ہے تو آکسیجن کی زیادتی سے موسم گرم تر گرم ہوتا چلا جاتا ہے۔

پھر یہ بھی فرمایا کہ انسان میں ہائیڈروجن اور امونیا۔۔۔ دو گیسیں ہوتی ہیں جب انسان امونیا استعمال کرتا ہے تو اُس کی برودت کے باعث اس پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور وہ کاہل اور سست ہو جاتا ہے اور جب وہ ہائیڈروجن استعمال کرتا ہے تو اُس میں حرارت توانائی پیدا ہوتی ہے اور وہ حرکت کرتا ہے۔ اب یہ انسان پہ ہے کہ وہ کون سی گیس استعمال کرتا ہے۔

مغرب کی اذان ہوئی تو فرمایا۔ میں ذرا اپنی عادت پوری کر لوں۔ یہ کہہ کر چارپائی سے اتر کر وہیں گھاس پہ قبلہ رو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا شروع کر دی۔

وہ کچھ دیر انہیں نماز پڑھتے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے وہیں اُن کے عقب میں نماز کی نیت کی اور نماز ادا کر کے دیکھا تو انہوں نے ابھی سلام نہ پھیرا تھا۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ وہیں بیٹھے بیٹھے آلتی پالتی مار کر مراقب ہو گئے۔ وہ آنکھیں بند کئے اپنے مرشد کے تصور میں کہیں دور نکل گئے اور وہ آنکھیں کھول کر اُن کو دیکھتا رہا۔۔۔۔

مراقبہ ختم کر کے مچھروں کی شکایت کرتے وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے تو وہ بھی اُٹھ کر اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کمرے میں داخل ہو کر اُسے باہر رکتا دیکھ کر فرمایا۔ آجائیں۔۔ آئیں بیٹھیں۔

وہ شکریہ کہہ کر اندر داخل ہوا اور جب مرشد کریم فرش پہ۔۔۔ دیوار کے ساتھ بچھے۔۔۔ سفید چادر والے گدے پہ بیٹھ گئے تو وہ اُن کے روبرو دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

ارشاد ہوا۔ یہ جو نیوٹن کی کشش ثقل والی تھیوری ہے کہ زمین پہ چیزیں کشش ثقل کے باعث گرتی ہے۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔ اشیاء زمین پہ اپنے وزن کی وجہ سے گرتی ہے نہ کہ کسی کشش ثقل کے باعث۔ اگر یہ تھیوری مان لی جائے تو درختوں کا اوپر کی طرف بڑھنا۔۔۔ پرندوں کا فضا میں بلند ہونا۔۔ قدم اُٹھانے کے لئے کوئی اضافی طاقت نہ لگانا۔۔۔ جیسی باتوں کو کیسے Justify کریں گے؟

پھر پودوں میں پانی کے عمل دخل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ پانی یوں تو نشیب کی طرف بہتا ہے لیکن پودوں میں جا کر اوپر کی طرف چڑھتا ہے۔ یہ سمجھنا کہ پودوں میں جا کر پانی کی فطرت تبدیل ہو جاتی ہے۔۔۔ غلط ہے۔ پھر شرح وبسط کے ساتھ بتایا کہ کس طرح پہلے ایک قطرہ عمل رساؤ سے اوپر چڑھتا ہے جب وہ قطرہ اوپر سے گرتا ہے تو اُس کے ردِ عمل میں دوسرا قطرہ اوپر اُٹھتا اور چڑھتا ہے اور اس طرح پانی جڑ سے ہوتا درخت کی آخری پھنگ تک جا پہنچتا ہے جو بعض درختوں میں سو سو فٹ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اُس نے عرض۔ اس سے بھی تو کشش ثقل کی نفی ہی ہوتی ہے۔

فرمایا۔ جی ہاں۔

پھر امریکہ سے کسی کے فون کی اطلاع آئی۔ ابا حضور فون کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ اجازت لے کر باہر آ گیا۔

صبح ناشتے کے لئے کچن کی طرف جا رہا تھا کہ عرفان صاحب کو ابا کے کمرے سے نکل کر گیٹ کی جاتے دیکھا تو علیک سلیک کو رک گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے پاس آئے اور کہا۔ آپ ابا یاد فرما رہے ہیں۔ ابا کے کمرے میں پہنچا تو خالہ ناشتے کے برتن لگا رہی تھیں۔ نگہت باجی اور شمع باجی بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کو سمجھاتے ہوئے فرما رہے تھے۔ آپ میری طرح لئے دیئے رہا کریں۔۔ پیار محبت سے ضرور پیش آئیں لیکن فاصلہ رکھ کر۔۔۔ اخلاق کی فضول خرچی نہ کیا کریں۔ وہ اخلاق کی فضول خرچی کی اصطلاح پہ جھوم اُٹھا۔

پھر طاہرہ شمیم سیالکوٹ خواتین مراقبہ ہال کی نگران کی مثال دیتے ہوئے فرمایا۔ وہ بہت سمجھدار ہیں۔۔۔ سوچ سمجھ کر بات کرتی ہیں۔۔ رُک رُک کر۔۔۔۔ لئے دیئے رہنے کی بات سمجھتی ہیں۔

اُس نے دیکھا تھا کہ حضور ساس بہو کے تنازعات میں عموماً ساس کو ہی اپنے طرز عمل کی درستی اور اصلاح کا کہتے اور بہوں کو نصیحت فرماتے کہ وہ ساس کو ماں سمجھا کریں۔

الفاظ کے استعمال کا قرینہ بتاتے ہوئے فرمایا۔ میں نے ایک تصویر۔۔۔ جس میں بھائی جان (وقار یوسف) حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی گود میں۔۔۔ انہوں نے اُسے کاٹ کر لکھا۔۔ ایڈیٹر روحانی ڈائجسٹ کی حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے ہمراہ ایک یادگار تصویر۔

فرمایا ان دونوں جملوں میں زمین آسمان کا فرق ہے،بعد میں وہ تصویر فروری ۱۹۹۳ء کے روحانی ڈائجسٹ میں اسی Caption کے ساتھ چھپی۔

پھر فرمایا۔اللہ تعالی نے ایک دستر خوان بچھایا ہوا ہے۔۔۔اب یہ آپ پہ ہے۔۔چاہے ہاتھ بڑھا کر مرغی کی پلیٹ اُٹھا لیں اور چاہے سامنے پڑی چٹنی پہ ہی گزارا کر لیں۔اللہ نے نہ مرغی کھانے سے منع کیا ہے اور نہ ہی چٹنی کھانا لازم کیا ہے۔

پھر بتایا کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ چٹنی سے روٹی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔مرید نے تعجب سے سوچا کہ بھلا چٹنی کھانے کے شوق کے پیچھے کیا حکمت ہو سکتی ہے۔۔۔فرمایا۔ بھئی اُن کی نظر ہمہ وقت لوح محفوظ پر رہتی تھی اور وہ اس بات پہ خوش ہوتے تھے کہ پانچ چھ ارب انسانوں میں یہ استغنا انہی کو حاصل ہے کہ وہ چٹنی سے روٹی کھا رہے ہیں۔ بھئی استغنا کسی بھی قسم کا ہو۔۔۔۔ ہوتا تو استغنا ہی ہے نا۔

مرید نے چاہا کہ وہ اس کو کوئی ایسا گر اور ایسا فارمولہ مرحمت فرمادیں کہ آئندہ زندگی میں سکون اور خوشی کی راہ کھوٹی ہونے سے بچ سکے۔فرمایا۔

ہر وہ خیال جو پریشانی کا باعث بنے شک ہے۔

اور ہر وہ جس میں ٹینشن ہو۔۔۔۔پریشانی ہو اُسے چھوڑ دینا چاہیئے۔

شک اور ٹینشن سے نجات کا ایسا تیر بہدف نسخہ دینے والے نے تو دے دیا تھا اور اب اُس کو استعمال کرنا اور باقاعدگی سے استعمال کرنا تو مریض ہی پر تھا ورنہ ڈاکٹر کے دوا کھانے سے تو مریض صحت یاب ہونے رہا۔

اُس نے سوچا بعض اوقات ایک کرنے کا کام نہ ہونے پر جو پریشانی لاحق ہوتی اُس کا کیا حل ہو اب اس فارمولے کے تحت تو کرنے کے کام ہی چھوڑنا پڑ جائیں گے۔۔۔ تو کام کیسے چلے گا۔ اُس نے سوچا اپنا سر کیا ڈ کھانا۔۔ مسئلوں کو حل کرنے والا باپ سامنے نہ ہو تو ایک بات ہے مگر جب وہ سامنے ہوں تو پھر بھلا کیا الجھاؤ۔۔۔ اُس نے عرض کی حضور۔۔۔ بعض اوقات شاہین ستائیسویں کا ختم دینا بھول جاتی ہے؟

پیشتر اس کے کہ وہ جملے کا اگلا حصہ منہ سے نکالتا۔ کسی قدر تند لہجے میں فرمایا۔۔ آپ کھانا مت کھایا کریں۔۔۔ پھر نرمی سے کہا۔۔ اب جب بھی کبھی ایسا ہو کہ آپ کی بیوی ختم دینا بھول جائیں۔۔ آپ احتجاجاً کھانا مت کھائیں۔۔ گھر سے باہر جا کر کھا لیں۔۔۔۔ ایک دو دفعہ ایسا کرنے کے بعد وہ دوبارہ نہیں بھولیں گی۔

وہ اتنا سمجھ گیا کہ کرنے کے کام کو کروانا اور پریشان ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ کام کروانا ایک الگ ہی صلاحیت ہے اور اگر وہ صلاحیت ہے تو کام کروانے کا ڈھنگ آنا چاہئے۔ مرید نے دوسرا مسئلہ بیان کیا کہ بعض اوقات لکھنے کے کام کے لئے بہت زور لگانا پڑتا ہے۔۔۔ یعنی طبیعت کچھ زیادہ مائل نہیں ہوتی۔

فرمایا۔ آپ روزانہ صرف ایک گھنٹہ لکھا کریں اور باقی تمام دن اس طرف کچھ زیادہ توجہ نہ دیں۔۔۔ آپ ایک گھنٹہ دینا طے کر لیں۔۔۔۔ کچھ عرصے میں طبیعت عادی ہو جائے۔

مراد کو مائل بہ کرم دیکھ کر مرید کے اندر ایک ایسے خیال نے سر ابھارا جس کو وہ اب تک نہیں سلجھا سکا تھا۔ اُس نے عرض کی۔ جب لوح و قلم کا ترجمہ کرنا تھا۔۔۔ اُس وقت نہ تو مجھے آپ کے لیکچر میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو سکی تھی اور نہ ہی

تشریحات پڑھنی نصیب ہو سکی تھی۔۔۔اب جب ترجمہ ہو چکا۔۔کتاب چھپ چکی۔۔۔دوسرا ایڈیشن آنے کو ہے۔۔تو تشریحات کا مطالعہ نصیب ہوا۔۔۔اگر اُس وقت ایسا ہو جاتا تو کیا یہ بہتر نہ ہوتا؟

فرمایا۔اگر آپ اُس وقت پڑھ لیتے۔۔تو آپ کا اپنا ذہن کام کرنے لگتا اور آپ اس غیر جانبداری اور احتیاط سے ترجمہ نہ کر سکتے جیسا کہ اب ہو گیا ہے۔

مرید نے بہت محفوظ ہو کر پوچھا۔تو کیا اب میرا ذہن کام کرنے لگا ہے؟

فرمایا۔جی ہاں۔آپ اردو اور انگریزی میں مضامین لکھا کریں۔

اُس نے سمجھا کہ ڈیوٹی لگا رہے ہیں۔۔۔تو بات بدلنے کو کہا۔پشاور میں ایک عمارت دیکھی تو جی میں آئی کہ اس پہ مراقبہ ہال لکھا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا؟

مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔یہ کیا مشکل تھا۔آپ کوئلہ لے کر اُس پہ مراقبہ ہال لکھ دیتے۔اس معصوم سے حل پہ سبھی ہنس دیئے۔

ہنسی مذاق سے بات شروع ہو کر سکھوں کے لطیفوں تک پہنچی تو مرید نے سکھوں کی بابت سُنی ہوئی اس بات کی تصدیق چاہی کہ کبھی کوئی سکھ بھکاری اور طوائف نہیں ہوتا۔

فرمایا۔ ہم انڈیا میں بھی دیکھتے رہے ہیں اور پھر کئی اور ممالک میں بھی دیکھا ہے۔۔۔اتنی عمر ہو گئی ہے۔۔واقعی ہم نے کبھی کسی سکھ کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔۔۔اسی طرح یہ دوسری بات بھی درست ہی ہو گی۔ پھر اس کی توجیہ یہ بتائی کہ گرو بابا نانک ایک روحانی بندے تھے۔۔انہوں بھی خانقاہی نظام ہی تو قائم کیا تھا۔ سکھ ازم بھی ایک روحانی سلسلہ ہی تو ہے۔

مرید نے سوچا بلاشبہ یہ خانقاہی نظام ہی کی برکات اور فیوض ہیں کہ انسان اتنا خوددار اور غیرت مند ہو جاتا ہے کہ وہ نہ عزت نفس کا سودا کرتا اور نہ ہی جسم و جان کا۔۔۔کیونکہ اپنے مالک اپنے خالق کی طرف متوجہ ہونے والا بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اگر اُس کا پالن ہار ہی اُس کو زندہ نہیں رکھنا چاہتا تو وہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔۔۔اور پھر یہ کہ جب مالک ہی نہ چاہے تو زندہ رہ کر کرنا کیا ہے؟۔۔۔اور جب کسی کو یہ بات سمجھ میں آجائے تو وہ دست سوال دراز کر کے اپنا ریکارڈ کیوں خراب کرے۔

وہاں سے اُٹھ کر حضور دفتر کے لئے تیار ہونے دوسرے کمرے میں چلے گئے اور وہ باہر آستانے کے پاس انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ حضور اپنا بیگ اُٹھائے باہر تشریف لائے۔ اتنے میں حامد بھائی سوزوکی وین لے کر مراقبہ ہال کے اندر آگئے اور آستانے کے سامنے رُک گئے۔ ابا حضور دروازہ کھول کر بیٹھ چکے تو حامد بھائی نے گاڑی کو ریورس میں لینے سے پیشتر اُس سے مصافحہ کو ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس نے اُن کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اُن کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ آپ کے ہاتھ ٹھنڈے ہیں۔۔۔

حضور نے فرمایا۔ ایک بار میں نے ایک رکشے کے پیچھے یہ شعر لکھا دیکھا تھا۔

سونے کا قلم، چاندی کی دوات　　　　گورے گورے ہاتھوں سے لکھ سے جواب

فرمایا۔ کیا ہوا جو اس میں وزن نہیں۔۔۔۔جذبات کا مکمل اظہار تو ہے۔

حامد بھائی نے جھٹکے سے ہاتھ اُس کی گرفت سے چھڑایا اور گاڑی روانہ کر دی۔ وہ دیر تک وہاں کھڑا اس بات کا لطف لیتا رہا۔

اگلے روز وہ مرشد کریم کے ساتھ ایئرپورٹ جا رہا تھا تو راستے میں مرید سے کہا کہ وہ پی ایچ ڈی کرے۔ فرمایا۔ آپ قلندر بابا اولیاؒ پر پی ایچ ڈی کریں۔ آپ میاں صاحب سے مل کر اشفاق صاحب اور تجمل صاحب سے ملیں۔۔۔ وہ آپ کی مدد کریں گے۔ تجمل صاحب ڈین یونی ورسٹی رہے ہیں۔ انہوں نے ایک بار لوح و قلم پڑھ کر کہا کہ میرے اوپر سے گزر گئی ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ اسے بار بار پڑھیں۔۔۔ یہ آپ کو سمجھ آجائے گی۔

پھر اُسے کہا کہ وہ لوح و قلم میں تشریحات اور نقشے وغیرہ شامل کر کے تھیسس کی صورت پیش کرے تو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جائے گی۔ پھر فرمایا۔ آپ کے نام کے ساتھ ڈاکٹر جچے گا۔ پھر 'ڈاکٹر مقصود عظیمی' تولنے کے انداز میں ادا کر کے فرمایا۔ اچھا لگے گا۔ وہ جی۔۔۔ اچھا۔۔۔ کہہ کر سر جھکا کر سوچنے لگا کہ برسوں پہلے اُس نے پی ایچ ڈی کرنے کا خواب دیکھا تھا اور جمالیات کے موضوع پر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی زیر نگرانی دو ڈھائی سال تک اس پر کام بھی کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہونے کی تگ و دو بھی کرتا رہا۔۔۔ لیکن جب اُس نے یونیورسٹی کو ایک مادر علمی کی بجائے ایک ایسا قلعہ پایا جہاں چند لوگ اپنی لابی بنائے بیٹھے تھے۔۔۔ تو علم کی دُنیا کو خیر باد کہہ کر دولت کمانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ آج اُس کا مراد اُس خواب گم گشتہ کو ایک حقیقت بنانے کی بات کر رہا تھا۔ مرید نے دعا کی۔ بارِالٰہ تو مجھے توفیق دے کہ میں اپنے مرشد کا کہا پورا کر دکھاؤں۔

پھر فرمایا باپ یہ چاہتا ہے کہ اولاد اُس کا ذہن فالو کرے۔۔۔ بھئی اگر دیکھ لیں کہ اولاد باپ کا ذہن فالو نہیں کر رہی تو باپ اولاد کا ذہن کیوں فالو نہ کرے۔۔۔ اجی یہ سب حکمرانی کی خواہش ہے۔۔۔ ہم خود کو اولاد پہ حاکم ہی تو سمجھتے ہیں۔

جب گاڑی سٹار گیٹ سے مڑ کر ایرپورٹ کی حدود میں داخل ہوئی اور سکیورٹی چیک کے نام پر گاڑی کی تلاشی ہو رہی تھی تو ایف آئی آئے کے ایک ڈائریکٹر کے حوالے سے فرمایا کہ امریکی ٹیم سے مذاکرات کے دوران انہوں نے اُن سے کہا کہ ہم پاکستانی تو پسماندہ لوگ ہیں۔۔۔اس لئے سمگلر ہم سے بچ نکلتے ہیں لیکن آپ یہ فرمائیں کہ آپ کے ایرپورٹس پہ۔۔۔آپ کی تمام تر ترقی یافتہ کوششوں کے باوجود وہ کیونکر بچ نکلتے ہیں۔یعنی اگر آپ ہم پر سمگلروں سے ملنے کا الزام لگاتے ہیں آپ بھی اسی الزام کی زد میں آتے ہیں۔ پھر بتایا کس طرح سمگلر ایک کروڑ کا مال پکڑواتے ہیں اور بیس کروڑ کا مال پار کروا لیتے ہیں اور بھتے میں سے ایک کروڑ منہا کر لیتے ہیں۔وہ بھی خوش کہ مال نکل گیا اور یہ بھی خوش کہ کیس پکڑ لیا۔

پھر ایرپورٹ پہ الوداع کہنے والوں کو شفقت بھری نگاہوں سے تکتے وہ بیرون ملک روانگی کے لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ مسافرت کے جھنجھٹ، سامان کو سنبھالنے کی مشقت، ٹکٹ اور سفری دستاویزات کے تردد، درپیش سفر کی بابت وسوسوں، منزل پہ پہنچ کر حاصل ہونے والی خوشی یا اندیشوں میں گرفتار مسافروں کے ہجوم میں۔۔۔ان سب باتوں سے آزاد۔۔۔ایک مسکان بکھیرتے۔۔۔اپنا ایک بیگ اور کارٹن ٹرالی پہ رکھے۔۔۔وہ اپنے مخصوص انداز میں قدم اُٹھاتے عرفان بھائی اور اُن کی بیگم انیسہ کے ہمراہ بورڈنگ کارڈ کے کاؤنٹر تک پہنچ گئے۔ بورڈنگ کارڈ لے کر انہوں نے پلٹ کر باہر سے دیکھنے والوں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور کسٹم اور امیگریشن والوں کو اپنی چھب دکھاتے گزرتے چلے گئے۔

کتاب تجلیات کی تقریب رونمائی

وہ عرس پہ دوبارہ کراچی آنے کا عہد کرتا ہوا پشاور پہنچ گیا۔

انگلینڈ سے واپس آنے کی اطلاع ملی تو اُس سے رہا نہ گیا اور اُس نے کراچی فون کیا۔ ابا سے بات ہوئی۔ فرمایا کہ وہاں قلندر شعور پہ کئی ورک شاپس ہوئیں۔ نو نو گھنٹے کا سیشن رہا۔ میں نے کہا۔۔۔ مقصود صاحب کی روح خوش ہو رہی ہو گی۔۔ بھئی میں خود تو وہیں تھا اور خوش ہی ہو رہا تھا۔

پھر کاروبار کا پوچھا۔۔۔ غصے کا دریافت کیا۔۔ عرض کی اب تو مدت ہی ہو گئی ہے غصہ کئے۔۔ آپ شاہین سے پوچھ لیں۔ فرمایا۔ان سے تو میں علیحدگی میں پوچھوں گا۔۔۔ اس وقت تو آپ کے سامنے کہہ دیں گی کہ ہاں نہیں کرتے۔

وہ دیر تک سوچتا رہا کہ یہ غصہ کی مزاج پرسی کیوں۔۔۔؟

چند روز بعد حضور کی سالگرہ پہ مبارک باد پیش کرنے کے بہانے اُس نے دوبارہ فون کیا۔ تو فرمایا بھئی مبارک تو آپ کو ہو۔ مرید نے کہا۔ جی ہاں اللہ آپ کا سایہ ہم پہ قائم رکھے واقعی یہ خوش بختی تو ہمیں کو مبارک ہو۔

پھر مرید نے اپنے مراقبے کی ایک کیفیت کی بابت عرض کیا کہ آپ کا دماغ میرے دماغ کی جگہ لگا ہوا ہے۔ مسکراتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ بھئی ضرورت تو مجھے تھی۔۔۔ بول بول کر سارا خرچ ہو گیا ہے۔۔۔ مرید نے عرض کیا۔ آپ نے خرچ کیا تو ہمیں مل گیا نا۔۔۔ ہنس کر بولے۔۔۔ جی ہاں۔

مرید نے عرض کی آج صبح مجھے یہ خیال گزرا کہ غصہ کرنا اللہ پہ اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔ فرمایا۔ جی ہاں۔۔۔انا۔۔۔کبر۔۔۔یہ سب خاندانی روایات ہیں۔۔۔صدیوں پرانی روایات۔۔۔پیغمبروں نے انہی خاندانی روایات پہ ہی تو ضرب لگائی۔۔۔پیغمبرانہ طرزِ فکر حاصل ہی تب ہوتی ہے جب آدمی خاندانی روایات کی حدوں سے باہر نکل جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو خاندانی روایات ہی کو توڑا۔۔۔ حضور ﷺ کو بھی لوگوں نے یہی تو کہا کہ ہمارے اجداد جو کچھ کرتے رہے وہ ہم کیسے چھوڑ دیں۔

پھر لکھنے پڑھنے کا پوچھا۔ عرض کی نہ کچھ لکھا جا رہا ہے اور نہ پڑھا۔

فرمایا۔ جب ایسی کیفیت ہوتی ہے تو دراصل ذخیرہ ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر فارسی کا ایک مصرعہ کچھ اس مفہوم کا پڑھا کہ سمندر کا سکوت طوفان کا پیشِ خیمہ ہوتا ہے۔

مرید نے اُن سے منسوب ایک جملہ جس کے راوی خالد نیاز تھے عرض کی کہ زیادہ کتابیں لکھنے سے لوگوں کو بدہضمی ہو جاتی ہے۔

فرمایا۔ میں نے یہ بات اُن سے اپنی تقریروں کے حوالے سے کہی تھی کہ اتنی تقریریں کرتا ہوں کہیں لوگوں کو بدہضمی ہی نہ ہو جائے۔ کہیں کتابوں سے بھی بدہضمی ہوتی ہے؟ مزید ارشاد ہوا۔ یہاں تو سب ہی کے پیٹ اتنے بھرے ہوئے ہیں کہ اب تو قورے کی بھی گنجائش نہیں۔ یہاں تو سب ہی قطب اور ابدال بنے ہوئے ہیں۔ کوئی صاحب خدمت ہے تو کسی نے کوئی اور عہدہ لیا ہوا ہے۔ کسی نے کوئی علاقہ سنبھالا ہوا ہے تو کسی کوئی۔ اپنے گلی محلے کی چائے تک نہیں پیتے۔۔۔کہتے ہیں اپنے علاقے میں چل کر چائے پیئیں گے۔۔۔میں کہتا کچھ ہوں تو سمجھتے کچھ ہیں۔۔۔اور کبھی تو کہہ بھی دیتے ہیں کہ ہم نے سمجھا کہ آپ ایسا چاہتے ہوں گے۔

روحانیت کو مذاق بنایا ہوا ہے۔ میں نے انگلینڈ میں کہہ دیا۔۔ یہاں کا ماحول ایسا ہے۔ آپ کبھی کبھار تاش کھیل لیا کریں۔۔۔لے کے مذاق بنا دیا۔۔ کہنے لگے لو جی تاش بھی روحانی ہو گیا۔

فرمایا۔ان میں گہرائی نہیں ہے۔ان کو وقت سے پہلے علم دینے کی غلطی ہو گئی۔آپ ان کی باتوں پہ کان نہ دھرا کریں۔۔۔ مجھ سے پوچھ لیا کریں۔۔ یہ نہیں کہ یہ مخلص نہیں۔۔ یہ بہت مخلص ہیں لیکن ابھی گہرائی اور پختگی نہیں ہے۔۔۔ بچپنا کر جاتے ہیں۔۔ میرے یہاں نہ ہونے سے یہاں پہ بھی جمود ہی طاری رہا۔۔ کرنے کے سبھی کام دھرے کے دھرے ہیں۔

پھر ہمایوں کے فون کا تذکرہ کیا کہ وہ حیات آباد میں مراقبہ ہال کے لئے زمین لے رہے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ نیاز صاحب کو بتا دیں۔۔۔ وہ مرکزیت کے بارے میں سوچتے ہیں۔انہوں نے پلٹ کت کہہ دیا۔۔۔ نہیں ہم تو حیات آباد مراقبہ کے لئے زمین لیں گے۔

پی ڈی اے کو زمین کے لئے درخواست دینے کی بابت پوچھا تو فرمایا۔ جو کام Through Proper Channel ہو وہی ٹھیک رہتا ہے۔ لیکن جو کام بالا بالا کر دیا جائے وہ ٹھیک نہیں رہتا۔ پھر ایک وزیر سے براہ راست دستخط کروا کر کام کروانے کی اپنی ایک کوشش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ نچلے والوں نے پرواہ ہی نہیں کی۔ وہ کام آج تک ویسے کا ویسا پڑا ہے۔

فون بند ہونے کے بعد وہ کتنی ہی دیر سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ شاید انہوں نے اپنے کچھ دکھ اُسے دکھا کر اُس کی آنکھوں پہ غفلت اور جہالت کی بندھی پٹی کو کچھ ڈھیلا کیا تھا کہ وہ جو سب ہرا ہی ہرا دیکھ رہا ہے وہ اتنا بھی ہرا نہیں۔ حقیقت کو سامنے رکھ کر خوش رہنا ہی تو فن ہے جو پتہ پانی کرنے اور خون کو برفاب بنانے کے بعد ہی آتا ہے۔ یہ ہنر خیالی دنیا میں رہنے اور احمقوں کی جنت میں

رہنے والوں کی طرح اپنی ذات میں مگن رہنے کی بجائے دوسروں کے لئے جینے اور مرنے کا وہ عملی مظاہرہ ہے جس کو انبیاء کی اصل اور حقیقی سنت کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

ایک دو ماہ کچھ ایسے ہی گزر گئے۔ صبح دفتر شام گھر ہفتے میں پندرہ دن میں ایک بار مراقبہ ہال۔ اللہ اللہ خیر صلہ۔ اس روز وہ دفتر پہنچ کر کچھ کام کرنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ فون پہ کامران باسط کی طرف سے ایک پیغام ملا کہ عرفان صاحب سے رابطہ کریں۔ اُس نے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ ابا حضور ابو ظہبی تشریف لے جا رہے ہیں اور اُس کو بھی ساتھ جانا ہے۔ اُس لئے دو پاسپورٹ کی نقل فیکس کرے تا کہ ویزا کا بندوبست کیا جا سکے۔ اُس نے پوچھا ٹکٹ وغیرہ کتنے کا ہو گا؟ عرفان بھائی نے کہا۔ ابا نے فرمایا تو اگر آپ کے پاس نہیں ہیں تو بھی ہو جائے گا۔۔۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔۔ بس پاسپورٹ کی نقل بھجوا دیں۔ اس نے ویسا ہی کیا اور پھر وہ کراچی سے آٹھ دس افراد کے وفد کی صورت دبئی ایئر پورٹ پر اترے۔ دبئی ایئر پورٹ پر جہاز سے باہر آتے ہی اُس کو آزادی اور خوشی کا احساس ہوا تھا اور وہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ابا حضور اُن سے ایک روز پیشتر کی فلائٹ سے دبئی جا چکے تھے۔

دبئی جانے والوں کے اُس وفد کی قیادت ڈاکٹر مسعود طارق کر رہے تھے۔ شمشیر بھائی اور شوکت صاحب (نگران سانگھڑ مراقبہ ہال) بھی انہی کے وفد میں شامل تھے۔ اُن کو دبئی ایئر پورٹ سے بیگ صاحب کے یہاں لے جایا گیا۔ وہاں محبوب بھائی اور جمال صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے وہیں کھایا۔ پھر وہ رشیدہ جیلانی صاحبہ کے گھر گئے۔ چائے وہاں پی۔ اخلاق مغل، حفیظ صاحب، شاہ صاحب اور دیگر اصحاب اور خواتین انگلینڈ سے سیدھے وہیں پہنچے۔

ابو ظہبی میں اُن کا قیام ایک ایسی عمارت میں تھا جس کے وہ آخری مکین تھے کیونکہ عمارت کو گرانے اور از سر نو تعمیر کرنے کے لئے خالی کروایا جا چکا تھا۔ حضور مرشد کریم کا قیام محبوب بھائی کے گھر پہ تھا۔ وہاں دو تقریبات ہونا طے تھیں۔ ایک روحانی

کانفرنس اور دوسرے حضور مرشد کریم کی کتاب تجلیات کے عربی ایڈیشن کی تقریب رونمائی۔ باقی سب مرشد کریم کے روحانی تصرف اور میزبانوں کی صوابدید پر تھا۔

ان دونوں تقریبات میں شمولیت کے علاوہ اُن کو ابو ظہبی اور دبئی کی سیر بھی کرنا تھی۔ حضور سے ملاقات اور بات چیت۔۔ان دونوں تقریبات کے علاوہ ابو ظہبی پارک کی سیر اور سمندر کنارے علی الصبح مراقبہ کرنے پہ ہی ہو سکی تھی۔ حضور مرشد کریم کا باقی وقت وہاں کے مراقبہ ہال کے اراکین، اُن کے اہلِ خانہ اور ابو ظہبی کی معروف شخصیات سے ملاقاتوں ہی میں صرف ہوا۔

ساحل سمندر پر بنے ہوئے تفریحی ہٹ نما چبوترے کے پیتلے فرش پر خشک گھاس کے اوپر بچھی دریوں پہ طلوع آفتاب سے پہلے مراقبہ ہوا۔ مرشد کریم نے اپنے خطاب میں اپنی روحانی اولاد کو مرکزیت اور اجتماعیت کی اہمیت کا احساس دلانے اور انفرادی طرزِ فکر سے دامن بچانے کا درس دیتے ہوئے فرمایا۔

ہر شے کسی نہ کسی مرکز سے متعلق ہوتی ہے۔ ہر شے کا کوئی نہ کوئی مرکز ہوتا ہے مرکزیت سے ہی اتفاق اور برکت ہوتی ہے۔ الیکٹرون بھی ایک مرکز کے ہی گرد گھومتا ہے اور جب تک وہ مرکزے سے وابستہ رہتا ہے قائم رہتا ہے۔ مرکزیت ٹوٹ جائے تو ہر چیز بکھر کر رہ جاتی ہے۔ فنا ہو جاتی ہے۔

انسان سے انسان، بلی سے بلی اور سیب سے سیب اس لئے پیدا ہو رہا ہے کہ ان میں مرکزیت ہے۔ اگر ان سب میں مرکزیت نہ ہو تو انسان کتے بلی کو جنم دے اور کتے بلی سے انسان پیدا ہونا شروع ہو جائیں اور یہ سب محض اس لئے نہیں ہوتا کیونکہ ہر چیز اپنی مرکزیت پہ قائم ہے۔

جب انسان کسی صفت پہ قائم ہو جاتا ہے تو اُس صفت کے حامل افراد خود بخود اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے یہ نظام گروہی تقسیم پر قائم کیا ہے۔ایک نشے باز آدمی کہیں بھی جائے تو وہ اپنے جیسے افراد کو فوراً تلاش کر لیتا ہے۔آپ جس صفت پہ بھی قائم ہو جائیں گے۔۔۔اُس صفت کے حامل افراد آپ کو خود ہی تلاش کر لیں گے۔

میں نے جب سلسلے کا کام شروع کیا تو میں اکیلا تھا۔آپ سب نے مجھے تلاش کیا۔۔۔میں نے آپ کو تلاش نہیں کیا۔

آپ میں اگر غصہ ہے تو آپ کے گرد غصے والے لوگ جمع ہو جائیں گے۔آپ میں سخاوت اور ہمدردی ہے تو آپ کے گرد ہمدرد اور سخی لوگ جمع ہو جائیں گے۔آپ میں عفو و درگزر ہے تو آپ کے گرد ایسے لوگ جمع ہو جائیں گے جو اس صفت کے حامل ہوں گے۔آدمی گروہ کو نہیں ڈھونڈتا۔۔۔گروہ آدمی کو ڈھونڈ لیتا ہے۔آپ چشمہ بنیں گے تو پیاسے خود ہی آپ کو کھوج نکالیں گے۔مریض ڈاکٹر کو اسی لئے تو تلاش کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کی صفات سے مستفیض ہونا چاہتا ہے۔کبھی ڈاکٹر مریضوں کو نہیں تلاش کیا کرتے۔

پھر فرمایا کہ اگر آپ کے اندر خوشی نہیں تو خوش رہنے والا شخص بھی آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ایسے لوگ تو ہنستے بندے کو دیکھ کر اُسے گھرک دیتے ہیں او یہاں تک کہہ دیتے کہ تم کیا ہر وقت دانت نکالتے رہتے ہو۔دراصل خود اُن کے اندر خوشی نہیں ہوتی۔ناخوشی اُن کے اندر اتنی گہری اتری ہوئی ہوتی ہے کہ وہ کسی خوش بندے کو اپنے قریب برداشت ہی نہیں کر سکتے۔آپ کو چاہئے کہ آپ اپنی خوشی پہ قائم رہیں۔۔۔۔

اُس کو لگا خطاب کا آخری حصہ محض اُس کی دلجوئی اور ڈھارس بندانے کو ارشاد فرمایا گیا تھا۔ گزشتہ روز جب مرشد کریم نے ابو ظہبی کی سیر کرتے دیکھا کہ دو کوچز میں بیٹھے مرد و خواتین اپنی اپنی خوشی پہ ایک دوسرے کے احترام اور تہذیب کے پہرے لگائے ہوئے ہیں تو انہوں نے ایک جگہ کوچز کو اکر تمام خواتین کو ایک کوچ میں اور تمام مردوں کو دوسری کوچ میں منتقل کرنے کا کہا۔ پھر جب دونوں کوچز کے مسافروں نے اس بات کو فرمائش سے ضد کا روپ دینے کی کوشش کی تو مرشد کریم اُن کی گاڑی میں بیٹھیں انہوں نے اپنی وِیٹو پاور کو خواتین کے حق میں استعمال کیا اور خواتین والی کوچ میں جا بیٹھے۔

جب مرشد اور بیویوں کے رعب سے مردوں کو کھلی چھٹی ملی۔۔۔ آزادی کا احساس بڑھا۔۔۔ تو ہنسی مذاق۔۔۔ جو دبا دبا تھا۔۔۔ کھلتا چلا گیا۔ بات جملے بازی سے مردانہ قسم کے لطائف تک پہنچی۔۔۔ وہ سب ہی اتنا ہنس رہے تھے جیسے انہوں نے لافنگ گیس سونگھ لی ہو۔۔۔ شمشیر بھائی اور نثار صاحب نے جب حفیظ بٹ صاحب جیسے سنجیدہ مزاج انسان کو بھی اپنی جملہ بازی کی زد میں لے لیا تو اب کسی اور کا بچنا کہاں ممکن رہا تھا لیکن ایک دو افراد کو شاید یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُن کے اندر کا زاہد خشک بُرا منا رہا تھا۔

ایسے میں اُس نے ایک جملہ اچھال کر جب داد طلب نگاہوں سے انہیں دیکھا تو وہ جو بھرے بیٹھے تھے۔۔ یک دم پھٹ پڑے۔۔۔ اور کہا۔ تم نے کیا مذاق بنایا ہوا ہے میں کب سے دیکھ رہا ہوں کہ تم دانت نکالے جا رہے ہو۔۔۔ اُس کے کاٹو تو لہو نہیں۔۔۔ سبھی پہ اوس پڑ گئی۔۔۔ سبھی نے اُن صاحب کی ناخوشی پہ دکھ محسوس کیا اور باقی سفر ایک گھٹن اور کوفت کی دھند میں کٹا۔ وہ رائل فیملی کے محلات اور ابو ظہبی کے قریب ایک پہاڑی پہ بنے پکنک ریزوٹ بھی گئے لیکن اُس کے ذہن پہ کوفت اپنے پنجے گاڑے رہی۔

رات بھر وہ خود سے یہ عہد و پیمان کرتا رہا کہ آئندہ وہ سیریس رہا کرے گا۔۔ ہنسی مذاق نہیں کیا کرے گا۔اُس نے خود کو طرح طرح کی قسمیں دیں کہ آئندہ کسی قسم کا ہنسی مذاق نہیں۔۔۔۔لیکن اپنے مراد کی یہ بات سُن کر پہلے تو اُس نے عہد و پیمان کا وہ ٹوکرا سمندر میں اچھال پھینکا اور پھر یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ مرکزیت کے حوالے سے کی گئی بات کے مخاطب کون تھے۔۔۔اُس کا جی چاہا کہ اپنے مرادِ کے پاؤں پکڑ کر اُن سے اپنے گناہوں اور خطاؤں سے درگزر کی درخواست کرے۔وہ کھسک کر اُن کے قریب ہوا۔وہاں عربی قہوہ پیش کیا جا رہا تھا۔ابا حضور نے قہوے کی پیالی لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔میں یہ نہیں پیوں گا۔۔باقی سب کو دیجیئے۔تو وہ کہنے کی بات بھول کر یہ پوچھنے لگا کہ آپ یہ قہوہ کیوں نہیں پی رہے۔اس پہ فرمایا۔کہ اس میں زعفران وغیرہ ہے۔۔۔یہ گرم ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ سمندر سے اگتے سورج کو دیکھنے اُٹھ کر ساحل کی طرف چل دیئے۔وہ قہوہ اُس نے پیا۔۔اُس کو اُس میں گلاب اور کافی کے علاوہ الائچی کی مہک محسوس ہوئی۔پھر ناشتہ بھی وہیں ریت پہ دریاں بچھا کر کیا گیا۔اتنی صبح پکنک،مراقبہ،ناشتہ،درس اور تفریح۔۔۔قرب مراد میں سب ایک ساتھ ملیں۔۔۔تو آدمی کسی شیرازی کبوتر کی طرح غٹرغوں نہ کرے تو اور کرنے کو ہے کیا۔

سہ پہر میں رائل ہسپتال اور تفریحی پارک کی سیر کے دوران اُس اپنے مراد کے قریب ہو کر بات کرنے کا موقع ملا تو اُس نے ابو ظہبی کے ماحول،نظام حکومت،صفائی،ٹریفک کے انتظام،سڑکوں اور ذہنوں کے کھلے پن کو سراہا تو فرمایا۔یہ سب ون مین شو ہے۔اب پیسہ تو سعودیہ کے پاس بھی تھا۔۔اُن سے امریکہ نے چھین لیا۔۔انہوں نے سب کا سب یہیں خرچ کر ڈالا۔پیسہ ان کے پاس بھی نہ رہا لیکن شہر تو بن گیا نا۔یوں لگتا ہے کہ جنت کو زمین پہ اتار دیا ہے۔

وقار بھائی جان نے تقریب رونمائی میں نظامت کے لئے اس کو اسٹیج پہ مدعو کیا۔ جب حضور دیگر مقررین اور میزبان تقریب کے جلو میں ہال میں داخل ہوئے تو وہ اسٹیج سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ انہیں دور سے بالکل نہ پہچان سکا۔ جب وہ قریب آئے تو اُن کو عربی لباس میں دیکھ کر اُس کو کچھ عجیب سا لگا۔ سپید عربی لباس میں اُن کی چھب ہی کچھ اور تھی۔ اس پہ مستزاد یہ کہ سبھی مقررین نے وہاں کی ریت کے مطابق انہیں شیخ اور الشیخ کہہ کر مخاطب کیا تو اُس کو جانے کیوں یہ لگا کہ ابا حضور سے کچھ فاصلے پہ روک دیا گیا ہے۔

عربی مقررین کا فصاحت و بلاغت سے ایک عجمی کی کتاب کو خراج تحسین پیش کیا جانا کسی کرامت سے کچھ کم نہیں تھا۔ تقریب کے بعد حضور بتا رہے تھے کہ جو سیاہ فام حبشی اُن سے گلے ملے وہ اپنے اظہار عقیدت کو اُن کے کان کی لو چوستے تھے۔ شاید یہ اُن کی خوش عقیدتی کے اظہار کی کوئی رسم تھی۔

دوسرے روز کانفرنس کی تقریب ایک عالی شان ہال میں ہوئی۔ اس تقریب کی نظامت کی سعادت پروفیسر اخلاق مغل کے حصے میں آئی۔ سینما ہال کی طرز پر سٹیج کے سامنے درجہ بدرجہ بلند ہوتی نشستوں پہ جگہ نہ ملنے والوں میں دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر کانفرنس کی کاروائی وہ کہیں دور ہی سے سن رہا تھا۔ اُس روز اُس کو ایک ہی احساس تھا کہ اُس کا مراد اپنے مرشد کے آدرش کو اپنا مشن بنائے، عرب کے صحرا میں اپنی دھن میں بہت آگے جا رہا ہے۔ اتنا آگے کہ اگر وہ اُسے پکارے بھی تو اُس کی آواز اُس تک نہ پہنچ پائے گی۔

کانفرنس کے اختتام پر وہ مرشد کریم کے ساتھ مسجد سلطان قابوس گئے۔ وہاں نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے نکل کر حضور نے فرمایا۔ پیسہ بولتا ہے اور دولت تماشا دکھاتی ہے۔

پھر معلوم ہوا کہ حضور اگلے روز پاکستان واپس تشریف لے جائیں گے جبکہ باقی ارکان اگلے روز شام کو دبئی سے کراچی جائیں گے تاکہ وہاں عرس میں شریک ہو سکیں۔

وہاں سے جمال صاحب اُن کے افسر مہمانداری مقرر ہوئے یا یہ عہدا نہوں نے اپنے طور پر مسعود طارق، شوکت صاحب اور اُس کے لئے خود انتخاب فرمایا۔ وہ انہیں اپنے گھر لے گئے۔ بخوردان میں سلگتے عود کی مہک مشام جان کو معطر کیا اور عربی قہوے اور کھجوروں سے تواضع کرنے کے بعد وہ انہیں ایک ٹریڈ فیئر دکھانے لے گئے۔

وہاں سے انہیں دبئی کی سیر کروا کر رات کا کھانا ایک انڈین ہوٹل میں کھلا کر وہ انہیں اُن کی رہائش گاہ پہ چھوڑ کر صبح آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ اگلے روز صبح وہ انہیں لے کر متحدہ عرب امارات کی چھ کی چھ ریاستیں گھما کر رات کا کھانا شارجہ میں کھلا کر دبئی ایر پورٹ پر خدا حافظ کہہ رہے تھے تو وہ محبوب بھائی اور جمال صاحب سے ڈیڑھ دن کی تمام تر بے تکلفی کے باوجود اُن کو اتنا ہی کہہ سکا کہ اس طوفانی قسم کی میز بانی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اُس کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جمال صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ گھر جا کر آرام سے ڈکشنری میں سے ڈھونڈ کر رکھیں۔۔۔ جب ہم پشاور آئیں گے تو کہہ دینا۔ البتہ محبوب بھائی نے اتنا ہی کہا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا۔۔۔ جس کی وجہ سے کیا۔۔۔ وہ انہی کا شکریہ ادا کرے۔

کراچی ایر پورٹ پر کسٹم حکام نے انہیں جس طرح خصوصی طور پر بلا کسی تردد اور جامہ تلاشی کے گزرنے دیا۔۔۔ وہ اُن کو یہ باور کروانے کو کافی تھا کہ وہ وزیر اعلیٰ کے ایک مشیر کے ہمراہ بیرونِ ملک دورہ کر کے ملک واپس آئے ہیں۔۔۔

کراچی میں حضور مرشد کریم کی مصروفیات اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ ملک کے مختلف حصوں سے ہی نہیں بیرونِ ملک سے آنے والا ہر ہر فرد اُن سے ملنا اور حال دل کہنا چاہتا ہے اور نہایت حیران کن امر یہ ہے کہ وہ ہر ہر فرد کو اُس کی مرضی کا وقت بھی دیتے ہیں۔۔۔اُس نے سوچا۔۔۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ تم ملاقات کرو ہو یا کرامات کرہو۔۔ٹائم مینجمنٹ کی اعلیٰ ترین تکنیک جاننے والے بھی وقت پہ ان کی گرفت اور رسائی کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔

عرس کے موقع پر حضور مرشد کریم کے سالانہ خطاب سے پیشتر مختلف مقررین نے مکالمہ جات پیش کئے تو سعیدہ خاتون عظیمی نے تجویز کیا کہ حضور مرشد کریم کو الشیخ عظیمی کہا اور لکھا جائے۔ پر زور تالیوں میں اس تجویز کو سند قبولیت سے نوازا گیا۔

جب اُس کو اپنا مکالمہ پیش کرنے کو کہا گیا تو اُس نے الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی کی سلسلہ عظیمیہ کے لئے خدمات اور رسول کریم ﷺ کے مشن کی پیش رفت میں اُن کے کردار اور کامیابیاں پہ روشنی ڈالتے ہوئے سادگی سے یہ کہہ دیا کہ وہ تو راستے کی ہر رکاوٹ کو پھلانگتے ہوئے۔۔۔دوڑنے کی بجائے۔۔۔ چھلانگیں لگاتے ہوئے۔۔اپنی منزل مراد کی طرف جا رہے ہیں۔ تو ڈیڑھ دو ہزار افراد کے مجمع کے بُرا منانے سے پہلے مرشد کریم نے ہنستے ہوئے دوہرے ہو کر اُس کو ایسے سراہا کہ وہاں موجود ہر فرد نے تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے۔۔۔اُس کی جسارت کو معاف کر دیا۔ سعیدہ باجی نے باقاعدہ اُٹھ کر پیٹھ تھپتھپائی۔

بعد میں بہت سے محبان مراد نے اس سے وضاحت طلب کی کہ اُس کو مرشد کریم کے حوالے سے چھلانگیں لگانے کی بات کہنے کی کیا سوجھی تھی۔۔۔اُس نے سادگی سے کہا۔۔۔ دراصل میں انگریزی میں سوچتا ہوں تو leap کے لئے اردو میں دستیاب لفظ چھلانگ ہی بنتا ہے اس سبب یہ لطیفہ ہو گیا ہے۔

عرس کی تقریبات کا اختتام نظریہ رنگ و نور کے عنوان سے ایک روز ورکشاپ پہ ہوا۔

اس سے اگلے روز جب زیادہ تر زائر اور مہمان رخصت ہو رہے تھے مرکزی مراقبہ ہال کے برآمدے میں تمام نگران مراقبہ ہال مرشد کریم کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھے۔ مرشد کریم نے اُن سے اپنی توقعات کا اظہار کرنے اور سلسلے کے کام میں اُن کو درپیش مشکلات کا حل بتانے کے لئے بلایا تھا۔ اُس کو اس میٹنگ میں بطور مبصر شریک ہونے کی اجازت نیاز بھائی نے دلوائی۔ میٹنگ کا آغاز ہوا اور تین چار نگران مصر ہو گئے کہ مرشد کریم کو چاہیئے کہ وہ اپنا نائب نامزد کریں۔۔۔ وہ اس کی اہمیت اور ضرورت پہ دلائل دے رہے تھے اور مرشد کریم کے منہ پر بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ اُن کے بعد اُن کی جگہ کون بیٹھے گا؟ سلسلہ کون چلائے گا؟ مرید اک عالم حیرت میں یہ سب سُن اور دیکھ رہا تھا۔ کل جن کو لفظ چھلانگ بُرا لگا تھا وہ مرشد ہی سے اُن کے بعد کی بات کس جرات اور دلیری سے کہہ رہے تھے۔ وہ سن ہو کر کڑھتا رہا۔

مرشد کریم نے کوئی تاثر ظاہر کئے بغیر کہا۔ بھئی آپ سب ہی میرے نائب ہیں۔

شاید کسی کے پلے نہیں پڑا کہ انہوں نے کیا فرمایا ہے تو مرشد کریم نے فرمایا۔ دیکھیں یورپ کے لئے میں نے سعیدہ خاتون کا کہا ہے اور وہ وہاں میری نائب ہیں۔ یہاں آپ سب ہی اپنے اپنے مراقبہ ہال میں میری ہی تو نمائندگی کر رہے ہیں۔۔۔ پھر بھی جب مجھے جانا ہو گا میں اس کا انتظام کر جاؤں گا۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔۔۔ اللہ نے سلسلہ چلانا ہے۔۔۔ وہ جس سے جو کام لینا چاہے گا لے لے گا۔

پھر فرمایا کہ امام سلسلہ جس کو چاہے اپنا ذہن منتقل کر سکتا ہے۔۔۔ جس کو امام سلسلہ کا ذہن منتقل ہوتا ہے وہ خانوادہ کہلاتا ہے۔ خانوادہ اپنا نائب یا خلیفہ تو بنا سکتا ہے لیکن کسی کو خانوادہ نہیں بنا سکتا۔۔ خانوادگی تو صرف امام سلسلہ ہی عطا کرتا ہے۔

اُس کے بعد ہر نگران نے اپنے اپنے مراقبہ ہال کے حوالے سے رپورٹ پیش کی اور مسائل بتائے۔

اُس روز شام تک مراقبہ ہال خالی ہو گیا۔ چند ایک مہمان یہ سوچ کر وہاں رہ گئے کہ اب انہیں اب حضور کے پاس بیٹھنے اور اُن کی باتوں کے گوہر آبدار چننے کا موقع ملے گا۔

شام کو محفل سجی۔ حضور چارپائی پہ تکیے سے کمر ٹکائے۔۔۔ نیم دراز۔۔۔ بائیں بازو کو سر کے پیچھے رکھے اُسے دائیں ہاتھ سے تھامے رنگ برنگی روشنیوں والے قمقموں کو دیکھ رہے تھے۔

فرمایا۔ یہاں تو ماورائی ماحول لگتا ہے۔

مرید کھسک کر آگے ہوا اور لطائف کی بابت دریافت کیا کہ ان کے بارے میں اتنا کچھ پڑھ کر بھی تصور واضح نہیں ہو پا رہا۔

فرمایا۔ دراصل کسی اطلاع کی نزولی اور صعودی حرکات ہی لطائف ہیں۔ لطائف کی رنگینی سے مراد ہے کہ لاشعوری تحریکات کو کس درجہ پر کس قدر وضاحت سے وصول کیا جاتا ہے۔ پیر و مرشد شعور سے بعد کے تصور کو لطائف سے اور اُس میں گہرائی کو رنگینی سے واضح کرتا ہے۔ پیر و مرشد اصل میں صرف مرید کے لطیفہ نفسی کو رنگین کرتا ہے۔۔۔ اُس کی اتنی صفائی کرتا ہے کہ وہ صیقل ہو جائے۔۔۔ ورنہ جو کچھ سامنے آئے گا اُس میں آمیزش ہو گی۔ جب لطیفہ نفسی کے رنگین ہونے یعنی اُس کی صفائی مکمل ہونے سے پہلے لطیفہ قلبی رنگین ہو جائے یعنی کام کرنا شروع کر دے اور اُس کی تحریکات شروع ہو جائیں۔۔۔ تو آدمی شیطان کو فرشتہ دیکھتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔۔۔ ایک مثال غلام احمد قادیانی بھی ہے۔۔۔ وہ شیطان کو فرشتہ ہی سمجھتا رہا۔

فرمایا۔ نزولی کیفیت میں ذات کا عرفان ہوتا ہے جب کہ صعودی میں صفات کا۔ پھر اس بات کی وضاحت پھول کی مثال دے کر فرمائی کہ پھول کا ادراک ہونا کہ یہ گلاب ہے۔۔۔یہ پھول کی ذات کا عرفان ہوا اور یہ سُرخ رنگ ہے۔۔ایسی خوشبو ہے۔۔۔اس میں کانٹے ہیں وغیرہ یہ سب اُس کی صفات کا عرفان ہوا۔

فرمایا۔ بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس کے لاشعور پردے میں چلا جاتا ہے۔۔۔بیس سال کی عمر تک دھول پڑتی رہتی ہے۔۔۔یہاں تک کہ پردہ پوری طرح لاشعور کو اپنی اوٹ میں لے لیتا ہے۔اسی دھول کی صفائی کرنا مرشد کا کام ہوتا ہے۔اگر یہ صفائی یکدم کردی جائے تو انسان یک دم بچے کی حالت میں واپس چلا جاتا ہے۔یہ صورت جذب کہلاتی ہے اور جب آہستہ آہستہ یعنی بتدریج اس پردے کو باریک جالی کی مانند کردیا جاتا ہے تو اُس میں سے لاشعور بھی جھلکتا رہتا ہے اور شعور بھی کام کرتا رہتا ہے۔اس پردے کو بالکل ختم کرنا مقصود نہیں ہوتا۔۔۔بلکہ اس کو لاشعور سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔

کسی نے مراقبہ کی سند قرآن کے حوالے سے مانگی تو فرمایا۔ یومنون بالغیب سے مراقبہ ہی کا مفہوم تو نکلتا ہے۔

مرید نے نجم و شجر کے سجدہ کرنے کی بابت دریافت کیا کہ اس کی اصل صورت کیا ہوتی ہے؟

فرمایا۔اللہ کی حاکمیت کو مان لینا ہی سجدہ ہے۔

کسی نے اخاف ربہ کے حوالے سے خوف کی وضاحت مانگی تو فرمایا۔اس کا کیا مطلب ہوا؟ کیا لاخوف علیھم کی موجودگی میں اخاف ربہ قرآن میں اختلاف اور تضاد ہے؟

اللہ میاں کو کبھی کسی ولی، نبی یا رسول نے غصے یا جلال کی حالت میں نہیں دیکھا۔۔۔ باپ کی، پیار کرنے والے کی یا مرشد کی صورت میں ہی دیکھا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ میاں غصے میں تھے۔ پھر نہ جانے یہ اسلام میں اللہ سے ڈرنے کا چکر کہاں سے چل گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر کسی نے بچوں کے حوالے سے کچھ دریافت کیا تو فرمایا۔ والدین کو بچوں کے سامنے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ اُن سے جھوٹا وعدہ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ اُن سے اتنا وعدہ کریں جتنا نبھا سکیں۔ ایسی باتیں بچوں پہ دوررس اثرات ڈالتی ہیں۔

فرمایا۔ خود میرے والد نے مجھ سے جھوٹ بول کر قرآن حفظ کرایا کہ تم قرآن حفظ کر لو گے تو میں تمہیں پہاڑ پہ لے جاؤں گا۔۔۔ پھر جب میں نے قرآن حفظ کر لیا تو انہیں یاد ہی نہیں تھا کہ انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی ایسا وعدہ بھی کیا تھا۔

فرمایا۔ انسانی آنکھ سورج کو دیکھتی ہے۔۔۔ اس کا مطلب ہوا کہ یہ آنکھ نو کروڑ میل تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔۔۔ چاند چوبیس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ انسان اُسے بھی دیکھتا ہے مگر انسان نے خود کو چوبیس فٹ تک دیکھنے پر محدود کیا ہوا ہے۔

سائنسدانوں نے ستارے تو دیکھ لئے مگر کوئی ایسی دوربین نہ بنا سکے جس سے فرشتہ یا جنات نظر آ سکیں۔

دراصل انسان کے دیکھنے کی حد بہت ہی زیادہ ہے۔

مرید نے عرض کی۔ حضور یہ 'میں' کیونکر ختم کی جا سکتی ہے؟

فرمایا۔ بھئی میں نہیں ہو گی تو کام کیسے چلے گا۔۔۔ کھانا آپ نے کھایا۔۔اب آپ یہی کہیں گے نا کہ کھانا میں نے کھایا۔۔۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کھانا شاہین نے کھایا۔۔ہاں البتہ انانیت نہیں ہونی چاہئے۔کام کر کے خوشی ہوتی ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ میں نے یہ کام کیا البتہ اس پہ غرور نہیں کرنا چاہئے۔

پھر کہا۔ خوش رہنے والے دنیا چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ ابراہیم بن ادھمؒ اور بدھا نے یہی تو کیا۔ جب انہیں پتہ چل گیا کہ خوشی کیا ہے تو وہ بادشاہت چھوڑ گئے۔ ادھمؒ نے بادشاہت چھوڑی اور دریا کنارے جھونپڑی ڈال کر بیٹھ گئے۔

بدھا کے بارے میں پیشگوئی تھی کہ اگر اُس نے ناخوشی دیکھی تو وہ دنیا چھوڑ جائے گا۔اُس کے باپ نے یہ انتظام کیا کہ وہ ناخوشی کا کوئی منظر نہ دیکھ سکے۔۔۔ لیکن جب اُس نے دیکھ لیا تو وہ سچی خوشی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ناخوشی جنت سے دوری ہے اور جنت سے دوری اُس کو ختم کرنا تھی۔

اللہ نے بھی کیا انتظامات کئے۔۔۔ پہلے اُسے ناخوشی سے دور رکھا۔۔۔اگر دور نہ رکھتے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا عادی ہی ہو جاتا۔ بھئی اللہ تعالیٰ بہت ہی بڑے ہیں۔ اب دیکھیں موسیٰؑ کو فرعون کے ہاں پرورش کروا دیا۔ تاکہ فرعون کا رعب اُن کے ذہن سے نکل جائے۔

فرمایا۔ انسان صبر نہیں کرتا۔ ان اللہ مع الصابرین۔۔۔ یعنی اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور صبر نہ کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہے۔ یعنی جب آپ جلد بازی کرتے ہیں تو اللہ آپ سے دور ہٹ جاتا ہے۔

ہر کام ایک سسٹم کے تحت ہوتا ہے۔۔۔بندہ خود اٹھارہ سال میں جوان ہوتا ہے اور جوان ہو کر کہتا ہے میرا کام ابھی ہو جائے۔۔ بھئی کیسے ہو جائے۔۔۔ یا تو تم خود اٹھارہ کی بجائے دو سال میں جوان ہو جاتے تو جو کام سال میں ہونا چاہئے وہ ایک مہینے میں ہو جائے۔انسان ظالم ہے جاہل ہے اور جلد باز ہے اور اس کا نقصان بھی خود اُسی کو ہے۔آپ غصہ کرتے ہیں۔۔آپ کی عمر کم ہو جاتی ہے۔۔۔کس کا نقصان ہوا۔۔۔یہ خود پہ ظلم ہی ہوا نا۔

پھر چند ایک لطیفے سُنا کر محفل برخاست کر دی اور اُٹھ کر عرفان صاحب کے ہمراہ گھر چلے گئے۔

اگلے روز صبح اُٹھ کر اُس نے آستانے میں بیٹھ کر مراقبہ کیا۔آج مرشد کریم مراقبہ ہال نہیں آئے تھے۔مراقبہ سے فارغ ہو کر وہ مراقبہ ہال کے اندر ٹہلتا رہا۔گیٹ کی ڈیوٹی پہ متعین صاحب نے اُسے کہا کہ وہ چائے کا کچھ انتظام کرتے ہیں اتنی دیر وہ وہیں گیٹ کے قریب رہے تاکہ اگر کوئی آ کر گھنٹی بجائے تو گیٹ کھولنے میں تاخیر نہ ہو۔

اتنی دیر میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔وہ گیٹ کی طرف چل دیا۔گھنٹی بجی۔۔اُس نے گیٹ کھولا تو عرفان صاحب نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔ابا تو نہیں آئے؟اُس نے نفی میں سر ہلایا۔وہ بنا کچھ کہے۔۔کچھ سوچتے ہوئے۔۔پلٹے اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔اُس نے گیٹ بند کیا اور کچن کی طرف چل دیا۔وہاں جا کر چائے پی۔۔اُس وقت وہاں دو تین اصحاب ہی تھے۔

کچھ دیر بعد کسی نے آ کر بتایا کہ حضور تشریف لا چکے ہیں۔۔۔اپنے کمرے میں ہیں اور سب کو بلا رہے ہیں۔انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ انداز میں دیکھا کہ وہ کب آئے؟ابا کے کمرے میں پہنچے۔تو فرمایا۔میں تو بہت دیر کا آیا ہوا ہوں۔خالہ کئی روز سے فرمائش کر رہی تھیں کہ آپ اپنی آواز میں کچھ ٹیپ کر کے دے دیں۔آج آیا تو تلاوت اور کچھ باتیں ریکارڈ کی ہیں۔۔آئیں سنیں۔

مرید نے کمرے کے اندر اتاری گئی جوتیوں کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ حضور نے کبھی کمرے کے اندر جا کر جوتے نہیں اتارے اور پھر جب وہ صبح ٹہلتے ہوئے حضور کے کمرے کے پاس سے دو تین بار گزرا تھا تو اُس وقت کمرے میں اُن کی موجودگی کا کوئی احساس کیوں نہیں ہو سکا تھا اور اگر وہاں کوئی گاڑی آئی تھی تو وہ خود کہاں سوئے ہوئے تھے کہ انہیں خبر تک نہ ہو سکی۔۔۔ پیشتر اس کے وہ کچھ کہتا ٹیپ ریکارڈر سے مرشد کریم کی مخصوص وجد آفرین آواز میں تلاوت کی آواز ابھرنا شروع ہو گئی اور پھر کسی کو یہ خیال ہی نہ رہا کہ وہ ابا حضور کی وہاں اس طرح اچانک امد اور اپنی بے خبری کی وجوہات کھوج سکے۔

تلاوت کے بعد وقت اور تاریخ بتا کر لاہور، پشاور، اٹک اور فیصل آباد سے آئے مہمانوں کا تذکرہ کرنے کے بعد مرکزی مراقبہ ہال کی مستانہ وار وجد آفرین کیفیات، آستانہ میں روشنیوں کے جھماکے ہونے اور اُس کو فرشتوں کی آمد و رفت کی علامت ہونے۔۔ قلندر باباولیا کے دربار کے لگنے۔۔ وہاں سے احکامات صادر ہونے کا حال بتانے کے بعد۔۔۔ حضور قلندر باباولیاءؒ کی تصویر اور تصویر میں باباصاحب کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے نور کے سمندر کا تذکرہ فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرمایا کہ اُن آنکھوں کے اندر جھانکنے سے نظر مقام ابراہیم پر جا ٹکتی ہے۔ حاملانِ عرش سے لے کر مقربین اور ملائے اعلیٰ کے فرشتوں تک کے نظر آنے کی بات کرنے کے بعد بیان کیا گیا:

ہر عظیمی کے اندر ایک ہی روح رواں دواں ہے۔ جسم و بدن جدا ہونے کے باوجود یہ سب ایک ہی جاں ہیں۔ جب کوئی عظیمی بچہ مراقبہ ہال کے کسی گلاب کے سامنے رُکتا ہے تو گلاب کا چہرہ کھل اُٹھتا ہے اور اُس میں رونق دوڑ جاتی ہے۔۔۔ اور وہ مست ہو کر فضا میں اپنی خوشبو گھول دیتا ہے۔

ٹیپ ختم ہوئی تو سب نے بہت تعریف کی تو بھولپن سے فرمایا۔۔ وہ جو چاہتے ہیں کہلوا دیتے ہیں ہم تو لوڈ سپیکر کے بھونپو ہیں۔

مرید نے دیکھا کہ اتنے میں حضور کے جوتے کمرے سے غائب ہو چکے تھے۔اُس نے کسی کو وہ جوتا اُٹھا کر باہر لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔۔۔شاید وہ کچھ زیادہ ہی منہمک ہو کر ٹیپ شدہ باتیں سُن رہا تھا اور اس دوران کسی نے ہاتھ بڑھا کر انہیں دروازے سے باہر کر دیا تھا۔

پھر حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کا رات رات بھر تکوینی امور کی انجام دہی میں مصروف رہنے اور صبح صبح اپنے چائے بنا کر انہیں پلانے کی بات بتا کر کہا۔وہ چائے کے عادی تھے مگر جب وہ چودہ سال کی رفاقت کے بعد ہمارے یہاں سے اپنے گھر گئے تو چائے چھوڑ دی۔

پھر اپنے سگریٹ پینے اور حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کے حکم پر انہیں چھوڑنے کا تذکرہ کیا۔ سگریٹ چھوڑنے کے بعد شروع شروع میں تو اتنا لپکا تھا کہ جب کوئی سگریٹ پیتا تو میں اُس کے قریب ہو کر بیٹھ جاتا کہ کچھ دھواں سانس کے ساتھ اندر چلا جائے۔ پھر بعد میں جب دانتوں میں تکلیف ہوئی تو ڈاکٹر نے کہا کہ آپ نے سگریٹ چھوڑے ہیں مگر دانتوں میں نکوٹین جم گئی ہے اگر آپ نے سگریٹ دوبارہ شروع کئے تو سارے دانت جھڑ جائیں گے۔

میں نے سوچا کہ دانت تو یوں بھی ایک نہ ایک دن گرنا تو ہیں۔۔۔ میں مرشد کریم کے حکم کی سرتابی کیوں کروں۔۔ لہذا دانتوں کو گرنے دیا۔ کھانا کھا رہا ہوتا تو دانت ہاتھ میں آ جات۔۔ سو کر اُٹھتا تو دانت گرے ہوئے ملتے۔

پھر فرمایا کہ جو دوسروں سے اپنی بات منواتے ہیں وہ انڈیپنڈنٹ ہوتے ہیں اور جو دوسروں کی بات مانتے ہیں وہ ڈیپنڈنٹ ہوتے ہیں۔انڈیپنڈنٹ آدمی جب چاہے کسی کو چھوڑ سکتا ہے۔

پھر ارشاد ہوا کہ لباس در حقیقت جنت میں آدم کی نافرمانی کی یاد ہے۔اگر آپ نے جنت میں جانا ہے تو کپڑے اتار دیں۔کچھ توقف بعد دوبارہ کہا۔ہاں۔۔ہاں اتار دیں۔مرید کے ساتھ ساتھ ساتھ باقی افراد نے بھی چشمِ تصور سے خود کو لباس سے آزاد کرتے دیکھا لیکن اُس کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہ کر سکے۔

فرمایا۔آپ لباس اتار ہی نہیں سکتے۔۔آپ لباس میں قید ہیں۔۔۔یہ لباس ہی شعور ہے۔لباس اتارنا لاشعور میں داخل ہونا ہے۔لباس نہیں تو شعور نہیں۔۔۔شعور نہیں تو جنت ہی جنت ہوئی نا۔

محفل برخاست ہوئی تو اُس کو ایک بار پھر سے حضور کے مراقبہ ہال آنے اور خود گیٹ کے قریب رہنے کے باوجود ان کی امد کی خبر نہ ہو سکنے کا اچنبھا شروع ہو گیا۔اُس نے اقبال بھائی سے بات کی تو وہ مسکرا کر طرح دے گئے۔اُس نے اُن سے پوچھا کہ ابا کے جوتے کمرے میں پڑے تھے۔کیا وہ آپ نے اُٹھا کر باہر رکھے تھے؟انہوں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔وہ وہاں باہر ہی تھے ابا نے کبھی جوتے کمرے میں نہیں اتارے۔وہ ٹہلتا ہوا کمرے کی دوسری جانب کھڑکی کے قریب گیا۔اس کو حضور کی کمرے میں موجودگی محسوس کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔تو صبح وہاں سے کئی بار گزرنے کے باوجود وہ اس بات کو نوٹ کیوں نہیں کر سکا تھا۔وہ الجھ ہی رہا تھا کہ اُس کو خیال گزرا۔جو بندہ زمان و مکاں کے مفرضہ ہونے کا سبق اپنے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے پڑھ چکا ہو۔۔

کیا وہ اس کو آزماتا اور برتتا نہ ہوگا۔۔۔اور اس دلیل پہ اُس کا ذہن شانت ہوتا چلا گیا۔

اُس کے بعد جب وہ قلندر شعور کی کلاس میں بیٹھا۔۔۔اپنے مراد کو۔۔اُس کلاس کے طلبا کو اختتامی لیکچر سے نوازتے سُن رہا تھا۔۔تو وہ ہر بات کو سُن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔

آپ نے فرمایا۔اللہ نے ہمیں توفیق دی۔ ہم نے قلندر شعور اسکول کا افتتاح کیا اور کتاب قلندر شعور کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ ہم نے جو کچھ پڑھا۔۔وہ مختصراً کچھ یوں ہے کہ ہر انسان کو اللہ نے اسی طرح پیدا کیا جس طرح دوسری مخلوق پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے تمام اعمال اور حرکات میں انسان کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہم عمر کے تعین کے لحاظ سے بھی انسان کو ممتاز قرار نہیں دے سکتے۔ اگر ہم ماں باپ کی شفقت کے حوالے سے دیکھیں تو سب ہی جانور اپنی اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں۔

انسان کو اگر کوئی فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف شعوری ارتقا کے حوالے سے ہے۔انسان کے علاوہ کسی اور جانور میں ہمیں شعوری ارتقا نظر نہیں آتا۔ بکری آج سے لاکھوں سال پہلے بھی پتے کھاتی تھی۔۔۔وہ آج بھی پتے ہی کھاتی ہے۔اُسے گھر کی ضرورت تب بھی نہ تھی اور آج بھی اُسے گھر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

انسان اور دوسری مخلوقات میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ انسان میں بار بار تبدیلی آتی ہے۔کسی کیڑے، کسی پرندے، کسی جانور کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں۔ جانوروں بلکہ انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں اُن کے شعور منجمد ہیں۔اُن کے شعور کا دائرہ معین ہے۔ وہ آپس میں لڑتے ہیں۔۔۔ کھاتے پیتے شادی بیاہ کرتے،اولاد کی خواہش اور اُس کی پرورش کرتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اُن کے اندر شعوری ارتقا نہیں ہے۔

پھر ارتقا کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ خیالات کی ایک رو دماغ پر مسلسل اور متواتر پڑ رہی ہے۔آدمی چاہے یا نہ چاہے۔۔۔یہ خیالات نازل ہوتے رہتے ہیں۔کچھ خیالات زندگی کو چلانے کے لئے ہوتے ہیں اور کچھ خیالات زندگی کو آگے بڑھانے اور سدھارنے کے لئے ہوتے ہیں۔۔۔اسی کو ارتقا کہتے ہیں۔

خیالات کو قبول کرنا یا انہیں رد کرنا۔۔۔۔یہ دو صلاحیتیں ہیں۔انسان کے علاوہ دوسری مخلوق میں خیالات کو رد کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔۔یعنی انسان کے دماغ میں ایک ایسا ریسیونگ سیٹ لگا ہوا ہے کہ وہ موصولہ اطلاعات میں الگ سے ہٹ کر بھی معنی پہناسکتا ہے۔معنی پہنانا۔۔علم کی حیثیت رکھتا ہے۔یعنی انسان انفارمیشن کو قبول کر کے اُن میں معنی پہناتا ہے۔اب اگر اطلاع میں پہنانے والی ایجنسی محدود ہے تو محدود دائرے میں سفر کرے گا اور اگر وہ انفارمیشن کو قبول کر کے گہرائی میں داخل ہو گا تو لامحدودیت میں سفر کرے گا۔

آسمانی مخلوق میں فرشتوں کی حیثیت ایک روبوٹ سے زیادہ نہیں ہے۔اُن کی اپنی کوئی مرضی،اپنی کوئی رائے یا کوئی اختیار نہیں۔جب انسان زمینی شعور سے نکل کر آسمانی شعور میں داخل ہو جاتا ہے تو اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اطلاع میں معنی پہنانے کا اختیار رکھتا ہے۔اس لئے شعوری ارتقا کی بنا پر فرشتوں پر بھی فضیلت حاصل ہے۔آدم کی اسی علمی حیثیت کی بنا پر فرشتوں سے آدم کو سجدہ کروایا گیا تھا۔

انسان کو معنی پہنانے کا علم یعنی اسما کی صفات میں معنی پہنانے کا علم دیا گیا تھا۔اللہ ایک ایسی ہستی جو قادر مطلق ہے۔۔۔پوری کائنات پر کنٹرول رکھنے والی ذات۔۔۔ہر مخلوق کے لئے ایک دائرہ ہے۔۔۔ایک ایسا دائرہ جو ہر طرف سے محیط ہے۔مخلوق اس

دائرے سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔۔اس بات علم رکھنا۔۔یہ بات علم میں ہونا ہی آدم کی فضیلت ہے یعنی آدمی میں اللہ نے ایک ایسا شعور رکھ دیا ہے جو گہرائی میں جا کر نئی نئی باتیں معلوم کر سکتا ہے۔۔۔ایجادات کر سکتا ہے۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں۔۔۔اُس کو زمینی اور آسمانی مخلوقات سے ممتاز کرنے والی ایک صفت رکھ دی گئی ہے اور یہ بھی ہے کہ وہ انفارمیشن کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کو رد کرنے والی ایجنسی بھی رکھتا ہے۔

قلندر کا مطلب ہے ایک ایسا شعور جو دنیاوی شعور میں رہتے ہوئے تمام شعوروں کا احاطہ کر سکے۔ میں یہ کتاب قلندرانہ ذہن سے لکھی۔۔یعنی ایسا ذہن جو کائنات کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کر سکتا ہے۔۔۔جو خود سے بھی آگاہ ہے اور اپنے خالق سے بھی واقف ہے۔ جو خود مسجود کو بھی جانتا ہے اور سجدہ کرنے والے کو بھی اور سجدہ نہ کرنے والے کو بھی۔۔۔وہ صرف سجدہ کرنے والا ساجد ہی نہیں ہے۔

وہ جانتا ہے کہ آدم کی اولاد بھی آدم ہے۔ آدم کی موجود پیدائش نسلی اعتبار سے زمینی شعور کے تابع پیدا ہے یعنی محدودیت میں رہ کر وسائل استعمال کرتی ہے۔ دنیاوی معاملات اُس کی تمام تر توجہ جذب کئے رہتے ہیں۔ ہر آدمی جنت میں نافرمانی کا مرتکب ہو دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔۔۔یعنی ہر آدمی آدم ہے اور ہر لڑکی حوا۔۔۔۔جو شعور ہمیں یہ بتاتا ہے۔۔۔اُس کا رابطہ براہ راست اللہ سے قائم ہوتا ہے۔

وہ دنیا کے محدود شعور سے نکل کر آسمانی لامحدود شعور میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ آزاد بندہ جس کے اندر لامحدود وسعتیں سمٹ آتی ہیں۔۔وہ کپڑوں کے پہننے اور کھانے پینے سے آزاد ہو جاتا ہے کیونکہ وہ خود کو جنت میں دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور جنت میں

یہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ وہ بیٹھا دنیا میں ہوتا ہے لیکن دیکھتا جنت میں ہے۔ وہ بار بار حضور ﷺ کے بیان کردہ ماحول میں داخل ہوتا ہے قلندر شعور حاصل ہونے والے بندے کو ٹائم اسپیس سے آزادی مل جاتی ہے۔

اگر ہماری مادی نظر ایک طرف نو کروڑ میل دور سورج کو دیکھ سکتی ہے تو دوسری طرف ہم چند سو فٹ پر بھی دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔۔۔یعنی جب ہم زمین کو دیکھتے ہیں تو ہم جانوروں کے برابر شعور میں مقید ہو جاتے ہیں۔۔۔ اگر ہم حیوانات سے ممتاز ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے اندر ہر وہ صلاحیت موجود ہونا چاہئے جو زمینی اور آسمانی مخلوقات کے اندر موجود نہیں۔۔۔اور صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم قلندر شعور سے آراستہ ہو اپنی تخلیق کے مقصد کو پالیں۔

لیکچر کے بعد اُس کو اپنے اندر اپنے مراد کا رعب اور اُن پہ فخر کا احساس پہلے سے کئی گنا بڑھا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ جس قدر وہ اُن کی باتوں کو سمجھتا ہے اسی قدر وہ اُس کو پہلے سے زیادہ قد آور، توانا اور جسیم محسوس ہوتے ہیں۔

بعد میں مرید نے جب وہ اپنے مراد کے ہمراہ اُن کے کمرے میں موجود تھا۔۔۔استدعا کی۔ جب یہاں سب ہی کچھ علم ہے تو روح بھی تو ایک طرح سے علم ہی ہوئی۔۔۔ تو پھر قلندر شعور کے مطابق علم الاسماء عطا کئے جانے اور اپنی روح میں سے پھونکنے میں کیا فرق ہے؟

اُس کا مراد گویا ہوا۔ سورج ہر روز طلوع ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مانا سورج کے طلوع ہونے میں ہمارے لئے بے شمار فائدے ہیں لیکن سورج کے ہر روز طلوع ہونے اور غروب ہونے میں کیا حکمت ہے؟ ہم نے غور و فکر کو چھوڑا ہوا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں صاف صاف ارشاد فرمایا ہے۔ میری نشانیوں پہ غور کر کے اُن میں پوشیدہ

حکمتوں اور صلاحیتوں کو تلاش کرو۔ جب بھی کوئی صلاحیت وسائل میں استعمال ہوتی ہے تو ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔ یعنی کوئی بھی ایجاد دراصل صلاحیت اور وسائل کی یکجائی ہے۔

پھر فرمایا۔ ہر چیز دو رخوں سے مرکب ہے۔ ایک اُس کا ظاہر اور دوسرے اُس کا باطن۔ ہر باطن کا بھی ایک باطن ہے جو اللہ ہے۔ یعنی ہر مظہر کسی باطن پر قائم ہے اور باطن کا قیام اللہ پر ہے۔ جب تک انسان اپنے باطن سے روشناس نہیں ہوتا وہ اللہ سے واقف نہیں ہو سکتا۔ غور و فکر اور ریسرچ وہ صلاحیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کو عطا کی ہے اور اسی کے سبب وہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ ایک بکری آج سے لاکھوں سال پہلے جو کچھ تھی وہ آج بھی وہی ہے۔ چونکہ اُس میں غور و فکر اور ریسرچ کی صلاحیت نہیں ہے لہذا وہ ارتقا سے محروم ہے۔ انسان میں یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بنیاد پر اُس کو شرف اور خلافت دی گئی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے مٹی میں ۔۔۔۔۔ جس کی اصل خلا ہے ۔۔۔۔۔ یہ صلاحیت بھر دی تو وہ کائنات میں ممتاز ہو گیا۔ علم الاسما عطا ہونے اور 'اپنی روح میں سے پھونکنے' کا یہی مفہوم ہے۔

بات ختم کر کے وہ خاموش ہو گئے اور آنکھیں موند لیں۔ مرید کو لگا اُس کے دماغ میں ہزار واٹ کا بلب روشن ہو گیا ہے جس کی روشنی اُس کو اپنے وجود کے تاریک گوشوں کو تابناک کرتی محسوس ہوئی۔ علم الاسما اور روح پھونکنے کا یہ مفہوم اُس کے فہم و ادراک کو کچھ ایسا منور کر رہا تھا کہ اُس کو ہر بات نکھری نکھری، اجلی اور روشن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

اگلے روز وہ اُس روشنی کی جوت کو سنبھالے پشاور پہنچ گیا۔ پشاور میں پہلے تو کئی روز وہ خود کو سنبھالنے میں لگا رہا۔ اُس کی ذہنی کیفیات میں کچھ ایسی بات در آئی تھی کہ لوگوں سے اپنے مرشد کریم سے سُنی ہوئی اُن سے سیکھی ہوئی باتیں کرنے میں تو بہت لطف

محسوس کرتا لیکن دنیاداری، کاروبار اور روزگار کی بات وہ ایک دو جملوں میں نپٹادیتا اور جب مخاطب ایک ہی بات کی تکرار کرتا اور اُس کو کئی بار دہراتا تو وہ الجھن اور کوفت محسوس کرتا۔

قلندر شعور سے مراد

اسی طرح تین چار ماہ گزر گئے۔ایک روز نیاز صاحب سے معلوم ہوا کہ قلندر شعور کلاس کا اجرا لاہور میں طے پا گیا ہے اور جون میں کلاس شروع کی جا رہی ہے۔انہوں نے اُس کو خاص طور پر کہا کہ وہ لاہور میں ہونے والی اس کلاس میں ضرور داخلہ لے کیونکہ ابا حضور بنفس نفیس اس کلاس کے طلبا کو پڑھایا کریں گے۔اُس نے داخلے کا طریقہ کار دریافت کیا تو انہوں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔اس کے لئے آپ کو تو ابا حضور سے خصوصی اجازت لینا ہو گی۔۔۔ وہ سر جھکا کر سوچنے لگا کہ کیا وہ فون پہ درخواست کرے یا کراچی جا کر بات کرے۔۔۔ابھی وہ کچھ طے نہ کر پایا تھا نیاز صاحب نے کہا۔۔آپ کیا سوچنے لگے؟ اگر آپ داخلہ لینا چاہتے ہیں تو مجھے بتا دیں میں آپ کا نام بھجوا دوں گا۔۔۔وہ اُن کے مزہ لینے کی اس ادا کو سمجھ گیا اور ڈھیلے پڑتے ہوئے کہا۔۔واہ نیاز بھائی۔۔آپ بھی کمال کرتے ہیں۔۔اگر کا کیا مطلب میں یقیناً داخلہ لینا چاہتا ہوں۔

جون کا سب سے لمبا دن گزار کر پشاور سے کلاس میں شرکت کرنے والوں کے ہمراہ وہ رات کو بس میں بیٹھ کر صبح اذانوں کے وقت راوی کا پل عبور کر رہا تھا۔لاہور سٹیشن کے باہر سے انہوں نے کاہنہ جانے والی ویگن پکڑی اور آہلو روڈ کے کے سٹاپ پہ لگے مراقبہ ہال کے بورڈ کے قریب اتر کر مراقبہ ہال ڈھونڈنے لگے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ ابھی ڈیڑھ دو میل پیدل چلنا ہوا۔رات بھر کے سفر کی تھکن اور صبح کی تازگی کا خمار حواس کا امتحان لے رہا تھا۔کچھ دوستوں نے رائے دی کہ ناشتہ کر لیا جائے۔۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ناشتہ کرنے کی بجائے لسی پی جائے۔ سڑک کنارے بنے کھوکھا نما ہوٹل کے ہاتھ بھر لمبے گلاس سے نپٹ کر۔۔۔ بوجھل ڈگمگاتے قدموں سے میل بھر چلنے کے بعد۔۔۔انہیں ہاتھوں میں پکڑے سامان کا وزن بڑھتا محسوس ہونے لگا۔

دور تک پھیلے کھیتوں کے بیچ گزرتی سڑک پہ اُس پر خمار حالت میں لڑھکتے گھسٹتے پولٹری فارمز اور چاول صاف کرنے کے کارخانے کے پاس سے گزر کر جب انہوں نے جامعہ عظیمی (مراقبہ ہال) کے گیٹ کو دیکھا تو توانائی کی ایک لہر نے اُن کو اپنے قدموں پہ کھڑا کر دیا۔اپنے مراد کے حضور حاضری کے احساس نے گویا اُن کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔

حضور مراقبہ ہال کے وسیع میدان نما لان میں میاں صاحب کے ہمراہ ٹہل رہے تھے۔سب دوست وہیں ڈیوڑھی میں رُک گئے لیکن وہ بے تابانہ آگے بڑھا اور حضور نے دونوں بانہیں کھول کر اُسے سینے سے لگنے کی اجازت اور ادھیکار عطا فرمایا۔خیر وعافیت دریافت کی پھر میاں صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ارے بھئی۔۔۔ان کو ناشتہ کروایئے۔ڈیوڑھی کے دائیں ہاتھ بنے وسیع و عریض ہال نما کمرے میں داخل ہونے سے پیشتر پشاور کے دوستوں نے اُس کی تقلید کرتے ہوئے بڑھ کر حضور سے ملاقات کی۔

ناشتے سے پہلے تک دیگر مراقبہ ہالز سے بھی قلندر شعور کلاس کے کئی طلبا پہنچ گئے۔کچھ لوگ ہاتھ منہ دھو کر اور کچھ افراد نہا دھو کر تازہ دم ہو لئے۔ناشتے کے بعد قلندر شعور کی کلاس کے لئے۔۔۔ڈیوڑھی کے بائیں ہاتھ ابا حضور کے کمرے کے ساتھ بنے ہال میں لگی کرسیوں پہ منتظر بیٹھے افراد اُس وقت احترام سے اُٹھ کھڑے ہو گئے جب حضور کمرے میں داخل ہوئے۔

کرسی مدرس پہ براجمان ہونے کے بعد آپ نے فرمایا۔سب سے پہلے میں آپ کو سلسلہ عظیمیہ کی ترویج اور اُس کے پھیلاؤ کی مختصر روداد سے آگاہ کروں گا تا کہ آپ ذہن میں یہ بات آ جائے کہ جب اللہ تعالٰی کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے لئے وسائل خود بخود ہی فراہم ہو جاتے ہیں۔

میرا تعلق بنیادی طور پر ایک علمی اور دینی گھرانے سے ہے۔جہاں اور بہت سی باتوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا وہاں روحانیت بھی کچھ ایسی ہی بات سمجھی جاتی تھی لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ میں روحانی علوم کی ترویج کروں۔

میری روحانی پیدائش لاہور یعنی پنجاب ہی کی ہے۔ اہلِ لاہور اور پنجاب سے میرا تعلق خاطر بہت پہلے سے ہے۔ حضور قلندر باباؒاولیاءؒشمس آباد کے رہنے والے تھے تو اس وجہ سے بھی اس تعلق میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔۔ اگرچہ میں گزشتہ پچاس سال سے کراچی ہی رہا۔ وہاں ہم دو آدمی تھے ہم وقت کی پابندی کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وسائل فراہم کئے اور آج دیکھ لیں کہ یہ سلسلہ کہاں پہنچ چکا ہے۔ میں نے وسائل میں دخل نہیں دیا یعنی یہ نہیں کیا کہ ایسا ہونا چاہئے یا ویسا ہونا چاہیئے۔ ہم نے ناظم آباد سے آغاز کیا پھر نارتھ ناظم اباد پہنچے پھر اللہ نے سرجانی ٹاؤن میں جگہ دی۔ وہاں رکشہ ٹیکسی بھی نہیں جاتے تھے۔ جب ہم نے پہلی روحانی کانفرنس کی تو دوڈھائی سو کرسیوں کا انتظام کیا۔۔ وہ کم پڑ گئیں۔۔۔ اللہ نے مجھ سے کہلوایا کہ میں ان شاءاللہ ایسا ماحول بنادوں گا کہ اسکول بنیں گے۔۔ کالج بنے گے۔۔۔ میں بچوں کا قاعدہ بناؤں گا۔۔ اک مجذوب کی بڑ کی طرح یہ بھی کہہ دیا کہ بڑوں کے لئے یونیورسٹی بنے گی۔۔ عظیمیہ سلسلے کی پہچان اُن کے علم سے ہو گی۔ میری زندگی میں اگر بیس پچیس ایکٹرز میں مل گئی تو روحانی یونیورسٹی بنادوں گا۔۔ ورنہ یہ کام میری روحانی اولاد کرے گی۔

آپ سوچیں مجھے یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ میں بادشاہ بن جاؤں۔۔۔ میں کوئی کاروبار کروں۔۔۔ مجھے یہی خیال کیوں آتا ہے کہ روحانی یونیورسٹی بنے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے کو روحانی علوم کی ترویج کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس وقت تک ہم پینتالیس مراقبہ ہال اور ۷۲ روحانی لائبریریاں بنا چکے ہیں ویسے میرا ارادہ ہے کہ کم از کم پچاس ہوں۔

مختصراً یہ کہ ہم نے سلسلے کا کام نہایت بے سروسامانی میں شروع کیا لیکن اللہ نے ہر طرح سے وسائل فراہم کئے۔ یہ بات یقین کو مستحکم کرتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے کام کے لئے منتخب کر لیتے ہیں تو وسائل بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی

توفیق کے ساتھ روحانی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم بھی حاصل کریں اور اپنی اولاد کو بھی وہی علم دیں تاکہ وہ ایک مکمل معلم بن سکیں۔ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو نہیں سنبھال سکتا تو وہ کسی کو باہر کیا سنبھالے گا؟ اگر کوئی اپنے گھر نہیں سنبھال سکتا تو باہر کسی کو کیا قائل کرے گا۔ آپ کو سب سے پہلے خود اپنی تربیت کرنا ہے۔

جب شوہر بیوی کا کہنا مانے گا تو بیوی بھی اُس کا کہنا مانے گی۔۔۔ جب بیوی شوہر کے مزاج کے مطابق چلے گی تو شوہر کو بھی اُس کے مزاج کے مطابق چلنا چاہئے۔ جب بیوی کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کچھ لو کچھ دو کا معاملہ ہے تو ساتھ دیتی ہے۔ لیکن اگر میاں بیوی اقتدار کی رسہ کشی میں پھنس جائیں تو اولاد خراب ہو جاتی ہے۔

روحانی علوم کی ان کلاسوں کے پڑھنے سے نہ تو آپ کو کہیں ملازمت ملے گی اور نہ ہی کوئی مالی منفعت ہو گی۔۔ روحانی علوم کا فائدہ یہ ہے کہ آپ محبت کا سمبل بن جائیں گے۔ انبیاء کرام کی طرز فکر حاصل ہو جائے گی۔۔۔ آپ ہر وقت اللہ کو اپنے اندر بیٹھا دیکھ سکیں گے۔۔۔ آسائش کے لئے آپ کو دنیاوی کام کرنا ہیں اور روحانی زندگی کے لئے خود کو علوم سے آراستہ کرنا ہے۔

یہ دنیا ایک ترازو کی طرح ہے۔۔۔ اس کا ایک پلڑا مادی علوم ہیں تو دوسرا پلڑا روحانی علوم ہیں۔ ہر آدمی کا دھیان دنیا کی طرف ہے اور آسائش و آرام کے انبار ہونے کے باوجود ہر آدمی پریشان ہے کیونکہ میزان قائم نہیں رکھا جا رہا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے۔۔۔ وہ چاہتے ہیں عظیمی بندہ اعتدال کے ساتھ روحانی اور مادی علوم حاصل کرے۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔۔۔ یعنی اس آیت میں یہ بات واضح طور پر بتادی گئی ہے کہ اگر دین اور دنیا میں اعتدال نہیں ہے اور دونوں بہتر نہیں ہیں تو عذاب سے نہیں بچا جا سکتا۔

روحانیت میں لازم ہے کہ جو اپنے لئے پسند کریں وہی اپنے بھائی کے لئے بھی چاہیں۔

روحانیت کا دوسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ آدمی میں شک نہ ہو۔ روحانیت کا علان ہے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کا ہے۔ انسان میں غصے کا اصل سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اُس کے اندر اقتدار کی خواہش ہے۔ اگر کسی میں بنیادی کمزوریوں یعنی خود غرضی، سیکس اور غصہ پر غلبہ نہیں ہے تو اُسے روحانیت سے ہٹ جانا چاہیئے۔ ہمیں یہ عہد کرنا ہے کہ ہم ان تینوں کمزوریوں سے لڑیں گے اور اُن کو خود پر غلبہ نہیں پانے دیں گے۔ ہمیں جتنا بھی عرصہ لگے ہم جدوجہد کرتے رہیں گے۔۔۔ بات جدوجہد اور کوشش کی ہے۔

یاد رکھیں انسان صرف دو طرح سے خوش رہ سکتا ہے اس کا کوئی تیسرا طریقہ نہیں ہے۔ پہلا۔۔۔ آپ جن سے وابستہ ہیں۔۔۔ انہیں اپنے مطابق ڈھال لیں اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو آپ خود کو اُن کے مطابق ڈھال لیں۔

کسی علم سے آگاہ ہونا اور اُس علم میں داخل ہو جانا۔۔۔ یہ دو بالکل الگ باتیں ہیں۔ آپ اپنے علم پہ قائم رہ کر روحانی علوم کی بابت جان سکتے ہیں لیکن روحانی علوم کو جاننے کی بنیادی شرط یہی ہے کہ آپ میں جتنی قابلیت ہو۔۔ آپ اُس کو ایک طرف رکھ دیں۔۔ آپ کو اُس سے صرف نظر کرنا پڑے گا۔۔۔ اُس سے کوئی سروکار نہ رکھ کر ہی آپ روحانی علوم سیکھ سکتے ہیں۔

ایک آدمی جس نے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ہو اردو پڑھنے کے لئے۔۔۔ الف بے پے ہی سے آغاز کرے گا ورنہ وہ اردو نہیں سیکھ سکتا۔۔۔ ماں باپ بچوں کو براہ راست نہ بھی پڑھائیں بچے تب بھی اُن ہی کی زبان بولتے ہیں۔ روحانی علوم کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

آپ یہاں سے جو کچھ پڑھ کر جائیں اُسے گھر جا کر ضرور دہرائیں۔۔۔جو عملی کام بتایا جائے وہ کریں۔روحانی علوم میں اب تک پریکٹیکل ہی پریکٹیکل تھا۔۔۔۔جنگل میں بھجوادیا۔۔مزار پہ بیٹھادیا۔۔ان سب باتوں کا ایک ہی مقصد تھا۔۔تاکہ ذہن مادیت سے بیزار ہو کر اُس ایجنسی کی طرف پلٹ جائے جو انسان کی اصل ہے۔حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے وہ علم جو اللہ نے آدم کو فرشتوں کے سامنے عطا کیا۔۔اُس کو پہلے تھیوری بنادیا اور پھر پریکٹیکل کروایا۔

اس وقت نوع انسانی کا شعور بہت زیادہ بالغ ہے۔۔اب سے پچاس سال پہلے کا شعور ایسا تھا۔۔۔میں آپ کو اپنی مثال دیتا ہوں۔۔۔میرے خالو ایک ریڈیو لے آئے۔ہم پریشان کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔پہلے ہم سمجھے کہ اس کے اندر آدمی بند ہے۔۔۔پھر میری خالہ نے بتایا کہ یہ آواز تاروں کے ذریعے دہلی سے آرہی ہے۔میرے جذبے میں مرکزیت پیدا ہوئی اور میں دہلی پہنچ گیا تو وہاں ریڈیو اسٹیشن میں تاروں کو دیکھ کر میں نے زور سے کہا۔خالہ اماں میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔

بالغ شعور میں کوئی آدمی آنکھیں بند کر کے نہیں چل سکتا۔پہلے زمانے میں جو باتیں خرق عادات اور کرامت کے زمرے میں آتی تھیں وہ آج کے معمولات ہیں۔

مجھ سے حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ بات فرمائی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام چاہتے ہیں کہ روحانیت عام ہو۔ابن عربی نے لکھا ہے کہ جو علوم میں پیش کر رہا ہوں اُن کے بارے میں کوئی نہیں سمجھ سکتا لیکن میرے بعد ایک ایسا آدمی آئے گا جو اس کو سمجھائے گا۔۔۔ہو سکتا ہے کہ اُن کی پیشگوئی حضور قلندر بابا اولیاءؒ ہی کے بارے میں ہو۔

آپ کو یہ علم اس طرح سیکھنا ہے کہ آپ کے سامنے صرف آپ کی اپنی ذات نہ ہو۔۔۔آپ کو اپنے بچوں کی تربیت اس طرح کرنا ہے کہ وہ روحانی علوم سیکھیں۔۔۔آپ کا اخلاق ایسا ہو کہ لوگ دیکھ کر بتا سکیں کہ آپ کا تعلق عظیمیہ سلسلے سے ہے۔

یہ جو روحانی کلاسز بنائی گئی ہیں یہ سب علم لدنی کے زمرے میں آتی ہیں۔۔۔جو بندہ بھی علم لدنی سیکھنے کی طرف قدم بڑھاتا ہے اُپر اللہ کی خاص رحمت ہوتی ہے۔۔۔اس علم کے سیکھنے میں ہمارا مقصد اللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہئے۔

لیکچر ختم کیا اور اُٹھ کر ہال سے باہر چل دیئے۔نہ جانے کیوں کسی کو جرات نہ ہو سکی کہ اُن کے ہمراہ باہر نکلتا۔دروازے پہ میاں صاحب اُن کے ہمراہ ہو کر اُن کے ساتھ کمرے میں چلے گئے۔

دوپہر کا کھانا آنے میں ابھی وقت کچھ لوگ وہیں کرسیوں پہ ڈھیر ہو گئے اور کچھ دوسرے کمرے میں جا کر چٹائیوں پہ لیٹ گئے۔ گرمیوں کی دوپہر، رات بھر کا سفر، تھکن، لسی کا خمار اور اب حضور مرشد کریم کے لیکچر کی نورانیت۔۔۔سب کے حواس لرز رہے تھے۔ وہ کہنا کچھ چاہتے تھے اور منہ کچھ اور تھا۔۔۔ڈاکٹر اکمل، فاروق اور اسلم صاحب سے باتیں کرتے اُس کی آنکھیں مندھ گئیں اور وہ وہیں چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔

آہٹ ہوئی تو دیکھا کہ کھانے کے لئے دستر خوان بچھ رہا ہے۔۔۔مدہوشی میں چنے کی دال کا پلاؤ کھاتے ہوئے۔۔۔ناصر بھائی کو اس بات پہ جز بز ہوتے دیکھ رہا تھا کہ چاول بالٹیوں میں کیوں تقسیم ہو رہے ہیں۔۔۔اُس نے سوچا کہ اِس میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔یہاں اس ویرانے میں کیا یہی کم ہے کہ چاول پک ہیں اور اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے کہ وہ ڈش میں آئیں یا بالٹی میں۔۔۔لیکن بات بڑھ گئی اور انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔۔۔پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بالٹیاں ہٹالی گئیں اور چاول پراتوں میں لائے گئے۔ناصر صاحب بتا رہے تھے حضور نے کئی بار کہا ہے کہ انسان خود کو جہاں چاہے ایڈجسٹ کر لے۔۔۔آپ نے نوٹس نہیں لیا۔۔۔میں نے نوٹس لے لیا۔۔۔ورنہ یہ یونہی چلتا رہتا بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس بات کو سند بنا لیتے کہ حضور اباجی کے ہوتے بالٹیوں میں لا لا کر چاول تقسیم ہوتے رہے اور انہوں نے منع نہیں فرمایا لہذا سلسلہ عظیمیہ میں لنگر بالٹیوں ہی میں بٹنا ضروری ہے۔

آپ دیکھ لیں۔۔۔اب یہ پراتیں کہاں سے نکل آئیں۔

اگلے ہفتے وہ دوبارہ اسی طرح حاضر تھے۔انتظامات میں قدرے نکھار تھا۔ میاں صاحب اور اُن کی ٹیم کے افراد مستعدی کے نئے زاویے دکھا رہے تھے۔ کلاس میں پانی کا چھڑکاؤ بھی کیا گیا تھا اور دو زائد پنکھے بھی لگا دیئے گئے تھے۔ مرشد کریم نے لیکچر کا آغاز کیا پہلے کتاب کے نام کی شرح فرماتے ہوئے کہا۔ قلندر شعور نام یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہر آدمی کے اندر ایک شعور۔۔۔ایک طرزِ فکر کام کرتی ہے۔۔۔شعور ایک ایسی ایجنسی ہے جو آنے والے خیالات کو ملحوظ مطلب معانی پہناتی ہے۔ ایک ایسی ایجنسی جو نیوٹرل نہیں ہوتی یعنی اس کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ضرور ہوتا ہے۔

علوم کے تین دائرے ہیں۔۔ طبعیات، نفسیات اور روحانیت۔ موجودہ علوم کی روشنی میں طبعیات اور نفسیات علم کے وہ دو دائرے ہیں جن کے بغیر کوئی آدمی دنیاوی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔ طبعیات کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق ایک مخصوص دائرہ عمل میں زندگی گزارے۔۔۔اس دائرے میں دو مخلوق۔۔انسان اور حیوانات کا کردار زیادہ اہم ہے۔ انسان کا یہ دعویٰ کہ وہ حیوانِ ناطق ہے یعنی بولنے والا حیوان ہے۔ یہ دعویٰ نہ صرف بے بنیاد ہے بلکہ محض ایک مفروضہ ہے کیونکہ سبھی حیوانات بولتے بھی ہیں اور آپس میں بات چیت بھی کرتے ہیں۔۔۔۔ خوشی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ شیر آجائے تو بندر پیٹ پیٹ کر شور کر کے ایک دوسرے کو خبردار بھی کرتے ہیں۔

جتنے بھی چوپائے ہیں اُن کی آوازیں الگ الگ ہیں۔۔ مرغی اُس وقت ایک مخصوص آواز نکالتی ہے جب اُس کے چوزوں کو کوئی خطرہ لاحق ہو یعنی مرغی کے بچے نہ صرف مرغی کی آواز سنتے ہیں بلکہ سمجھتے بھی ہیں کیونکہ وہ فوراً دوڑ کر ماں کے پروں کی پناہ لے لیتے ہیں۔ اب یہ کہنا کہ انسان ہی حیوان ناطق ہے ایک خود فریبی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

انسان کا دوسرا دعویٰ کہ وہ باشعور ہے اور عقل کا استعمال جانتا ہے۔۔۔ بھی غلط ہے۔آپ ایک حقیر سے کیڑے شہد کی مکھی سے زیادہ عقل نہیں رکھتے۔۔شہد کی مکھی کو وحی کی جاتی ہے لیکن انسانوں میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو یہ سعادت حاصل ہوئی؟

طبیعات کے دائرے میں رہتے ہوئے نفسیاتی تقاضے تو مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مادی تقاضوں میں سب مخلوقات ایک اشتراک رکھتی ہے۔آدم وحوا سے لے کر آج تک۔۔۔انسانی ارتقا کے باوجود کوئی انسان حیوانات سے ممتاز ہونے کی سند پیش نہیں کر سکتا۔انسان کا شعور محدود ہے وہ آج تک کوئی ایسی ایجاد نہیں کر سکا جو اُس نے شعوری حدوں سے باہر کی ہو۔۔۔اُس میں وسائل کی پابندی نہ ہو۔پرندوں کو اُڑتے دیکھ کر انسان نے اُڑنے کے وسائل کھوجے پرندوں کے گھونسلے اور چوہوں کے بل دیکھ کر یعنی انسانی عقل حیوانی عقل کے تابع ہو کر ایجادات کرتی ہے اپنے لئے گھر اور رہنے کی جگہیں بناتی ہے۔چیونٹی پہ قرآن کی ایک سورۃ کا نام سورہ نمل ہے۔انسان کے پاس اپنے ممتاز ہونے کی کوئی سند نہیں ہے۔

ہمارا شعور ہمیں محدود کرتا ہے اور ہم اس محدودیت کو آزادی کا نام دے کر خود کو دھوکا دیتے ہیں۔۔۔ایک طرف وہ آزاد ہونا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہ خود کو چار دیواری میں مقید رکھتا ہے اور اس کو تحفظ کا نام دیتا ہے۔دراصل شعور محدودیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔اب تک انسانی شعور کا صرف پانچ فی صد حصہ ہی بیدار ہو سکا ہے۔باقی کب ہو یہ کوئی نہیں جانتا۔ویسے انسان کے شرف کا انسان کے شعوری ارتقا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

انسان دوسری مخلوقات سے اللہ کے حکم کے مطابق ممتاز ہے لیکن یہ شرف کسی بھی طور شعور کی بنیاد پر نہیں ہے۔انسان کے فرمان کے مطابق یہ شرف اُس علم کی بدولت ہے جو فرشتوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔لیکن یہاں یہ حال ہے کہ انسان جرم کرتا ہے اور مجرم کو پکڑنے کے لئے انسان کتوں کا محتاج ہے۔۔یہ کیسا شرف ہے؟

پھر فرمایا کہ ایک شعور وہ ہے جو ہمیں ہر قدم پہ پابند رکھتا ہے۔۔۔اس شعور کے تحت ہر حس۔۔۔خواہ وہ بولنے کی حس ہو، سننے کی حس ہو، دیکھنے، سونگھنے اور چھونے کی حس ہو۔۔۔شعوری طور پر پابند ہے۔۔۔اس کا ایک تعین ہے۔

انسان جبلی طور پر حیوانات سے قدرے آگے ہے۔جانوروں کی طبیعات پہ غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ وہ جبلت کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔بھوک کے بارے میں بکری کی جبلت ہے کہ وہ گھاس کھاتی ہے۔۔۔شیر کی جبلت گوشت کھانے کی ہے۔۔۔انسان سبھی کچھ کھاتا ہے۔۔گوشت بھی، پتے بھی، مٹی اور پتھر بھی۔۔۔کھانے پینے کے بارے میں انسان کو پابند نہیں کر سکتے۔لیکن دیگر جبلی تقاضوں میں انسان میں اور حیوانات میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ محض اس فرق کی وجہ سے وہ حیوانات سے ممتاز ہو گیا ہے۔جبلت کے اس فرق کی وجہ سے وہ ممتاز نہیں ہو سکتا۔انسان کا شرف اس بات کو ضروری بنا دیتا ہے کہ وہ حیوانات سے ممتاز ہو کر اپنا شرف ثابت کرے۔انسان گوشت کو پکا کر کھانے کے باوجود پیٹ کے امراض میں مبتلا ہوتا ہے جب کہ جانور کچا گوشت کھا کر بھی بیمار نہیں ہوتے۔

پھر آپ نے **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم ردونہ اسفل سافلین** والی آیت پڑھ کر فرمایا۔ انسان تو جانوروں سے بھی کم تر ہے۔جبلت کے حوالے سے انسان اور حیوان برابر نہیں ہیں۔جب بھی انسان نے عقل کا استعمال کیا۔۔۔جینئس لوگ زیادہ ہو گئے۔۔۔انہوں نے فساد برپا کیا۔۔جانوروں نے کبھی فساد نہیں کیا۔

انسان نے رفتار کو زیادہ سے زیادہ کر کے وقت کو کم کر لیا اس کے ثمرات بھی ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوئے۔ ایک سپر پاور ایک ہتھیار بنا کر دعویٰ کرتی ہے کہ اب ایک منٹ میں ایک لاکھ آدمی مر جائیں گے دوسرے نے پانچ لاکھ آدمی مارنے کا بندوبست کر ڈالا۔۔۔ تیسرا اس سے زیادہ افراد کو لقمہ اجل بنانے کا دعویٰ کر رہا ہے۔۔ آپ اس کو ترقی کہتے ہیں۔ اس تمام ترقی کے پیچھے تخریب، مالی منفعت اور لالچ کے سوا کچھ نہیں۔

موجودہ دور شعور، ترقی اور محیر العقول ایجادات کا دور کہلاتا ہے۔۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان ایجادات کے ثمرات بلڈ پریشر، کینسر جیسے موذی امراض ہیں اور ان کا علاج اول تو ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو اس مہنگا کوئی دوسرا علاج نہیں۔ عقل و شعور کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایک مخصوص گروہ نے وسائل پہ اپنا تصرف قائم کرنے کے لئے یہ سب ہتھکنڈے ایجاد کئے ہیں۔ وہ دوسروں کے شعور کو اجاگر اپنا باجگزار بنانے کو ہی ترقی مانتے ہیں۔

اس شعور سے۔۔۔ اس پابند شعور سے نکلنے کے لئے غیر جانبداری سے جائزہ لیں تو وہ نہ صرف اپنی ذات سے دور ہو گیا ہے بلکہ اپنے خالق سے بھی دور ہٹا ہوا ہے۔ شعوری ارتقا ہوا تو ہے لیکن اُس کی سمت درست نہیں رہی۔۔ اس شعوری ارتقا کے پیچھے ایک شعور دائرہ بن گیا ہے۔ قلندر سے مراد غیر جانبدار زاویے سے سمجھنے والا۔۔۔ ایک آزاد طرزِ فکر رکھنے والا۔۔ محدودیت میں رہتے ہوئے لامحدودیت میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھنے والا بندہ ہے۔

محدود شعور کو متحرک کرنے کا طریقہ کم ہی لوگ جانتے ہیں مثلاً کوئی نہیں جانتی کہ وہ کیوں زندہ ہے۔۔۔ کس وجہ سے زندہ ہے؟ ایک آدمی مرتا ہے تو اُس کے آس پاس ہزاروں آدمی ہوتے ہیں تو صرف ایک کیوں دم توڑ دیتا ہے۔

یہ ایک سوال ہے کہ اگر آدمی آکسیجن پر زندہ ہے۔۔۔پانی پر زندہ ہے۔۔۔تو کیا اُس ایک بندے کے لئے ہوا یا پانی ختم ہو جاتے ہیں؟ نہیں۔۔۔وہ تو اُس کے مرنے کے بعد بھی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ہمارے دانشور آج تک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ ہم تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی کیوں مر جاتے ہیں؟

ہمارا محدود شعور اس بات سے واقف نہیں کہ ہم کیوں زندہ ہیں۔۔۔مر کیوں جاتے ہیں۔۔۔زندگی کی توانائی کہاں سے آتی ہے؟

کیلوریز کا فلسفہ بھی اس وقت غلط ثابت ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جیسی خوراک کھانے والے دو افراد کے وزن یکساں نہیں ہوتے۔

قلندر شعور سے مراد ہے ایک ایسا شعور جو زندگی کی Equation سے واقف ہو، جن فارمولوں پہ زندگی کا قیام ہے وہ اُن فارمولوں سے آگاہ ہو۔۔۔جو یہ جانتا ہو کہ انسان پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھا۔۔۔اور مرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے۔اس دنیا میں آنے سے پہلے وہ کن حالات میں تھا اور کن حالات سے گزر کر یہاں پہنچا ہے اور یہاں سے جانے کے بعد وہ کن حالات سے گزرے گا۔

قلندر شعور کا نام رکھتے وقت میرے پیشِ نظر میرے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ تھے جن کی آزاد طرز فکر سے میں اس کتاب کو لکھنے کے قابل ہوا۔آزاد طرزِ فکر سے واقف ہوئے بغیر انسان اپنا شرف تلاش نہیں کر سکتا۔قلندر شعور کے مطابق اگر کوئی انسان محدود شعور سے نکل جائے تو وہ یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ اس دنیا سے باہر کیا ہے؟ عالم جنات کیا ہے؟ عالم ملکوت کیا ہے؟ عالم

جبروت ولاہوت کیا ہیں؟ قرآن میں جس کو "سلطان" کہا گیا ہے وہ ایک ایسا علم اور ایک ایسی طرزِ فکر ہے جو زمین و آسمان کے کناروں سے نکل سکتا ہے۔۔ورنہ تو انسان مقید اور محبوس ہی ہے۔

زمین نام ہی ایک ایسے شعور کا ہے جو محدود ہے اور اللہ نے اسی محدودیت سے نکلنے کا راستہ بتانے کو ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ سلطان کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔

انسان جب تک زمینی شعور سے آراستہ رہتا ہے وہ یہ تک نہیں جانتا کہ زمین کے اندر کیا ہے؟ بالکل ویسے ہی جیسے انسانی جسم کے اندر گوشت پوست اور خون کی ترسیل ہے۔۔۔کوئی سائنسدان یہ نہیں بتا سکتا کہ دل کیوں دھڑکتا ہے؟ ڈیڑھ لاکھ کلو میٹر طویل شریانوں اور وریدوں میں کون سی توانائی خون کو گردش میں رکھے ہوئے ہے۔ جن چیزوں کی بنیاد پر وہ زندہ ہے وہ اصل میں کیا ہیں؟

اس محدود شعور کا نام زمین ہے۔ آسمان بھی شعور کی محدودیت کے مختلف درجے ہی ہیں۔ وہ صلاحیت جو ہمیں اس محدود شعور سے نکال کر لامحدود شعور سے آشنا کر سکتی ہے اس کا نام قلندر شعور ہے۔

ساری ریسرچ رفتار پر استوار ہے۔ اگر شعور کی رفتار بڑھا کر اتنی زیادہ کر دی جائے کہ وہ شعور ہی نہ رہے تو اُس کو اس محدودیت سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ ہمارا شعور ٹھس بیل ہے۔ آرام طلب ہے۔۔ذاتی مفاد کے علاوہ وہ کام ہی نہیں کرتا۔ اس عادت کے خلاف جب انسان اپنی ذات سے ہٹ کت نوعِ انسانی کے لئے خدمت خلق کا شعبہ قائم کرتا ہے۔۔تو اس شعور کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔

انسان میں لچک بہت ہے۔ جب وہ پیدال چلتا ہے تو اُس کو چلانے والی ایجنسی اتنی سُست ہو جاتی ہے کہ وہ ایک گھنٹے میں دو تین میل ہی چل سکتا ہے۔ جب وہ گاڑی میں سفر کرتا ہے تو وہ ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ سفر کر لیتا ہے اور جب وہ ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے تو یہ رفتار ہزار پانچ سو فی میل گھنٹہ تک ہو جاتی ہے۔ اس ایجنسی یعنی اس صلاحیت میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ ہر طرح کے حالات سے مطابقت پیدا کر لیتی ہے ورنہ پیدل چلنے والی ایجنسی کی رفتار اگر جہاز کی رفتار کے مطابق پھیل نہ سکے تو اُس کا دماغ پھٹ جائے۔

اس کے بعد آپ نے کتاب قلندر شعور پہ بات کا آغاز فرمایا اور کہا۔ اس کتاب کی شروعات اللہ کے ذہن سے نکلے ہوئے لفظ 'کن' سے ہوتی ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو ایک ذات تھی۔ اُس ذات نے ایک پروگرام کو پورے خدوخال کے ساتھ۔۔ نقش و نگار کے ساتھ۔۔ معین مقداروں کے ساتھ۔۔۔ درجہ بندی کے ساتھ تشکیل دینے کے بعد۔۔۔ حکم دیا۔۔۔ ہو جا۔۔۔ یعنی حرکت میں آنے کے لئے تیار ہو جا۔

ایک کتاب المبین کہہ کر شعور کو خبردار کیا جا رہا ہے۔۔ اس پر ضرب لگائی جا رہی ہے۔ شعور ایک سے بھی واقف ہے اور کتاب سے بھی۔۔۔ اور مبین سے بھی۔۔۔ یعنی ایک ایسی کتاب جو روشنیوں سے بھری ہوئی ہے۔ گویا ایک طرح سے شعور کو مادیت سے نکال کر روشنیوں کی طرف دھکیلا گیا ہے۔۔ اُس کو محدودیت سے لا محدودیت کی طرف دھکیلا گیا ہے۔

کتاب کہہ کر شعور کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ کتاب میں صفحات ہیں۔۔ یعنی اُسے ایک دستاویز کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔۔ ایک کتاب المبین۔۔۔ یعنی ایک ایسی دستاویز جس پر نورانی تحریر نقش ہے۔۔ ایک ایسی کتاب جس کا تعلق الفاظ سطروں اور صفحات سے تو ہے لیکن یہ سب نور کے غلاف میں ملفوف ہیں۔۔۔ وہ روشن تحریر جس روشنی سے لکھی گئی ہے وہ سب کا سب نور ہے اور اُس

نور میں اللہ کا وہ پروگرام ہے جو کن سے پہلے اللہ کے ذہن میں تھا۔۔۔یعنی شعور کی سطح کو بلند کرتے ہوئے اُسے زمینی شعور سے نکال کر آفاقی سطح میں داخل کر دیا گیا ہے۔ کن کے مظہر بننے میں پہلی بات ایک دستاویز کا بننا ہے۔ جب آپ کن اور کتاب المبین پہ غور کریں گے تو یہ باتیں آپ کی سمجھ میں آ جائیں گی۔۔رفتہ رفتہ سہی لیکن آئیں گی ضرور۔

پھر آپ نے سب کو۔۔۔کتاب المبین کائنات یکجائی پروگرام ہے۔۔۔ہوم ورک کے طور پر سوچنے اور حاصل غور و فکر کو تحریر کرنے کا حکم دیا۔ ساتھ میں شعور کی محدودیت اور کتاب المبین کی بابت جو کچھ بتایا گیا ہے اُس کو اپنے الفاظ میں مختصراً لکھ کر لانے کا بھی کہا۔

اسی طرح ایک کلاس سے پہلے مرید کو بتایا کہ اللہ نے نزولِ وحی کے وقت وحی کو یاد کرنے سے حضور ﷺ کو منع فرمایا کہ آپ یادداشت پہ زور نہ دیں۔۔۔ہم آپ ﷺ کو خود یاد کرا دیں گے۔۔۔آپ ﷺ صرف متوجہ رہا کریں۔۔۔انسان کو کچھ بھی یاد نہیں ہوتا اُس کو تو صرف متوجہ رہنا آنا چاہیئے۔

فرمایا پانی جب تک گلاس میں ہے اُس کی ایک شکل ہے۔۔ایک صورت ہے ایک عکس ہے۔۔اُس میں ٹھہراؤ ہے۔ آپ اُس گلاس کو دیوار پہ دے ماریں۔۔۔پانی میں انتشار آ گیا۔ منتشر ہونے سے پہلے اُس ٹھہراؤ میں ایک ہی صورت تھی۔۔۔ایک نام تھا۔۔۔انتشار کے سبب دیوار پر کئی طرح کی صورتوں اور ناموں میں ڈھل گیا۔

ناخن پہ پٹی لگا رہے تھے۔۔۔دریافت کیا تو فرمایا۔ ناخن پھٹ گیا ہے۔۔۔پھر مسکراتے ہوئے اپنی مخصوص ظرافت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔۔۔اس کے لئے کوئی جوڑنے والا سلوشن ہوتا تو وہ لگا لیتے۔

مرید نے بقراطی جھاڑی کہ ناخنوں پہ بکری کا دودھ لگانے سے وہ پھٹتے نہیں ہیں۔

فرمایا۔ جی ہاں بکری کے دودھ کے اور بھی بہت فائدے ہیں۔۔ بکری کو ٹی بی کے مریض کے قریب باندھنے سے۔۔۔ بکری کی بو سے ٹی بی کے مرض میں افاقہ ہوتا ہے۔۔اس کا مزاج سرد تر ہے اور گرمی میں فائدہ دیتا ہے۔اس کے علاوہ اور بہت سے فائدے ہیں۔انبیا نے بکریاں چرائیں۔۔۔ سلسلے میں چھ ماہ کا یہ ٹریننگ پروگرام ہونا چاہئے کہ سلسلے کے لوگ چھ ماہ تک بکریاں چرایا کریں۔

اسی طرح کلاسیں ہوتی رہیں۔ پھر گرمی کا زور ٹوٹتا چلا گیا۔اب شام کو مراقبہ ہال کی کھلی فضا میں سردی کا احساس ہونا شروع ہو چکا تھا۔ پھر ایک روز وہ اپنے مرشد کریم کے ہمراہ لاہور ہائی کورٹ بار جا رہا تھا۔وہاں وکلا حضرات نے اُن کا لیکچر سنا۔۔سوال جواب کی نشست ہوئی۔

آپ نے لیکچر کا آغاز اس بات سے کیا کہ جب بھی ہم انسان اور اُس کی صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو ساتھ ساتھ زمین پہ پھیلی ہوئی دوسری لاتعداد مخلوقات کا بھی تذکرہ آتا ہے۔ جس طرح تخلیقی مراحل سے گزر کر انسان اس دنیا میں آتا ہے اس طرح دیگر تمام مخلوقات بھی تخلیقی مراحل سے گزرتے ہیں۔۔پیدا ہونا۔۔۔جوان ہونا۔۔۔بوڑھا ہونا اور مر جانا۔

آج ہم اس بات پہ غور کریں گے کہ سب کچھ یکساں ہوتے ہوئے انسان کا شرف کیا ہے؟انسان بیدار رہتا ہے پھر تھک کر سو جاتا ہے۔۔یہ مجبوری حیوانات میں بھی ہے۔انسان عقل استعمال کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔۔بہت سارے جانور ایسے ہیں جو عقل میں انسان سے برتر ہیں۔

پھر آپ نے اس ضمن میں چند ایک مثالیں دینے کے بعد فرمایا کہ انسان میں ایک ایسی ایجنسی ہے جو اُس کو علم سکھانے میں معاون ہے۔۔یہی علم اور یہی ایجنسی وہ ہے جس کی بنا پر انسان کو شرف حاصل ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم سکھایا۔۔ان علوم کو اللہ نے علم الاسما کہا ہے۔۔اسی علم کی بنیاد پر فرشتوں نے آدم کی برتری کو قبول کیا۔۔۔اور آدم کو سجدہ کیا۔اب وہ علم کیا ہے جس کی بنا پر انسان کو شرف حاصل ہے؟

اب ایک علم یہ ہے جو ہم سیکھتے ہیں۔۔۔اس کو سیکھ کر کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے۔۔کوئی وکیل بن جاتا ہے اور کوئی سائنسدان۔ اسی طرح ایک علم وہ ہے جو ہمیں اُن دنیاؤں کے بارے میں بتاتا ہے جو انسان کے عام مشاہدے میں نہیں ہیں۔

اس علم کے مطابق خیال کا انا۔۔ایک اطلاع ہے۔ہم پانی پیتے ہیں۔۔اگر خیال نہ آئے تو ہم پانی نہیں پی سکتے۔اسی طرح ہم دفتر جاتے ہیں، سوتے ہیں، جاگتے ہیں، کھاتے اور دیگر کام کرتے ہیں۔۔۔یہ سب تقاضے ہیں۔۔۔ان تقاضوں کی بابت اطلاع دماغ پر وارد ہوتی ہے۔

یہ اطلاع کہاں سے وارد ہوتی ہیں۔۔۔یہ اطلاع ہمیں ہماری روح دیتی ہے۔ہماری روح ہی اصل انسان ہے۔اگر انسان کے اندر روح نہیں تو وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔۔انسان کے اندر اگر روح ہے تو اس کے اندر حرکت ہے۔موت کے بعد یعنی جب روح اس جسم کو چھوڑ دیتی ہے تو سب اعضاء ہونے کے باوجود انسان کسی بھی قسم کی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔

اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو انسان اور دیگر مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔۔اس ضمن میں وہ بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہیں۔۔۔اس بات کو اب مزید دھیان سے سمجھنا چاہیئے۔

ہر انسان لباس پہنتا ہے۔لباس کو جسم انسانی سے الگ کرکے۔۔اُس کو حرکت نہیں دی جاسکتی۔ہمارا مادی جسم ہمارے لباس کی مانند ہے۔یہ ہماری روح کا لباس ہے۔جب تک ہماری روح اس لباس کو پہنے رہتی ہے۔۔اس کو سنبھالے رکھتی ہے۔۔۔یہ جسم حرکت کرتا ہے۔

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ روح کیا ہے؟روح میرے رب کے امر سے ہے۔روح اللہ کا امر ہے۔۔۔روح کی بابت علم قلیل ہے۔اللہ کا علم لا محدود ہے۔۔۔تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلم بن جائیں تو بھی اللہ کی باتوں کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔اس لا محدود علم کا جزو اور قلیل بھی لا محدود ہی ہوتا ہے۔

روح امر رب ہے۔۔۔اور امر رب یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کن کہہ کر اُس کو وجود بخش دیتا ہے۔جب اللہ نے کن کہا تو روح بنی۔۔۔اور فیکون کی صورت میں اُس کا مظاہرہ ہوا۔اللہ نے عالم ارواح میں پوچھا کیا نہیں ہوں میں تمہارا رب۔۔۔تو روحوں نے اقرار کیا اور کہا جی ہاں۔۔۔آپ ہی ہمارے رب ہیں۔روح جو ہماری اصل ہے۔۔۔وہ روح اللہ کی ربوبیت کا اقرار بھی کر چکی ہے۔۔۔اُس کو دیکھ بھی چکی ہے۔ہمارا مادی جسم اسی روح کے تابع ہے۔انسان کا مادی جسم دو نمبر ہے روح ہی ایک نمبر جسم ہے۔جب آدم کو علم الاسما سکھائے تو آدم علیہ السلام کو منتقل ہونے والے علوم، خصوصیات اور نقوش اُس کی نسل کو بھی منتقل ہو رہے ہیں اور یہ وہی علوم ہیں جن کی بنیاد پر انسان کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔

آج کا سائنسدان اگر روح نہیں۔۔۔اگر اُس میں حرکت نہیں۔۔۔اگر اُس میں اوپر سے آنے والی انسپائریشن کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں تو وہ ایجاد کیسے کر سکتا ہے؟سائنسدان جو کچھ بھی کرتا ہے اسی روح ہی کی بنیاد پر کرتا ہے۔اب وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے یا یہ ایک الگ بات ہے۔

قرآن پاک میں معاد۔۔۔ علم غیب۔۔۔۔یعنی غیب کی دنیا کو جاننے کے لئے غور و فکر کو لازمی قرار دیتا ہے۔اللہ کی نشانیوں پر تفکر کرنا اسلامی تعلیمات کا جزو اعظم ہے۔اگر ہم اسلامی تعلیمات پہ گہرائی میں غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ سب انتظام ہمیں اپنی روح سے واقف کروانے کے لئے کیا گیا ہے۔مثلاً جب ہم نماز قائم کرتے ہیں اور اُس میں ہمیں یکسوئی حاصل ہو جائے تو ہم اپنی روح کے قریب ہو جاتے ہیں۔جب تک آپ کی ذہنی صلاحیت ایک نکتے پر مرکوز نہ ہو جائے آپ کوئی بھی کام نہیں کر سکتے۔اگر آپ کا دھیان اور توجہ کیس پہ نہ ہو تو آپ کیس کی تیاری نہیں کر سکتے،اپنے موکل کے دفاع کا کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں نہیں آ سکتا۔اگر کوئی جج توجہ سے آپ کی بات سُن رہا ہو تو وہ درست فیصلے پہ نہیں پہنچ سکتا۔

ایک طریقہ اسلامی تعلیمات پر غور و فکر کر کے روح سے آشنائی پیدا کرنا ہے اور دوسرا طریقہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کا اتباع کر کے اپنی روح سے واقف ہونا ہے۔آپ ﷺ نے تین سال تک غارِ حرا میں اللہ کی نشانیوں پہ غور و فکر کیا۔۔۔اتنا عرصہ ذہن ایک ہی نکتے پہ مرکوز رہا تو اللہ نے گروہ ملائے اعلیٰ کے فرشتے حضرت جبرائیل علیہ اسلام کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا اور وہ **اقرا بسم ربک الذی خلق** کا پیغام لے کر آپ کے پاس آئے۔

ہم نے اس بات کو بنیاد بناتے ہوئے غور و فکر کرنے کے نظام مراقبہ پہ کام کیا ہے۔اس کے باقاعدہ سلپس مرتب کئے ہیں۔ مراقبہ یعنی(Meditation)کی باقاعدہ کلاسیں منعقد کر کے انسان کو اپنی روح کا کھوج لگانے کا طریقہ سکھا رہے ہیں۔انسان کے اندر کھوج ہو تو وہ ہر چیز کو تلاش کر لیتا ہے۔

آپ ایک جگہ اور وقت متعین کر کے اس بات پہ غور و فکر کریں گے کہ کیا ہمارے جسمانی مادی وجود کی کوئی اصل ہے؟اگر ہے تو وہ ہوا ہے، پانی ہے، غذا ہے۔۔۔تو ہم اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ اس مادی وجود کی اصل یہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک طاقت

ہے۔۔۔ایک توانائی ہے۔۔۔یہ طاقت یا توانائی ہمیں ہماری روح مہیا کرتی ہے۔اس طاقت اور توانائی کی اصل روح ہے۔ یہ سب روح ہے۔انسان روح سے اُس کی حرکت سے واقف نہیں ہے تو وہ بے سکون رہتا ہے۔۔۔مال و دولت کے باوجود وہ بے سکون اور بے آرام رہتا ہے۔ اگر انسان کی زندگی میں سکون نہیں ہو گا تو وہ بیمار ہو گا۔۔۔خوش رہنے والے بندے کی صحت اچھی رہتی ہے۔ ہم سب کچھ ہونے کے باوجود بے سکون اور بے چین کیوں ہیں کیونکہ ہم اپنی اصل روح سے واقف نہیں ہیں۔

اگر ہم عرفان حاصل کرنے کی جدوجہد نہیں کریں گے تو سکون اور خوشی حاصل نہیں ہو گی۔۔۔روح کا ادراک حاصل کریں تو اللہ سے دوستی ہو جاتی ہے۔۔۔ذکر کرنے سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔خانقاہی نظام کے تحت مادی وجود کی نفی کر کے اصل وجود سے واقف اور آگاہ ہونے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ انسان اپنے اندر جاری روحانی تحریکات سے مسلسل اور مستقل طور پر آگاہ رہ سکے۔

اللہ کو پہچاننے اور اللہ سے دوستی کرنے کا راستہ یہ ہے کہ آپ غور کریں۔۔ جس قدر انہماک ہو گا اُسی مناسبت سے روح کے علوم آپ پر آشکار ہوں گے۔ ہم سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ سورج تو سبھی مخلوقات کو روشنی فراہم کرتا ہے۔ وہ کسی کو اپنی ضیا پاشیوں سے استفادہ کرنے سے منع نہیں کرتا۔۔۔ایسا نہیں ہے تو پھر تو سورج کا بنی آدم کے لئے مسخر ہونے کا کیا مطلب ہے ؟ اگر ہم غور کر کے۔۔۔ تفکر کر کے۔۔۔آدم کے اس ورثے کو حاصل کریں گے تو سورج سے متعلق تمام علوم ہم پر واضح ہو جائیں گے۔

مسلمان جیسے جیسے غور و فکر سے دور ہوتے گئے۔۔اُن پر علوم کے دروازے بند ہوتے چلے گئے اور وہ دنیا میں پست ہوتے چلے گئے۔ اب اگر وہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں آدم کے ورثے کو کھوجنے کے لئے غور و فکر کرنا ہی ہو گا۔

اپنی روح سے۔۔۔اپنے رب۔۔۔اپنے اللہ سے واقفیت پیدا کرنے کے سفر کے آغاز کرنے کو آپ نے انہیں نیلی روشنی کا مراقبہ کرنے کا طریقہ بتا کر اپنے خطاب کو سمیٹ دیا۔

سوال جواب کی اجازت ملنے پر کئی وکلا نے سوال دریافت کئے۔ایک صاحب نے پوچھا۔کیا روح کا کوئی تشخص ہوتا ہے اور کیا وہ تشخص قائم رہتا ہے اور کیا اُس سے کوئی رابطہ کیا جا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں آپ نے وضاحت فرمائی کہ روح کا ایک تشخص ہوتا ہے اور اُس کی بنیاد اللہ کی صفات ہیں جیسا کہ اللہ تعالٰی نے خود بیان فرمایا ہے کہ میں نے انسان کو اپنی صورت پہ پیدا کیا ہے۔یعنی انسان میں اپنی صفات کا عکس پیدا کیا ہے۔اسی لئے اللہ کی صفات کو جاننے اور کھوجنے کا حکم بار بار دیا گیا ہے تا کہ انسان اپنی روح کی خفتہ صلاحیتوں سے واقف اور آگاہ ہو سکے۔جہاں تک روح کے تشخص سے رابطے کا تعلق ہے تو وہ اسی بات سے ثابت ہے کہ اہلِ قبور کو سلام کہنے کا حکم حدیث شریف سے ثابت ہے۔پھر یہ بات بھی بتائی کہ خواب کا جسم یعنی انسان کا وہ جسم جو حالت خواب میں متحرک ہوتا۔وہ روح سے بہت قریب۔

ایک اور سوال یہ پوچھا گیا کہ نارمل حالات میں روح کو خوش گوار بنانے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟اس پہ آپ نے سوال میں غلطی کی نشاندہی کرنے کی بجائے اُس کو اپنی مخصوص مسکراہٹ کی اوٹ میں لیتے ہوئے فرمایا۔روح کو خوش کرنے کا طریقہ بہت آسان ہے۔روح ہر اُس چیز سے خوش ہوتی ہے جس سے اللہ خوش ہوتا۔

ایک اور وکیل صاحب نے جرح کی۔اگر انسان جبلت کے تحت زندگی گزار رہا ہے تو پھر انبیا علیہ السلام کی تعلیمات کس کے لئے ہیں؟

آپ نے بُرا منائے بغیر فرمایا۔ اگرچہ انسان جبلت کے ہاتھوں پابند ہے تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو جبلت پہ کنٹرول کا اختیار بھی تو دیا ہے۔ پھر اس کی دلیل یہ ارشاد فرمائی کہ غصہ بھی ایک جبلت ہے لیکن انبیا نے غصہ نہیں کیا۔

ایک اور بہت دلچسپ سوال یہ دریافت کیا گیا۔ روح کا ایمان سے کیا تعلق ہے؟

اس کے جواب میں آپ نے اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ بتائی کہ انبیا کرام کے علوم کے مطابق زندگی ہونا ہی ایمان ہے۔ زندگی نہ ہو تو ایمان بھی زیرِ بحث نہیں آسکتا۔

محفل کا اختتام ہوا تو بیشتر وکلا کے اندر دور کرتی اطمینان کی لہریں واضح طور پہ محسوس ہو رہی تھیں۔

لاہور سے واپس پشاور پہنچ کر وہ اپنے مرشد کریم سے سُنی ہوئی باتوں پہ غور کرتا۔ اُن کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا۔ اس طرح اپنے آموختہ کو دہراتا اور اس کو اپنے اندر اتارنے جدوجہد کرتا۔ جب لوگ اُس کی باتوں میں دلچسپی لیتے تو اُس کو اچھا لگتا اور وہ مزید کھلتا چلا جاتا۔

ایک روز اُس نے مرشد کریم سے فون پر بات کی۔ انہوں نے روزگار اور کاروبار کی بابت دریافت کیا۔ اُس نے کہہ دیا کہ آج کل کام دھندا تو ہے نہیں دب بھر ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور دن تمام کرتے ہیں۔

فرمایا۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ ایک دوسرے کی صورت تو دیکھتے ہیں۔۔۔ بھئی یہ بھی کوئی آزمائش ہی ہو گی۔۔ آپ فکر نہ کریں اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ پھر فرمایا۔ شیر بہت بن لئے اب بکری بن جائیں۔۔ گوشت کھانا چھوڑ دیں۔۔ اللہ خیر کرے گا۔

خیال اور برزخ

وقت کو جیسے پر لگ گئے ہوں۔۔۔ حضور مرشد کریم نے کئی بار فرمایا تھا کہ خوشی میں وقت کی رفتار تیز ہو جاتی ہے جبکہ غم اور پریشانی میں وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ اُسے لگتا تھا کہ چند روز پہلے ہی تو اُن سے بات ہوئی اور پھر معلوم ہوا کہ انہیں عرس میں شرکت کرنے کراچی جانا ہے۔ وہ عرس سے چند روز پیشتر ہی کراچی پہنچ گیا۔ سٹیشن سے سیدھا مراقبہ ہال آیا۔

کراچی مراقبہ ہال پہنچ کر اُسے ایک عجیب سا احساس یہ ہوا جیسے وہ وہاں سے کچھ ہی دیر پہلے گیا تھا حالانکہ چھ سات ماہ گزر چکے تھے جب ابا حضور انگلینڈ جا رہے تھے اور وہ اُن سے ملنے آیا تھا۔ کیاریوں میں پھول پہلے سے بہت زیادہ اور خوب بڑے ہو چکے تھے۔ گملوں کو رنگ کیا جا رہا تھا۔ کیوریوں کے حاشیے بن رہے تھے۔ آستانے کی سجاوٹ ہو رہی تھی۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر ابھی سامان اتار ہی رہے تھے کہ مراقبہ ہال سے حضور باہر تشریف لے آئے۔ حامد صاحب، کامران باسط اور غفار صاحب اُن کے ہمراہ تھے۔ بہت تپاک سے اُسے سینے سے لگایا۔ چاہین کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ بچوں سے مل کر کہا۔ آپ لوگ چل کر پہلے ناشتہ کر لیں پھر ملتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ ابا انہیں عرس کے انتظامات کی بابت ہدایات دیتے۔۔۔ جاتے دیکھتے رہے۔ اُن کی تو جیسے عید ہو گئی۔ پہنچتے ہی ملاقات ہو گئی۔ دو رات ایک دن کے ٹرین کے سفر کی ساری تھکن ہوا ہو گئی۔

سامان استقبالیہ کمرے کے پاس برآمدے میں چھوڑ کر وہ سیدھا کچن پہنچے۔ کچن کے انداز پہلے کی نسبت کافی بہتر محسوس ہوئے۔ سب سے ملتا ملاتا۔۔ ناشتہ کر کے کامران صاحب سے ملا۔ انہوں نے خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اُن کو رہائش کے لئے کمرے کا بتایا۔ جب مہمان آئیں گے تو مردوں کو مسجد جانا ہو گا۔ خواتین کا قیام وہیں مراقبہ ہال ہی میں رہے گا۔ فی الحال وہ بچوں کے ہمراہ مراقبہ ہال ہی میں قیام کر سکتا ہے۔

شام کو شاہین نے بتایا کہ امی حضور تشریف لائی تھیں اور انہوں نے انہیں گھر پہ مدعو کیا ہے اور آج رات کھانا وہیں کھائیں گے۔ شام کو مراقبہ کر کے اب حضور بھی گھر جائیں گے شاید کچھ اور مہمان بھی ہوں گے۔

شام کو وہ حضور مرشد کریم کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں نجمہ صاحبہ بھی موجود تھیں۔ اُن میں حضور کے لئے عقیدات و وارفتگی کا عجب امتزاج تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اُن کی موجودگی میں مرشد کریم اُن کے علاوہ کسی اور کو توجہ نہ دیں۔۔۔ باقاعدہ جز بز ہو کر پاؤں پٹخ کر اپا پہ اپنا ادھیکار جماتیں۔ مرشد کریم کبھی اُن کا مان بڑھاتے اور کبھی طرح دے جاتے۔

حضور مرشد کریم جب یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی اُن کی محبت کا دم بھرتا ہے تو وہ اُس کے اس جذبے کو تعمیری انداز میں استعمال کرنے پر راغب کرتے ہیں۔ اُس سے سلسلے کا کوئی کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اُس کی حوصلہ افزائی اس انداز میں فرماتے کہ وہ خود کو اہم بھی گردانتا ہے اور کار آمد بھی۔ اپنی روحانی اولاد کی تربیت کو اُن میں روحانی تشخص ابھارنے سے پہلے اُن کے اندر پڑی نفسیاتی گرہوں کو سلجھاتے ہیں۔ انہیں اخلاقی قدروں سے آشنا کرنے کے ساتھ مختلف موقع پر جسم کردار اور ذہانت کے استعمال کا طریقہ بھی تعلیم فرماتے ہیں۔

اُس وقت اپنے گھر کی اوپری منزل کے فرش پہ دیوار کے ساتھ رکھے تکیہ سے کمر لگائے فرما رہے تھے۔ اس بار میں انگلینڈ جن کے یہاں ٹھہرا وہ مجھے ایک دعوت پہ اپنے ساتھ لے گئے۔ جن کے گھر گئے وہ صاحب مجھے اپنے عالی شان ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود اپنے شغل میں مصروف ہو گئے۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا تو میں کرسی گھما کر۔۔۔ اُن کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ شاید انہیں کچھ احساس ہوا۔۔ وہ میرے پاس آئے اور کہا۔ میں نے آپ کو اتنے قیمتی قالین پہ بٹھایا اس کی قیمت اتنی ہے۔۔۔ یہ صوفہ اتنے کا

ہے۔۔۔یہ کرسی اتنے کی ہے۔۔۔میں نے اُن کو کہا۔۔یہ قالین کتنا بھی قیمتی ہو بہر حال پیروں کے نیچے رہتا ہے اور جس چیز کا مقام پیروں کے نیچے ہو وہ بیش قیمت ہو کر بھی قیمتی نہیں رہتی۔

اسی طرح ایک بار میں ایک محفل میں گیا۔لوگ میرا مذاق اُڑانے کے موڈ میں تھے۔میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔وہ سب اصرار کرتے رہے کہ میں کچھ بولوں لیکن میں خاموش ہی رہا۔جب اُن کا اصرار بڑھا تو میں نے شرط رکھی کہ اگر آپ میری بات خاموشی سے سنیں گے تو میں کچھ کہوں گا ورنہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔جب سب نے ہامی بھر لی تو میں نے اپنی بات کہہ دی۔

فرمایا۔گھبراہٹ میں خاموش ہو جانا چاہئے۔یہ بھی ہے کہ خاموشی جہالت کا پردہ ہے۔آدمی خاموش رہے تو اُس کی لاعلمی پردے میں رہتی ہے۔

مرید نے سوچا انہوں نے یہ سب باتیں فرما کر کس قدر غیر محسوس انداز میں اُس کی اُن تمام الجھنوں کا حل تجویز فرمادیا جن کی بابت خود اس کا اپنا شعور اندھیروں میں تھا۔گھبراہٹ پہ قابو پانے کی تگ و دو کرنے کا کیا مجرب اور تیز بہدف حل فرمایا۔ایک چپ سو کو ہرائے۔

یہ بات بھی بتائی کہ لوگوں کا مزاج اُن شہروں کے مزاج کے تابع ہوتا ہے۔یعنی ہر شہر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔کسی شہر کے لوگوں کا مزاج اُس کے شہر کے مزاج کے تابع ہو گا۔ہاں البتہ کسی جگہ کا موسم وہاں کے لوگوں کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔اگر کسی علاقے کے لوگوں کے مزاج میں شدت پسندی ہو تو وہاں کا موسم بھی شدید ہوتا ہے۔آپ دیکھ لیں ایک ہی ملک کے مختلف

حصوں میں ایک سا موسم نہیں ہوتا۔ موسم گرما میں کہیں گرمی کم اور کہیں زیادہ تو اسی طرح سرما میں کہیں سردی زیادہ ہوتی ہے تو کہیں کم۔

پھر یورپی ممالک کے لوگوں کے یقین کے پیٹرن کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اگر بیوی کسی مرد کے ساتھ بیٹھی گفتگو کر رہی ہو تو شوہر کمرے سے باہر جاتے ہوئے خود ہی دروازہ بند کر دیتا ہے اور یہ بات وہاں کے آداب میں شامل ہے۔ اصل میں وہاں وسوسے بھی تو نہیں آتے۔

شاہین نے اچانک کہا۔۔ابا۔۔ مقصود ڈبل روٹی نہیں کھاتے۔۔۔کہتے ہیں اس میں خمیر ہوتا ہے۔۔۔ جس سے گیس پیدا ہوتی ہے۔

فرمایا۔ آپ چپاتی بنا کر دیا کریں۔۔۔زیتون کا تیل لگا کر۔۔۔ لہسن کی چٹنی کے ساتھ کھلایا کریں۔

پھر اُسے مخاطب ہو کر فرمایا۔ چند ہی روز میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔۔ بلڈ پریشر وغیرہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ساتھ میں خون کی حدت کم کرنے کے لئے لوکی کا جوس آدھا گلاس روزانہ نہار منہ چالیس روز تک پینا بھی مفید بتایا۔

شاہین نے کہا۔۔۔جی ابا۔۔۔ لہسن کی چٹنی تو بہت مزے کی ہوتی ہے۔ میں نے کئی بار بنائی ہے۔

عجیب سے لہجے میں فرمایا۔ آپ میرے پاس رہیں تو میں آپ کو پانی سے روٹی کھانا سکھا دوں۔

مرید جو آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔۔اُن کا انداز تکلم اور لہجہ سُن کر سہم گیا۔ سیدھا ہو کر دوزانو ہو گیا اور سر جھکا کر عرض کی۔ کیا پانی میں ڈبو کر کھاتے ہیں؟

فرمایا۔ نہیں۔۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس پاس رکھیں۔۔۔ نوالہ توڑ کر چبائیں اور اوپر سے ٹھنڈا پانی پی لیں۔۔۔ پھر یکدم لہجے اور انداز میں نرمی اور حلاوت در آئی۔۔ فرمایا۔۔۔ میں نے کتنا عرصہ بھوسی والے سے سوکھی روٹیاں خریس کر کھائی ہیں۔۔۔ ٹکر ٹکر چبا لیا کرتا تھا اور اوپر سے پانی پی لیتا تھا۔

مرید کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اُس نے اُس رات مرشد کریم کے دستر خوان پہ کھانے کے دوران روٹی کے کئی نوالے سالن کے بغیر چبا کر پانی سے کھا کر دیکھا۔ وہ اندازہ کر رہا تھا کہ اگر روٹی سوکھی بھی ہوتی تو طبیعت میں کتنی منکسرالمزاجی پیدا ہوتی۔

عبیداللہ درانی باباؒ کی بابت بتایا کہ جب انہوں نے فقیری میں گھر بار چھوڑا اور کئی سال بعد واپس لوٹے تو بتایا کرتے تھے کہ جب میں گھر آیا تو بچوں کے حالات بہتر تھے اور اُن کے چہروں پہ سُرخی کی جھلک تھی۔۔۔ یعنی اُن کی غیر موجودگی میں گھر کا نظام رُک نہیں گیا تھا۔

پھر فرمایا کہ جب حضرت عمرؓ، حضرت اویس قرنیؓ سے ملے تو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے فرمان کہ ملک شام کی طرف سے۔۔۔۔ بوئے دوست آتی ہے اور اُن کا اپنے دانت توڑ دینے کے پسِ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت اویس قرنیؓ سے دریافت کیا کہ آپ نے حضور ﷺ کو دیکھا تک نہیں تو اتنا گہرا تعلق کیونکر ممکن ہو سکا۔

حضرت اویس قرنیؓ نے اُن سے دریافت کیا۔ آپ تو حضور ﷺ کی قربت سے سرفراز رہے ہیں۔۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ ﷺ کی بھنویں آپس میں ملی ہوئی تھیں یا نہیں۔۔۔ حضرت عمرؓ اس بات کا جواب نہ دے سکے تو دریافت کیا۔ آپ ﷺ کا کون سا دندانِ مبارک شہید ہوا تھا۔۔۔ حضرت عمرؓ اس بات کا بھی جواب نہ دے سکے۔ یہاں پہ سلسلہ کلام توڑ کر فرمایا۔ آپ یہ

دیکھیں کہ کس قدر احترام تھا کہ کبھی نظر بھر کے نہ دیکھا تھا۔ رعب نبوت ہی تو تھا کہ اُن کی نظر ﷺ کے رُخِ انور کا نظارہ کرنے کی تاب نہ لا سکی تھی۔

پھر بات کو وہیں سے آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔ اس پہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت اویس قرنیؒ سے نصیحت کی درخواست کی تو انہوں نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا۔ اللہ کو جانتے ہو؟

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔۔ جی ہاں۔۔ میں اللہ کو جانتا ہوں۔

پھر دریافت کیا۔ کیا اللہ بھی آپ کو جانتا ہے؟

اور جب حضرت عمرؓ نے اس پہ بھی اثبات میں جواب دیا تو فرمایا۔ پھر تمہیں کسی نصیحت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس پہ حضرت عمرؓ رونے لگے اور کہا۔ کاش کوئی مجھ سے یہ ساری سلطنت دو پیسے کے عوض لے لے۔ اس پہ حضرت اویس قرنیؒ نے فرمایا۔ عمرؓ! جو چیز ناگوار ہو اُسے پھینک دینا چاہیئے۔۔ اُس کی قیمت نہیں لگاتے۔

فرمایا۔ حضرت عمرؓ اور امام حسینؓ مثل تھے۔۔۔ دونوں اتنے غیر جانبدار ذہن کے مالک تھے کہ اپنی شہادت کی تمثیلیں خود ہی بنا دیں۔

کھانے کے بعد وہیں دستر خوان پہ بیٹھے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ایک آدمی جوتے گانٹھتا ہے۔۔۔۔ پھر وہی آدمی خود نیا جوتا بناتا ہے۔۔۔ پھر وہی آدمی مشین پہ جوتے بناتا ہے اور دن بھر میں دس بارہ جوڑے بنا لیتا ہے۔ اُس نے یہ سب کیسے کیا؟ اُتنے ہی وقت میں۔۔۔ اُسی توانائی اور انہی صلاحیتوں کے ساتھ وہ چند ایک جوتے مرمت کر کے گزارا کرتا ہے۔۔۔ تب بھی اور اگر دس بارہ

جوڑے جوتے نئے بنا کر بیچتا ہے تب بھی۔۔۔اور اگر فیکٹری لگا کر سینکڑوں جوتے روزانہ بناتا ہے تب بھی۔۔۔وہ ایسا کر سکتا ہے۔ فرمایا۔گھر میں تھری فیز وائرنگ کی طرح کی بات ہے۔۔ بجلی کی مقدار تو ایک ہی ہے۔آپ اُس سے دو دو اے سی چلائیں اور چاہے محض پندرہ واٹ کا بلب جلا کر گزارا کرتے رہیں۔

فرمایا۔مساوات مادی وسائل نہیں بلکہ صلاحیتوں کی یکساں تقسیم کا نام ہے۔اللہ تعالی کے نزدیک مساوات کا مفہوم انسان کو توانائی کا ذخیرہ مساوی مقدار میں فراہم کیا جاتا ہے۔اس توانائی کو بروئے کار لانے کا پورا اختیار انسان کو دیا گیا ہے۔آپ چاہے تو اُس توانائی کو استعمال کر کے بھکاری بن جائیں اور چاہے تو سائنسدان اور چاہے تو قارون۔۔آپ کو روکا کس نے ہے کہ ریسرچ نہ کریں۔۔بھکاری بننے میں کیا توانائی نہیں صرف کرنا پڑتی۔۔۔آپ دیکھیں بھکاری دب بھر کتنی محنت کرتے ہیں۔

اللہ نے انسان کو انرجی دے دی۔۔اُس انرجی کو استعمال کا اختیار دے دیا۔اب فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ اُس توانائی کو۔۔ اُس انرجی کو کیسے اور کیونکر استعمال کرنا ہے۔۔۔کرنا بھی ہے یا نہیں۔

فرمایا۔یونانیوں کا ماننا تھا کہ آقا اور غلام قدرت پیدا کرتی ہے۔سقراط نے جب حقیقت کا اندازہ کر لیا تو کہہ دیا کہ قدرت سب کو یکساں پیدا کرتی ہے۔۔۔انسان ایک دوسرے کو غلام بنالیتا ہے۔اپنے اجداد کی اس بات کی تردید میں وہ اتنا ڈٹ گیا کہ بالآخر اُسے زہر پینا پڑا اور وہ پی گیا۔

فرمایا۔تنہائی بھی ایک تقاضا ہے اور یہ تقاضا تو جانوروں میں بھی پایا جاتا۔آپ دیکھیں کہ بعض اوقات جانور گلے یا ریوڑ سے ہٹ کر الگ ہو کر بیٹھتے ملتے ہیں۔سقراط لوگوں سے بچنے کے لئے ایک ٹوکرے میں بیٹھ کر چھت سے لٹکا رہتا تھا۔

پھر حضور قلندر بابااولیاءؒ کا تذکرہ فرمایا کہ وہ لوگوں سے صرف عصر تا مغرب ہی ملا کرتے تھے۔ وہ تخت پوش پہ چڑھ کر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اگر اُن کا کوئی رشتے دار بھی آتا تو اُن کی کوشش ہوتی کہ جلد فارغ ہو کر چلا جائے۔ ایک بار حضورؒ کے بھائی اُن سے ملنے آئے۔ حضورؒ نے حسب عادت کہا۔ تمہاری بھابھی اندر ہیں یعنی آپ اندر جائیں لیکن وہ بھی خوب پکے تھے۔ اکڑ گئے کہنے لگے بھائی صاحب میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔۔۔ وہ ایک دن ایک رات وہیں رہے، وہیں سوئے، وہیں اُٹھے، وہیں بیٹھے۔۔ اندر زنان خانے نہیں گئے۔ وہیں مراد نے میں اُن کے پاس رہے۔

فرمایا۔ میں نے ایک بار حضور قلندر بابااولیاءؒ سے پوچھا کہ بدر صاحب کی ترقی ہو رہی ہے میری کیوں نہیں ہو رہی۔۔۔ تو انہوں نے فرمایا۔ بدر صاحب شراب پیتے ہیں اور آپ شراب پینے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ یعنی کسی کو بُرا سمجھنا اتنا بُرا ہے کہ آدمی کی روحانی ترقی رک جاتی ہے۔

بدر صاحب ہی کے حوالے سے بتایا کہ انگلینڈ میں ایک خاتون جو ابا حضور کی بہت معتقد تھیں اور سلسلے میں ابا حضور سے بیعت تھیں۔ اُن کے شوہر بدر صاحب سے ملے۔ انہوں نے حضور قلندر باباؒ کی نسبت کی وجہ سے ان کی بہت پزیرائی کی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے گھر رہنے پہ آمادہ کر کے اپنے ساتھ لے آئے۔ بدر صاحب نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بچے ہیں۔ اُن کی اولاد نہیں تھی۔۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے کہا۔ آپ کی خدمت کے عوض میں آپ کے لئے ایک بیٹا Sanction کرتا ہوں۔ وہ دونوں اور بھی مرعوب ہو گئے۔

ایک روز اُس خاتون نے ابا حضور کو فون پہ اس تمام کی بابت مطلع کیا اور کسی قدر گلہ مندی سے بتایا کہ وہ بہت خدمت لیتے ہیں۔ ابا حضور نے انہیں کہا کہ اگر آپ کے پیر و مرشد ہیں تو پھر آپ کو گلہ نہیں کرنا چاہئے۔

اس بات کا اُس خاتون نے اثر لیا اور خدمت میں کچھ کمی کر دی۔ بدر صاحب اُن کے رویے کو بھانپ گئے اور وہاں سے چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد اُن کے گھر آئے اور دروازے پہ کھڑے کھڑے کہا۔ میں نے آپ لوگوں کو بہت تکلیف دی۔۔۔ وقت بے وقت کی خدمت لی۔۔ میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا آپ اندر تو آئیں انہوں نے کہا۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں۔۔ جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے میں یہیں کھڑا رہوں گا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ ہم اس معافی کی کوئی بات نہیں دیکھتے۔۔ لیکن اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو ہم نے آپ کو معاف کیا۔ بدر صاحب نے کہا۔ دراصل میں نے جو بیٹا آپ کے لئے Sanction کیا تھا اُسے میں نے کینسل کر دیا ہے اور میں آپ کو یہی اطلاع دینے آیا تھا۔

اُس خاتون نے یہ بات بھی ابا حضور سے فون پہ عرض کی تو آپ نے انہیں کہا۔ اب یہ معاملہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ ہی طے فرمائیں گے۔

اس کے بعد وہ میاں بیوی انگلینڈ سے کراچی آئے۔ حضور انہیں لے کر حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے مزار پہ گئے۔ وہاں مراقبہ کے بعد انہیں بتایا کہ حضور قلندر بابا اولیاؒ نے معاملہ حل کر دیا ہے۔ وہ واپس چلے گئے اور ایک سال بعد انہوں نے اطلاع دی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹے سے نوازا ہے۔

باتوں باتوں میں رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ محفل برخاست فرماتے ہوئے کہا۔ اس وقت آپ مراقبہ ہال کیسے جائیں گے۔۔ یہیں سو جائیں۔ اُس کے پاس۔۔ جی۔۔ بہتر کہنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ مرشد کریم کے گھر اُن کے ساتھ بسرام ہونا ایک ایسا اعزاز تھا جس پہ وہ ناز ہی کر سکتا تھا۔

صبح ڈرائنگ روم میں ہی مراقبہ کر کے وہ مرشد کریم کے ساتھ اُن کی خواب گاہ میں چلا آیا۔ شاہین چائے بنا کر وہیں لے آئی۔ اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ صبح صبح چائے پلاتی ہیں۔

چائے پیتے ہوئے مرید کی نظر حضور کے تخت پوش پہ دھری کچھ ڈائریوں پہ پڑی۔ فرمایا۔ مرشد کی باتوں کو ڈائری میں لکھنا میری عادت تھی۔۔۔ ایسی کئی ڈائریاں میرے پاس بھری پڑی ہیں۔

اتنے میں شاہ عالم نے آکر ناشتے کی بابت پوچھا۔ تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور انڈے ڈبل روٹی لانے کو کہا۔ اس اثناء میں مرید نے ایک ڈائری اُٹھا کر دیکھی۔۔ نہایت خوشخط تحریر دیکھ کر اُس نے سوچا۔ یہ حضور کی جوانی کی تحریر ہے۔۔ یعنی انسان کا خط بھی وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ چند ایک باتیں پڑھ کر اُس نے یہ سوچ کر اُسے بند کر دیا کہ یہ میرے مراد کی پرائیویٹ ڈائری ہے مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں اسے پڑھوں۔

مرید نے اعراف اور برزخ کا فرق سمجھانے کی درخواست کی تو فرمایا۔ خیالات لوحِ محفوظ سے نشر ہوتے ہیں۔ اُس وقت وہ بے رنگ ہوتے ہیں۔ انسان انہیں موصول کر کے اُن میں معنی پہناتا ہے۔ اب ان میں ایک رنگ اور خدوخال پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب برزخ میں بیٹھا ہوا عامل اُن کی منظوری دیتا ہے۔۔ یہ عامل عموماً مجذوب ہوتے ہیں اور اُن کا ذہن ہمہ وقت برزخ میں کام کرتا ہے۔ اگر منظوری نہ دے تو خیال عملی جامہ پہن ہی نہیں سکتا۔ یہ سب اتنی تیزی اور تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے کہ انسان اس کو سمجھ ہی نہیں پاتا۔

مثلاً ایک تقاضا نشر ہوا کچھ کھانا چاہیے یعنی آپ نے بھوک محسوس کی۔۔۔ کیا کھانا چاہیے؟ آپ نے معنی پہنائے۔۔۔ روٹی کھانی چاہیے۔۔۔ اب یہ خیال برزخ میں عامل کے ذہن سے گزرا۔۔ اگر اُس نے اسے رد کر دیا تو آپ روٹی نہیں کھا سکتے۔ کچھ اور کھائیں۔۔ یعنی آپ وہی کر سکتے ہیں جس کی وہ منظوری دیتا ہے۔

شاہ عالم واپس آئے۔ ابا حضور نے اُن کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ناشتہ لے آئے ہیں اور کہا آپ کھانے کی میز پر تشریف لے ائین۔ ابا حضور نے پوچھا کیا لائے؟ انہوں نے کہا حلوہ پوری لایا ہوں۔

فرمایا۔ دیکھ لیں ہم نے انڈے روٹی کی بات سوچی۔۔ یہاں کسی کے ذہن میں حلوہ پوری نہ تھی۔۔ پھر بھی حلوہ پوری ہی آئی۔ ہم انڈہ ڈبل روٹی کھا ہی نہیں سکتے تھے۔۔ کھا لیتے تو حلق سے نیچے نہ اترتی۔۔ حلق میں پھنس جاتی۔۔۔ اعراف میں تو ہم یہاں سے جانے کے بعد رہیں گے اور کھانے کے کمرے کی طرف بڑھے۔

مرید نے سوچا۔ یہ برزخ اور اعراف کا حال جاننے کی خواہش پیدا ہونے سے پہلے اُس کے عملی مظاہرے کی تیاری ہوئی۔۔ بالکل اُسی طرح جس طرح ایک ٹیچر جانتا ہے کہ آج اُس کو کلاس میں کیا پڑھانا ہے اور وہ اُس کے لئے سمعی اور بصری مواد تیار کرتا ہے۔ پہلے شاہ عالم بھائی کو انڈہ ڈبل روٹی کا کہا۔ پھر اعراف اور برزخ کی بات سمجھائی اور عملی مشاہدے کے لیے حلوہ پوری سے توضیح کروادی۔

ناشتے کے دوران زیادہ تر خاموشی رہی۔ خاموش رہنے کی ایک مشق چپ رہنا بھی ہے۔ بعض لوگ اسے چپ کا روزہ رکھنا بھی کہتے ہیں۔ ویسے صوم کا مادہ صم ہی تو ہے یعنی گونگا ہونا۔ فقیروں کے یہاں کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا علاماتِ فقر کے طور پر بتائی جاتی ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تین روز شب کسی سے بات نہ کرنا ایک نشان راہ کے طور پر فرمایا تھا۔ اس کی حکمت

بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ مرید نے سوال اپنے مراد کے حضور پیش کیا تو انہوں نے اتنا ہی کہا۔ اس سے خرچ ہونے والی توانائی ذخیرہ ہوتی ہے۔۔۔اور مرید اتنے پہ ہی قناعت کر گیا۔

ناشتے کے دوران کسی نے پوچھا آج کیا دن ہے۔ فرمایا انسان نے محض نام ہی مختلف رکھے ہیں ورنہ دن تو سب ہی دن ہوتے ہیں۔۔ایک دن کا دوسرے دن سے کیا فرق ہے؟ یہ نام رکھ کر دراصل انسان نے خود کو محدودیت میں قید کر رکھا ہے۔

پھر فرمایا۔ تاریخ انسانی میں کتنے انبیاء آئے۔ اوسطاً چھ سو سال ایک نبی کا لگائیں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کتنے عرصے میں آئے ہوں گے۔ لگ بھگ ساڑھے سات کروڑ سال میں۔ پھر قرآن اور دیگر الہامی کتب میں دی گئی تاریخ کا تذکرہ فرمایا تو مرید نے دریافت کیا۔ کیا قرآن میں متذکرہ تاریخ صرف موجودہ دس ہزار سال کی تاریخ ہے؟

فرمایا۔ قرآن تو وقت کا تذکرہ ہی نہیں کرتا۔ وہاں کا ایکدن آپ کے ہزاروں سال کے برابر ہے۔۔۔یعنی آپ اتنے سست ہیں کہ جتنا کام آپ کو ایک دن میں کرنا چاہیئے اتنا کام آپ نے ہزار دنوں میں بھی نہیں کر پاتے۔

مرید کو اپنی سست روی کا خیال آیا اور اُس نے دریافت کیا کہ رفتار کار کیسے بڑھائی جائے؟

فرمایا۔ ذہن ہلکا ہو تو رفتار بڑھتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ خلفشار نہ ہو۔ خلفشار ہو تو ذہن بوجھل رہتا ہے۔ پھر فرمایا۔ ایکسیڈنٹ ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی کے ذہن میں کوئی پیچیدگی ہوتی ہے۔ ویسے تو بیماریاں بھی ذہنی پیچیدگی ہی کے سبب ہوتی ہیں۔

بیماریوں کا تذکرہ ہوا تو مرید نے ناف ٹلنے کے روحانی علاج کے بابت کہا کہ وہ کچھ زیادہ موثر نہیں۔ فرمایا۔ وہ علاج وقتی اثر کرتا ہے۔ اس کا مستقل علاج تو ورزش ہی ہے۔

یہ بات بھی بتائی کہ کھانے کے اوقات کا تعین سب سے پہلے حکیم جالینوس نے کیا تھا۔۔ اُس نے کھانے کے تین اوقات مقرر کئے تھے۔ اس سے پیشتر لوگ ہر وقت کھاتے رہتے تھے۔۔ اُس نے کہا تھا کہ انسان کو تین وقت سے زیادہ نہیں کھانا چاہئے اور ہر کھانے کے دوران کم از کم چھ گھنٹے کا وقفہ ضروری بتایا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مسعود طارق اور فاروق صاحب آن پہنچے۔ حیدرآباد کا پروگرام تھا۔ حضور نے اُسے مدعو کیا تو وہ کھل اُٹھا۔

حیدر آباد جاتے ہوئے راستے میں فرمایا۔ ایک بار مجھے ایک صاحب نے کہا میں آپ کو ایک کام کی بات بتاؤں۔ میں نے اشتیاق ظاہر کیا تو کہا کل بتاؤں گا۔ خیر وہ کئی دن بلاتے رہے اور میرا اشتیاق بڑھاتے رہے، آخر ایک دن کہنے لگے۔ آپ دیکھیں گاہک آئے۔۔ وہ کچھ بھی نہ لے تو اپنے پاؤں کی مٹی تو چھوڑ ہی جاتا ہے نا۔۔۔ پھر اس کی وضاحت فرماتے ہوئے کہا۔ گاہک دکان سے کچھ بھی نہ خریدے۔۔ وہ چند ایک چیزیں دیکھے گا۔۔۔ تو اُن چیزوں کی جھاڑ پونچھ تو ہو جائے گی اور پھر دیکھنے والے کو پتہ چلے گا کہ

گاہک کھڑا ہے اور دکانداری ہو رہی ہے۔

پھر ایک اور صاحب کا بتایا کہ اُس نے کسی تھوک فروش سے سامان اس وعدے پر لیا کہ جب بکے گا تو ادائیگی کریں گے۔ وہ جب بھی وصولی کے لئے آتا اور تقاضا کرتا تو کہہ دیتے کہ بھئی سامان ابھی فروخت نہیں ہوا لہذا پیسے نہیں ہیں۔

وہ خاموش ہو کر چلا گیا۔ پھر اُس نے ملازم کو بھجوایا۔ ملازم کو انہوں نے جانے کیا کہہ کر بھیجا۔ وہ سر ہو گیا۔ انہوں نے اُس کی بات سُنی اور سامان اُٹھوا دیا کہ زیادہ بات نہیں کرو اپنا سامان لے جاؤ۔

کچھ عرصے بعد مالک ادھر سے گزرا۔ اُس نے کہا آپ ہم سے سامان نہیں لے رہے۔ کہا فی الحال پڑا ہے جب ہو گا تو منگوا لیں گے۔ کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ آیا۔ انہوں نے وہی بات کہی۔ وہ دکان میں داخل ہوا اور دیکھ کر کہا۔۔۔ صاحب آپ کمال کرتے ہیں۔۔ مال تو نہیں ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہے۔ انہوں نے کہا۔۔ ایسے مال کیا لینا۔۔۔ نہ مال ہو گا نہ کوئی تقاضا کرے گا۔

ایک بات یہ سُنائی کہ ایک پیر صاحب کے خلیفہ اُن کے وصال کے بعد گدی پر بیٹھے ۔ جب مریض آئے تو پوچھا کرتے۔۔۔ پھوکا ماراں یا تویز (تعویز) دیاں۔

فرمایا۔ ایک بار مراقبہ ہال کے لئے پودے لینے چلا گیا۔ نرسری والے نے کچھ ایسی قیمتیں بتائیں کہ مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے اُس سے پوچھا ملک الموت آئے گا تو کیا کرو گے ؟ تم نے مرنا نہیں ہے ؟ اتنا کہا اور ہم چل دیئے۔ اُس کے دل پہ کچھ ایسی لگی کہ واپس بلوا کر پودے بھی دیئے اور پیسے بھی نہ لیئے۔

پھر بری معصومیت سے کہا۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ سچ مچ ملک الموت آ ہی گیا ہو۔ اب جب بھی کبھی جاتا تو شاید یہی سمجھتے ہوں گے کہ کہیں ملک الموت آ ہی نہ جائے۔ اس لئے جتنے پودے لیتا ہوں دے دیتا ہے اور پیسے بھی طلب نہیں کرتا۔۔ خود ہی کچھ دے دوں تو لے لیتا ہے۔۔ ورنہ نہیں۔

فرمایا۔عام طور پر جب مرید پیر صاحب کو روشن ضمیر کہتے ہیں تو وہ تردید نہیں کرتے۔۔۔چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔۔۔ حتیٰ کہ مرید تنگ آکر خود ہی کہنا شروع کر دیتا ہے کہ آپ تو روشن ضمیر ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہے کوئی میری بھینس کھول کر لے گیا ہے۔ میری بیوی بیمار ہے یا میری زمین کا یہ مسئلہ ہو گیا ہے اور پھر باہر جا کر اپنے پیر صاحب کی روشن ضمیری کے تذکرے کرتا پھرتا ہے۔ فرمایا دراصل پیر کو اُس کے مرید ہی پیر بناتے ہیں۔

ایک اور بات یہ تعلیم فرمائی کہ طرزِ فکر یہ ہونی چاہیئے کہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی آئے تو آپ کہیں اور سمجھیں کہ یہ اللہ نے کیا۔اگر آپ سب کچھ کیر آف اللہ کریں گے تو یہ رحمانیت ہے اور اگر یہ سب اپنی معرفت سمجھیں گے تو یہ شیطنت ہے۔اگر آپ کیر آف اللہ سوچیں گے تو یہ پیغمبرانہ طرزِ فکر ہو گا ورنہ یہ شیطانی طرزِ فکر ہو گا۔

فرمایا۔سوچیں گے تو یاد آئے گا۔۔ سوچیں گے تو سمجھیں گے۔۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہاں اتفاق نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ہر کام جو ہو رہا ہے ایک قانون اور ضابطے کے مطابق ہو رہا ہے۔۔۔

حیدر آباد میں گھومتے ہوئے جب گاڑی فاروق صاحب کے والد کے بنائے ہوئے ہسپتال کے سامنے سے گزر رہی تھی تو فاروق صاحب نے اُس ہسپتال کی بابت اپنے والد کی کوششوں کا ذکر کر کے کہا۔ابا دعا کریں کہ اللہ مجھے بھی کوئی ایسا کام کرنے کی توفیق دے دے۔

فرمایا۔ہاں بھئی اللہ ہی توفیق دیتا ہے۔

مرید نے رنگ و روشنی سے علاج کے لئے ایک ہسپتال ہونے کی ضرورت اور ایک ہسپتال بنانے کی خواہش کا ذکر کیا تو فرمایا۔اُمیں رنگین شیشے لگا کر مریضوں کو رکھیں۔رنگین بلب استعمال کرنے سے یہ کہیں زیادہ بہتر اور کار آمد ہے۔

شاہین نے دریافت کیا کہ وہ سلسلے کی خدمے کے لئے کیا کرسکتی ہے تو فرمایا۔شوہر کی خدمت،اولاد کی تربیت اور خوش رہنا ہی وہ خدمت ہے جو آپ سلسلے کے لئے کرسکتی ہیں۔شاہین نے اپنا خواب سُنایا کہ اُس نے دیکھا ہے کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے عاطف (چھوٹے بیٹے) کو قلم دیا ہے تو فرمایا آپ کے مزے آرہے ہیں۔

پھر کہا چلیں اسی بہانے شاہین نے حیدر آباد دیکھ لیا۔

فاروق صاحب کے گھر گئے۔ممتاز علی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ابا اندر تشریف لے گئے۔اندر خواتین سے مل کر باہر آئے۔پھر فیروزہ بہن کے گھر سے ہوتے گلشن شہباز حیدر آباد مراقبہ ہال پہنچے کئی لوگ وہاں پہ اُن کی آمد کے منتظر تھے۔ملتے ملاتے شام کی اور واپس کراچی کو روانہ ہوئے۔

اگلے روز سے عرس میں شرکت کے لئے مہمان آنا شروع ہو گئے۔

عرس کی تقریبات کی گہما گہمی شروع ہوئی تو ابا حضور کی مصروفیات بامِ عروج پہ جا پہنچیں۔زائرین کا اجتماع پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔اُن سب کے رہنے،کھانے پینے اور انہیں تربیت کے مختلف مراحل سے گزارنے کے لئے ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا تھا۔مزار پہ چادریں چڑھانے کے لئے ایک گروہ نعیم قادری صاحب کی سربراہی میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے مزار پہ گیا۔خواتین کے دو گروہ

فیروزہ بہن اور سعیدہ خاتون کی قیادت میں چادریں چڑھانے گئے۔ پھر سہ پہر میں حضور خود گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد لنگر کی تقسیم شروع ہوئی۔ پھر رات گئے حضو کا سالانہ خطاب ہوا۔

اگلے روز وفود سے ملاقاتیں جو صبح سویرے سے شروع ہوئیں تو رات گئے تک جاری رہیں۔ اگلے روز غیر ملکی وفود سے ملاقاتوں کی باری تھی۔ اکثر لوگ جو دیارِ غیر سے آتے ہیں وہ کراچی رک کر حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کے عرس میں شرکت اور اپنے مرشد کریم سے ملنے کے بعد اپنے آبائی گھروں کو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک پنتھ اور کئی کاج کے مصداق ایک ہی سفر سے ہم خرما و ثواب کے مزے لوٹتے ہیں۔

شام کو محفل سجی۔ حلقہ ارادت مندوں میں بیٹھے مردانے دورہ انگلینڈ کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس بار انگلینڈ میں کچھ زیادہ پروگرام نہیں کئے کیونکہ اس سے رجوع خلائق بڑھ جاتا ہے اور سلسلے کے لوگوں کی تربیت کا کام رہ جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اب سلسلے میں نئے لوگوں کے داخلے پر پابندی لگنی چاہئے اور جو آچکے ہیں اُن کی تربیت کا اہتمام زیادہ ہونا چاہئے۔ فرمایا کم لوگوں میں انتخاب بھی آسان ہو جاتا ہے۔

فرمایا۔ فقیر کے پاس خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ اس بات کی حکمت یہ بتائی کہ فقیر قربِ الٰہی کے کسی نہ کسی مقام پر ہوتا ہے۔ جب لوگ ملنے جاتے ہیں تو وہ اُن کی خاطر تواضع کرنا چاہتا ہے۔ اب جب وہ ادھر نیچے متوجہ ہوتا ہے تو اُس کا دھیان بٹتا ہے۔ اُس کو دنیا داری سے محفوظ رکھنے کے لئے کم از کم اتنا سا اہتمام کرنے میں کیا ہرج ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ بتائی کہ جب کوئی کسی فقیر کے لئے کچھ کرتا ہے تو فقیر بھی لامحالہ اُس کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہتا ہے۔ اب فقیر کچھ اور تو کر نہیں سکتا تو وہ دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی یہ دیکھتے ہیں کہ اس بندے نے اُن کے بندے کی خاطر کی ہے تو اللہ اُس بندے کو خود نوازتے ہیں۔

پھر نظام الدین اولیا کے لنگر کی مثال دی کہ انہوں نے ناند یعنی بڑے بڑے مٹکے رکھواد ییئے تھے۔ لوگ آتے۔۔۔ کوئی چاول لایا تو اُس نے وہ چاولوں کے مٹکے میں ڈال دیا۔۔ گھی لایا تو اُس نے وہ گھی کے مٹکے میں ڈال دیا۔۔ گندم لایا اور گندم کے مٹکے میں ڈال دی۔ اللہ نے اُن مٹکوں میں کچھ ایسی برکت ڈال دی تھی کہ وہ خالی نہیں ہوتے جب وفات پائی تو سب مٹکے

خالی کروا کر لنگر بنا کر تقسیم کر دیئے گئے۔

فرمایا۔ داتا صاحب کا لنگر تاریخ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اس سے پہلے نظام الدین اولیا کا تھا۔ پھر داتا صاحب کے مزار پہ لنگر کی تقسیم کے انداز کو سراہا کہ لوگ آتے ہیں وہیں پہ پکی پکائی دیگ خریتے ہیں اور وہیں کھرے کھرے بانٹ دیتے ہیں،۔ اس طرح ہزار ہا دیگیں روزانہ تقسیم ہو جاتی ہیں۔

فرمایا کہ انگلینڈ میں کیرلین فوٹو گرافی اب اتنی عام ہو گئی ہے کہ آپ کو اکثر دکانوں پہ اس کی سہولت مل جاتی ہے۔ آپ جائیں وہ آپ کی اورا کی تصویر بنا کر آپ کو دے دیں گے۔ ساتھ میں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ آپ میں غصہ ہے، آپ جذباتی ہیں، آپ فلاں بیامری ہو سکتی۔ وہاں سب نے اپنی اپنی تصویر بنوائی۔ طاہرہ کی تصویر میں اُن کے گرد آنے والے ہیولے میں ایک بیم سی سیدھی نظر ائی۔ اس کی تشریح میں وہاں کی انچارج خاتون نے بتایا کہ آپ ایک روحانی خاتون ہیں۔ طاہرہ نے گایا کہ انہوں نے تصورِ شیخ کیا تھا۔ پھر فرمایا۔ یہ تو انہوں نے کیا۔۔ آپ نے کیا کیا؟

بتایا کہ طارق محمود نے ایک مشین بنائی ہے جس پر آپ ہاتھ رکھیں تو آپ کے ہاتھ کے گرد روشنیوں کے ہالے کی تصویر اتار لیتی ہے۔

مرید نے سوال کیا۔ حضور ہم جب تلاوت میں قل کہتے ہیں تو ہم کس کو مخاطب ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ نے قل کہا تو جبرائیل علیہ السلام نے جا کر حضور ﷺ سے کہا۔ جب جبرائیل نے حضورؐ سے کہا قل۔۔ تو انہوں نے اپنی امت کے جن وانس کو کہا۔۔ اب جب امت کے افراد باآواز بلند قل کہتے ہیں تو اُن کے مخاطب دیگر افراد ہوتے ہیں لیکن جب حالت نماز میں دل ہی دل میں قل کہتے ہیں تو ہم کس کو کہتے ہیں۔۔ قل۔۔۔ یعنی آپ کہہ دیں۔

فرمایا۔ ہم تو نقل کرتے ہیں حضور ﷺ کی۔۔ قرآن میں جو کچھ پڑھتے ہیں۔۔ وہ ان کی پیروی میں ہی تو پڑھتے ہیں۔

فرمایا یہ سب انسانی شعور کی مجبوری ہی کہ وہ مرکزیت کے لئے ایک نقطہ چاہتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کیوں بنایا۔۔ ورنہ اُس عمارت میں کہیں اللہ آ سکتا ہے۔۔ اوپر سے آپ اُس پہ تالا بھی دیکھتے ہیں۔۔ حجر اسود بھی تو ایک پتھر ہے۔۔ حضور ﷺ نے نہ جانے کس مصلحت کے تحت اُسے بوسہ دیا تھا۔۔ ہم نے کبھی ایسی باتوں پہ غور تو کیا نہیں۔۔ بس پیروی ہی میں لگے ہوئے ہیں۔

مرید نے سوال کیا۔ حضور ٹھہراؤ میں کیونکر اضافہ ہو سکتا ہے؟

ایک جھٹکے سے کہا۔۔ ٹھہراؤ تو موت ہے۔۔ حرکت ہی تو زندگی ہے۔۔ حرکت میں رہنا ہی حیات ہے۔۔ ٹھہر گئے تو سب ختم۔

فرمایا یہ لمبی بحر میں ہے۔

ہر خوشی اک وقفہ، تیاری، سامان غم　　　ہر سکوں مہلت برائے اضطراب وامتحان

یعنی ہر خوشی کے بعد غم اور ہر غم کے بعد خوشی آتی ہے یعنی یہ دونوں کیفیتیں ادل بدل ہوتی رہتی ہیں۔ بعض لگ زیادہ حساس ہونے کے سبب ۵۰٪ کی بجائے ۸۰٪ غمگیں ہوتے ہیں۔

فرمایا یہاں سب کچھ ایک دھوکہ ہی ہے۔ آدمی کہتا ہے میں نہی ہوں گا تو میری اولاد کو کون پڑھائے گا لیکن جو ماں باپ اپنی اولاد کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں تو ان کی اولاد چورڈا کو کیوں بنتی ہے؟

اگر بیج کو اصل مان لیں تو درخت فکشن ہوا۔۔ درخت میں دعبارہ گٹھلی کا کیا مطلب ہوا؟ یعنی نہ درخت اسل ہے اور نہ گٹھلی۔۔۔اب سوچیں کہ اصل کیا ہے؟

دعوت تفکر دے کر ایک نکتہ مزید یہ بتایا کہ آدمی کے مرنے کے بعد جب اُس کا اعمال نامہ سیل کر دیا جاتا ہے تو پھر یہ ختم اور ایصال ثواب وغیرہ کا کیا مطلب ہے؟ کیا ہماری دعائیں اعمال نامہ پہ لگی اللہ کی مہر سے گزر سکتی ہیں؟

اگلے روز وہ واپس جانے کے لئے تیار ہو کر اس تاک میں تھا کہ حضور سے الوداعی ملاقات ہو جائے۔ مراقبہ ہال میں آستانے کے باہر ٹہلتے ہوئے سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے۔۔ کسی سے کہلوائے۔۔ خود جا کر دستک دے۔۔ کہ حضور نے کمرے کی چق اُٹھا کر ہاتھ کے اشارے سے اُسے اندر بلایا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو فرمایا۔ آیئے مقصود صاحب۔۔ بیٹھیں۔ پھر عود کی لکڑی نکالی۔۔ سلگتے کوئلے پہ رکھی اور کہا۔۔ یہ آپ کی خاطر کی جارہی ہے۔ عود کی مدھر مہک کمرے میں پھیلی،، مشام جان معطر ہونے لگے۔۔ فرمایا۔۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عود کی خوشبو بہت پسند تھی۔۔۔اسی کا عطر لگاتے تھے۔۔آج بھی خانہ کعبہ میں اس ی لکڑی کو لوبان کی طرح سلگایا جاتا ہے وہاں کے لوگ بھی اس کی خوشبو کو سنتِ رسول ﷺ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

پھر کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔ آپ کا کالج کیسا چل رہا ہے؟ مرید نے انہی دنوں پشاور میں ایک کالج قائم کرنے کی سعی کی تھی۔ حضور اُن دنوں امریکہ گئے ہوئے تھے۔ اُس نے انہیں فون پہ اس امر کی اطلاع دی تھی۔۔ مرید نے عرض کی۔ ٹھیک ہے۔۔ ابھی آغاز ہے کچھ دشواریاں تو ہیں لیکن اُمید ہے رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

فرمایا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کالج اور کاروبار میں کسی ایک کا انتخاب کریں۔

مرید نے عرض کی۔ حضور آپ ہی فیصلہ فرمادیں کہ مجھے کالج چلانا چاہیئے یا اپنے کاروبار کو۔

فرمایا۔ نہیں بھئی۔۔ یہ فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے۔

مرید نے عرض کی۔ حضور درس وتدریس تو ایک مشن ہے اور میں نے کالج اسی جذبے سے شروع کیا ہے لیکن روزگار کے طور پر اپنا کاروبار ہی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تعلیم سے روزگار کو وابستہ کرنا مجھے کچھ مناسب نہیں لگتا۔۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں علم بیچ رہا ہوں۔ اس لئے میری سوچ یہ تھی کہ میں کالج کو خود اپنی کمائی سے چلاؤں نہ کہ اُسے کمائی کا ذریعہ بناؤں۔

بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ پھر فرمایا۔ آپ کو اس کام کے لئے کوئی ایسا آدمی تلاش کرنا چاہیئے جس کو آپ کالج میں بٹھا سکیں۔ اُس کی یکسوئی کالج میں ہو۔ کالج کے علاوہ اُس کو کوئی اور کام نہ کرنا ہو۔ جب آپ دونوں کے ذہن ایک نقطے پر مرکوز ہو جائیں گے تب آپ کا کالج خوب پھلے پھولے گا۔

پھر بتایا کہ ایک سیٹھ نے ایک مینجر رکھا۔ اُس کی تنخواہ ایک لاکھ روپے ماہانہ مقرر کی۔ ایک روز وہ مینجر اُن کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ یہ مسئلہ ہے۔۔ سیٹھ صاحب بپھر گئے اور کہا۔ ہم نے تمہیں اس لئے نہیں رکھا کہ تم ہمیں آکر یہ بتاؤ کہ یہ مسئلہ ہے یا وہ

مسئلہ ہے۔ہم تمہیں مسئلے کو حل کرنے کی تنخواہ دیتے ہیں اگر تم اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے تو گھر جاؤ ہم اس کو خود حل کر لیں گے۔ تمہیں تنخواہ پھوکٹ میں کیوں دیں۔خبر دار جو کوئی مسئلہ لے کر آئندہ میرے پاس آئے۔

بعد میں مرید نے جب فون پر برخیا ایجوکیشن فاؤنڈیشن بنانے کی اطلاع دی تو فرمایا۔اب آپ واقعی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔۔یہ لوگ اس قابل ہیں تو نہیں کہ ان کی خدمت کی جائے لیکن بھئی ہمیں تو یہی کرنا ہے۔ہمیں لوگوں سے کیا لینا دینا۔آپ کو اللہ کی خوشنودی چاہیئے تو مخلوق کی خدمت کرنا ہی ہو گی۔

ٹیکسی میں سامان رکھ رہے تھے کہ حضور مراقبہ ہال سے باہر آ گئے۔تپاک سے رخصت کرتے ہوئے مرید کو گلے لگایا اور کہا۔آپ اتنی دور سے تشریف لائے۔آپ کا شکریہ

مرید نے عرض کی حضور شکریہ تو آپ کا کہ آپ نے ہمیں مدعو کیا۔اپنی صحبت سے نوازا اور قربت سے سرفراز کیا۔

فرمایا۔آپ سب کے آنے سے مجھے خوشی ہوئی۔ایک بندہ آکر مجھے ملا تو اُسے بھی خوشی ہوئی اور مجھے بھی۔اس طرح جب مجھے ہزار لوگ ملے تو مجھے اتنی خوشی ملی جو ایک ہزار افراد کی خوشیوں کے برابر تھی۔

پھر خدا حافظ کہہ کر انہیں رخصت کیا اور جب تک ٹیکسی روانہ نہیں ہوئی وہیں کھڑے رہے۔

فقیر کو بے وقوف سمجھنا

دوبارہ ملنے کی آس لئے پشاور واپسی ہوئی۔ ابھی اپنے مراد سے ملاقاتوں کا سرد سرور کم نہ ہوا تھا اسے معلوم ہو کہ حضور لاہور سمن آباد میں خواتین مراقبہ ہال اور حکیم نور عجم کے کلینک کا افتتاح کرنے لاہور آرہے ہیں وہ اور شاہین لاہور پہنچ گئے۔ چوبرجی کے راستے سمن اباد داخل ہوئے تو پہلے ہی چوک پر بائیں طرف مڑنے کے بعد عظیمی مطب زیرِ سرپرستی خواجہ شمس الدین عظیمی کا بورڈ دیکھ کر انہوں نے جانا کہ وہ منزل مراد پہ پہنچ گئے ہیں۔

خواتین مراقبہ ہال کے لئے بطور نگران ڈاکٹر شگفتہ فیروز کا تقرر کیا گیا تھا۔ وہ سلسلے کے لئے کچھ کرنے کا عزم رکھتی تھیں۔\ہال کمرے میں مراقبہ ہال قائم کیا گیا تھا اور گیراج اور اس کے ساتھ کا کمرہ مطب اور انتظار گاہ مریضان تھا جبکہ دو کمرے ابا حضور کی رہائش کے لیے مختص کئے گئے تھے۔ کچن میں خواتین کی ڈیوٹیاں لگائی جا رہی تھیں۔

شاہین نے ہال کمرے میں دری پہ ایک چادر بچھا کر دیواروں کے ساتھ چند تکیے اور کھڑکیوں میں پھول دان رکھ کر نشست گاہ کا تاثر ابھارا تو اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ مقصود صاحب! اللہ نے آپ کو اتنی سلیقہ مند بیوی دی ہے۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ ان کی قدر کیا کریں۔ شاہین تھی کہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

شام کو مطب کا افتتاح ہوا۔ بیگم میاں مشتاق احمد، بیگم اکرام شہابی، ڈاکٹر شگفتہ فیروز، بیگم اسلم اور لاہور کے علاوہ دیگر شہروں سے آنے والی بہت سی خواتین نے حکیم نور عجم سے نسخے تجویز کروائے۔ شام کو حضور گھر کے صحن میں بچھی چارپائی پہ آ کے بیٹھے۔ کچھ دیر دونوں ہاتھ چارپائی کے کنارے پہ رکھے سر کو آگے جھکائے بیٹھے۔ پھر کسی نے تکیہ لا کر دیا تو پاؤں سمیٹ کر اوپر اُٹھا لئے اور تکیے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گئے۔

مرید نے موقع دیکھ کر قریب ہو کر خراٹوں کا علاج دریافت کیا۔

فرمایا۔اس کا کوئی علاج نہیں۔اس کا تعلق پیٹ کے ابھار سے ہوتا ہے۔جتنی بڑی توند ہو گی اتنے ہی زیادہ خراٹے ہوں گے۔ دراصل آدمی نیند کے دوران گہرائی میں سانس لیتا ہے۔اُس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔آواز تو بیداری میں سانس لینے سے بھی پیدا ہوتی ہے لیکن اس وقت سانس میں گہرائی نہ ہونے کے سبب سنائی نہیں دیتی۔

مرید نے سندر سنگھ کی بابت بتایا کہ جب وہ سوات مراقبہ ہال کے لئے زمین دیکھنے سوات گئے تو وہاں زبیر اور جمشید بھائی بھی ہمراہ تھے۔اس سے پیشتر جب سندر سنگھ کہیں پشاور آئے تھے تو جمشید بھائی نے اُن سے کہا تھا کہ سیدھے ہو جاؤ ورنہ میں تمہارے لئے مولوی بلاتا ہوں۔اس بات کے پس منظر میں سندر سنگھ نے جمشید کو دیکھتے ہی کہا۔وہاں تم میرے لئے مولویوں کو لا رہے تھے اب دیکھو میں تمہارے لئے سکھ لاتا ہوں۔اس پہ حضور نے تبسم فرمایا اور کہا۔سندر بہت پیارا بچہ ہے۔

نشست جمی تو جمتی ہی چلی گئی۔

مرید نے عرض کی اس سے پیشتر جب زبیر بھائی زمین دیکھنے سوات گئے تھے تو ایک صاحب نے انہیں وہاں پورا پہاڑ خریدنے کی دعوت دی تھی۔مراد نے ایک نظر اُٹھا کر مرید کو دیکھا۔اُسے محسوس ہوا گویا کہہ رہے ہوں آپ ایک کنال زمین تو لے نہیں سکتے پورا پہاڑ کیا خرید کر دیں گے۔مگر انہوں نے فرمایا۔جب کبھی بندوبست اراضی ہوا ہوگا۔۔تو اُس آدمی کے بزرگوں میں سے کسی نے اپنی زمین کی جو حدود بتائی ہو گی وہ پہاڑ بھی اُس میں آگیا ہو گا ورنہ انہوں نے بھلا اللہ کو اُس زمین اور پہاڑ کے عوض کیا دیا ہو گا؟

کچھ دیر سکوت رہا پھر ارشاد فرمایا۔ جب کوئی مجھے زندگی کی دُعا دیتا ہے تو مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا مجھے قید میں اضافے کی سزا دی جا رہی ہو۔ اوپر عالم اعراف کی زندگی اچھے اور بُرے دونوں ہی کے لئے یہاں کی زندگی سے بہر حال بہت بہتر ہے۔ وہ اچھوں کے لئے تو خیر بہت ہی اچھی ہے لیکن بُروں کے لئے بھی بہت ہی بہتر ہے۔ وقت پہ کھانا ملتا ہے۔ گھنٹی بجتی ہے سب آ کر اپنا اپنا کھانا لے کر کھا لیتے ہیں۔ نہ پکانے کا جھنجھٹ۔۔ نہ برتن صاف کرنے کا مسئلہ۔۔۔ کپڑے بھی تیار مل جاتے ہیں۔۔۔ عورتوں کے لئے بھی اور مردوں کے لئے بھی۔ رہنے کی جگہ مل ہی جاتی ہے۔ یہاں جو بچے فوت ہوتے ہیں جب وہاں جوان ہوتے ہیں تو اُن کی شادیاں ہوتی ہیں۔۔۔ یہ شادیاں وہاں رہنے والوں کے لئے اجتماعی خوشی بن جاتی ہے۔۔ سب اُس میں شریک ہوتے ہیں۔۔۔ وہاں کوئی اور مصروفیت بھی تو نہیں۔۔۔ اِدھر چلے گئے۔۔ اُدھر چلے گئے۔۔۔ اس سے مل لیا۔۔ اُس سے مل لیا۔۔۔ بعض سیارے ایسے ہیں جہاں انسان جا سکتا ہے۔۔ وہاں چلے گئے۔۔۔ یہ اُن کی پکنک ہو گئی۔۔۔ البتہ تکوین کا کام کرنے والوں کو وہاں بہت کام کرنا ہوتا ہے۔۔۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔

وہاں سب کام ایک قاعدے اور ضابطے کے تحت ہوتا ہے اُن سے مفر نہیں۔ یہاں کی طرح نہیں کہ قانون کو چکمہ دیا اور صاف بچ نکلے۔ شریر لوگ فوراً پکڑ میں آ جاتے ہیں اور سزا پاتے ہیں۔ زیادہ بُرے لوگ بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ اُن کی زندگی عذاب ہی کی ہوتی ہے نہ کوئی ٹھکانہ تو نہ کوئی پرسان حال۔۔ اللہ معاف کرے۔

پھر کسی نے معجزے اور کرامت کی بابت پوچھا تو فرمایا۔ معجزے اور کرامتیں دیکھ کر کوئی ایمان نہیں لاتا۔ حضور نے شق القمر کا معجزہ دکھایا تو کتنے لوگ مسلمان ہوئے؟ جو دیکھنے گئے تھے سب بھاگ گئے۔

مرید نے سورج کے دھبوں کی بابت سوال کیا تو بتایا کہ سکر دو جیسی جگہوں کا عکس سورج پہ دھبوں کی صورت پڑتا ہے۔ گہری وادیوں اور غاروں سے زمین کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچتی وہ جگہیں دھبے محسوس ہوتی ہیں۔

پھر بتایا کہ حضور قلندر باباولیاءؒ نے مجھے سترہ دنوں کا روزہ رکھوایا۔ اس دوران بغیر چینی کے چائے یا کافی کے علاوہ کچھ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ جب میری والدہ نے مجھے دیکھا تو میری کمزوری دیکھ کر بہت ناراض ہوئیں اور حضور قلندر باباولیاءؒ سے خفا ہو گئیں اور آخر تک ناراض ہی رہیں کہ انہوں نے اُن کے بچے پہ ظلم کیا۔ پھر ہنس کر فرمایا۔ یہ بھی خوب رہا۔۔۔اب کس نے کیا ظلم کیا۔۔انہیں کیا معلوم۔۔میں نے اُن سے عرض کی کہ لوگ بغیر دیکھے اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہیں۔۔اب میں دیکھ لینے کے بعد کیسے پھر جاؤں؟

فرمایا۔ حضور قلندر باباولیاءؒ جب کوئی کام کہتے تھے تو ساتھ میں تصرف بھی فرماتے تھے۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ جب انہوں نے کہا کہ روزہ رکھو تو بھوک ہونے کے باوجود کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بھوک میں جو کیفیت ہوتی ہے وہ سب ہونے کے باوجود کھانے کی طلب نہیں ہوتی تھی۔ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔۔۔بھوک کی اپنی ایک لذت ہوتی ہے۔ روزوں کے بعد یہ لذت باقاعدہ یاد آتی ہے۔ اُن دنوں مجھے یہ دیواریں پتلے کاغذ کی مانند نظر آتی تھیں۔ چھت بھی ایسی ہی نظر آتی تھی جیسے کاغذ کی بنی ہوئی ہو اور باہر کے عکس اُس پر پڑتے ہوں۔

جب روزہ مکمل ہو گیا تو آنتیں خشک ہو گئیں تھیں۔ پہلے مجھے روغن بادام دودھ میں ڈال کر گرم کر کے دیا گیا۔ پھر دودھ۔۔۔پھر نرم غذائیں دی گئیں پھر رفتہ رفتہ واپس نارمل خوراک پہ لایا گیا۔

پھر حضور نے مجھے اس ذہنی کیفیت سے گزارا کہ میں دیکھتا کہ ایک کمرے میں بند ہوں اُس میں الماریاں ہیں جن میں سونا بھرا ہوا ہے۔ بھوک میں آواز آتی۔۔۔ سونا کھاؤ۔۔ پھر دیکھتا کہ ایک کمرہ ہے جس کی الماریوں میں چاندی بھری ہوئی ہے۔ بھوک لگتی تو آواز آتی کہ چاندی کھاؤ۔۔اسی طرح دکھایا گیا کہ ایک کمرہ ہے جس کی الماریوں میں نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔

بھوک لگتی تو آواز آتی ہ نوٹ کھاؤ۔ میری یہ حالت ہوگئی کہ نوٹ دیکھتا تو گھن آتی۔

فرمایا حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے میری بڑی کڑی نگرانی فرمائی۔ میری تربیت کے مراحل میں میرے ساتھ خود بھی سختی جھیلی۔ حضور نے میری تربیت لاشعوری طور پہ کی یعنی میرے لاشعور کی تربیت کی یہ لاشعوری تربیت ہوئی۔اب سلسلے میں شعور پہ ضرب لگا کر اُسے لاشعور سے جوڑا جاتا ہے۔

نیاز بھائی نے بیٹے کو اسکول میں داخل کروانے کی بابت پوچھا کہ اسکول والے اتنے پیسے مانگتے ہیں تو انہیں کیا کرنا چاہئے۔ فرمایا۔ آپ ارادہ کریں۔۔ اگر خیال آگیا کہ کیسے ہو گا تو پھر نہ ہوا۔

پھر فرمایا کہ کچھ لے دے کر اگر داخلہ ہو جائے تو کروالیں۔اب تعلیمی اداروں میں داخلے ڈونیشن دیئے بغیر کہاں ملتے ہیں؟ رشوت تو ناجائز کام کی ہوتی ہے۔۔آپ تو جائز کام کروا رہے ہیں۔ بھئی اب تو وہی لوگ شریف ہیں جو کچھ کر نہیں سکتے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کی ملازمت جائز ہے۔ حکومت سود کے پیسوں سے آپ کو تنخواہ دیتی ہے۔

فرمایا۔ وہاں انگلینڈ میں لوگ شراب پی کر حلال گوشت کے کباب ڈھونڈنے میلوں جاتے ہیں۔

بھئی آپ کے تمام پڑھے لکھے لوگوں نے امریکی ویزالاٹری میں حصہ لے کر ایک طرح کے ریفرنڈم میں فیصلہ دے دیا ہے کہ ہمیں یہاں نہیں رہنا۔اب ظاہر ہے کہ امریکہ سب کو تو وہاں نہیں بلا سکتا لہذا خود آرہا ہے۔

صبح مراقبے کے بعد ارشاد فرمایا۔انسان تکرار کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ایک ہی بات کو بار بار کر رہے ہیں۔آپ کہتے ہیں آج نیا دن ہے۔آج نیا کھانا پکا ہے۔کھانے میں کیا نیا ہوتا ہے؟ہر روز وہی روٹی تو کھا رہے ہیں جو شروع سے کھاتے آرہے ہیں۔۔۔ہر روز وہی کروڑوں سال پرانا سورج ہی تو طلوع ہوتا ہے۔وہی پانہ تو پی رہے ہیں جو اس وقت سے ہے جب سے زمین بنی ہے۔تبدیلی تو تب ہوتی کہ آج سے پہلے کے انسان کے کان کی جگہ ناک لگ جاتی۔۔۔تو ہم کہتے کہ ناک اس جگہ لگ گئی۔۔۔پہلے دور کا انسان کچھ یوں تھا اب یوں ہو گیا ہے۔

دراصل یہاں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔انسان ایک کام کے دوران وقفہ چاہتا ہے۔۔۔جیسے ہم نے ابھی کھانا کھایا۔اب مزید نہیں کھا سکتے۔۔کچھ دیر بعد دوبارہ کھائیں گے۔وہی صدیوں پرانی گندم۔۔وہی ایک بات۔۔انسان بھی وہی پرانا ہے۔انسان سے انسان پیدا ہو رہا ہے۔۔۔بکری سے بکری۔۔کہیں کبھی بکری سے انسان۔۔۔کہیں کبوتر سے مرغی پیدا ہوتی تو ہم کہہ سکتے ہیں تھے کہ یہ ایک نئی بات ہے۔فرعون پہلے بھی ہوا کرتے تھے اب بھی ہوتے ہیں۔۔۔صرف ان کے نام آج کل کے ناموں جیسے ہوتے ہیں۔

ناشتے پہ توس اس وقت دستر خوان پہ آئے جب سب ناشتہ کر چکے تھے۔فرمایا۔یہ باورچی خانے میں چار چار عورتوں کے عمل دخل کا نتیجہ ہے۔

فرمایا۔ حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کی بیوہ اب کہیں جا کر یہ بات تسلیم کرنے لگی ہیں کہ میں حضور کا روحانی فرزند ہوں۔اس بار ملنے گیا تو شکوہ فرما رہی تھیں کہ تم آتے نہیں۔۔میں نے کہہ دیا کہ آپ نے بھی تو کبھی بیٹا نہیں سمجھا۔ کبھی آئیں ہمارے یہاں۔۔۔ کبھی بچوں کا پوچھا۔۔آپ نے بھی تو کبھی بزرگ بن کر نہ دکھایا۔اس پر انہوں نے مجھے گستاخ اور بے تمیز کہا۔۔۔میں چپ ہو رہا کہ ٹھیک ہے۔ بھئی سیدھی بات سنتا کون ہے۔

مرید نے نمازیوں کے ماتھے پہ بننے والی محراب کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا۔ یہ سر کی ساخت کی وجہ سے بنتی ہے۔ جب سجدے میں پیشانی کی ہڈی کا زور کھال پہ پڑتا ہے اور روشنیاں زیادہ رفتار سے ارتھ ہوتی ہیں تو اس جگہ کی کھال جھلس سی جاتی ہے۔ کئی لوگوں کے سر کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ ساری عمر کوئی نماز بھی قضا نہ کریں تو بھی یہ محراب نہیں بنتی۔

فرمایا حیرت کی بات ہے سب کے اندر ایک ہی روح ہے۔ کہیں یہ روح پیغمبر بن جاتی ہے کہیں یہ مرشد اور کہیں مرید۔

مرید نے عرض کی جب سب کے اندر ایک ہی روح ہے۔۔۔سب ایک ہی مسالے کے بنے ہوئے ہیں تو پھر یہ افرا تفری، اختلاف، افتراق اور فساد کیسا اور کیوں؟

فرمایا۔ یہ اسی بات سے لاعلمی کے سبب ہے۔ پھر کہا۔ آج آپ نے پندرہ سال بعد یہ سوال کیا آج سے پہلے کیوں نہیں۔۔ یعنی اب آپ کا ذہن اس طرف آ رہا ہے۔

طاہر رشید نے دریافت کیا۔ کیا یہی آوا گون ہے؟ اس پر آپ نے آوا گون کے نظریے کی وضاحت فرماتے ہوئے کہا۔ اسی بات کو یعنی سب میں ایک ہی روح ہونے کی بات کو انہوں نے کچھ اور ہی طرح سے سمجھا کہ ایک ہی روح ہے جو بار بار عود کرتی ہے

اور مختلف رویوں میں سامنے آتی ہے۔ حالانکہ ایک ہی روح کا سب کا مظاہر میں کار فرما ہونا اور ایک ہی روح کا بار بار روپ بدلنا دو مختلف باتیں ہیں۔ روح تو ایک کرنٹ کی مانند ہے جو سب مظاہر میں زندگی کا باعث ہے تو وہ بار بار روپ کیوں بدلے گی۔

پھر ایک لطیفہ سنایا۔ لالہ جی کے فوت ہونے کے بعد ایک کتے نے لالہ جی کے گھر آنا شروع کر دیا۔ لالائن اُس کو روٹی وغیرہ ڈال دیا کرتیں۔ بچوں نے کتے کو دیکھا تو دھتکارنا چاہا۔ اب اُن کے عقیدے کے مطابق اگر انسان اچھے کام کرتا ہے تو اُس کی روح اگلے جنم میں مور یا بندر یعنی ہنومان بن جاتی ہے اور اگر بُرے کام کرتا ہے تو کتا، بلی یا سانپ وغیرہ بن جاتی ہے۔ جب بچوں نے کتے کو بھگانے کی کوشش کی اور اس کو مارنا چاہا تو لالائن بولی۔ بیٹے اسے کیوں مارتے ہو۔۔۔ تمہارے پتا کے کرم ہی کچھ ایسے تھے۔

ایک لطیفہ یہ سنایا کہ ایک مولوی صاحب کہیں ختم پہ گئے اور اتنا کھالیا کہ نڈھال ہو گئے۔ کسی نے چورن پیش کیا تو کہا۔ اگر چورن کی گنجائش رہتی تو ایک رس گلہ اور نہ کھالیتا۔

بیگم اسلم کچھ سیب لا کر سامنے رکھے کہ فلاں صاحب لائے تھے کہ ابا کے لئے ہیں۔

فرمایا۔ لوگ آتے ہیں تو کوئی سیب اُٹھائے چلا آرہا ہے کوئی سردا لئے آرہا کہ ابا کو کھلانا ہے۔

مرید نے عرض کیا۔ پیار میں وہ یہی تو کر سکتے ہیں۔

فرمایا۔ جی ہاں کھلا دیا یا پہنا دیا۔۔ انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے۔۔۔ اُس کے پاس ہے ہی کیا؟

سیب بہت بڑے بڑے تھے۔ مرید نے اُن کے سائز پہ تبصرہ کیا تو فرمایا۔۔ یہ اتنے خوبصورت نہیں۔ کھاد کی پیداوار ہیں نا۔

مرید نے کہا۔ یہ کھاد کا استعمال بھی تو لالچ ہی ہوا نا۔

فرمایا۔ اور کیا۔۔۔ زمین سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا لالچ ہی تو ہے۔ کھادوں کے استعمال سے زمین خراب ہو جاتی ہے اور جب تک اُس کو کھاد نہ ملے فصل نہیں دیتی۔

پھر یہ کہتے ہوئے محفل سے اُٹھ گئے کہ آخر انسان کتنا بولے۔۔ بھئی کوئی لوہے کا بنا ہوا تو ہے نہیں۔۔ اور پھر لوگ یاد بھی کب رکھتے ہیں۔

شام کو طاہر رشید اور مجید صاحب ابا کو سیر پہ لے جانے آئے تو آپ نے مرید کو بھی ساتھ آنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ آئیں آپ کو لاہور دکھائیں۔ مرید نے دیکھا کہ حضور نے سرمہ لگایا ہوا ہے۔ مرید نے چاہا کہہ دے سرمہ آپ پہ بہت جچ رہا ہے۔ ابھی وہ کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ آپ نے کہا۔ آج کچھ کام کر رہا تھا کہ ایک صاحب آئے۔۔ بوڑھے سے تھے۔ کہنے لگے میں آپ سے عمر میں چھوٹا ہوں لیکن عینک کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔۔ آپ کیسے کر لیتے ہیں؟ مجھے لگا کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔۔ میں نے جا کر فوراً سرمہ ڈال لیا۔

فرمایا۔ نہ جانے میں انہیں بڑا کیوں لگا۔۔۔ شاید اس لئے کہ میرے دانت نہیں ہیں۔

طاہر صاحب ڈرائیونگ سیٹ پر تھے۔ مجید صاحب اور مرید پچھلی سیٹ پر۔ گاڑی روانہ ہوئی تو فرمایا۔ میں نے سفر بہت کیئے۔ سلسلے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

ایک بار ہم کہیں گئے تو وہاں لوگوں نے پوچھا کہ قرآن میں مراقبے کا تذکرہ کہاں ہے؟ تو میں نے کہا۔یوں تو فیرج اور ٹی وی کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔آپ اُن کو استعمال کرتے ہیں تو قرآن میں اُن کا تذکرہ کیوں تلاش نہیں کرتے۔

فورٹرس سٹیڈیم میں نت نئی گاڑیاں دیکھ کر تبصرہ فرمایا۔ یہ مقروض ملک کے غریب عوام کی شان ہے۔۔۔ باہر سے جو لوگ آتے ہیں اور اس ملک کو قرض دیتے ہیں۔۔انہیں یہ سب نظر نہیں آتا ہوگا۔

حکمرانوں کی بابت فرمایا۔یہ ایک ایسا طبقہ ہے جسے سزا ہوتی ہے اُس کو بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔۔وہ قید میں پڑا لوگوں سے ڈرتا رہتا ہے۔

مرتضے بھٹو کے قتل پہ تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔۔یہ سب بہت برے دماغوں کا کھیل ہے۔

مجید صاحب نے کہا۔آپ کے قریب رہتے ہوئے منفی خیالات نہیں آتے۔

فرمایا۔اسی لئے تو مرشد کا قرب ضروری ہوتا ہے۔

پھر کہا۔مجھے خیال نہیں آتے۔۔۔میں یکسو رہتا ہوں۔۔جب آپ کسی ایسے بندے کے قریب جاتے ہیں تو آپ اُس کی ٹرانس میں آجاتے ہیں۔یہ نہیں ہے کہ وہ جان بوجھ کر آپ کو اپنی ٹرانس میں لیتا ہے بلکہ آپ خود بخود اُس کی ٹرانس میں آجاتے ہیں اور منفی خیالات کی رو ختم ہو جاتی ہے۔

ریس کورس گراؤنڈ میں سیر کرتے ہوئے فرمایا۔دنیا میں ہر چیز کا نام رکھا جاتا ہے۔ہر چیز خواہ وہ پہلے سے موجود ہو یا انسان نے اُسے بنایا ہو۔۔اُس کا ایک نام ہوتا ہے۔اب درختوں کو ہی لیجیئے۔کتنی قسموں کے درخت ہیں ہر قسم کے درختوں کا ایک نام ہے۔

پھر پودوں سے لیکر گھاس پھونس ۔۔۔ہر پودے کا ایک نام ہے۔آپ ایک سائیکل بناتے ہیں ۔۔۔اس سائیکل کے ہر ہر پرزے کا ایک نام ہے۔آپ دیکھیں یہ کیسی عجیب صلاحیت ہے۔انسان ہر چیز کو نام سے جانتا ہے۔صلاحیت اُس کے علم الاسماہی کے ضمن میں عطاہوئی ہے۔

طاہر رشید صاحب نے سوال کیا۔کیاایک جگہ کے جانوروں کی زبان دوسرے مقام کے جانوروں کی زبان میں کوئی فرق ہوتاہے؟

فرمایا۔یہ تو وہی بتاسکتاہے جس کو پرندوں کی زبان آتی ہو۔پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔البتہ یہ بات میرے مشاہدے میں ہے کہ اگرایک جگہ کا طوطاٹیں کرکے بولتاہے تودوسری جگہ طوطاٹین کرتاہےاور تیسری جگہ تو بالکل ہی کین کے قریب کی آواز نکالتاہے۔جس طرح مختلف علاقوں کے لوگوں کی زبان ہر دوسو میل کے بعدبدل جاتی ہےاسی طرح پرندوں کی بولیوں میں بھی فرق آجاتاہے۔

ایک جگہ کے درخت کسی دوسری جگہ کے اسی قسم کے درختوں سے مختلف ہوتے ہیں بالکل اُسی طرح جیسے ایک مقام کے لوگ کسی دوسرے مقام سے مختلف ہوتے ہیں۔پہاڑی علاقوں کے لوگ میدانی علاقوں سے مختلف ہوتے ہیں۔یہ سب اختلاف ماحول،فضااور زمین کی وجہ سے ہوتاہے۔

اس کے بعد گفتگو کارخ نقاشی،خطاطی،کندہ کرنے،پچی کاری،مرصع کرنے،شیشہ گری کی تشریح اور فرق واضح کرتے کرتے خواجہ سراؤں کی طرف مڑ گیا۔توفرمایا۔اُن میں بہت بڑے بڑے اللہ والے ہوئے ہیں۔ہر علاقے اور خطے کے ہجڑوں کا ایک سربراہ ہوتاہے۔اس کانام اپنی اپنی زبان کے اعتبار سے پھوپھی عبدالکریم ہوتاہے۔وہ ہر کام اُس کے مشورے سے کرتے ہیں۔

پھر واجد علی شاہ حاکم لکھنو کی بابت فرمایا کہ وہ بھی تیسری جنس سے تھا۔اُس کو شوق تھا کہ اُس کا بچہ ہو۔ محل کے خواجہ سرا اُس کی خواہش کو پورا کرنے کو اُس کو باور کراتے کہ وہ اُمید سے ہے۔۔پھر وقت آنے پر کوئی گڑیا وغیرہ دکھا کر کہتے آپ کا بچہ ہے۔ اس پر باقاعدہ جشن ہوتا کہ بادشاہ سلامت کے یہاں بچہ ہوا ہے۔

انہوں نے فوج بھی انہی ہجڑوں کی بنائی ہوئی تھی۔جب انگریزوں نے حملہ کیا اور اس فوج پہ گولی چلائی تو انہوں نے کہا۔ گورے سپاہیو۔۔دیکھ کر بھائی۔۔ذرا آنکھ منہ بچا کر ماریو۔۔۔آج کل یہ لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔۔لوگ انہیں گھروں میں گھسنے بھی تو نہیں دیتے۔گاؤں دیہات وغیرہ میں شاید اب بھی ہوں۔۔شہروں میں تو بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔

سیر سے واپسی پر رئیس امروہوی کا تذکرہ ہوا تو فرمایا کہ انہوں نے اپنے کالموں سے لوگوں کو مابعد الطبعیات کی طرف متوجہ کیا۔انہوں نے جو کچھ بھی لکھا مطالعہ کے زور پر لکھا۔وہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ میں ذاتی تجربہ نہیں رکھتا یہ سب میرا مطالعہ ہے۔وہ فقیروں کو بابا اور بابے کہا کرتے تھے۔انہوں نے روحانی صائجسٹ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ایک ایسا رسالہ ہے جس کی اردو ٹھیک ہے۔انہوں نے اتنے بڑے اخبار کا کالم نویس ہونے کے باوجود کبھی کسی کے خلاف نہیں لکھا۔یہ بہت بری بات ہے۔

فرمایا۔میں کسی موضوع پہ کتاب پڑھ کر نہیں لکھ سکتا۔اس سے میرا ذہن بند ہو جاتا ہے۔کسی کو کہہ دیتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے بتا دو کہ اس میں کیا کہا گیا ہے۔

اردو کیا کسی بھی زبان میں مہارت پیدا نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ مادری زبان ہی کیوں نہ ہو۔ ایک انگریز نے بہت زور لگایا اور ایک بار سر سید سے کہا۔ میں نے آپ کی زبان پہ مکمل عبور حاصل کر لیا ہے۔ اس پر سر سید نے انہیں کہا۔ چل بے ڈیوٹ کے۔۔ انہوں نے بہت زور دیا لیکن کچھ نہ سمجھے۔ ڈیوٹ چراغ کی لو کو اونچا کرنے والی دندانے دار لکڑی کو کہتے ہیں۔

فرمایا۔ میرے بھائی اکبر صاحب امریکہ سے مجھے ملنے لندن آئے۔ وہاں لوگوں کا پیار اور عقیدت دیکھ کر رو پڑے اور کہا۔ بھائی تم اچھے رہے۔

فرمایا کسی جگہ کوئی پروگرام ہو تو تقریر سے پہلے اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ میرے دل میں کوئی ایسی بات ڈال دے جس کے سننے سے لوگوں کا بھلا ہو جائے۔

پھر انگلینڈ میں اپنے ایک پروگرام کے بارے میں بتایا کہ وہاں ایک پروگرام میں ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دیوبندی اور بریلوی حضرات کافی تعداد میں آئے تھے۔ میں نے کہا۔۔۔ آپ دونوں ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت سے سر فراز ہیں تو پھر آپ اپنا نام مدنی اور مکی کیوں نہیں رکھ لیتے۔ یہ سننا تھا کہ پورا ہال ایک دم ہی خالی ہونا شروع ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سب ہی کھسک گئے۔

اگلی صبح مراقبے کے بعد مراقبہ کرنے میں سستی ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس سے کیسے نجات پائی جائے کہ اُس کا مراد گویا ہوا۔ صبح بستر سے اتر کر کسی مصلے پہ بیٹھ کر مراقبہ کرنے سے سستی غالب نہیں اتی۔ یعنی مراقبے کے لئے بستر سے باہر آکر ہی سستی سے نجات پائی جا سکتی ہے۔ بستر میں ہی بیٹھ کر مراقبہ کرنے سے سستی غالب ہی رہتی ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ لوگ فقیر کو بے وقوف بناتے ہیں۔۔وہ بے وقوف بنتا رہتا ہے۔۔۔اس میں اس کا بھی بھلا ہوتا رہتا ہے اور لوگ بھی خوش رہتے ہیں۔ بھئی کوئی آتا ہے تو کچھ لے کر آتا ہے۔۔۔کوئی آتا ہے تو کچھ لے کر جاتا ہے۔

مرید نے بکری اور دیگر چوپایوں کے بچپن کی نسبت انسان کے بچپن کی طوالت کے زیادہ ہونے کے سبب کا پوچھا تو فرمایا۔
کون کہتا ہے کہ انسان کا بچپن جانوروں کے بچپن کی نسبت زیادہ طویل ہوتا ہے۔ یہ اصل میں عمر کی نسبت سے ہوتا ہے انسان کی عمر بھی تو ان جانوروں سے لمبی ہوتی ہے جن جانوروں کی عمریں زیادہ نہیں ہوتیں اُن کا بچپن بھی مختصر ہی ہوتا ہے۔ مرغی، گھوڑے اور بکری کی مثال دے کر بات کی وضاحت فرما کر کہا کہ بچپن کل عمر کی نسبت سے ہوتا ہے۔

ایک خاتون نے اپنے بچے کی شکایت کی تو فرمایا۔

بچوں کو مارنا نہیں چاہئے۔اس سے بچہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔اُس کو مار کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔مار کھانے کی عادت جسم دبوانے جیسی ہی ہوتی ہے۔ آپ جسم یوں دبائیں یا زور سے چوٹ لگائیں۔۔ایک ہی بات ہوئی۔۔۔بچہ اس عادت کو پورا کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا کہ اُسے مار پڑے۔

مرید نے اس عجب قانون کی بابت غور کرتے ہوئے سوچا کہ قدیم مصریوں نے بنی اسرائیل کو مار کھانے کا اتنا عادی بنا دیا تھا کہ انہیں غلامی سے تو نجات مل گئی لیکن مار کھانے کی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیک سلائیڈ یعنی پیچھے کو پھسلنے کی حرکت سے نجات کا سفر آج بھی جاری ہے۔

فرمایا۔ایک پروگرام کے بعد مجھ سے پوچھا گیا کہ نابینا آدمی مراقبے میں نیلی پیلی روشنیوں کا تصور کیوں کر کرے۔میں نے کہا آپ خود تو کر کے دیکھیں۔۔۔جب کوئی نابینا پوچھے گا تو اُس کو بھی بتا دیں گے۔لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔اب اُس وقت ہال میں کتنے نابینا لوگ تھے۔۔ایک بھی نہیں اور سوال ایسے پوچھ رہے تھے جیسے خدانخواستہ نابیناؤں ہی سے تو خطاب کر رہا تھا۔

'انی جاعل فی الارض خلیفہ' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔دراصل زمین ایک بیلٹ پر گردش کر رہی ہے اور فی الارض کا مطلب ہے۔۔زمین میں۔۔نہ کہ زمین پر۔۔۔انسان کو زمین میں خلیفہ بنایا گیا ہے نہ کہ زمین پر۔۔آپ اسے زمین پر خلیفہ سمجھیں گے تو بات نہیں بنے گی۔

مرید نے بگ بینگ Big Bang اور بگ کرنچ Big Crunch کے نظریات کے حوالے سے سوال پوچھا کہ یہ تھیوریاں حقیقت کے کس قدر قریب ہے؟

فرمایا۔آپ اس بات کو چھوڑیں اور یہ دیکھیں کہ آپ نے کیا کہا ہے اور کیا کیا ہے؟ آپ نے اب تک کوئی نظریہ کوئی تھیوری پیش کی ہو تو بتائیں۔اُس کی بابت بات کریں۔۔۔آپ تو کچھ بھی نہیں۔۔اُن لوگوں نے کچھ نہ کچھ سوچا تو سہی۔۔ چلیں مادی فوائد کے لالچ میں سہی۔۔ بھئی سوچا تو۔۔آپ نے کیا کیا؟

پھر بتایا کہ امریکہ میں ایک شخص نے زمین سے بجلی پیدا کی۔سب نے استعجاب کا اظہار کیا تو فرمایا۔ہر چیز میں بجلی ہوتی ہے۔ ہر شے میں ایک بہاؤ ہوتا ہے۔بالکل اسی طرح جس طرح پانی میں ہوتا ہے۔آپ پانی کے ذرات کی حرکت اور بہاؤ کو بجلی کے بہاؤ میں بدل لیتے ہیں۔۔۔اُس شخص نے زمین کے ذرات کے اندر دور کرنے والے بہاؤ کو استعمال کرتے ہوئے بجلی پیدا کی لیکچ۔۔اس سے

پیشتر کہ بات سامنے آتی اُسے مروا دیا۔۔ شاید اس لئے کہ اس سے لوگوں کو گھر بیٹھے مفت بجلی ملنے لگتی۔۔ بھئی مادی طرزوں میں کوئی کسی کا بھلا دیکھ ہی کہاں سکتا ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں تو کراچی سے عرفان بھائی کا فون آگیا۔ فون پہ عرفان بھائی کی بات سُن کر فرمایا۔ میں کراچی آکر تمہیں بہت پیار کروں گا۔

فون بند کیا تو بتایا کہ بینک کی ملازمت کے دوران عرفان بھائی کو بینک نے نو لاکھ کا مقروض بنا لیا تھا۔ اُس کا سود رعائتی نرخوں پہ چھتیس لاکھ بنتا ہے۔ میں نے اُن سے کہا۔ تم ایک طرف اللہ سے دوستی کرنا چاہتے ہو اور دوسری جانب اللہ سے دشمنی مول رہے ہو۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ تمہیں اللہ سے دوستی کرنا ہے یا دشمنی۔

فرمایا اب انہوں نے بینک کے قرض کی واپسی شروع کر دی ہے اُسی کی بابت انتظام کے حوالے سے اطلاع دے رہے تھے۔ پھر عرفان بھائی کی تعریف کی کہ انہوں نے سود سے پیچھا چھڑانے کی ٹھان لی ہے۔

پھر منصور بھائی کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کتابوں کی تدوین میں میرا بہت ہاتھ بٹایا اور آج کل تو کالم بھی انہی کے ذمے ہے۔ میں بولتا ہوں وہ لکھ دیتے ہیں۔

مراقبہ ہال کی طرف سے بچوں کا ایک پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ بچوں میں جا کر وہ بالکل بچے لگ رہے تھے۔ مسکراہٹ کی لو روشن تر کئے اپنے بچپن کا ایک قصہ سنایا۔۔ جن مولوی صاحب وہ قرآن پڑھنے جایا کرتے تھے۔ بچوں کو مارتے بہت تھے۔ فرمایا۔ ایک روز میں نے سوئیوں کا ایک پتہ خریدا اور لا کر سوئیاں اُن کی گدی میں لگا دیں جس پر بیٹھ کر وہ پڑھاتے تھے۔ جب وہ آکر اس

گدی پہ بیٹھے تو اُن کی چیخ نکل گئی۔ سب کلاس سہم گئی لیکن میری ہنسی نکل گئی۔ انہوں نے میرا سر اپنے گھٹنوں میں پکڑ کر اپنی کہنیوں سے میری کمر پہ بہت مارا۔

اگلے روز سے میں سکول سے اور پھر گھر سے ہی بھاگ گیا اور ایسا بھاگا کہ آج تک واپس نہیں گیا۔

بچوں سے کہا گیا کہ حضور سے جو سوال پوچھنا ہو تو پوچھیں۔ ایک بچے نے کہا۔ آپ ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے۔۔۔ تو فرمایا۔ جب میں لوگوں کو صبح سات بجے سے رات بارہ بجے تک اچھا لگتا ہوں تو یہ مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔

ایک بچے نے سلسے میں داخلے کی عمر کا پوچھا تو فرمایا۔ بھئی سلسلے میں داخلے کا عمر سے کیا تعلق۔۔۔ یہ تو اسباق کے لئے ہوتی ہے۔۔ آپ سب بچے ماشاءاللہ پیدائشی عظیمی ہیں۔

پروگرام کے بعد مرید نے کتاب نظریہ رنگ و نور کے انگریزی ترجمے کا پیش لفظ لکھنے کی بابت رانمائی کی درخواست کی تو دریافت کیا۔ آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں۔۔ مرید نے اجمالی ساخاکہ بیان کیا کہ اب تک پیش کردہ سائنسی نظریات کا تقابلی تجزیہ کرتے ہوئے اُن کی خامیوں اور کمزوریوں کو اجاگر کیا جائے تو کیسا رہے گا؟۔

فرمایا۔ کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی کتاب میں اُن سائنسدانوں کو لا کر یہ کریں گے کہ کوئی آپ کی بات سنن۔۔ آپ کا نقطہ نظر جاننے کے لئے کتاب خریدے اور آپ اُسے آگے کسی اور کے حوالے کر دیں۔۔۔ پھر فرمایا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا حکم ہے کہ آپ کسی سلسلے کو بُرا نہ کہیں۔۔ لہذا آپ بھی کسی نظریے کو رد کرنے کے چکر میں نہ پڑیں۔

مرید کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جس طرح سے وہ سوچ رہا تھا وہ اس قدر غلط تھا کہ سلسلے کے ایک حکم سے براہ راست ٹکرا بھی رہا تھا اور اُس کی سوچ کی منفیت کا بھی آئینہ دار تھا۔ انہوں نے اُس کی سوچ میں کجی کو کس مہارت اور ہنر مندی ست سیدھا فرما دیا تھا۔۔ وہ اُس پہ عش عش کر اُٹھا اور اللہ کا شکر کیا کہ اُس نے اپنے مراد سے اس کی بابت بات کی۔

اُس روز شام کو سیر کرنے گئے تو نیاز صاحب اور میاں مشتاق احمد صاحب بھی ہمراہ تھے۔ آج گفتگو کا رنگ علمی سے زیادہ تربیتی رنگ لئے ہوئے تھا۔ اُن سب کے اندر کہیں بہت کچھ درست ہونے کا تھا۔ پشاور کے پیر صاحب کا تذکرہ ہوا۔ اُن کی بابت یہ مشہور تھا کہ اگر اُن کا کوئی مرید انہیں ایک لاکھ روپے کا نوٹوں کا ہار پہنائے تو اُس کے سارے کام ہو جاتے ہیں۔ نیاز صاحب نے یہ بت کہی تو فرمایا۔

بعض مرید پیر و مرشد کو نذر دے کر حصول دنیا کی آرزو کرتے ہیں۔۔۔ در حقیقت اس میں مرید کا اپنا یقین کام کرتا ہے۔ پھر یک دم بات بدل کر فرمایا۔ اگر کوئی شخص جو مجھ سے مل کر جاتا ہے۔۔ اب اگر وہ کسی مراقبہ ہال کے انچارج سے جا کر ملتا ہے۔۔۔ تو وہ کیا تاثر لے گا۔ اُن کی شخصیت میں میرا کتنا پرتو ہے۔۔۔ وہ لوگوں کو اپنی باتوں سے اپنے افکار اور خیالات سے کیسا تاثر دیتے ہیں؟

ایک بار لندن میں ایک صاحب نے ٹی وی کے لئے میرا پروگرام کرنے کی خواہش کی۔ میں نے اُن سے کہا۔ سعیدہ کو لے جائیں۔ وہ صاحب چپ کر گئے اور پھر اُٹھ کر چلے گئے۔ ٹھیک ہے سعیدہ نے بہت کچھ دیکھا ہے۔۔۔ وہ یہاں آ گئیں۔۔۔ وہ وہاں گئیں لیکن بات کو سائنسی انداز میں واضح کرنا اور اُس کو لوگوں کی فہم کے مطابق بیان کرنا اور ہی بات ہے۔

پھر آداب محفل پہ بات کرتے ہوئے فرمایا۔ آدابِ محفل کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ کوئی صاحب آئے اور آپ نے جماہی لی تو وہ بھاگ جائے گا کہ جس بندے میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اپنی جمائی روک سکے اُس کی بات کیا سننا۔

فرمایا ایک بار زرداری صاحب نے سعودی رائل فیملی کے افراد کے ساتھ ملاقات کے دوران اپنی ٹانگ پہ ٹانگ رکھ دی۔ انہوں نے بہت مائنڈ کیا کہ اس شخص کو بالکل تمیز ہی نہیں۔ یہاں تک کہ آئندہ کے لئے بلیک لسٹ کر دیا۔

اسی طرح ایک بار آپ کی امی حضور ایک بار انگلینڈ میں ایک پروگرام کے دوران آکر سب سے اگلی صف میں بیٹھ گیئں۔۔ ہوتا ہے۔۔ یہ شوق بھی ہوتا ہے۔۔ اُن کے کپڑوں پہ ڈھنگ سے استری تک نہیں تھی۔ کچھ دیر تو انہوں نے سیدھے بیٹھ کر گزار لی پھر وہیں کرسی پہ بیٹھے بیٹھے سو گئیں۔ انگریزوں نے کہا۔ اگر آپ اتنی ہی Tired تھیں تو آپ کو بھلا محفل میں آنے اور سب سے آگے بیٹھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ شرمندہ سی ہو گئیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔

فرمایا۔ آپ کو لباس پہننے کا سلیقہ ہونا چاہیئے۔ جس سے ملنے جا رہے ہیں اُس کو کم از کم آپ کا لباس ناگوار تو نہیں گزرنا چاہیئے۔ ٹھیک ہے آپ فقیر بنتے ہیں تو پھر اپنی جگہ پر بیٹھیں۔۔۔ پھر آپ جیسا بھی لباس پہنیں گے۔۔ جس کو آنا ہو گا خود آئے گا لیکن اگر آپ ایک پیغام لے کر اُس کو پھیلانے کے مشن پر ہیں تو پھر آپ کو لوگوں کے مطابق لباس پہننا ہی ہو گا۔

اب مزید نئے مرید بنانے کی بجائے جو آ گئے ہیں اُن کی تربیت کریں۔

فرمایا۔ نگران مراقبہ ہال کے ذہن اور دل دونوں بڑے ہونے چاہیئں۔۔۔ اُن میں مسائل کو حل کرنے کے لئے جراتمندانہ اقدام کرنے کا حوصلہ اور سلیقہ ہونا چاہیئے۔

پھر اپنی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ ایک بار کراچی میں کسی نے عرس پہ شرارت کی اور اعلان کروادیا کہ عورتوں کا کھانا لگ گیا ہے۔اب عورتوں کا غول کھانے کی طرف لپکا۔ادھر لطیف بھائی پریشان ہوگئے کہ یہ کیا ہوگیا۔میں نے اعلان کروایا کہ عورتیں مسجد میں تشریف لے جائیں۔ابا حضور اُن سے خطاب کریں گے۔سب خواتین نے بات مانی اور مسجد میں آگئیں۔دراصل ہم نے میٹنگ میں یہ طے کیا تھا کہ جب لطیف صاحب کہیں گے کہ کھانا تیار ہے اُس وقت خواتین کو کھانے پہ بلانے کا اعلان کیا جائے گا۔ چناچہ یہ طے ہوا کہ جب تک لطیف صاحب خود آکر نہیں کہیں گے اُس وقت تک کھانے کا اعلان نہیں کیا جائے گا۔

میں صورت حال کا جائزہ لینے خود ادھر چلا گیا۔دیکھا تو حلیم کی صرف سولہ دیگیں آئی تھیں۔میں نے اندازہ لگایا کہ یہ تو کم پڑ جائیں گی۔میں نے ایک دو دیگیں چیک کیں تو دیکھا کہ خوب گاڑھی حلیم تھی۔میں نے پانی گرم کروایا اور دو دیگوں سے تین دیگیں بنوادیں۔اس طرح سولہ دیگوں سے چوبیس دیگیں بن گئیں۔۔لیکن ہجوم خلقت۔۔۔میں نے کہا کہ دو من آٹے کی روٹیاں لے کر آئیں۔۔۔لیکن جب دیکھا کہ ہجوم زیادہ ہے تو میں نے ہال کے قریب جاکر کہا کہ کراچی کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔۔آپ سب کراچی والے بعد میں کھایئے گا۔۔۔یہ سنتے ہی ساڑھے تین سو افراد ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہوگئے اور جب سب مہمان کھا چکے تب انہوں نے کھایا۔

مرید کے ذہن میں دیکھے ہوئے واقعہ کی پوری جزئیات تازہ ہوگئیں۔اُس نے اُس بات کو کرامت ہی جانا تھا۔۔آج اتنے عرصے بعد انہوں نے اپنی کرامت کی شرح کرتے ہوئے اُس کو قوانین فطرت سے مطابقت کی وجہ قرار دیا تھا لیکن اتنی ہڑبونگ میں خواتین کا فی الفور بات ماننا اور ساڑھے تین سو افراد کا محض اپنے مہمان نواز ہونے کا ثبوت دینے کو کھانا کھانے سے احتراز کرنا۔۔۔

کیا یہ کھانا پورا کرنے سے کم درجے کی کوئی کرامت تھی یا آج اُس کے مراد نے اپنی اُس کرامت کو مزید گہرائی میں دیکھنے اور سمجھنے کو یہ بات سنائی تھی۔ ویسے بظاہر تو اُس بات کو سنانے کی وجہ یہ تھی کہ انچارج مراقبہ ہال کو کس دل گردے سے ہنگامی معاملات سے نبٹنا چاہیئے۔

بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ آپ حیلہ تو کریں۔۔اُس میں برکت ڈالنا اللہ کا کام ہے۔ پھر ایک اور واقعہ سنایا۔ میں نے ایک بار لطیف صاحب سے کہا۔ مہمانوں کو کھانے کے بعد حلوہ کھلائیں گے۔ فرمایا اُن کا ذہن ابھی تک اتنا بڑا نہیں ہوا۔ میں نے کامران اور لطیف صاحب پر بہت محنت کی ہے۔ بہر حال وہ کہنے لگے پانچ کلو سوجی کا حلوہ کافی رہے گا۔ میں نے باورچی بابا سے بات کی کہ ایک کلو سوجی میں کتنی چینی اور کتنا پانی ڈالیں گے۔۔اُس سے کتنا حلوہ تیار ہو گا اور اُسے کتنے افراد کھائیں گے۔ پھر میں نے لطیف صاحب کو بلایا اور انہیں کہا کہ دو من سوجی اور دو من چینی کا حلوہ تیار کروائیں۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد شربت آب شفا کی تیاری شروع فرمائی۔ جب شربت ابلنا شروع ہوا تو مرید سے کہا کہ اب یہ پکتا رہے گا اور آپ اس کے اوپر سے میل اکٹھا کر کے اتارتے جائیں۔ مرید نے کرچھا تھاما اور شربت پہ آنے والا میل اتارنے لگا۔ میل اتارتے اتارتے اُس نے اپنے مراد کو اپنی طرف تکتے محسوس کیا۔ تو بات کہنے کو پوچھا یہ میل اتارنا بھی تو 'صفائی' کا عمل ہی ہے۔

فرمایا۔ جی ہاں۔۔ دیکھ لیں بظاہر چینی میں کوئی میل نہیں ہوتا۔۔ لیکن جب اُسے پکاتے ہیں تو صاف شفاف رنگ چینی میں سے بھی میل نکلتا ہے تب جا کر شربت بنتا ہے۔

پھر بتایا کہ ایک تار اور دو تار کے شربت اور چاشنی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ پھر چمچ سے ایک دو قطرے زمین پر گرا کر دکھائے کہ اگر یہ موتی جیسے دکھیں تو سمجھیں شربت تیار ہو گیا۔ اب اسے اتار لیں اور اُس میں خوشبو شامل کر لیں۔

پھر بتایا کہ پھل اور سبزیاں ابالنے سے بھی اُن کا عرق پانی میں آجات ہے۔۔۔میں چاہتا تو ہوں کہ یہ عرق عمل کشید کے ذریعے نکالوں لیکن اب یہاں 'کردار بختی 'یعنی عمل کشید والا برتن نہیں ہے تو یوں ہی سہی۔

مرید نے عرض کی کہ اُس نے سوچا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو نوکریاں کروانے کی بجائے اپنے کاروبار میں اپنے ساتھ لگا لے۔۔اس طرح اُن میں اتفاق اور اتحاد بڑھے گا اور پھر اُن کی بیویاں بھی انہیں ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکیں گی۔

فرمایا۔نہیں ایک کاروبار بھی اولاد کو ایک نہیں رکھ سکتا۔بچوں کو اپنی زندگی میں ہی الگ الگ بنیادوں پر استوار کر دینا چاہیئے۔

پھر اپنے بچوں کی بابت بتایا کہ کس طرح انہوں نے ہر بچے کے لئے الگ کاروبار اور الگ پلاٹ کا بندوبست کیا۔اب میرے پانچ بیٹے ہیں اور پانچ ہی کاروبار ہیں۔مکتبہ روحانی ڈائجسٹ اور پرنٹرز، مکتبہ تاج الدین، عظیمیہ دواخانہ، الکتاب پبلشرز۔۔ہر ادارہ ایک ایک بچے کو دیا جا چکا ہے۔وقار بھائی جان، فرخ اعظم اور سلام عارف کو میں نے پلاٹ لے کر دیئے اب انہوں نے مل کر نورِ عجم کو لے دیا ہے۔اب شاہ عالم رہتے ہیں۔اللہ نے چاہا تو اُن کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔

شاہین نے کہا۔آپ نے ہمیں بھی تو پلاٹ دلوایا ہے۔خوش ہو کر فرمایا۔ماشاءاللہ اس وقت تک وہاں انیس عظیمیوں کے پاس پلاٹس ہیں۔عرفان اور حامد نے تو اپنے پلاٹوں پہ گھر بھی بنا لیئے ہیں۔اب تو لوگ استقبالیہ پہ آکر کہتے ہیں کہ ہمیں پلاٹ چاہیئے۔یہاں کوئی پلاٹ مل جائے گا۔

پھر فرمایا کہ لوگ معاش اور روزگار کے چکر میں صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں اور میں صرف چار گھنٹے کاروبار کو دیتا ہوں اللہ اُسی میں میری پوری کر دیتے ہیں۔ کسی نے سوال پوچھا کہ کیا ایمرجنسی کے لئے بھی کچھ نہیں رکھنا چاہئے تو فرمایا۔ دس بیس ہزار روپے رکھنا کافی ہوتا اس سے زیادہ کیا کرنے ہیں۔

پھر ایک صاحب کا تذکرہ فرمایا۔ جو کسی بنک کے سربراہ تھے۔ بتایا کہ وہ انیس ہزار سے زیادہ افراد کے سربراہ تھے۔ اُن کی اصل خوبی یہ تھی کہ اُن کے اندر معافی کا خانہ بہت بڑا تھا۔

اتنے میں قاضی مقصود صاحب بھی آ گئے۔ دورانِ گفتگو انہوں نے دریافت کیا۔ حضور فلاں کتاب میں ایک تعویذ کو جلا دینے کا لکھا ہے اس سے کہیں لوگ ہمارے خلاف ہی نہ جائیں آج کل یوں بھی قرآن کو جلانے کے خلاف مہم کچھ زیادہ ہی زوروں پر ہے۔

قاضی صاحب کی تعویذ کو قرآن کے برابر قرار دینے کی حرکت سے صرف نظر کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ کہہ دیا کریں کہ تعویذ کو پانی میں بہادیں یا اُسے زمین میں دفن کرنے کا کہہ دیا کریں۔۔ قاضی صاحب جانے کیا سوچ کر آئے تھے انہوں نے مرشد کی بات سنی تو ضرور لیکن اپنی بات پہ اصرار جاری رکھا۔ اس پہ حضور نے کسی بھی قسم کا تبصرہ نہیں کیا اور وہاں سے اُٹھ کر چل دیئے۔

شام کو سیر کے لئے جاتے ہوئے عثمان صاحب کی بابت بتایا کہ و نہاں نے ایک عجیب بات کہی کہ جب بھی کوئی پروگرام

ہوتا ہے تو اُس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کتنے فیصد افراد میری بات سُنیں گے۔ فرمایا۔ میں نے اُن سے کہا مجھے پینتیس سال ہو گئے یہ کام کرتے۔۔ مجھے تو آج تک اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں تو بس اپنا کام کئے چلا جا رہا ہوں۔۔ پھر کہا شاید وہ کاروباری آدمی ہیں۔۔۔اس لئے نفع نقصان کا حساب کرتے رہتے ہیں۔۔ شاید ٹھیکیدار ہیں جو سپلائی کا کام کرتے ہیں۔

مجید صاحب نے گاڑی ایک چائنیز ریسٹورنٹ کے قریب روکتے ہوئے دریافت کیا۔ ابا حضور۔۔ سوپ پینا پسند کریں گے ؟

فرمایا۔ سوپ پی کر بتائیں گے کہ پسند آیا یا نہیں۔

کھانے کے بعد نیاز صاحب اور میاں صاحب بل دینے میں سبقت لے جانا چاہ رہے تھے۔ نیاز صاحب نے میاں صاحب سے کہا۔ آپ مجھے موقع دیں کہ میں بل ادا کر دوں۔۔ اس پر فرمایا۔

آپ دونوں مجھے اجازت دیں۔ ورنہ میری جیب میں پڑے پیسے احتجاج کرنا شروع کر دیں گے کہ ہمیں خرچ کرو۔ مجید صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ بل تو وہ ادا کر چکے ہیں۔

اگلے روز وہ پشاور واپس جا رہے تھے۔۔ جانے سے پہلے نیاز بھائی نے مرشدِ کریم سے پشاور آنے کا وعدہ لیا تو فرمایا۔ میں سوات جانا چاہتا ہوں۔۔۔ سوات کی خاطر آنا پڑے گا۔

مور کے پر جیتھے چھائے

ایک ماہ بعد حضور پشاور تشریف لائے۔ ورسک روڈ پہ مراقبہ ہال کے لئے خریدی گئی زمین دیکھ کے فرمایا۔ یہاں قبرستان کے لئے زمین لیں اور وہاں چار دیواری نہیں تو باڑ لگا کر عظیمیوں کے لئے ایک احاطہ مخصوص کر لیں اور پھر اُسے یونہی نہ چھوڑ دیں بلکہ اُس کی دیکھ بھال کریں وہاں پودے لگائیں۔ قبرستان میں ایک حسن اور ترتیب ہونی چاہئے۔

فرمایا۔ مردے تبھی اپنی قبروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جب وہاں کوئی آتا جاتا رہے۔

پھر ایک حکایت سنائی کہ ایک بار کسی مسافر نے راہ میں بیٹھے ایک فقیر سے بستی کا راستہ پوچھا۔ اُس نے اشارے سے کہا۔۔اُدھر۔۔وہ مسافر چلتے چلتے قبرستان جا پہنچا۔ قبرستان دیکھ کر بہت ناراض ہوا۔ واپس ہوا اور فقیر کے پاس پہنچ کر کہا۔ میں نے تم سے بستی کا پوچھا تم نے مجھے قبرستان کا راستہ بتا دیا۔ فقیر بولا۔ مجھے یہاں بیٹھے سالوں ہو گئے ہیں۔ ادھر سے جو بھی گیا۔۔واپس نہیں آیا۔۔اصل بستی وہی ہوئی نا۔

پھر اپنا ایک واقعہ سناتے ہوئے فرمایا۔ ایک بار اچانک مجھے قبرستان جانے کا شوق چرایا۔ میں قبرستان چلا جاتا ادھر اُدھر گھومتا رہتا اور قبروں کے کتبے پڑھتا۔ ایک روز میں نے ایک قبر پہ بہت خوبصورت سے لگی باڑ وغیرہ دیکھی۔ بیٹھنے کی جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ بیلیں وغیرہ لگا کر ٹھیک ٹھاک جگہ بنائی ہوئی تھی۔ میں نے جا کر وہاں بیٹھنا شروع کر دیا۔ فاتحہ کے بعد مراقبہ وغیرہ کیا کرتا۔ ایک روز صاحبِ مزار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا وہ تکلیف میں ہیں۔ مجھے ترس آ گیا۔ میں نے اُن کے لئے دعا کی اور جو کچھ کر سکتا تھا کیا۔ اللہ نے کرم کیا۔ اُن کی تکلیف ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اچانک ہی میرا شوق ختم ہو گیا۔ اب نہ قبرستان جانا اور نہ کتبے پڑھنا۔ ایک روز میں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ صاحب اپنی زندگی میں بہت امیر کبیر تاجر تھے۔ اُن

میں ایک خوبی تھی کہ وہ فقیروں سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ محض اس عقیدت کی وجہ سے اللہ نے مجھے وہاں بھیجا کہ میں اُن کے لئے کچھ کروں۔

اتنا کہہ کر آپ خاموش ہوگئے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی اور پنڈال میں بیٹھے سبھی لوگ آپس میں بات کرنے لگے۔ کچھ انتظامات کی بات کر رہے تھے کہ چائے کہاں لگائی جائے۔۔مردوں کو الگ دی جائے۔۔خواتین کے لئے انتظام کہاں ہو۔۔۔اور کچھ اُن کی بتائی گئی باتوں پہ اپنا اپنا تبصرہ کر رہے تھے۔

مرید نے دیکھا کہ حضور کی طرف کوئی متوجہ نہیں تو وہ کھسک کر قریب ہو بیٹھا اور کچھ توقف کے بعد سبع من المثانی۔۔۔سات دہرائی جانے والی آیات اور قرآن حکیم عطا کرنے کے حوالے سے دریافت کیا کہ جب قرآن عظیم کا عطا کیا جانا فرما دیا تو پھر سات دہرائی جانے والی آیات کو الگ سے بیان کرنے میں کیا حکمت ہے اور یہ کونسی سات آیات ہیں؟

فرمایا۔کہتے ہیں کہ یہ سورہ فاتحہ کی طرف اشارہ ہے۔آیت تو نشانی کو کہتے ہیں۔پھر سورہ فاتحہ کی ساتوں آیات کی ایک ایک کر کے تلاوت فرماتے ہوئے۔۔اُن کا ترجمہ کر کے بتایا کہ سات نشانیاں۔۔زمین و آسمان، آب و جل اور بارش، جمادات، نباتات، حیوانات بشمول چرند پرند اور حشرات، فرشتے جنات اور انسان سبھی کچھ ہیں۔

رب العالمین یعنی عالمین کو وسائل فراہم کرنے والی ہستی۔۔مالک یوم الدین۔۔حشر نشر۔۔روزِ حساب۔۔۔جس روز ریکارڈ دہرایا جائے گا۔۔یعنی ایک فلم ہے اس کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔۔اُس سے ہر بار ایک نیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔یہ نہیں کہ آپ ایک ہی بات کو بار بار دیکھ کر عادی ہو جائیں گے۔۔آپ ہر روز سورج دیکھتے ہیں کیا آپ عادی ہو گئے؟

عبادت اور استعانت کی کی درخواست اور ایاک یعنی یہ عہد کہ اسی ذات سے استعانت طلب کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ صراط مستقیم۔۔۔ پیغمبروں کا راستہ۔۔انعام والے لوگ یعنی پیغمبروں کی تعلیمات پر عمل کرنے والے لوگ۔۔اولیا کرام اور اُن کے پیروکار۔۔۔اور غیر المغضوب۔۔یعنی وہ باقی تمام لوگ جو انعام والے نہیں ہیں۔

فرمایا۔ من المثانی۔۔یعنی یہ سب نشانیاں دہرائی جاتی ہیں۔۔۔دہرائی جانے والی ہیں۔ بھئی اسی لئے تو حضور نے اس سورۃ کی تلاوت ہر نماز کی ہر رکعت میں کرنا لازم فرمایا ہے لیکن کوئی غور کرے تو معلوم ہو۔

جونہی حضور کی بات مکمل ہوئی۔۔اقبال قریشی صاحب نے چائے پینے کی دعوت اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں دی۔۔ حضور مسکراتے ہوئے صوفے سے اُٹھ کر اس طرف چل دیئے جہاں چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔

اس دوران یہ بات بھی طے ہوگئی کہ صبح ابا حضور بذریعہ جہاز سوات جائیں گے اور باقی سب لوگ گاڑیوں اور بسوں میں سوات جائیں گے۔ایڈوانس پارٹیاں اعلیٰ الصبح روانہ ہوں گی۔

شام تک موسم نے پلٹا کھایا۔ گنگھور گھٹائیں چھا گئیں۔ خبر آئی کہ موسم کی صورت حال کے پیشِ نظر ہو سکتا ہے کہ صبح پرواز نہ جا سکے۔ مزید تفصیلات کے لئے صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ مرید نے یہ جاننے کے لئے صبح دم فون کیا تو معلوم ہوا کہ فلائٹس کینسل ہوگئی ہیں اور اب پروگرام یہ ہے کہ ابا حضور اور میاں مشتاق احمد مرید کے ہمراہ سوات گاڑی میں جائیں گے۔ مرید اس سعادت پہ پھولا نہیں سما رہا تھا کہ وہ اُس گاڑی کا ڈرائیور ہوگا جس میں اُس کا مراد بیٹھے گا اور وہ بھی مسلسل سوات تک جانا وہاں گھومنا پھرنا اور پھر واپس آنا۔

پشاور سے نکلے تو تیز بارش شروع ہوگئی۔ گاڑی کے شیشے بند کیے تو نمی نے انہیں دھندلا دیا۔ گاڑی کا ہیٹر کام کرنے سے انکاری تھا۔ مرید کو گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ گاڑی کا شیشہ کپڑے سے بار بار پونچھنا پڑ رہا تھا۔ نمی شیشوں سے باہر کا منظر دھندلا رہی تھی۔

اس دوران میاں صاحب نے مرشد کریم سے کہا۔ میں نے مقصود صاحب سے فرمائش کی ہے کہ سفر نامے کی طرز پہ ایک کتاب لکھ کر دیں تو اُسے چھاپ میں دوں گا۔ اس پر مرشد کریم نے فرمایا۔ ہاں بھئی کیوں نہیں۔۔ پھر اُسے مخاطب ہو کر فرمایا۔ انیسہ عرفان نے جو سفر نامہ ایران لکھا وہ بہت مقبول ہوا۔ لوگوں نے اُسے بہت پسند کیا۔ بھائی جان نے بھی اُس پہ بہت محنت کی۔ کئی میٹنگیں ہوئیں۔ ایک عورت ہو کر۔۔۔۔ پہلی بار لکھا اور اچھا لکھا۔

میاں صاحب نے تبصرہ کیا۔ اُس میں آپ کی باتیں بہت کم تھیں اور ایران بہت زیادہ تھا۔

فرمایا۔ میں اور آپ کی امی بیٹھے رہتے تھے۔۔ یہ لوگ سیر کرتے گھومتے پھرتے تھے۔۔ اب ہم پہاڑوں پہ چڑھ بھی تو نہیں سکتے نا۔۔ وہاں کوئی زیادہ باتیں بھی تو نہیں ہوئیں۔۔۔ اب خاموش رہنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ پہلے بہت بولا کرتا تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا گویا اندر کوئی ٹیپ ریکارڈر لگا ہو۔۔۔ ہر وقت بولتا رہتا تھا۔۔ جو بات بھی اللہ ذہن میں ڈالتا جی چاہتا کہ سب کو سناؤں۔۔ لیکن اب ساتھ میں یہ خیال آجاتا ہے کہ کیا فائدہ؟ اللہ نے یہ بات اب جا کر کہیں مجھے سمجھائی میں اُس کو کسی کے سامنے بیان کروں بھی تو کیا۔۔ جب اللہ سمجھانا چاہے گا تو وہ خود ہی سمجھا دے گا۔

پھر مرید سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ آپ یہ کتاب ضرور لکھیں۔ ویسے لوگ ماورائیت کی باتیں شوق سے پڑھتے ہیں۔

مرید سوچ میں پڑ گیا کہ ماورائیت سے کیا مراد؟ انہوں نے کس خوبصورتی سے میاں صاحب کے تبصرے کا ڈنک بے اثر کر دیا تھا۔ کیا یہ ماورائیت نہیں ہے؟ کیا بادلوں سے اوپر اڑان ہی نام ماورائیت ہے؟ ابھی اُس کی سوچ یہیں تک پہنچی تھی انہوں نے ارشاد فرمایا۔ بھئی آپ نے تو بادلوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

مرید نے تنبیہ کو ستائش جانے کی غلطی کی اور خوش ہوا۔ بارش کی بوچھاڑ میں اچانک Diversion کا ایک بورڈ نگاہوں کے سامنے ابھرا۔ مرید نے یکبارگی بریک کو دبایا اور سڑک کے عین بیچ میں رکھے بورڈ سے بچنے کو اسٹیئرنگ گھمادیا۔۔ گیلی سڑک پہ یکبارگی بریک لگانے سے گاڑی پھسلتی ہوئی دو رویہ سڑکوں کے درمیان نشیب میں ایک درخت کو کچلتی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

جھٹکا لگنے سے گاڑی کے اندر پڑا گلاس اچھلا۔۔ ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور کرچی کرچی ہوگیا۔ گاڑی اور اس میں سوار سب بالکل محفوظ ومامون تھے۔ مرشد کریم نے مرید کو تسلی دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ خیر ہوگئی۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ پھر میاں صاحب کی خیریت دریافت کی۔ میاں صاحب نے اپنی خیریت کا بتا کر حضور کی خیریت کا پوچھا۔

مرید اپنی لاپرواہی پہ شرمندہ گنگ بیٹھا تھا کہ قافلے کی تمام گاڑیوں سے لوگ اتر کر دیوانہ وار اپنے مرشد کی گاڑی کی طرف لپکے چلے آئے۔ نیاز صاحب اور اُن کے دیگر ہمراہی بارش کی پرواہ کئے بغیر گاڑی کو دھکیل کر اُسے نشیب سے نکالنے کی تگ ودو کرنے لگے۔ حضور نے دروازہ کھولا اور گاڑی سے اترتے ہوئے فرمایا۔ خواتین پریشان ہو رہی ہوں گی۔۔ میں ذرا اُن کو تسلی دے دوں۔

آپ پیچھے کھڑی گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ نیاز صاحب نے یہ دیکھ کر کہ گاڑی کو وہاں سے دھکیل کر نہیں نکالا جاسکتا۔۔۔ وہاں سے گزرتے ایک ٹرک والے سے مدد کی درخواست کی۔ ٹرک والے نے کلینر کو کچھ کہا۔ وہ ٹرک کے اوپر چڑھا اور ٹول بکس سے

ایک لمبی سی رسی کا گچھا نیچے اتارا۔ رسی کو ٹرک کے اگلے حصے اور گاڑی کے پیچھے باندھ کر ڈرائیور کو پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ گاڑی ٹرک کے زور سے پیچھے ہٹی تو اُس کے نیچے دبا درخت ابھرا اور سرو قامت کھڑا ہو گیا گویا اُس نے گاڑی کو تھامنے کی ڈیوٹی پوری کر دی تھی۔

حضور یہ دیکھ کر گاڑی روانگی کے لئے تیار ہے نیاز صاحب کی گاڑی باہر آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مرید نے سوچا اگر مرشد کریم اُس کے ساتھ گاڑی میں مزید سفر کرنے سے انکار کر دیتے تو اُس پہ کیا بیتتی۔۔ کیا پھر کبھی دوبارہ اسی اعتماد سے گاڑی چلا سکتا؟۔۔ سب نے کہا بھی کہ اس گاڑی کا ہیٹر درست نہیں۔۔ اس گاڑی میں سفر غیر محفوظ ہے۔۔ ابھی تو سفر شروع ہی ہوا ہے اور مقصود صاحب کے حواس بے قابو ہو رہے ہیں۔۔۔ آگے جا کر تو ملاکنڈ اور سوات لہراتی سڑکوں پہ سفر اور بھی خطرناک ہو جائے گا۔ لیکن وہ سب کو تسلی دیتے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

اس حادثے پہ فقط اتنا تبصرہ کیا کہ باہر ممالک میں کہیں راستے میں ٹریفک کو ناگہانی موڑ نا ہو تو میلوں پہلے سے آگاہ کرنے کو بورڈ کھڑے کئے جاتے ہیں۔ یہاں کی طرح نہیں کہ موڑ کے عین اوپر جہاں راستہ بند کیا وہیں ایک بورڈ لٹکا دیا۔

پھر امریکہ کے حوالے سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ وہاں حکیم فیاض صاحب ہیں۔ بہت اچھے سرجن ہیں۔ جب وہ ڈاکٹری پڑھ رہے تھے تو انہوں نے مجھے فون کیا کہ میں کیا پڑھوں؟ میں نے کہا بھئی مجھے تو سرجن اچھے لگتے ہیں۔ کہنے لگے وہ تو میں کر ہی نہیں سکتا کیوں کہ جب میں نشتر پکڑتا ہوں تو میرے ہاتھ کانپتے ہیں۔ میں نے کہا اگر کرنا نہیں تھا تو پوچھا کیوں؟۔۔ مشورہ کیوں لیا۔۔ انہوں دوبارہ پوچھا۔۔ میں نے پھر وہی جواب دیا۔۔ اب ماشاءاللہ خیر سے وہ بہت کامیاب سرجن ہیں۔ ایک بار جب میں اُن سے ملنے گیا تو پتہ چلا کہ اُن کے یہاں اولاد نہیں۔۔ میں نے کہا۔ کیا بات ہے میاں تم بانجھ ہو یا تمہاری بیوی۔۔ کہنے لگے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔ صرف یہ سوچا ہے کہ جب تک ہم یہاں امریکہ میں ہیں۔۔۔ بچے نہ ہی ہوں تو اچھا ہے۔۔ یہاں کا ماحول بچوں کے

لیے اچھا نہیں ہے۔ میں نے اُن سے کہا۔ بھئی مجھے تو بچے اچھے لگتے ہیں۔۔اگر تم بچے نہیں لاؤ گے تو میں آئندہ تمہارے گھر نہیں آؤں گا۔ وہ کچھ زیادہ ہی دوراندیشی کر رہے تھے۔اب ماشاءاللہ اُن کے تین بچے ہیں۔اُنکی بیوی بھی ڈاکٹر ہیں۔

خیر سے سوات پہنچے تو سندر سنگھ کے یہاں بھی گئے۔ گروہی تقسیم پہ بات ہوئی تو فرمایا۔آپ نے اس ماہ کا صدائے جرس نہیں پڑھا۔پھر اپنا بیگ منگوا کر روحانی ڈائجسٹ نکال کر مرید کو دیا اور پڑھنے کو کہا۔

پھر فرمایا کہ دنیا ایثار پر قائم ہے۔ہر چیز دوسری چیز کو کھا رہی ہے۔ایک طرف انسان گندم کو کھا رہا ہے تو دوسری طرف گندم انسان کو کھا رہی ہے۔اگر صرف انسان گندم کو کھا رہا ہوتا تو آج گندم ختم ہو چکی ہوتی۔گندم نے خود کو انسان کے سامنے پیش کیا کہ مجھے کھاؤ۔موم بتی جلتی ہے تو روشنی ہوتی ہے گویا روشنی موم بتی کو کھاتی اور موم بتی روشنی کو۔۔۔اب باقی کیا بچا؟سب نے کہا ۔۔کچھ نہیں۔

فرمایا۔ایثار بچا۔

کچھ توقف کے بعد فرمایا۔سب پھل ایک ہی طرح بننے کے باوجود ایک سے نہیں ہوتے بلکہ مختلف ہوتے ہیں۔آپ ایک ٹرے میں مختلف پھل رکھ کر اُن پر غور کریں۔

سوات میں رہنے والے سلسلے کے ایک بھائی نے سوال کیا کہ جو لوگ تصرف کر سکتے ہیں وہ مسلمانوں کی حالت سدھارنے کے لئے تصرف کیوں نہیں کرتے ؟ مثلاً جب کوئی اسم اعظم سیکھنا چاہتا ہے اور وہ سیکھ بھی لیتا تو وہ اُسے دوسروں کے فائدے اور بھلے کے لئے استعمال کیوں نہیں کرتا؟

فرمایا۔اس لئے کہ وہ اللہ کے قوانین کو آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ایک قانون بنادیا ہے کہ آپ جس حالت میں رہنا چاہتے ہیں۔۔رہیں۔۔کوئی آپ کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔اب اگر آپ کوئی اچھا کام کرنا چاہتے ہیں تو اصحاب تصرف کر کے آپ کی مدد کرتے ہیں مگر کسی بُرے کام میں آپ کی مدد نہیں کرتے۔

فرمایا۔یورپی اقوام کے لئے تسرف ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کے اہل ہیں۔۔آپ اس کے اہل ہو جائیں گے تو آپ کے لئے بھی ہو گا۔آپ اپنی حالت سدھارنا چاہتے ہیں تو حکومتوں سے توقع نہ رکھیں۔اپنی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بنالیں اور مل جل کر کام کریں۔۔ایجادات کریں۔حکومتوں نے تو ہمیشہ ایجادات کرنے والوں کو سزا دی ہے۔گیلیو کو پھانسی کی حکم دے دیا کہ اُس نے دور بین کیوں بنائی۔ بھئیحکومت کو کیا پڑی ہے کہ آپ کی مدد کرے۔آپ کوئی ایجاد کر لیں اور اگر کامیاب ہو گئی تو حکومت کی طرف سے گرانٹ بھی مل جائے گا اور اُس پہ ٹیکس بھی لگا دیا جائے گا۔آپ اس پہ نہ بیٹھیں کہ حکومت آپ کی مدد کر کے آپ کی ایجاد مکمل کرادے گی۔آپ تو اپنے گھروں کے کوڑا کرکٹ کی صفائی کے لئے بھی حکومت ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔جو کام آپ کے کرنے کے ہیں۔۔وہ تو آپ کو خود کرنے چاہیئں۔

پھر جانے کیسے بات کارخ مرشد کی کہی بات نہ ماننے اور اُس کے انجام کی طرف مڑ گیا۔فرمایا۔بڑے پیر صاحب ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ نے وصیت کی فلاں صاحب کو میرا نائب اور خلیفہ ہونا چاہیئے۔اُن کے بعد اُن کی گدی پہ اُن کے بیٹے کو بٹھا دیا گیا۔۔وہ جب تک زندہ رہے اونگھتے ہی رہے اور جوانی میں ہی فوت ہو گئے۔اُن سے وہ انوار برداشت ہی نہ ہو سکے جو گدی کے متعلق تھے۔اُس کے بعد اُن کے دوسرے بیٹے کو اُن کی جگہ بنا دیا گیا مگر اُن کو پھر بھی نہ بنایا جن کی بابت انہوں نے نصیحت کی تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔مرید کے اندر کوئی گویا ہوا۔نافرمانی کا تو یہی انجام ہوتا ہے۔

مرشد کی ذات سے متعلق انوار کا تذکرہ سن کر نیاز صاحب ، میاں صاحب اور ہمایوں صاحب تربیتی پروگرام میں اپنی شرکت کے حوالے سے بتارہے تھے کہ وہاں سے آنے کے بعد کئی دن تک یہی محسوس ہوتا رہا تھا کہ ابا حضور ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ پاؤں رکھتے کہیں تھے اور پڑتا کہیں اور ہی تھا۔ حضور ان کی باتیں سنتے مسکراتے رہے فرمایا۔ جی ہاں تصرف کے اثرات ہوتے ہیں۔

میاندم چلنے لگے تو نیاز صاحب نے دریافت کیا۔ آپ کس گاڑی میں تشریف رکھیں گے ؟ فرمایا۔ جمشید کی گاڑی ٹھیک رہے گی۔۔ مقصود صاحب تو مجھے دیکھ کر جذبات میں آجاتے ہیں۔

راستے میں ایک جگہ دیکھ کر قافلے نے پڑاؤ کیا۔ بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان لہراتی بل کھاتی سڑک کے کنارے ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔۔ اُس کے ایک سرے پر ایک پتھر لگا کر اُسے بطور مسجد استعمال کا عندیہ دیا گیا تھا۔ حضور کے لئے چادر بچھا کر جگہ بنائی گئی۔ سب انہیں گھیرے میں لے کر بیٹھ گئے۔ منظر کی خوبصورتی دیکھ کر نیاز صاحب کو مرشد کی تصویر اتارنے کا خیال آیا اور پھر چونک کر بولے۔۔ افوہ۔ کیمرہ تو میں وہیں سوات بھول آیا ہوں۔۔ مسکرا کر کہا۔۔ آپ کیمرہ اس لئے بھول آئے کہ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کیمرہ رہ جائے۔۔ کیمرہ اس لئے رہ گیا کہ آپ بار بار اس بات کی تکرار کر رہے تھے کہ کہیں رہ نہ جائے۔۔ لہذا وہ رہ گیا۔

انسانی شعور کی کتنی ہی ادائیں ایسی ہیں جنہیں سمجھنا محال ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے کس سہولت سے انہیں یہ بات تعلیم فرمادی کہ وسوسے اور خدشے کی ایک صورت یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ آپ جس شے کی بابت جس قدر متفکر ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے تو ویسا نا ہو گویا ہم نے خود ہی طے کر دیتے ہیں۔

فرمایا کہا فراسیاب اور حضرت لوط علیہ السلام کی عمر ایک ہزار پچاس سال تک ہوئی کیونکہ اُن کا ذہن ایسا تھا کہ وہ کسی کیفیت میں Invole نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً اگر انہیں اطلاع ملتی کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے تو وہ کہتے۔۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔۔ سبھی جانداروں کی اولاد ہوتی ہے۔ اگر بتایا جاتا کہ فلاں مر گیا تو وہ کہتے سبھی نے مرنا ہے۔

میاندم ایک ہوٹل میں چائے کے لئے رُکے۔ سڑک کنارے شروع ہو کر ہوٹل پہاڑ کے ساتھ ساتھ زینہ بہ زینہ بلند ہوتا، انگریزی طرز تعمیر کی جھلک لئے، تین چار منزلوں میں بنا ہوا تھا۔ اس کے لان میں فوارے اور موسمی پھولوں کی فراوانی نے منظر کو دلفریب بنا دیا تھا۔ چائے پینے کے دوران بات بکریاں چرانے کے حوالے سے شروع ہو کر پہاڑوں میں رہ کر ریاضتوں اور مجاہدوں تک آ پہنچی تو فرمایا۔ یہاں اس ہوٹل جیسی عمارت لے کر اس سلسلے کے افراد کے لئے ایک تربیتی ادارہ بنا دیا جائے۔ سالکین آ کر یہاں رہیں۔ سال چھ ماہ قیام کریں۔ اس پروگرام میں تین تا چھ ماہ بکریاں چرانا بھی شامل ہو۔ سب نے تجویز کی تائید کی اور سراہا۔ واہ ایسا ہو جائے تو مزہ ہی آجائے۔ نیاز صاحب نے تجویز دی کہ اسی ہوٹل کو خرید لیا جائے۔

مرشد کریم نے دریافت کیا۔ اس ادارے کو چلانے کے لئے یہاں کس کو بٹھائیں گے۔ نیاز صاحب نہ جانے کیا سوچ کر مرید سے سرگوشی کی۔ آپ کہیں کہ آپ تیار ہیں۔ مرید سن کر لرز گیا۔ اُس نے عرض کی میں ایسا نہیں سمجھتا۔۔ ہاں اگر حضور خود حکم دیں تو پھر میں تیار ہوں۔ انہوں نے کمال سادگی سے مرشد کریم کو مخاطب کر کے کہا۔ حضور! مقصود بھائی کہہ رہے ہیں کہ اگر ابا کہیں تو میں تیار ہوں۔ آپ انہیں کہہ دیں یہاں رہیں اور اس ادارے کا انتظام کریں۔ مرشد کریم نے نظر بھر کر نیاز صاحب کو دیکھا۔ سب انہیں دیکھنے لگے کہ اب وہ کیا کہیں گے۔ کچھ تامل کے بعد فرمایا۔ ابھی مقصود صاحب کے بچے چھوٹے ہیں۔۔ اُن پہ اپنے بچوں کی ذمہ داریاں ہیں۔

چائے سے فارغ ہو کر پورے ہوٹل کا باقاعدہ معائنہ ہوا۔ اب سب اسے ایک مختلف حوالے سے دیکھ اور پرکھ رہے تھے۔ استقبالیہ پہ ایک صاحب اس کے مالکوں کا پوچھ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کراچی کا کوئی سیٹھ ہے۔ انہوں نے اُس کا نام پتہ لا کر ابا کو دیا تاکہ کراچی میں اُن سے رابطہ کرکے اس ہوٹل کا سودا کیا جا سکے۔

ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میاں صاحب نے کہا کہ انہوں نے زندگی میں سفر بہت کئے ہیں۔ سلسلے میں آنے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

فرمایا۔ سفر کرنا فقیر کی خاصیت ہوتی ہے۔ آپ تو شروع سے ہی فقیر ہیں۔ پھر فرمایا مور کے پر حتّے چھتائے ہوتے ہیں یعنی پر مکمل ہونے سے پہلے ہی یہ طے ہو چکا ہوتا ہے کہ ان پروں پر کیسا ڈیزائن ابھرے گا۔

سوات واپس پہنچے۔ سندر سنگھ کے گھر کے ساتھ بنے ایک وسیع و عریض مہمان خانے میں قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ رات کھانے کے بعد سوال جواب کی نشست رہی۔ پھر یہ کہتے ہوئے اُٹھ گئے کہ صبح مراقبے کے لئے آنکھ نہیں کھلے گی۔۔۔۔ سو جائیں۔

صبح ناشتے کے بعد مینگورہ سے آگے مدین کے قریب پکنک کا پروگرام تھا۔ وہاں گئے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے دوپہر ہو گئی تو دریا کنارے ایک جگہ دیکھ کر نیاز بھائی نے دریاں چادریں بچھانے کا حکم دیا۔ وہاں جگہ جگہ بھینسوں کے سوکھے گوبر بھی پڑے تھے۔ کچھ افراد چولہا جلانے، کھانا پکانے میں لگ گئے۔ ایک دو افراد کو۔۔ گاڑی دے کر۔۔۔۔ قریب کے کسی تنور سے روٹیاں لانے بھیجا گیا۔ کھانا پکنے اور روٹیاں آنے میں سہ پہر ہو گئی۔۔ کھان کھاتے کھاتے چار بج گئے۔ مرشد نے دھوپ کا چشمہ لگا لیا تھا۔

مرید نے انہیں دھوپ کا سیاہ چشمہ پہنے دیکھا تو اُس کو کچھ یوں محسوس ہوا گویا انہوں نے خود کو اپنے ارد گرد کے ماحول سے

بے تعلق سا کر لیا ہے یا جیسے وہ اُن سے کچھ دور ہٹ گئے ہیں۔ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہ وہاں نہیں ہیں۔۔۔ اُن کے انداز میں بے تعلقی سی در آئی تھی۔

ایسے میں کوئی بات کہاں ہوتی۔ سب احترام سے بیٹھے انہیں دیکھتے رہے۔ کھانا ختم ہوتے ہی واپسی کا سفر شروع ہوا۔ مینگورہ میں شام کو نیاز صاحب اور میاں صاحب کے ہمراہ سید و شریف کے مزار پہ گئے۔ نیاز صاحب سید و بابا کے بارے میں بتا رہے تھے کہ بادشاہ وقت ان کے دربار میں حاضری دیا کرتے تھے۔

مزار کے راستے پہ چند ایک ملنگ نما افراد کاسہ گدا گری پھیلائے، اکا دکا زائرین کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔ مزار کی حالت اور رکھ رکھاؤ میں عقیدت اور دلچسپی کے بجائے بے دلی اور بے توجہی کا تاثر نمایاں تھا۔ منتظمین اپنی ادھیڑ بن میں مصروف۔۔ زائرین اپنی سوچوں میں غلطاں صاحب مزار سے بے جا غلط توقعات لگائے۔

مرشد کریم نے احاطہ مزار سے باہر نکلتے ہوئے تبصرہ کیا۔ بادشاہ وقت سے تعلقات والی بات کے اثرات تو محسوس نہیں ہو رہے۔ مینگورہ کے گرین بازار میں ڈھلتی شام میں بجلی کے تاروں پہ سینکڑوں نہیں ہزاروں ابابیلوں کو پہلو بہ پہلو بیٹھے دیکھ کر اچنبھا اور حیرت ہوئی۔ وہاں رہنے والوں کے لئے اس منظر میں کوئی ندرت نہ تھی وہ یہ منظر روزانہ ہی دیکھتے تھے۔ لیکن باہر سے آنے والے انہیں دیکھنے رک جاتے اور پوچھتے آندھی بارش میں یہ پرندے کہاں جاتے ہوں گے، اُن پہ ایسے میں ن بیتتی ہو گی؟ ذہن میں آنے والے سوال کا جواب نہ ملے تو سوال حیرت کا اظہار یہ ہو جاتا ہے۔۔ سو اُس وقت بھی یہی ہوا۔

وہاں چوک سے آگے بڑھے تو نیاز صاحب نے سوات مراقبہ ہال کے لئے سندر صاحب کا اپنے گھر کی پیشکش کا تذکرہ کیا تو فرمایا۔ یہ مناسب نہیں رہے گا۔ لوگ بہت تنگ نظر ہیں انہیں بہانہ مل جائے گا۔ پھر کہا۔ نیاز بھائی آپ بھی بات کو سوچ تو لیا کریں۔

اب آپ مجھے اتنے عرصے سے بلا تو رہے تھے لیکن کوئی مناسب پروگرام طے نہیں کیا۔ آپ کو چاہئے تھا کہ میرے قیام کا کوئی ایسا بندوبست کرتے جہاں میں کسی پہ بوجھ نہ بنتا۔ آزادی سے رہتا۔ اب لوگوں کے گھروں میں رہنے سے پہلا مسئلہ یہی ہو جاتا ہے کہ لوگ مجھے ملنے آتے ہیں تو میزبان پہ مزید بوجھ پڑتا ہے۔ ایک وہ بے چارہ میری میزبانی کرے اور اوپر سے میرے مہمانوں کی بھی مہمانداری کرے۔ یہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ آپ آئندہ جب بھی انتظام کریں تو ان باتوں کا خیال رکھا کریں۔

پھر اپنی بات کو مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ اب پکنک کے لئے پہلے سے کسی مناسب جگہ کا تعین نہ ہونے کے سبب یہ ہوا کہ آپ کو اپنے مرشد کو گوبر کے پاس بٹھا کر کھانا کھلانا پڑا۔ کھانا تیار ہونے میں ہی چار بج گئے۔۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ آپ لوگ ہدایات کو نظرانداز کرتے ہیں۔۔۔ میں نے کہا بھی تھا کہ زیادہ لوگ ہمراہ نہ ہوں پھر بھی اتنے لوگ ہمراہ ہو لئے۔۔ ایسے میں بھلا کیا انتظام ہوتے۔۔۔ بھیڑ میں انتظامات ہوں بھی تو کیسے۔

نیاز بھائی سر جھکائے بات سن رہے تھے اور مرید سوچ رہا تھا کہ آپ نے یہ بات سمجھانے کو کتنے تحمل سے موقع تلاش کیا۔ اب تک کسی کو خبر نہ تھی وہ جوشِ عقیدت میں کیا کیا غلطیاں کر رہے ہیں اور اپنے مرشد کے چہرے پہ مسکان دیکھ دیکھ کر سمجھ رہے ہیں کہ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔

اگلے روز پشاور کی طرف روانگی ہوئی۔ راستے میں ایک جگہ کچھ لینے کے لئے رُکے تو وہاں جھولے دیکھ کر ایک بچہ مچل گیا۔ باپ نے سوچا کہ بچے کو اجازت دی اور میرا قافلہ روانہ ہو گئے تو کیا ہو گا۔ اُس نے جان چھڑانے کو بچے سے کہا۔ جا کر ابا حضور سے پوچھ لو اگر وہ اجازت دیں تو ٹھیک۔ بچہ دوڑتا ہو حضور کے پاس پہنچا۔ آپ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بچے کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

اُس کی پوری بات سنی اور کہا۔ دیر ہو جائے گی۔ آپ پشاور جا کر اپنے ابو سے کہنا کہ میں نے کہا ہے کہ وہ آپ کو جھولے پہ بٹھائیں۔ بچہ خوشی سے اچھلتا۔۔اپنے والد کی طرف دوڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے فرمایا۔ یہ تو ایک طوفانی دورہ ہے۔

پشاور واپس پہنچ کر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اگلے روز علیٰ الصبح اجتماعی مراقبہ میں شرکت کے لئے پہنچے۔ مراقبہ کے بعد درس دے کر حضور چہل قدمی کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ نیاز صاحب کو محکمہ برق و آبپاشی میں ایکسین ہونے کے ناطے شہر کے گرد ڈ سٹیشن کے اندر بنے رہائشی حصے میں بنگلہ نما گھر ملا ہوا تھا۔ انہوں نے اسی میں مراقبہ ہال بنا دیا تھا۔ سیر کے دوران فرمایا کہ بات کو بار بار دہرانے سے اُس کی تہیں کھلتی ہیں۔ دہرائی کرنے۔۔۔بات کو ذہن میں بار بار گردش دینے سے اس کے مفہوم اچھی طرح ذہن نشین ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا۔ روحانی سلاسل میں اس وقت عظیمیہ سلسلہ سب سے اوپر آ گیا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سلسلے کی تعلیمات لٹریچر کی صورت میں۔۔سائنٹفک انداز میں۔۔آج کے ترقی یافتہ شعور کو سامنے رکھتے ہوئے پیش کی جا رہی ہیں۔

فرمایا ایک بار میں نے سوچا کہ آخر لکھنے پڑھنے کا کیا فائدہ؟۔۔۔لوگ پڑھتے تو ہیں نہیں۔۔۔اس خیال کے نتیجے میں مجھ پر اک جمود سا طاری ہو گیا۔ سال ڈیڑھ سال یہی کیفیت رہی۔۔ پھر خیال آیا کہ آج نہیں تو کل تو ضرور کوئی پڑھے گا۔۔ اللہ نے ایک صلاحیت دی تو میں اس کو استعمال کیوں نہ کروں۔۔۔اس طرح بات کا ریکارڈ پر تو آ گئی۔ اب آپ دیکھیں کہ کتنی ہی کتابیں بن گئی ہیں۔

فرمایا۔والدین بھی اُسی بچے کی طرف ملتفت ہوتے ہیں جو اُن کا خیال رکھے۔ پھر اپنی والدہ کے حوالے سے بتایا کہ وہ ہمارے چھوٹے بھائی کے گھر کو اپنا گھر کہتی تھیں۔آتیں تو کچھ عرصے بعد کہتیں۔۔مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ہم کہتے کیا یہ آپ کا اپنا گھر نہیں؟تو فرماتیں۔۔ہے تو۔۔مگر مجھے جانا ہے۔

غصے کی بابت فرمایا۔آپ گھر سے باہر اس لئے غصہ قابو کر لیتے ہیں کہ وہاں منہ توڑ جواب ملنے کی توقع ہوتی ہے بھئی آخر وہاں بھی تو کنڑول کرتے ہی ہیں ناتو پھر گھر میں کیوں نہیں کرتے؟ یہ تو غلط ہی ہوا نا۔دراصل یہ سب اپنی ملکیت سمجھنے کے سبب ہوتا ہے۔بیوی خاوند کو اور خاوند بیوی کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اس لئے دونوں ایک دوسرے پہ غصہ کرنا جائز سمجھتے ہیں۔

مرید نے جزا و سزا کی بابت دریافت کیا تو فرمایا۔۔آپ کسی کو قتل کرتے ہیں۔۔خدانہ کرے کہ آپ قتل کریں۔۔۔۔میں ایک مثال دے رہا ہوں۔۔۔اس عمل کی ایک فلم بن گئی۔اب یہ فلم آپ کو بار بار دکھائی جائے گی اور ہر بار اس کا وہی تاثر مرتب ہوا ہر بار انہی کیفیات سے بار بار گزریں جو اس وقت طاری ہوئیتھیں جب آپ قتل کر رہے تھے۔۔یہ سزا ہوئی۔فرمایا یہی حال جزا کا ہے۔یعنی اعمال کی فلم بنتی ہے اچھے اعمال کی فلم میں کیفیات اچھی ہوتی ہیں اور برے اعمال کی فلم میں کیفیات ایزیت ناک ہوتی ہیں۔

جب ایک کام ہو گیا اور اُس میں آپ کی مرضی شامل نہیں تو پیشمانی کیسی۔پیشمانی کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے وہ کام اپنی مرضی سے کیا۔پھر اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا۔آپ پولیس سے ڈرتے ہیں۔جب آپ نے چوری نہیں کی تو پولیس سے ڈرنا کیسا؟ جب آدمی بے اختیاری کی زندگی اپنا لیتا ہے تو پھر جزا اور سزا دونوں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔جب آپ اضافی عقل استعمال کرتے ہیں تب خود کو بااختیار سمجھتے ہیں اور یہیں سے انانیت زیرِ بحث آجاتی ہے۔یہ اضافی عقل ہی تو ہے جو انسان کو مغالطے کا شکار کرتی ہے۔

سیر سے واپسی پر ناشتے کے بعد نگہت حیات کے یہاں جانے کا پروگرام بنا۔ شوکت حیات اور اُن کی بیوی نگہت دونوں حضور مرشد کریم سے بہت گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ حیات آباد میں روحانی لائبریری کے قیام کی منظوری لے کر وہاں اس کا افتتاح مرشد کریم سے کراونے کا پروگرام تھا۔

کسی نے کہہ دیا۔۔ نگہت بہت کام کرتی ہے لیکن شوکت صاحب سستی کرتے ہیں۔ حضور نے مدافعت فرماتے ہوئے کہا۔ نہیں بھئی کام تو وہ کرتے ہیں۔ بستر سے اُٹھتے ہیں۔ سبزی لاتے ہیں۔۔ بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔۔۔ ٹھیک ہے وہ کوئی کاروبار نہیں کرتے لیکن گھر میں ملتے جلتے تو ہیں نا۔

نگہت حیات صاحبہ کے گھر لوگوں سے ملنے، اُن کے مسائل کے حل تجویز کرتے جب بہت دیر ہو گئی تو نیاز صاحب نے سلیقے سے چائے لگانے کا کہہ کر بھیڑ کو ہٹایا۔

چائے کے بعد بچیوں نے اپنی کشیدہ کاری کے کاموں پہ داد چاہی۔ مسکراتے ہوئے سر ہلا کر جب آپ کسی کام کو سراہتے تو بچیاں کھل اُٹھتیں۔

مرید نے بھورے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اچانک پوچھا۔ آپ کے کپڑے میلے ہیں یا ان کا رنگ ہی ایسا ہے۔ مرید نے عرض کی ان کا رنگ ہی ایسا ہے تو فرمایا۔ سفید رنگ سب سے بہتر ہوتا ہے۔ فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ کپڑا میلا ہے یا نہیں۔ پھر فرمایا۔ آپ سفید رنگ کے کپڑے پہنا کریں۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد نیاز صاحب کے گھر پہ اُس کمرے میں جہاں حضور قیام فرماتھے محفل جمی۔ آپ پلنگ پر تکیے کمر کے نیچے رکھے نیم دراز تھے۔ جب مرید کمرے میں داخل ہوا تو آپ فرمارہے تھے۔ بندہ ایسے کام کرتا ہے جن کی بابت وہ سمجھتا ہے کہ یہ اچھے ہیں لیکن در حقیقت وہ اللہ کے نزدیک بُرے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ سمجھتا ہے کہ یہ بُرے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک وہ برے نہیں ہوتے۔ ہمیں کیا پتہ کہ اللہ کی پسند اور ناپسند کیا ہے؟ ہمیں کیا معلوم کہ اللہ کی پسند اور ناپسند کا پیمانہ کیا ہے؟ ہم نے نہ تو شیطان کو دیکھا ہے اور نہ ہی اللہ کو۔ ہمیں اللہ کی پہچان کب ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اللہ ہے۔۔ لیکن یہ بات ہمارے مشاہدے میں نہیں۔ مشاہدے میں تب آتی ہے جب دل میں شک نہ ہو۔ یہ کتاب ہدایت دیتی ہے متقیوں کو۔۔ مسلمین کو نہیں۔۔ منافقین کو نہیں کفار کو بھی نہیں۔۔ متقی کہا۔۔ جب شک نہ ہو اور متقی ہو۔ مسلمان ہونا تو یہ ہے کہ آپ نے اللہ کی واحدانیت اور توحید کا اقرار کر لیا۔ لیکن آپ میں ایمان تب پیدا ہوتا ہے جب آپ کو یہ یقین آجائے کہ اللہ ہے۔۔۔ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔

پھر اُس مرید کا قصہ سنایا جس کو مرشد نے ایک مرغی ذبح کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کو کسی ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو اور مرید آکر بتاتا ہے کہ اس نے جہاں بھی چھری مرغی کی گردن پہ رکھی تو اللہ کو اپنی طرف دیکھتے اور نگران پایا۔

فرمایا۔ انسان گناہ کرتا ہی تب ہے جب اُسے کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ پھر مثال دیتے ہوئے فرمایا۔ میں اور نیاز صاحب یہاں اس کمرے میں اکیلے ہوں اور کوئی گناہ کرنا چاہتے ہوں۔۔ تو ہم سب سے پہلے یہ اطمینان کریں گے کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ پردہ بھی تھوڑا سا مزید کھسکا کر درست کر لیں گے۔۔۔ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے تو ہم کوئی گناہ کر ہی نہیں سکیں گے۔

فرمایا۔اور جب بندے کے اندر یہ طرزِ فکر راسخ ہو جائے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے تو اس کو تو گناہ اور ثواب سے تو ویسے ہی نجات مل گئی۔جب اُس نے اللہ کو دیکھ لیا پھر کسی اور کی کیا پرواہ؟آپ نے کبھی کسی فقیر کے بادشاہ بننے کا واقعہ سنا ہے؟آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا۔پوری تاریخ انسانی میں ہے ہی نہیں۔البتہ یہ کئی بار ہوا ہے کہ شاہوں نے بادشاہت چھوڑ کر فقیری اختیار کی۔اس لئے کہ وہ حقیقی بادشاہ اور اُس کی بادشاہت سے واقف ہو گئے تھے۔حقیقی بادشاہ سے مل لینے کے بعد تو ہر بادشاہت ہیچ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر نعمت صاحب نے سوال دریافت کیا کہ نقشے میں دیئے گئے مقامات لطائف کی کیا اہمیت ہے اور یہ کہ جب دل کے آپریشن کے دوران دل کو جسم سے الگ کر کے کرنٹ دینے والی مشین پر ڈال دیا جاتا ہے تو یہ سب کیسے کام کرتا ہے؟

آپ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ کائنات میں دور کرنے والے کرنٹ کی لہریں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ایک افقی اور دوسرے عمودی۔ایک کو طولانی حرکت کہتے ہیں اور دوسری کو گردشی۔ایک شعور ہوا اور دوسرا لاشعور۔جب یہ دو لہریں آپس میں مرکب ہو جاتی ہیں تو بارہ کھرب پوائنٹس بن جاتے ہیں۔ان پوائنٹس کو ان کی کارکردگی کی بنیاد پر چھ گروپس میں تقسیم کیا جاتا ہے۔تصوف میں انہیں لطائف کہا جاتا ہے۔یہ انسان ہوا۔

جب لہروں میں تھوڑا فاصلہ در آتا ہے اور گردشی حرکت غالب آجاتی ہے تو ہم سو جاتے ہیں اور جب فاصلہ اور زیادہ ہو جاتا ہے تو ہم اس کو مرنا کہتے ہیں۔روحانی آدمی افاصلے کو ختم کر دیتے ہیں یعنی دونوں لہروں کو واپس جوڑ دیتے ہیں تو آدمی زندہ ہو جاتا ہے۔

جب کبھی کسی ایک عضو کے پوائنٹس میں کرنٹ کا بہاؤ رک جاتا ہے تو وہ عضو بے کار ہو جاتا ہے۔جیسے کسی ٹیوب لائٹ کی تار خراب ہو جائے تو ٹیوب لائٹ روشن نہیں ہوتی حالانکہ بجلی موجود ہے۔اب اگر آپ ٹوٹے ہوئے تار کو جوڑ دیں تو بجلی کا بہاؤ شروع ہو جائے گا اور بلب، ٹیوب یا پنکھا دوبارہ کام شروع کر دے گا۔

اب رہی بات دل کی۔۔ تو دل کو کہیں سے کرنٹ ملتا ہے تو وہ پھیلتا اور سکڑتا ہے۔ وہ مشین بھی اُس کو کرنٹ کے بہاؤ کا ایک متبادل نظام ہی تو فراہم کرتی ہے۔

ڈاکٹر نعمت صاحب نے دوسرا سوال کیا۔ یہ مجذوب لوگ کپڑے کیوں نہیں پہنتے؟

جواب میں ارشاد فرمایا۔ آپ ایکسرے مشین کے سامنے دس بیس قمیضیں پہن کر کھڑے ہو جائیں۔ کیا مشین تب بھی آپ کے اندر دیکھ نہیں لیتی۔ آپ فقیر کی نظر کو کیا سمجھتے ہیں؟ کیا وہ ایکسرے سے بھی گئی گزری ہوتی ہے؟ دراصل مجذوب کے ذہن میں یہ بات ہی نہیں ہوتی کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔

پھر تاج الدین باباؒ اولیاؒ کے بارے میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا بتایا ہوا واقعہ سُنایا۔ راجہ رگھورائے کے ملازم اُن کے لئے تھال میں کپڑے لئے کھڑے رہتے تھے۔ جب طبیعت ہوتی تو پہن لیتے لیکن پھر جونہی جذب غالب آتا تو یہ کہہ کر پھاڑ کر پھینک دیتے۔۔ جنت میں بھلا کوئی لباس ہوتا ہے۔

فرمایا آدمی لباس تو دوسروں کے لئے پہنتا ہے۔ خود تو بے لباس ہو کر ہی خوش ہوتا ہے۔ آپ باتھ روم میں جا کر۔۔۔ جہاں کوئی نہیں ہوتا تو لباس اتار کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس میں مرد اور عورت کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ سبھی یہی کرتے ہیں۔۔۔ اور پھر مسکراتے ہوئے فرمایا۔۔ ورنہ باتھ روم میں آئینے لگاتے ہی کیوں؟

اس پر مرید نے گوالے کے مقدمے میں تاج الدین باباؒ اولیاؒ کا اپنا کرتا اتار دینے کی بات کہنے کی بابت پوچھا تو فرمایا۔ وہاں کرتے سے مراد۔۔ تکوینی اختیار کے تحت کام کرنا ہے۔ وہاں اوپر کوئی ایسی بات ہو گئی ہو گی تبھی تو مقدمہ حضورﷺ کے دربار تک پہنچا ورنہ گوالے کو تو وہ خود ہی لے کر آ سکتے تھے۔

کسی نے دریافت کیا کہ جمعرات کو قبروں پہ جانے کی کیا اہمیت ہے؟

فرمایا۔ اس روز اعراف کے لوگوں کو چھٹی ملتی ہے تو وہ اپنے لواحقین کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس روز قبر پر صاحب مزار کی توجہ ہوتی ہے۔ یہ تعلق تیس سال تک رہتا ہے۔ جب لوگ قبر پر نہیں جاتے تو اُن کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ وہاں اور دلچسپیاں بن جاتی ہیں۔ جب لوگ مزار پہ جاتے ہیں اور صاحب قبر کو سلام کرتے ہیں تو وہ بھی متوجہ رہتے ہیں۔۔۔ ورنہ رہے نام اللہ کا۔

نیاز صاحب نے اپنی والدہ مرحومہ کی بابت دریافت کیا تو فرمایا۔ وہ وہاں بہت خوش ہیں۔۔ اپنی پرانی سہیلیوں کے ہمراہ ہیں۔

جمشید نے آکر بتایا کہ خواتین حضور سے الگ ملاقات کے لئے دوسرے کمرے میں منتظر ہیں تو اس محفل کا اختتام ہوا۔

شام کو حیات اباد میں نگہت حیات کے گھر روحانی لائبریری کا افتتاح ہوا۔ وہاں سے نکلے تو حیات اباد کے باغِ ناران میں سیر کے لئے گئے۔ صبح مراقبے کے بعد مغرب سے پہلے دو وقت سیر کرنا ایک معمول بن چکا ہے۔ کراچی میں ہوں لاہور میں ہوں یا کہیں بھی ہوں یہ دو وقت سیر ضرور کرتے ہیں۔ اگر کبھی کسی مصروفیت کے سبب شام کی سیر میں تاخیر ہو جائے تو بعد از نماز مغرب وقت

نکالا جاتا ہے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ کسی فنکشن یا تقریب کے سبب شام کا وقت نکل جائے تو رات کھانے کے بعد پندرہ منٹ کا ٹہلنا لازم ہے۔

سیر کے دوران ایک دو اصحاب ساتھ ہو لیتے ہیں اور کبھی کبھار یہ دو چند ہو جاتے ہیں۔ جس کسی کو سیر پہ ساتھ دینے کی سعادت ملتی وہ خوشی اور فخر سے پھولے نہیں سماتا۔ اس دوران اگر کسی نے کچھ پوچھ لیا تو ہلکی پھلکی گفتگو کے انداز میں علم و عرفان کے موتی بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ سیر کرنے کی بابت ارشاد فرمایا۔ اگر میں سیر نہ کروں تو نیند نہیں آتی، گیس پریشان کرتی ہے، جسم ٹوٹتا ہے۔

سیر کے دوران فرمایا۔ ایک بار ایک صاحب میرے ساتھ کھانے پہ بیٹھے تو تبصرہ کیا کہ آپ قطب ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے یہ بات کس بنا پہ کہی ہے تو کہا۔ آپ کے دستر خوان میں ہر طرح کی نعمتیں موجود ہوتی ہیں۔ بہت لطف لیتے ہوئے کہا تو پھر یہ صدر اور وزیراعظم تو قطب سے بھی بڑے ہوئے۔

بات صدر اور وزیر اعظم سے ملک پہ آ گئی۔ فرمایا۔ امریکہ نے ویزہ لاٹری کے نام پہ ریفرنڈم کروایا ہے۔ ملک کے ہر پڑھے لکھے آدمی نے اس لاٹری میں حصہ لے کر یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ ہمیں پاکستان میں نہیں رہنا۔ آپ ہمیں امریکہ اپنے یہاں بلا لیں۔

اب امریکہ سب کو اپنے یہاں تو بلا نہیں سکتا وہ خود یہاں آ گیا ہے۔

فرمایا۔ اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ آپ نے ایک اینٹ بھی لگانی ہوتی ہے تو اجازت آئی ایم ایف دے گی۔

سننے والے اک سناٹے کے عالم میں سنا۔ آپ نے خود ہی اس سناٹے کو توڑنے کو ایک بات بتائی۔ ایک طرح کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ وہ جیب میں لیموں ڈالے ہوٹلوں وغیرہ کے قریب گھومتے رہتے۔ جہاں کسی کو اچھے کھانے کا آرڈر دیتے دیکھتے۔ جا پہنچتے۔ لباس اچھا خاصا مہذبانہ ہوتا۔ بیٹھنے کی اجازت لیتے۔ ادھر اُدھر کی بات شروع کر کے کھانے کے ساتھ لیموں کی افادیت پہ لیکچر دیتے۔۔ جب کھانا آتا تو یہ جیب سے لیموں نکال کر میز پر رکھ دیتے۔ پھر کہتے۔ اجازت ہو تو لیموں نچوڑ دیں۔ انداز گفتگو ایسا ہوتا کہ کوئی انکار کر ہی نہ پاتا۔ یہ لیموں نچوڑ کر سیدھے ہو کر بیٹھ جاتے تو کھانے والا اخلاقاً کہنے پہ مجبور ہو جاتا۔ آیئے آپ بھی کھائیں۔۔ اور وہ جی شکریہ کہہ کر کھانے پر ٹوٹ پڑتے اور ہر ہر لقمے پر لیموں کی وجہ سے ذائقے میں ہونے والی بہتری پہ داد طلب کرتے۔ ایسے لوگوں کو لیموں نچوڑ کہا جاتا تھا۔ اب ایسے لوگ کہاں ؟

مرید نے سوچا واقعی ایسے لوگ کہاں ہیں اب لوگ جیب میں لیموں نہیں۔۔ لیموں نچوڑنے کا شکنجہ لئے پھرتے ہیں۔ وہ بھی کیا بھلا وقت تھا لوگ کسی کو بے وقوف بناتے تھے تو وہ بھی محض چند لقموں کا ساتھ دینے کے لئے۔۔ اب تو لوگ آدمی کو ہی لیموں کی طرح نچوڑ کر پی جاتے ہیں۔۔۔ اب اس فن کی ترقی یافتہ صورت دیکھنی ہو تو ترقی یافتہ ممالک کو ترقی پذیر ممالک کے تیل اور لہو کو نچوڑتے دیکھیں۔۔ وہ یہ کام اتنی مہارت اور پُرکاری سے کرتے ہیں کہ کوئی انہیں اخلاقاً بھی منع کرنے کی ہمت نہیں کر پارہا۔ اس شکنجے کے دستوں میں سے ایک پہ مفاد پرستی اور حرص و لالچ کی سنہری پٹی چڑھی ہوتی ہے اور دوسرے پہ جہالت اور نا سمجھی کا پانی پھرا ہوتا ہے۔ جو ایک بار اس شکنجے میں کسا جاتا ہے پھر اُس کو چھڑانے کوئی نہیں اتا۔ وہ جس کسی کو مدد کے لئے پکارتا ہے تو وہ بھی آکر شکنجے کے دستوں پہ زور دینے میں لگ جاتے ہیں۔

سبھی پہ اک سناٹا سا چھا گیا۔

ختم اللہ علی قلوبھم

اس روز جو سناٹا طاری ہوا وہ دیر پا ثابت ہوا۔اس کی طوالت اگلے برس کے اُس لمحے تک پھیل گئی جب راولپنڈی مراقبہ ہال میں۔۔۔مراقبہ کے لئے تیار بیٹھے اپنے مراد سے اُس کی آنکھیں چار ہوئیں۔وہ مرشد کریم کے پنڈی آنے کا سُن کر مراقبہ ہال اس وقت پہنچا جب مراقبہ شروع ہونے ہی والا تھا۔اُس پہ نظر پڑتے ہی اک دلآویز مسکراہٹ اُن کے چہرے پہ ابھری اور پھیلتے ہوئے اُس کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی۔اُس کو لگا اُس کی پذیرائی کو انہوں نے اپنی خوشنودی کی اطلاع دی ہے۔

سب نے مراقبہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور وہ اپنے مراد پہ نگاہیں جمائے انہیں دیکھتا رہا۔کتنی دیر تکتے رہنے کے بعد جب اُس نے آنکھیں موندیں تو مراقبہ ختم کرنے کا اعلان کرتی درود شریف کی مدھر بھری صدا بلند ہوئی۔مراقبہ کے بعد ایک صاحب نے انسان کے دیکھنے کی صلاحیت کے حوالے سے دریافت کیا کہ دل کے دیکھنے سے کیا مراد ہے؟

اس پر آپ نے ختم اللہ علی قلوبھم۔۔۔والی آیت کی تلاوت کر کے فرمایا۔اللہ نے مہر کر دی دلوں پر اور سماعتوں پر اور دبیز پردے ڈال دیئے بصارتوں پر۔۔۔یعنی اس پہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے کا تعلق مادی آنکھ سے نہیں بلکہ روحانی آنکھ سے ہے۔خواب میں دیکھنا ہو یا معراج کے موقع پر اللہ سے راز و نیاز ہونا۔۔۔اللہ کا اُس کو فوراً کہنا۔۔۔یہ بتانا کہ دل نے جو دیکھا غلط نہ تھا یعنی اصل دیکھنا دل کا دیکھنا ہے۔

پھر روح حیوانی، روح انسانی اور روح اعظم کا تذکرہ فرما کر لطائف ستہ یعنی لطیفہ نفسی، قلبی، روحی، سری، خفی اور اخفیٰ کے بارے میں بتا کر واضح کیا کہ دیکھنے کا تعلق دراصل لطیفہ قلبی سے ہے۔مادی انکھ ایک طرف تو ایک باریک سے کاغذ کے پار بھی نہیں دیکھ سکتی اور دوسری طرف نو کروڑ دور سورج کو دیکھتی ہے یعنی اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ انسان نے خود کو محدود کیا ہوا ہے اُس کو

وہ نظر استعمال کرنا ہی نہیں آتی جو اُس کو نو کروڑ میل دور سورج اور اُس کے بیچ آنے والی اشیا کو دکھا سکتی ہے۔اب جیسے ہوا ہے۔۔ گیسیں ہیں۔۔وائرس ہیں۔۔فرشتے ہیں۔۔وہ اُن کو کیوں نہیں دیکھتا۔۔یہ سب شعور میں محدود ہونے کے سبب ہے۔

فرمایا۔انسان بہت عجیب ہے۔کہتا ہے کہ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔۔اور آزادی کا مفہوم یہ لیتا ہے کہ زمین پہ چار دیواریں بنا کر اُن میں ایک دروازہ لگا کر۔۔۔خود کو ایک کمرے میں بند کر کے سمجھتا ہے کہ اب میں آزاد ہوں۔

اب اگر اُس کو اسی کمرے میں بند کر کے باہر کنڈی لگا دیں تو وہ کہتا ہے کہ مجھے قید کر دیا گیا ہے۔یہ سب اپنی صلاحیتوں سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔جب انسان اپنے دل کی آنکھ سے دیکھنا سیکھ جاتا ہے تو اُس کے دیکھنے کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اربوں کھربوں میل دور دیکھ سکتا ہے۔

اُس کے شعور میں یہ صلاحیت ہے کہ چاہے تو سکڑ کر ایک وقت میں ایک ہی جگہ محدود ہو کر دیکھے یا دور تک پھیل جائے۔

انسان کے جسم میں بارہ کھرب سیل ہیں۔اُن میں سے دو کھرب انسان کا دماغ اور ذہن بناتے ہیں اور یہ سب ایک نظام کے تحت کام کرتے ہیں۔۔۔۔جیسا کہ اب ریڈیو میں ہے۔اس کے اندر کل پرزے ہوتے ہیں۔۔۔ورنہ اس سے کوئی آواز کہاں آسکتی ہے۔یہ سب کسی نہ کسی بنیاد پہ قائم ہیں۔۔۔جاندار ہوں درخت ہوں۔۔حیوان ہوں۔۔مکان ہو۔۔۔کسی نہ کسی بنیاد پر قائم ہیں۔یہ سیل چارج بھی ہوتے ہیں اور ڈیڈ بھی ہوتے ہیں۔۔یعنی بنتے اور مرتے ہیں۔ان سیلز میں منفی اور مثبت چارج ہونے سے نشو نما کا عمل جاری رہتا ہے۔اسی سے بچہ جوان ہوتا ہے۔۔۔یہ سب نظام روشنیوں پر قائم ہے۔۔۔جو سر سے داخل ہوتی ہیں۔۔سر کے بال انٹینا کا کام کرتے ہیں۔جانوروں میں اُن کے جسم کے بال خصوصاً ریڑھ کے بال انٹینا کا کام کرتے ہیں۔

فرمایا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ میں مومن کے دل میں رہتاہوں۔گوشت کالو تھڑادل نہیں ہے۔۔۔بلکہ اُس کا باطنی رخ روشن نقطہ ہےاور اسی سے بندہ عالم شہود میں داخل ہوتا ہے۔

انسانی شعور روح حیوانی ہے،لاشعور روح انسانی ہےاور تحت لاشعور روح اعظم ہے۔روح کے ان تینوں دائروں کو سیر اب کرنے والا کرنٹ ایک ہے۔قلب ایک ایسا روشن نقطہ ہے جو دو طرح سے کام کرتا ہے۔ایک طرف وہ مظاہرات کو دکھاتا ہے خواہ وہ مادی ہوں یا غیر مادی اور دوسری طرف ان مظاہرات کے غیب کو دکھاتا ہے یعنی یہ دکھاتا کہ مظاہرات کی اساس کیا ہے۔

قلب سے غیر مادی چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔یہ آسمان حدِ نظر ہے۔۔۔جہاں ہماری نظر ٹکرا کر پلٹتی ہے اور اُس کو نیلا دکھاتی ہے۔۔۔ہم اس حد نظر کو فوکس کرنے کی طاقت کو کم یا زیادہ کر سکتے ہیں اور یہ قلب کا کام ہے۔ہمارا قلب ہمارے ارادے کے تحت دکھاتا ہے۔۔۔اگر ہم کسی چیز کو دیکھنے کا ارادہ نہیں کرتے تو اُسے دیکھ بھی نہیں سکتے۔

شعور خود کو محدود کر کے خوش ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے قلندر کی بابت دریافت کیا تو فرمایا۔قلندر کوئی عہد نہیں۔۔۔یہ ایک طرح سے ایک ڈگری ہے۔نیوٹرل طرزِ فکر رکھنے والے ذہن کو قلندر کہتے ہیں۔ذہن جب انا کے خول سے آزاد ہو جاتا ہے تو وہ نیوٹرل کہلاتا ہے۔۔انسان کو عطا کی گئی صلاحیتیں بھیک ہیں۔۔بخشش ہیں۔۔انسان کی ملکیت نہیں۔شریعت میں ملکیت ہے۔قلندریت اور شریعت میں یہی فرق ہے۔

پھر اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا۔۔۔

فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

قلندر جز دو حرف لااِلہ کچھ نہیں رکھتا

اور فرمایا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے کہا ہے۔

یار دم بدم آید و بار بار می آید

یعنی اللہ میرا یار ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ہر سانس کے ساتھ میرے اندر آرہا ہے۔ قلندر آزاد ذہن۔۔ ملکیت ست آزاد ذہن۔۔۔ نیوٹرل طرزِ فکر رکھنے والے بندے کو کہتے ہیں۔

اس نشست کے بعد ناشتہ کروایا گیا۔ شام کو بری امام کے مزار پہ گئے۔ وہاں کچھ دیر مراقبہ کیا۔ مراقبے کے بعد ٹہلتے ہوئے باہر آئے اور مزار کے ارد گرد قائم بازار کی سیر کرتے رہے۔ اس دوران فرمایا۔ دیکھ لیں اللہ والے بندے جہاں کہیں بیٹھ جائیں وہیں شہر باس جاتا ہے۔

اگلے روز صبح مراقبہ اور ناشتے کے بعد پکنک کا پروگرام تھا۔ راول جھیل گئے۔ مری اور ایوبیہ سے ہو کر رات ڈھلے واپس آئے۔ مرید اس تمام سیر میں اُن کے ساتھ کی بجائے تعاقب میں رہا۔ جس جگہ رکتے وہ قریب جانے کا موقع ڈھونڈنا کبھی کامیاب و کامران ہو جاتا اور کبھی موقع آتے آتے روانگی شروع ہو جاتی۔

چند ماہ بعد عرس پہ کراچی پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوا تو بڑی شفقت سے گلے لگایا اور کتنی ہی دیر لگائے رکھا۔ اتنی دیر میں اُس کی کیمسٹری میں عجیب سی تبدیلیاں در آئیں۔

مسافرت کی تھکن کی جگہ بشاشت۔۔۔کچھ ہونے کے احساس کی جگہ عاجزی اور فروتنی غالب آگئی۔ذہن کی اچھل کود تھم گئی۔۔۔اک مسرت آگیں سکون اور ٹھہراؤ اُس کے اندر بہنے لگا۔

عرس کی تیاریوں کے ہنگام کے باوجود کمرے کے اندر سکون کا کچھ ایسا راج کہ یوں لگتا ہی نہ تھا کہ اس کمرے سے باہر اتنی گہما گہمی ہے۔ایک لحظے کو بھی انہوں نے عرس پہ ہونے والے انتظامات کے حوالے سے کسی طرح کا کوئی منفی تاثر نہیں دیا۔یوں لگتا تھا کہ ہونے والے انتظامات اور گہما گہمی کسی اور دنیا سے متعلق ہیں۔وہاں ملکی حالات پہ بات ہونا شروع ہوگئی۔روزنامہ جنگ کی حکومت سے لڑائی پہ بات کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے سیف الرحمان کو بلیک میل کیا تو اُس نے انہیں جتا دیا کہ تمہارے اپنے گھر کے جھگڑے کیا کم ہیں کہ تم حکومت سے بھی لڑائی مول لینے چلے ہو۔فرمایا۔سیاست کے لئے بہت ہی بڑا ذہن درکار ہوتا ہے۔

پھر فوج کی بابت حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا فرمان دہرایا کہ جو فوج اپنے عوام پہ گولی چلائے۔۔اوپر والے لکھ دیتے ہیں کہ وہ کبھی فاتح نہیں ہو سکتی۔کیونکہ فوج کو تنخواہ عوام سے ٹیکس لے کر ہی تو دی جاتی ہے۔اب اگر کوئی ملازم اپنے مالک پر ہی فائر کر دے تو وہ کسی دوسرے کے خلاف لڑنے کا کہاں رہا؟

پھر مشرقی پاکستان میں نوے ہزار فوجیوں کے قیدی ہونے کا تذکرہ ہوا تو فرمایا۔ہم نے تو یہ دیکھا کہ جو وہاں قید ہوئے وہ نہ صرف یہاں ملازمت میں واپس آئے بلکہ انہوں نے ترقی بھی کی۔

مرید نے عرض کی کہ بھٹو کا دعویٰ تھا کہ اُس نے نوے ہزار فوجی بھارت کی قید سے چھڑائے۔

فرمایا۔اُس نے کہاں چھڑائے۔۔انہوں نے خود چھوڑے۔۔ اتنی فوج کو رکھنا۔ کھلانا پلانا۔۔اُن کی حفاظت کرنا۔۔یہ کوئی آسان بات تھی کیا۔۔۔اجی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔۔ کہہ کر بات لپیٹ دی۔

عرس سے پہلے محمد الرسول اللہ ﷺ کے عنوان سے ہونے والی روحانی تربیتی ورکشاپ کے اختتامی سیشن سے خطاب کے دوران فرمایا۔

میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اُن کے معجزات کی سائنسی توجیہہ کرنے کی اجازت مانگی اور آپ ﷺ کی طرف سے عطا کی گئی توفیق سے یہ کتاب لکھی۔اس تقریب کے مہمان خصوصی رویت ہلال کمیٹی کے چیرمین مولانا اطہر نعیمی صاحب تھے۔

عرس کی صبح مقالات کا سیشن تھا۔احتشام الحق صاحب پنڈال میں لوگوں کو مدعو کرتے ہوئے بار بار اعلان کر رہے تھے کہ حضور مرشد کریم پنڈال میں آچکے ہیں سب لوگ پنڈال میں آجائیں۔

آپ نے بار بار اعلان سُنا تو فرمایا۔۔یہ لوگ باؤلے ہو گئے ہیں۔۔آپ جا کر انہیں منع کریں کہ یہ بار بار میرے پنڈال میں آنے کا علان نہ کریں۔۔۔بس ایک بار کہہ دیا۔۔۔یہ کافی ہے۔

مرید نے جا کر رانا تجمل صاحب جو سیکورٹی ڈیوٹی پہ مامور تھے اُن سے کہہ دیا تو فرمایا۔۔یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔آپ جا کر خود احتشام صاحب سے کہہ کر آئیں۔

مرید نے احتشام صاحب کو بتایا کہ ابا حضور بار بار اپنے پنڈال میں ہونے والے اعلان کرنے سے منع فرما رہے ہیں اور آکر واپس حضور کے پہلو میں بیٹھنے لگا تو فرمایا آپ سٹیج پر جا کر آدابِ مریدین پہ تقریر کریں۔ مرید نے سٹیج پہ جا کر اپنے بکھرتے حواس کو

مجتمع کرتے ہوئے اپنے مراد سے دوئی کو ختم کرنے کی بابت بات کہنی شروع کی۔ابھی بات جاری تھی کہ احتشام صاحب نے اشارہ کیا کہ اب پروگرام کا باقاعدہ آغاز کرنا ہے۔۔مرید اپنی بات کہہ کر سٹیج سے اتر کر حضور کے پاس آکر بیٹھا تو فرمایا۔آپ نے کم وقت میں اچھی بات کہی۔

عرس کی رات خطاب کا بنیادی نکتہ یہ رہا کہ علم الاسما کے بغیر آدمی جانور ہے۔خطاب کے بعد یااللہ یارحمٰن یارحیم کا ذکر جہری کروایا۔جب تین ساڑھے تین ہزار افراد حرف ندا 'یا' پکارتے تو یوں محسوس ہوتا گو یااللہ تعالیٰ سامنے موجود ہیں اور ہم انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کو انہیں پکار رہے ہیں۔

صبح کے مراقبہ کے بعد لیکچر میں فرمایا۔سلسلہ ایک زنجیر کی مانند ہوتا ہے۔اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملنے کے سبب اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ اگر ہاتھی کو باندھ دیں تو وہ ہل نہیں سکتا۔اس کی دوسری مثال یہ فرمائی کہ سلسلہ ایک کارواں کی مانند ہوتا ہے۔اس میں نائی،موچی،لوہار،ترکھان ہر طرح کے افراد کا ہونا ضروری ہے۔آپ موچی کو نکال دیں تو سارا قافلہ ہی ننگے پاؤں ہو جائے گا۔ہر آدمی کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔

پھر اپنے دادا پیر حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کے حوالے سے فرمایا۔کہ انہوں نے کہا تھا کہ سلسلے میں جو آگے نکل جائے اُس کو چاہیے کہ اپنے پیچھے آنے والوں کو اپنی طرف کھینچے اور پیچھے رہ جانے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اگلے والوں کو آگے دھکیلیں نہ کہ اُس کی ٹانگ کھینچیں۔ٹانگ کھینچنے کا سُن کر اکثر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ناشتے کے بعد حضور سے ملنے والوں کی بھیڑ لگی کہ وہ دور دور ہی ٹہلتا رہا۔شام کو جب حضور کمرے سے باہر تخت پوش پر آکر بیٹھے تو کئی افراد جو اُس وقت تک واپس نہیں گئے تھے اُن کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔

مرید نے سوچا اللہ کے اس بندے میں آخر وہ ایسی کیا بات ہے کہ لوگ بے محابہ اُن کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔اس کشش اور جذب کر لینے کی اس خوبی کا راز کیا ہے؟

اِدھر اُس کا مراد بتا رہا تھا کہ جب بندہ اللہ کے کام سے لگ جاتا ہے تو اللہ اُس بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے اور اس امر کی اطلاع فرشتوں کو دے دیتا ہے کہ وہ فلاں بندہ مجھے محبوب ہے۔فرشتے اس بات کی اطلاع لوگوں کو دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں اس بندے کے لئے پیار پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر اپنے والد محترم کے حوالے سے بتایا کہ ایک بار اُن سے روحانی طور پر ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کبھی قبر پر سلام کرنے بھی آجایا کرو۔میں اپنے بھائی سے کہا کہ وہ مجھے اُن کی قبر دکھائیں کیونکہ مجھے یاد نہیں کہ کون سی قبر اُن کی ہے۔

فرمایا۔یہ دنیا ہے ہی ایسی جگہ۔یہاں کوئی تعلق نہیں۔۔یہ سب ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہونے کے سبب ہے۔ایک آدمی کو دس آدمی نوچ رہے ہیں۔۔۔اس نوچنے کو آپ تعلق کہہ لیں۔۔۔رشتہ کہہ لیں۔۔کبھی کوئی آدمی اپنے بیٹے یا باپ کی قبر پہ رات نہیں رہا۔۔ہاں اگر قبر پہ چادریں چڑھنا شروع ہو جائیں تو اور بات ہے۔اب حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی اولاد بھی تو آکر بیٹھ ہی گئی نا۔۔۔اور انہیں بیٹھنا بھی چاہئے۔

فرمایا۔یونہی چلتے ہوئے۔۔گزرتے ہوئے آکر سلام کرنے اور خاص طور پر پروگرام بنا کر ملنے کے لئے آنے میں فرق ہوتا ہے۔۔خاص طور پر ملنے کے لئے آنے والے کا ذہن یکسو ہوتا ہے۔وہ آکر ملتا ہے تو جو کچھ سنتا ہے اُس پہ دھیان بھی دیتا ہے۔

دل آزاری کے حوالے سے بتایا کہ اگر کسی نے مذاق میں ہی کہہ دیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں گولی ماردوں تو اس سے دل آزاری ہوگئی۔اسی طرح اگر کسی نے آپ کو کوئی چیز دکھائی اور آپ نے یہ کہہ دیا کہ یہ تو بہت مہنگی ہے تو اُس کے ذہن میں آپ کی صورت بگڑ جائے گی۔ پھر اپنی والدہ محترمہ کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک بھائی نے انہیں کوئی کپڑا دکھایا۔۔انہوں نے بتایا کہ اتنے کا لیا۔ ہمارے والد صاحب نے والدہ سے کہا کہ تم نے بیٹے سے یہ کیوں نہیں کہا کہ اُس نے یہ کپڑا مہنگا لیا ہے۔اس پر میری والدہ نے بہت سمجھداری کی بات کی اور کہا کہ اگر میں یہ کہہ دیتی تو آئندہ وہ کبھی مجھے کوئی چیز نہ دکھاتا۔۔۔اب جب بھی وہ کوئی چیز لائے گا مجھے دکھا دیا کرے۔ مرید نے سوچا کتنے لوگ ہوں گے جنہیں اس بات کا ادراک نصیب ہوتا ہے کہ کسی کے ذہن میں اپنی صورت کو بگڑنے سے بچانے کا سوچ سکیں۔

اپنی والدہ کی سمجھداری کے حوالے سے ایک اور بات یہ بھی بتائی کہ انہوں نے اپنی بہوؤں کو کہہ دیا کہ یہ رہیں چابیاں۔۔۔ اب مجھ سے اور نہیں ہوتا۔۔۔جب بہوئیں اُن سے پوچھتیں کہ آج کیا پکایا جائے تو وہ کہتیں جو جی چاہے پکالو۔۔۔ویسے میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج مسور کھائیں۔

فرمایا۔اُس روز مسور ہی پکتے۔

کوئٹہ سے آئی ہوئی ایک خاتون نادرہ نے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو فرمایا۔آپ میری کوئی بات مانتے تو ہیں نہیں لیکن پیار کا دعویٰ کرتے ہیں۔۔۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ غصہ کرنا چھوڑ دیں۔۔تو کیا آپ نے غصہ کرنا چھوڑ دیا۔اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو آپ میری بات ضرور مان لیتیں۔

اقبال قریشی صاحب کے بیٹے مقصود کے مسوڑوں میں تکلیف تھی انہوں نے اپنی تکلیف کا مداوا چاہا تو فرمایا۔انار کے پتوں کو جوش دے کر اس پانی سے کلیاں کریں۔اس پہ کسی نے کہا کہ آج کل انار کے درختوں پہ پتے دستیاب نہیں ہیں تو فرمایا۔یوکلپٹس کے پتوں کا بھپارا لیں۔اس کے پتوں کے پانی سے کلیاں کرنے سے بہت فرق محسوس ہوتا ہے۔

پھر مراقبہ ہال میں لگے درختوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔اللہ نے آپ کے گھر میں ہی ہر چیز مہیا کر دی ہے۔Vicks اسی سے ہی تو بنتی ہے۔

پھر میر تقی میر کے بارے میں بتایا۔وہ بہت حساس آدمی تھے۔ایک صاحب اُن سے ملنے گئے اور پوچھا۔آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ تو یوں سکڑ کے بیٹھ گئے۔انہوں نے دوبارہ پوچھا تو وہ کچھ اور بھی سمٹ گئے۔پھر کہا۔

نہ چھیڑ نکہتِ بادِ بہاری راہ لے اپنی

تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

اور کہا کہ طبیعت کی بابت بیمار سے پوچھا جاتا ہے اور صحت مند آدمی کا مزاج دریافت کرتے ہیں۔۔وہ بے چارے اپنی حساسیت کے ہاتھوں آخر میں باؤلے ہی ہو گئے تھے۔

پھر غالب کی بابت فرمایا۔ایک بار ایک نواب اُن سے ملنے آئے۔نوابی کا دور ختم ہو چکا تھا۔غربت کے سبب بُرا حال تھا۔ انہوں نے جو انگرکھا پہن رکھا تھا وہ میلا اور بوسیدہ ہو رہا تھا۔غالب نے اُن سے فرمائش کی کہ وہ انگرکھا انہیں مرحمت فرمادیں۔اس

طرح انہوں نے وہ انگر کھا اُن سے اتروالیا اور جب جانے لگے تو اندر سے نیا انگر کھا منگوا کر انہیں پہنا دیا۔ یہ نہیں کہ نواب صاحب سمجھے نہیں ہوں گے لیکن وضع داری کے ہاتھوں خاموش ہی رہے۔

فرمایا۔ غالب کے مزاج میں عجیب تضاد تھا۔ ایک طرف شاہ کا مصاحب بننے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری طرف نوکری کرنے گئے تو یکے سے اترے ہی نہیں کہ پرنسپل مجھے لینے آئے اور جب وہ نہیں آئے تو پلٹ آئے۔

ایک بار انہیں پینشن ملی تو جا کر تمام پیسوں کی شراب خرید لائے۔ بیگم نے احتجاج کیا تو کہا جس چیز کا اللہ نے وعدہ نہیں کیا وہ لے آیا ہوں رزق کا اُس نے وعدہ کیا ہے۔۔۔ وہ ضرور دے گا۔

فرمایا۔ شاعری کا تعلق لاشعور سے بہت گہرا ہے۔

فرمایا۔ اب یہ پورا قرآن ہی فعلن فعلن کے وزن پر ہے۔ اللہ نے چیلنج کر دیا تھا کہ سورہ کوثر کی تین آیا جیسی ایک آیت ہی بنا کر دکھاؤ۔ اس پر ایک شاعر نے لکھا۔۔ ماھذا قول بشر یعنی یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔۔۔ اب تئیس سال تک ایک ہی وزن میں بات کہنا۔۔ یہ انسانی کاوش سے تو ممکن ہی نہیں۔

اتنے میں داؤد صاحب نے آ کر بتایا کہ ہالینڈ فون پہ خطاب کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ اُٹھ کر کمرے میں تشریف لے گئے۔ ٹیلی فونک خطاب میں۔۔ **الاإن اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون**۔۔۔ آیت کی شرح میں فرمایا۔ یہاں غم سے مراد کسی چیز کے چھن جانے کا غم اور خوف سے مراد کسی چیز کے چھن جانے کا اندیشہ لاحق ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جو

لاوگ اللہ تعالیٰ کی قربت سے سرفراز ہوتے ہیں اُن کو کسی چیز کے چھن جانے کا اندیشہ لاحق نہیں رہتا اور نہ ہی کسی چیز کے چھن جانے پر انہیں کوئی ملال ہی ہوتا ہے۔ خود کو اس طرزِ فکر سے آراستہ کرنے والا بندہ ہی اللہ کا دوست بن سکتا ہے۔

فرمایا۔ آپ جب بھی پریشان ہوں تو آپ حضور قلندر بابا کا ذکر کیا کریں۔۔ اُن کا ذکر کرنے سے پریشانی ختم ہو جائے گی۔

اس خطاب کے بعد فرمایا۔ حالات اچھے اور بُرے رہتے ہیں لیکن سر کے لئے چھت، جسم کے لئے لباس اور پیٹ کے لئے روٹی میسر ہی رہتی ہے۔۔ حالات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مغربی کھانوں کی بات ہو رہی تھی۔ فرمایا۔ یہ کھانے کھا کر نیت تو بھر جاتی ہے لیکن پیٹ نہیں بھرتا جبکہ یہاں کے کھانے کھا کر پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن نیت نہیں بھرتی۔

مشرقی اور مغربی کھانوں پہ اتنا بھرپور، جامع اور مبسوط تبصرہ سن کر سبھی بہت محظوظ ہوئے۔

پھر رفیع صاحب کا تذکرہ ہوا۔ فرمایا۔ ایک روز بہت رازداری سے مجھے کہا۔ مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔۔ میں نے کہا ضرور۔۔۔ تو میرے کان میں کہا۔۔ آپ کبوتر ہیں۔۔ میں نے کہا آپ نے ٹھیک کہا۔ تو وہ ناچ اُٹھے۔ اب انہوں نے جو بھی دیکھا اپنے اندر دیکھا۔۔ ہو سکتا ہے کسی کو میں کچھ اور ہی دکھتا ہوں۔۔ تو کیا میں اُن کے کہنے سے کبوتر بن گیا یا کچھ اور بن گیا۔

فرمایا ہر آدمی اپنے اندر دیکھتا اور ہر آدمی دوسرے کا آئینہ ہے۔

پھر بتایا کہ جس روز وہ فوت ہوئے اُس روز وہ یہاں مراقبہ ہال میں اندر کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اُٹھے اور باہر آ کر کہا۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔ اچھا خدا حافظ اور وہیں لیٹ گئے۔ ہم سمجھے گھر جانے کا کہہ رہے ہیں لیکن وہ تو اوپر چلے گئے۔ ایسی موت تو اللہ سب کو دے۔

طاہرہ اور نثار صاحب نے آ کر ایک مسودہ پیش کیا۔ دیکھا تو تشریحات لوح و قلم کے عنوان سے دیئے گئے لیکچروں کا مجموعہ تھا، مرید نے تجویز کیا کہ اس کا نام تشریحات کی بجائے شرح لوح و قلم زیادہ مناسب رہے گا۔ بات سُن کر پہلے تو مرید کو نظر بھر کر دیکھا اور پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پیڈ پہ قلم سے شرح لوح و قلم لکھ کر چند ساعت اُسے دیکھتے رہے پھر فرمایا۔ جی ہاں یہ زیادہ مناسب رہے گا۔

مرید نے پشاور میں باباجی پبلشرز کی طبع کی گئی اسلم ناز کی کتاب 'مرشد مرشد' دکھائی کتاب دیکھ کر مسکرائے اور کتاب دیکھ کر اس نظم کی بابت جس کے ہر شعر کے پہلے مصرعے کے حرفِ اول کو جوڑنے سے خواجہ شمس الدین عظیمی بنتا تھا۔۔ فرمایا۔ اس کے ساتھ فٹ نوٹ ہونا ضروری تھا کہ اس نظم کے ہر مصرعے کا پہلا حرف ملا کر دیکھیں کہ کیا بنتا ہے؟

پھر دیباچے میں لکھے ایکجملے کی ساخت پہ تبصرہ فرمایا۔ یہ کر رہی ہوتی ہے۔۔ کیا ہوا؟ مرید جھینپ کر بولا یہاں اردو کچھ گلابی ہو گئی ہے۔۔ فرمایا۔ گلابی کہاں ہوئی یہ تو نیلی ہو گئی۔

مراقبہ ہال کی بابت فرمایا۔ اب یہ واقعی ایک ہال بن گیا ہے۔ اب اس میں وہ فقیر کی جھونپڑی والی بات نہیں رہی۔ پہلے جو کیفیات ہوا کرتی تھیں اب وہ نہیں رہیں۔ پہلے یہاں لالٹینیں جلتی تھیں۔۔۔۔ یہ عمارت بھی نہیں تھی۔۔ اب اگر یہاں ٹی وی لا کر رکھ دیں تو یہ سب ٹی وی ہی دیکھتے رہیں گے۔

فرمایا۔میں نے کئی بار سوچا کہ زمین خریدنے اور تعمیر کے جھنجٹ میں نہیں پڑوں گا اور مزید تعمیر نہیں کروں گا لیکن اب پھر یہ مہم درپیش ہے کہ یہاں جگہ کم پڑ گئی ہے اور نئی جگہ لے کر مزید تعمیر کا سلسہ کرنا پڑ رہا ہے۔ بھئی بندہ اپنے طور پہ کیا کر سکتا ہے اللہ جو چاہتا ہے اُسے وہی کرنا پڑتا ہے۔

پھر گروہی تقسیم کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرمایا۔ ایک آدمی کو خیال آتا ہے کہ وہ لوہار بنے یا ویلڈنگ کرے۔۔۔اب ہوتا یہ ہے کہ دوسرا آدمی اس لئے لوہار نہیں بنتا کہ یہ بہت محنت طلب کام ہے اور وہ اتنا سخت کام کرنے پر امادہ نہیں لیکن اللہ نے جس کو لوہار بنانا ہوتا ہے اُس کو لوہا کوٹنا قطعاً سخت یا دشوار نہیں لگتا۔

پھر مغرب میں ہونے والی تحقیق اور ریسرچ کے حوالے سے بتایا۔ایک بار میں وہاں ایک ریسرچ سنٹر گیا۔ وہاں پہ دبیز قالین بچھے تھے۔۔۔دیواریں ساؤنڈ پروف تھیں۔ میں نے ایک کاغذ اُٹھایا تو آواز پیدا ہوئی۔۔۔ایک شور سا اُٹھا۔ایک عورت تیزی سے آئی اور اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اشارے سے شور کرنے سے منع کرنے کو کہا کہ مت کریں۔ وہاں ایک صاحب کو دیکھا۔ نگاہیں دور کہیں خلا میں جمی ہوئی۔۔۔ہاتھ میں قلم۔۔جونہی کوئی خیال آتا وہ کاغذ پہ کچھ لکھتے۔۔ سیکریٹری آتی۔۔۔وہ کاغذ اُٹھا کے لے جاتی اور خاموش مشینوں پہ ٹائپ ہوتا۔۔اُن کو نہ یہ ہوش کہ ہم نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں یا نہیں۔۔اُن کو انہوں نے معاش سے آزاد کیا ہوا ہے۔رہنے کو عالی شان گھر۔۔ گھومنے پھرنے کو گاڑی۔۔بنک میں وافر بینک بیلنس۔۔یہ سب سہولتیں وہ اس لئے دیتے ہیں کہ ذہن کہیں رُکے یا اٹکے نہیں۔اب اگر معاش کے مسئلے ہو تو ذہن کہاں کھلے گا۔۔ ہمارے یہاں ذہن کہیں سیکس میں اٹکتا ہے تو کہیں بچوں کی فیسوں میں الجھتا ہے۔۔آپ اُن سے اپنا موازنہ تک نہیں کر سکتے۔۔ بھئی ہمارا اُن کا کیا مقابلہ ؟

رقیب روسیا

جب مرشد کریم کا دوبارہ پشاور آنا ہوا تو ایرپورٹ پر استقبال کرنے والوں میں شامل شاہین نے امی حضور کی خیریت دریافت کرنے کے بعد بات کو طول دینے اور دیر تک مخاطب رہنے کو جب ایک ایک بیٹے اور بہو بیٹیوں کا نام لے لے کر اُن کی خیر و عافیت کا پوچھا تو سب ٹھیک ہے کہتے کہتے فرمایا۔ سب خوش ہیں۔ بھئی سب خوش ہیں تو اپنے حال میں ہیں۔ اسی لئے تو جو جس حال میں ہے وہ اُس حال میں اس لئے ہیں کیونکہ وہ اُس حال میں خوش ہیں اگر وہ اُس حال میں خوش نہ ہوں تو وہ اس کو چھوڑے نہ دے۔ ہر انسان اپنی جگہ خوش ہی ہے۔ کوئی کسی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے۔ اپنے بارے میں کہے تو کوئی بات بھی ہے۔

اب کچھ لوگ ہیں جو خوش ہوتے ہیں جب انہیں دولت ملے۔ کچھ لوگ دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہوتے ہیں۔ کچھ کو دمار کھا کر اذیت برداشت کر کے خوش ہوتے ہیں۔۔ یہ فطرت کے باعث ہوتا ہے۔ اب بچھو کو ہی دیکھ لیں۔۔ اُسے لکڑی پہ رکھ دیں، لوہے پہ رکھ دیں۔۔ وہ ہر جگہ ڈنک مارتا ہے۔ اُسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ڈنک ہاتھ پہ پڑ بھی رہا ہے یا نہیں۔ پھر فارسی کا مصرعہ پڑھا۔۔ بتقاضائے طبیعت نیش عقرب تسکین خواہی۔

کار پارکنگ کی طرف چلتے ہوئے فرمایا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا ارشاد ہے کہ انسان خوشی سے واقف ہی نہیں۔ جب انسان خوشی سے واقف ہی نہیں تو وہ خوش کیسے ہو سکتا ہے؟ جب آپ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو پیچھے رہ جانے والے مرید نے سوچا۔ یہ خوش ہونا اور خوشی سے واقف بھی نہ ہونا۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کیا ہم لوگ خوشی سے واقف ہوئے بغیر ہی خوش ہوتے ہیں؟ پیشتر اس کے وہ کسی نتیجے پر پہنچتا۔۔ سب کے روانہ ہونے پر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ کر یہ سوچتے ہوئے چل پڑا کہ یہ بات وہ حضور سے دریافت کرے گا۔

شام کو جب وہ مراقبہ ہال پہنچا تو حضور مراقبہ ہال کے کمرے میں ارادت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ سب اُن کے گرد نیم دائرہ بنائے بیٹھے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو آپ فرما رہے تھے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ہر دو سو میل کے بعد زبان بدل جاتی ہے۔ ہر زبان میں ہر چیز کا نام ہوتا ہے۔ کوئی جڑی بوٹی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ اُس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو مگر اُس علاقے کے لوگ اُس کو کسی نہ کسی نام سے ضرور پکارتے ہیں۔ پہاڑوں کے بھی نام ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر علاقے کا بھی ایک نام ہوتا ہے۔ اب یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ نام کہاں سے آئے۔ بعض لوگ علم الاسما کی تفسیر کرتے ہوئے انسان کی اس صلاحیت کو زیرِ بحث لے آتے ہیں۔ یہ بھی ایک پہلو ہے اس علم کا۔ پھر آپ یہ دیکھیں کہ ہر دور میں ہر عہد میں لوگ نئے نئے نام رکھتے ہیں۔۔۔ یہ سب کہاں سے آتے ہیں؟

آپ خاموش ہوئے تو کسی نے دریافت کیا۔ عالمِ برزخ واعراف میں کونسی زبان بولی جاتی ہے؟

فرمایا۔ وہاں کوئی زبان نہیں بولی جاتی۔ خیالات براہ راست منتقل ہوتے ہیں۔ ہم جو بھی زبان بولتے ہیں اُن میں آواز کی لہروں کو مخصوص معانی کی ادائیگی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب آپ نے پانی کہنا ہے۔۔ آپ اسے آب کہہ لیں۔۔۔ اُب کہہ لیں۔۔۔ واٹر کہہ دیں۔۔ ما کہہ لیں۔۔ مفہوم ایک ہی ہے۔ پانی کا تصور کہیں واٹر کہلایا تو کہیں ما، کہیں آب او کہیں ابو۔ دراصل ایک جھماکا سا ہوتا ہے۔ خیال آتا ہے اور الفاظ کے قلب میں ڈھل جاتا ہے۔۔۔ اُن الفاظ کے قالب میں جو فرد کی مادری زبان کے الفاظ ہوتے ہیں۔ انسا کسی دوسری زبان کو کتنا ہی سیکھ جائے۔۔ سوچتا اور خواب اپنی مادری زبان ہی میں دیکھتا ہے۔

پھر ایک لطیفہ سنایا کہ ایک لڑکا اپنے ماں باپ کے ساتھ بنارس گیا۔ گنگا جمنا کے سنگم پر کوئی میلہ یا کوئی تہوار تھا۔ وہ وہاں سو گیا۔ نیند سے بیدار ہوا تو اُس نے ارد گرد موجود لوگوں کو اشاروں سے کچھ بتانا چاہا۔۔ لوگ سمجھے وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کسی نے مارا ہے۔ سننے والے اور وہ لڑکا مسلمان تھے۔ انہوں نے سوچا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے ہندوؤں نے مارا ہے۔ ہندوؤں سے پوچھا انہوں نے کہا ہم اسے کیوں ماریں گے؟ اس نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟ ادھر وہ لڑکا زور و شور سے اشاروں میں مسلسل کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنے میں اُس کی ماں وہاں آگئی۔ ماں نے اس کے اشاروں کو دیکھا تو وہ ہنس پڑی اور بتایا۔ یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دولہا بنا ہوا گھوڑے پر بیٹھا ہوں اور زور زور سے ڈھول بج رہا ہے۔ اس پر وہ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ستار العیوب اور غفار الذنوب ہیں۔۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے پردہ داری ہی کا ایک انتظام ہے کہ خیال الفاظ کے جامے میں سامنے آتے ہیں۔ خیال اپنی جگہ انتہائی Pure ہوتا ہے۔ الفاظ فریب دیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے کے سامنے اپنے عیب اور نفرت و حسد وغیرہ چھپانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتے۔

سب کے ذہن سے جانے کیا گزرا کہ آپ نے فرمایا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ رحم و کرم فرمائے اور آپ براہ راست دیکھنا شروع کر دیں تو وعدہ فرمائیں کہ آپ کسی کے اندر نہیں جھانکیں گے۔

لوگ آپ کی باتیں سنتے سنتے کہیں کھو جاتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ جو کچھ بھی ارشاد فرماتے ہیں خلوص اور اپنے متعلقین اور مخلوقِ خدا کی بھلائی کے جذبے سے ارشاد فرماتے ہیں۔ لوگوں کو کھویا دیکھ کر آپ نے مرید سے فرمایا۔ میں تو ایک داستان گو ہوں۔۔۔ لوگ اس لئے بھی میری بات سنتے ہیں کہ انہیں مزہ آتا ہے۔ فلم نہ دیکھی۔۔ داستان سن لی۔ فقیر کے پاس آپ جب بھی ائیں گے۔۔ وہ آپ کو کوئی نئی بات ہی سنائے گا۔

مرید نے کڑھ کر سوچا تو کیا لوگ آپ سے کچھ سیکھنے نہیں آتے محض تفریح طبع کے لئے آتے ہیں؟ فلم نہ دیکھی داستان سن لی۔۔۔واہ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی۔ پیشتر اس کے وہ کچھ کہتا۔ آپ نے یہ کہہ کر محفل برخاست کر دی کہ رات کھانے کے لئے کسی کے گھر جانا ہے۔۔ میں ذرا تیار ہو لوں۔

اگلے روز جمشید علی کے ولیمے میں شرکت کے لئے اُن کے گاؤں گئے۔ وہاں گاؤں کے حجرے میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں موجود سبھی لوگ آپ کو دولہا کے پیر صاحب جان کر عزت واحترام بھی کر رہے تھے اور متجسس ہو کر۔۔۔ کوشش میں تھے کہ اُن سے بات ہو۔۔ حضور نے سیاہ چشمہ پہن کر مخصوص انداز میں ایک طرح کا فاصلہ پیدا کر لیا تھا۔ آپ نے خاموشی کو توڑنے کو پوچھا۔ اس گاؤں کی آبادی کتنی ہو گی؟ کسی نے کہا پانچ ہزار۔۔ کسی نے بیس ہزار،۔۔۔ ایک صاحب نے ڈیڑھ لاکھ تعداد بتائی۔ سُن کر خاموش ہو رہے۔ کچھ دیر بعد اس پر تبصرہ کیا۔ ہم اپنے ارد گرد سے اس قدر غافل رہتے ہیں کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے آس پاس کون کون رہتا ہے۔ کسی کو یہ تک تو پتہ نہیں کہ ہمارے شہر، قصبے یا گاؤں کی آبادی کتنی ہے؟

حضور ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب نے جو اُسی گاؤں کے معلوم ہو رہے تھے سوال کیا کہ شریعت کو By Pass کیا جا سکتا ہے یا ایسا کرنے کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟ اب نہ جانے اُن کے ذہن میں کیا تھا۔۔ وہاں بیٹھے عقیدت مندوں ہی نے نہیں بلکہ سب نے قدرے حیران ہو کر سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔۔ نہ جانے وہ ایسا سوال کیوں پوچھ رہے تھے جس کا جواب نفی کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

جب وہ خاموش ہوئے تو حضور نے فرمایا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا کسی عیب جوئی کرنے، غلط بیانی یا برائی کرنے کی شریعت میں کوئی اجازت ہے؟ جب انہوں نے جواب نفی میں دے دیا تو آپ نے فرمایا۔ آپ دوسروں میں غلطیاں ڈھونڈتے ہیں جبکہ

شریعت تو اس سے بھی منع کرتی ہے۔اب کئی لوگ میری ڈاڑھی کی بابت کہتے ہیں کہ یہ غیر شرعی ہے۔اب ڈاڑھی نہ ہوتی تو ایک بات تھی اب ڈاڑھی ہے تو شرعی اور غیر شرعی کیسی ہو سکتی ہے؟اور پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ ایک ڈاکٹر کے پاس علاج کروانے جائیں اور اُسے کہیں تمہاری ڈاڑھی نہیں ہے، لہذا میں تم سے علاج نہیں کراؤں گا۔

اسی طرح ایک بار ایک صاحب آئے۔۔اپنے بیٹے کا علاج کروانے۔۔۔مجھے دیکھ کر کہنے لگے ہم جا رہے ہیں۔۔ہم نے دیکھ لیا۔میں نے کہا بھئی کیا دیکھ لیا۔۔کہا آپ نے آستانے میں ننگی تصویر لگائی ہوئی ہے یہ غیر شرعی ہے۔

فرمایا۔ٹی وی پر جو تصویریں آتی ہیں وہ انتہائی عریاں بھی ہوتی ہیں پھر بھی ہر گھر میں ٹی وی ہے۔گھروں، بیٹھکوں، حجروں اور دکانوں میں ایکٹریسوں کی تصاویر لگی ہوں تو جائز۔۔۔تصویروں والے نوٹ جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا جائز۔۔۔تصویر کے بارے میں صرف ایک ضعیف حدیث ملتی ہے اور بھی بتوں کے حوالے سے ہے۔بات یہ ہے کہ یہ لوگ کسی اللہ والے کی تصویر تک برداشت نہیں سکتے۔کم بولنا، جھوٹ بولنا، کسی کا حق مارنا تو سب ہو رہا ہے۔۔۔لوگ رشوت بھی لے رہے ہیں۔۔۔آپ کو اُس وقت تو شریعت کی یاد نہیں آتی جب کوئی راشی افسر آپ کا کام کرنے کے پیسے مانگ رہا ہوتا ہے۔۔شریعت کا سارا زور۔۔۔یوں لگتا ہے کہ ٹخنوں سے نیچی شلوار پہ ہی چلتا ہے۔اُس وقت امارت اور تکبر کے اظہار کو ایسا لباس پہنتے تھے جو زمین پہ گھسٹتا تھا۔۔شریعت نے اس اصراف سے منع کیا ہے۔

فرمایا۔لوگ کہتے ہیں کہ میں نماز سے منع کرتا ہوں۔۔میں کیوں منع کروں گا۔۔میں خدانخواستہ کوئی شیطان ہوں۔۔میں تو یہ کہتا ہوں کہ نماز کو ٹھیک طرح سے ادا کریں۔۔آپ نے کوٹ الٹا پہنا ہوا ہے۔۔میں نے کہہ دیا کہ کوٹ کو سیدھا کر کے پہن لو۔۔تو کیا میں نے کوٹ پہننے سے ہی منع کر دیا۔میں تو کہتا ہوں کہ فویل المصلین والی نماز مت پڑھو بلکہ معراج المومنین والی نماز

پڑھو۔اب اس پہ کوئی یہ کہے کہ میں نماز سے منع کرتا ہوں تو کیا یہ انصاف ہو گا؟اسی طرح اب شریعت میں تفرقے کی کتنی اجازت ہے ؟لیکن چار چار مسجدیں ایک ہی محلے میں ہونا اور اوپر سے لاؤڈ سپیکر پہ لوگوں کو پریشان کرنا۔۔کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟کاروبار کے لئے بنکوں سے پیسے لیتے وقت لوگوں کو تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ سود کو واشگاف منع کرتے ہیں۔وہاں کیا شریعت آپ کو اس کی اجازت دیتی ہے کہ آپ مجبوری کی آڑ لے کر سود پہ پیسے لے لیں؟

آپ کی بات پوری ہونے تک سوال پوچھنے والے صاحب کے چہرے پر تڑخنے کے آثار نمایاں تھے۔

نیاز صاحب نے مزاج شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لئے سوال کیا۔جب بندہ اللہ سے ملنا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی بندے سے ملنا چاہتا ہے تو پھر ملاپ کیوں نہیں ہوتا۔۔اس میں اتنی دشواری کیوں محسوس ہوتی ہے؟

اس پہ آپ نے سوال پوچھا۔ایک محبوب ہے۔۔۔اور ایک محب ہے۔۔۔۔یہ دونوں آپس میں ملنا چاہتے ہیں۔۔وہ کون سی ایسی بات ہے جو اُن کے آڑے آتی ہے اور اُن کا ملن ہونے نہیں دیتی؟

سب سوچ میں پڑ گئے۔

فرمایا۔رقیب روسیاہ!جب بندہ اللہ سے ملنا چاہتا ہو اور دنیا رقیب سے روسیا بن کر آڑے آئے تو وصل کیسے ہو سکتا ہے؟اگر بندے کے لئے جنت رقیب بن جائے تو اللہ سے وصل کیسے ہو گا؟دنیا ہو۔۔دولت ہو۔۔اولاد ہو۔۔بیوی ہو۔۔۔بیوی کے لئے خاوند ہو۔۔گاڑی ہو۔۔یہ سب چیزیں جو آپ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔۔۔آپ کو اللہ سے دور کرتی ہیں۔۔اس کا یہ مطلب ہرگز

نہیں کہ آپ ان اشیاسے بالکل قطع تعلق کر لیں۔۔اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں آپ کے استعمال کے لئے بنائی ہیں۔۔آپ انہیں استعمال کریں اور خوش دلی سے استعمال کریں۔۔لیکن ان میں دل نہ لگائیں۔

پھر فرمایا۔ بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کی باتیں کسی کو بتانے کی نہیں ہوتین۔ سب جانتے ہیں کہ میاں بیوی کے درمیان کیا ہوتا ہے لیکن کبھی کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کیسے تعلق رکھتا ہے۔

پشاور واپسی پر راستے میں فرمایا۔ایک بار ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے اور کہا کہ انہوں نے خواب میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کو دیکھا ہے کہ وہ اُن سے کہہ رہے ہیں کہ خواجہ صاحب جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے بہت دماغ لڑایا کہ بھلا اس کا کیا مطلب ہوا؟ آخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ میں کہتا ہوں کہ روحانی ڈائجسٹ خسارے میں جا رہا ہے۔ میں نے چار پانچ سال ہر ماہ پانچ سے سات ہزار روپے نقصان کیا۔۔اب تو اشتہار بھی نہیں ملتے۔۔لوگ کہتے ہوں گے کہ مذہبی سا رسالہ ہے۔۔اسے کون پڑھتا ہوگا۔

جب میں نے غور کیا کہ آخر یہ نقصان کہاں سے پورا ہو رہا ہے۔۔کتابیں بک رہی ہیں۔۔دواخانہ چل رہا ہے۔ نقصان وہاں سے پورا ہو ہی جاتا ہے تو اس طرح میرا یہ کہنا کہ روحانی ڈائجسٹ خسارے میں جا رہا ہے غلط ہی ہوا نا۔۔۔اس کے بعد سے میں نے یہ بات کبھی نہیں کہی۔

کس خوبصورتی سے انہوں نے باتوں باتوں میں یہ امر تعلیم فرمادیا کہ نقصان کو دیکھنے کی بجائے۔۔۔اللہ کے اس انتظام کو بھی دیکھنا چاہئے جس کے تحت نقصان پورے ہوتے ہیں۔

ایک اور بات یہ سنائی کہ ایک بار اُن کے پڑوسی کا بچہ اُن کے پاس آیا اور بتایا کہ اس کا ابو اُس کی امی کو مار رہا ہے۔ فرمایا۔ میں چھڑایا تو وہ الٹا میرے سر ہو گئے کہ آپ نے مداخلت کیوں کی۔ میں نے کہا آپ اپنی بیوی کو کیوں مار رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ مجھے قرآن اجازت دیتا ہے کہ میں اپنی بیوی کو مار سکتا ہوں۔ اس پر میں نے کہا۔ آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ قرآن نے یہ اجازت کس بات پر دی ہے۔۔ مگر وہ اپنی کہتے رہے۔

اتنی دیر میں اُن کے بڑے بھائی بھی وہاں پہنچ گئے۔ متشرع قسم کی ڈاڑھی والے تھے۔ کہنے لگے۔ مارنے کی کیا ضرورت ہے نباہ نہیں ہو رہا تو تم طلاق دے دو۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔ اور کھڑے کھڑے ایک دو تین طلاق کہہ کر فارغ کر دیا۔

میں نے کہا طلاق یوں نہیں ہو سکتی۔ میں بخاری شریف لے کر بیٹھ گیا۔ اللہ میاں اس طرح مجھے بخاری شریف پڑھوانا چاہتے ہوں گے۔ میں نے انہیں احادیث کے ذریعے سمجھانا چاہا۔ انہوں نے مولانا مودودی اور مفتی شفیع اوکاڑوی کو خط لکھے۔ دونوں نے کہہ دیا کہ طلاق ہو گئی ہے۔ لیکن میں نے اپنی بات پہ اصرار جاری رکھا۔ اس پر انہوں نے کہا اگر ان میں سے ایک بھی صاحب لکھ کر دے دیں کہ طلاق نہیں ہوئی تو میں مانوں گا۔

میں نے مفتی صاحب سے وقت لیا۔ وہاں گیا۔ انہوں نے صبح بلایا تھا۔ بٹھا کر کہلوایا کہ وہ میٹنگ میں ہیں فارغ ہو کر بلائیں گے۔ پھر بارہ بجے کہلوا دیا کہ وہ تو اُٹھ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ جب انہوں نے بلایا تھا تو انہیں ملنا بھی چاہئے تھا۔ وہ خود کہہ دیتے کہ آپ کسی اور وقت آ جائیں۔۔ آج میں فارغ نہیں۔ اسی دوران اس مدرسے کے شیخ الحدیث بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے آ کر بات سنبھالنے کی بجائے تو تو میں میں شروع کر دی۔ اس پہ میرا ہاتھ اُٹھ گیا۔ انہوں نے کہا۔ اسے مارو۔ میں نے کہا۔ ہاں مارو۔۔ بات بہت بڑھ گئی۔ اس پر مفتی صاحب وہاں خود آ گئے۔ انہوں نے بزرگوں کی طرح بات سُنی۔ میں نے کہا

متعلقہ احادیث کے حوالے دیئے۔اُن صاحب کے حالتِ جنوں میں طلاق دینے کے بارے میں اپنی بات کہی۔ میرے ساتھ اُن صاحب کا بیٹا بھی تھا جنہوں نے طلاق دی تھی۔ اُس نے میری بات کی تائید کی۔ انہوں نے کہا۔آپ کی بات درست ہے مگر گواہی معتبر نہیں۔ شاید انہوں نے بھی میری ڈاڑھی کی وجہ سے ایسا کہا تھا۔اس پر میں نے اپنا تعارف کروایا۔وہ میرے پورے گھرانے سے واقف تھے۔

خیر قصہ مختصر انہوں نے لکھ کر دے دیا کہ طلاق نہیں ہوئی گواہی معتبر ہے۔ اگر میں اتنا زور نہ لگاتا تو شاید کام بھی نہ ہوتا۔ وہ گھرانہ آج بھی ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا ہے۔

شام کو مراقبہ ہال میں خواتین و حضرات کے اجتماع سے خطاب کو اِن اولیا اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔کسی چیز کے چھن جانے کا ڈر خوف ہوا کسی چیز کا سچ مچ چھن جانا حزن یعنی غم ہوا۔ پھر اس کی مختلف مثالیں دے کر وضاحت فرمائی کہ انسان پہلے کسی چیز کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے اس دوران اُس کو وسوسے گھیرے رہتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گا بھی یا نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فضل و کرم کرتے ہیں اور وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ کہیں یہ چھن نہ جائے۔اس ڈر اور خوف سے زندگی آلودہ تر ہوتے ہوتے جب ایک دن وہ چیز سچ مچ چھن جاتی ہے تو غم لاحق ہو جاتا ہے۔

اللہ کے دوستوں کو ایسی طرزِ فکر حاصل ہوتی ہے کہ جب وہ کسی چیز کے حصول کے لئے تگ ودو کرتے ہیں تو وسوسے اور خدشات اُن کو پریشان نہیں کر سکتے اور جب وہ اس کو حاصل کر لیتے ہیں تو اُن کو اس کے چھن جانے کا ڈر اور خوف پریشان نہیں کرتا اور جب وہ چیز اسباب وعلل کے قانون کے تحت استعمال کر لیتے ہیں یا وہ اُن کے پاس مزید نہیں رہتی تو وہ غمگین نہیں ہوتے۔اُس کے

ہجر میں دبلے نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دروبست اللہ کی طرف سے ہو رہا ہے اور اسی کی طرف پلٹ رہا ہے۔ اگر ہم قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق ان باتوں کو سمجھ لیں اور ایسی طرزِ فکر حاصل کر لیں جس میں اندیشے وسوسے، ڈر اور خوف نہیں ہوتا تو ہم لامحالہ غم اور حزن سے بھی محفوظ ہو جائیں گے اور ہم اللہ کے دوست بن سکیں گے۔

فرمایا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دوستی کی شرائط ہی تو بیان فرمائی ہیں۔

محفل کے اختتام پر ادھر لنگر تقسیم ہو رہا تھا اور ادھر نیاز صاحب نے چند دوستوں کو مرشد کریم کے قریب بیٹھنے کا موقع فراہم کرنے کو الگ کمرے میں نشست کا اہتمام کر دیا۔

ایک خاتون کی بابت بتایا کہ انہوں نے ٹڈے پر ریسرچ کی اور کوئی ڈھائی ہزار اقسام بیان کیں۔

فرمایا۔ اب انہوں نے ہر قسم کا کوئی نام بھی رکھا ہو گا۔

ہمارے اپنائے ہوئے نظریات پہ چوٹ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب انسان کوئی برائی کرتا ہے تو تنہائی میں کرتا ہے۔ باتھ روم جاتا ہے تو اندر سے کنڈی لگا لیتا ہے گویا پیشاب پاخانہ کرنا بھی کوئی غلط اور بُری بات ہی ہوئی۔

کھانے کے بعد ٹہلنے کے دوران ارشاد فرمایا۔ دنیا میں کل سو کہانیاں ہیں اور اُن میں سے بھی صرف پانچ کہانیاں بنیادی ہیں۔ باقی تمام انہی کی آمیزش سے بنی ہیں۔ اس پر نیاز صاحب نے بتایا کہ عجیب بات ہے کہ راگ بھی کل پانچ ہیں اور اُن سے دو سو راگنیاں بنی ہیں۔ اس پر ابا حضور مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔ لیکن سر تو سات ہوتے ہیں۔

پھر لباس کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرمایا۔ جنت میں تو یہ لباس ہو گا نہیں۔ مولوی حضرات بتاتے ہیں کہ حوروں نے ریشم و حریر کے ستر ستر چولے پہنے ہوں گے اور اُن میں سے بھی اُن کی پنڈلی نظر آئے گی۔ یہ پنڈلی انہیں بہت پسند ہے۔ ملکہ سبا کے قصے میں بھی حضرت سلیمان نے پنڈلی ہی تو دیکھنے کے لئے ایسا فرش بچھوایا تھا کہ محسوس ہو کہ پانی بہہ رہا ہے۔ اُن کے انجینئرنگ کے کمالات اور ترقی پہ تو ہماری نظر جاتی ہی نہیں البتہ پنڈلی کو ضرور واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حوروں کی پنڈلی میں ہدی اور پھر ہڈی کے گودے کا رنگ تک نظر آئے گا۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔ مجھے تو قے ہو جائے ایسی پندلی دیکھ کر۔

فرمایا۔ جنت میں جب آدم سے نافرمانی ہوئی اور انہیں پیشمانی کے ساتھ برہنگی کا احساس ہوا تو کیلے کے درخت نے اپنی خدمات پیش کیں اور انہوں نے اس کے پتے لے کر ستر پوشی کی۔ یوں لباس وجود میں آیا ورنہ اس سے پیشتر لباس کہاں تھا۔ جونہی لباس وجود میں آیا۔۔ جنت نے آدم کو رد کر دیا ہے۔ اب بھی دیکھ لیں کہ ہم باتھ روم میں جا کر لباس اتار کر خوش ہوتے ہیں۔ میں تو صاف کہہ دیتا ہوں کہ میں جنتی ہونے جا رہا ہوں۔۔ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ انسان وہاں جا کر یکسو ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں مجھے باتھ روم میں یہ خیال آیا۔۔۔ وہ خیال آیا۔

مرید نے عرض کی۔ یہ انسانی عقائد کے بننے اور انہیں اپنانے کے عمل کو لباس کہا گیا ہے؟

اس پر ارشاد فرمایا۔ نافرمانی سے اندیشے نے وجود پایا اور خوف محسوس ہوا۔۔ اس خوف سے کہ اب جنت چھن جائے گی۔۔ معافی تلافی کا خیال ہی نہ آ سکا۔ جب جنت چھن گئی تو غم نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس غم میں انہیں معافی تلافی کا دھیان آ گیا ورنہ یہ کام وہ وہاں پہ بھی تو کر سکتے تھے لیکن خوف نے انہیں اس قابل ہی نہ چھوڑا۔ جب انہوں نے معافی مانگ لی تو اللہ نے کہا۔ اب تو تم اتر آئے ہو اب اگر میرے بتائے ہوئے راستے پر چلو گے تو واپسی ہو سکے گی ورنہ نہیں۔

اگلے دن ڈاکٹر میاں مختار الحق صاحب کے گھر پہ سلسلے کے بہن بھائیوں کے ساتھ نشست تھی۔ لوگ ملنے آرہے تھے کوئی کچھ پوچھ رہا تھا تو کوئی کچھ۔ سب سے ملتے ملاتے ایک صاحب نے اپنے کسی دوست کا تعارف کروایا۔ یہ فخر ہیں۔

مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کس کے فخر ہیں یہ؟

جواب میں کہا گیا جی ان کا نام فخرِ عالم ہے۔

اُن کو غور سے دیکھا اور کہا۔۔ آپ میرے لئے دُعا کیا کریں۔

فخر عالم نے اپنی طرف سے حاضری جوابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ حضور میں تو آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔

فرمایا۔ بڑے تو چھوٹوں کے لئے دعا گو ہوتے ہی ہیں۔ چھوٹوں کو چاہیئے کہ وہ بڑوں کے لئے دعا کریں اور رب اغفرلی ولوالدی والی آیت کے حوالے سے کہا اللہ تعالیٰ بھی اس بات کا حکم دیتا ہے کہ آپ اپنے والدین اور بزرگوں کے لئے دعا کریں۔

اگلے روز ورسک ڈیم پہ پکنک کا پروگرام تھا۔

پکنک پہ کھانے کا انتظام وہاں کے ریسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ سلسلے کے سبھی بہن بھائی موجود تھے۔ قریشی صاحب نوجوانوں کی ٹیم کی سربراہی کرتے ہوئے کھانا پکانے کی نگرانی کر رہے تھے۔ رونق اور چہل پہل دیکھ کر فرمایا۔ یہ سب بڑوں کی برکت ہوتی ہے۔ کوئی بڑا نہ بھی ہو لیکن آپ نے مان لیا تو اُن کے دم قدم سے رونق ہو جاتی ہے۔ سب اکٹھے ہوتے ہیں۔۔۔ مل جل کر بیٹھتے ہیں۔

نیاز صاحب جو واپڈا میں سپر نٹنڈنٹ انجینئرنگ ہو چکے ہیں ابا حضور کو پاور ہاؤس کے اندورنی حصے کا معائنہ کروا رہے تھے۔ یہ ڈیم کب بنا؟ کس نے بنایا؟ اسکی بلندی کتنی ہے؟ ٹنل کتنی بڑی ہے؟ اگر یہ ٹربائن ہے تو وہ کیا ہے؟ جنریٹر کے کوائل کتنے ہیں؟ یہاں کتنی بجلی پیدا ہوتی ہے؟ اس کی پیداواری لاگت کیا ہے؟ جب بتایا گیا کہ صرف چار پانچ پیسے فی یونٹ تو کہا۔۔لو دیکھ لو کتنا فرق ہے۔ پھر فرمایا۔ اس میں گھر گھر بجلی پہنچانے۔۔ تاروں اور ٹرانسفارمرز کا خرچ اور دیکھ بھال کرنے والے عملے کی تنخواہیں شامل نہیں ہیں۔

پاور ہاؤس سے نکل کر ڈیم کی دوسری طرف جھیل کنارے کھڑے ہو کر سامنے کے پہاڑ کے اوپر بنی پکٹ کو دیکھ رہے تھے تو تسنیم بھابھی نے بتایا کہ اُن کا لڑکپن اور نوجوانی کا دور وزیرستان میں اسی طرح کے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر گزرا ہے۔ پانی بھرنے انہیں وہاں اوپر چوٹی سے نیچے آنا پڑتا تھا۔ دوڑ کر واپس جانا اور ایک ہی سانس میں اوپر پہنچنے کی شرط لگا کرتی تھی۔ ہنستے ہوئے بتا رہی تھیں کہ وہ ہمیشہ جیتا کرتی تھیں۔ حضور نے زیرِ تبسم لہجے میں کہا۔ آپ کو وہ زندگی یاد تو بہت آتی ہو گی؟ انہوں نے کہا۔ حالانکہ وہ بہت سخت زندگی تھی لیکن حقیقت ہے اس وقت ایسا ویسا کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔

کسی نے پہاڑوں کی بابت کہا۔ کیا ان میں بھی زندگی ہے؟

فرمایا۔ پہاڑ بھی باقاعدہ سانس لیتے ہیں۔ اور پندرہ منٹ میں ایک سانس لیتے ہیں جبکہ انسان ایک منٹ میں اٹھارہ تا بیس سانس لیتا ہے۔ یہ تقریباً تین سو گنا زیادہ مدت ہوئی۔ اسی نسبت سے ان کی عمریں بھی ہوتی ہیں۔

ریسٹ ہاؤس آ کر نیچے دریا کی طرف اتر گئے۔ وہاں سیر کرتے ہوئے دریافت کیا۔ یہ کالا باغ ڈیم کا کیا قصہ ہے؟ مرید نے اپنی معلومات کی روشنی میں اظہار خیال کیا تو دریافت کیا کہ سندھ کیوں مخالفت کر رہا ہے اور یہ پنجاب کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے؟ سب اپنی اپنی بساط کے مطابق اندازوں پر مبنی بات کہتے رہے۔ اس دوران راستے میں جہاں پتھر آتے یا پانی آ جاتا وہاں مرید کا ہاتھ تھام

لیتے۔ناہموار راستے پہ کسی کا ہاتھ تھام لینے سے راستہ ہموار تو نہیں ہو جاتا لیکن ناہمواری کو برداشت کرنے اور اُسے طے کرنے کی سکت میں ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہی سبق دینے کو اُسے وہاں کی اونچی نیچی راہیں طے کروا رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کی طرف واپسی پہ ڈھلوان راستہ چڑھتے ہوئے انہوں نے مرید کا ہاتھ تھاما تو شاہین نے اپنی خدمت پیش کرتے ہوئے کہا۔اب میں آپ کا ہاتھ تھام لوں؟ تو وہیں رُک کر فرمایا۔جی نہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا تھا۔اگر آپ گاڑی چلا رہے ہوں راستے میں سامنے بھینس آجائے تو گاڑی روک لو اور اگر کوئی عورت سامنے آجائے تو بھی گاڑی روک لو کہ ان کا کچھ پتہ نہیں کہ یہ آگے بڑھیں گی، رک جائیں گی یا واپس پلٹیں گی۔

بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ عجیب بات ہے۔ہم بیوی کو خرید کر لاتے ہیں۔ بھئی حق مہر دینا خرید نا ہی ہوا نا۔ پھر ساری زندگی اُس کو کما کر لا کر بھی دیتے ہیں۔ پھر اُس سے ڈرتے بھی ہیں اور اُس کی غلامی بھی کرتے ہیں۔ جبکہ انا اولیا اللہ لا خوف۔۔۔کا سبق پڑھنے کے بعد بیوی سے ڈرنا تو بہت ہی عجیب بات ہے۔

پھر مرید کو مخاطب ہو کر پوچھا۔آپ نے دیا تھا حق مہر؟ اور اثبات میں جواب سُن کر مسکرا دیئے۔

دریا کنارے سے ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھتے ہوئے زمین پہ پرانے خزاں رسیدہ پتوں پہ چلتے ہوئے آپ نے اوپر دیکھا اور درختوں پہ نئی پھوٹتی کونپلوں اور شگوفوں کو دیکھ کر فرمایا۔پتوں کا چھپ جانا خزاں کہلاتا ہے اور ظاہر ہو جانا بہار کہلاتا ہے۔ خزاں آنے سے یہ سب کچھ ختم تھوڑے ہی ہو جاتا ہے۔

چند قدم آگے بڑھے اور فرمایا۔ یہ پتے دراصل آکسیجن بنانے کی فیکٹریاں ہیں۔ یہ گرمی دراصل آکسیجن کی زیادتی کے باعث ہوتی ہے اور سردی آکسیجن کی کمی کا نام ہے۔ جب فضا میں آکسیجن بڑھ جاتی ہے تو پتے اس گرمی سے جل جاتے ہیں اور جب آکسیجن کم ہو جاتی ہے تو آکسیجن سازی کا عمل آغاز کرنے کو درختوں پہ پتے دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں۔

ریسٹ ہاؤس پہنچ کر کمرے میں فرشی نشست کا اہتمام دیکھ کر مرید نے انتظام والوں کی دور اندیشی کی دل ہی دل میں داد دی۔ اتنی دیر گھومنے پھرنے کے بعد تو لیٹنے کو جی چاہ رہا تھا۔ جب سب اپنے مرشد کے گرد نیم دائرہ بنا کر بیٹھ گئے تو نیاز صاحب نے اسلم ناز کو اپنے کلام میں منقبت سنانے کو کہا۔ اسلم ناز نے کچھ اشعار حمد کے پیش کئے۔ پھر کچھ نعت کے اشعار پیش کر کے ایک منقبت بحضور قلندر بابا اولیاءؒ سنا کر اپنے مرشد سے داد لی اور حوصلہ پا کر اپنے مرشد کی شان میں کہے گئے اشعار پیش کرنے کی اجازت لی۔ ان کے خلوص اور عقیدت میں ڈھلے ہوئے اشعار پہ سب نے اُن کو بہت داد دی۔ پھر قریشی صاحب نے اپنی بھانجی انیلا درانی سے نعت سنانے کی فرمائش کی۔ اُن کی آواز کا ترنم اور گداز سب کو بہالے گیا۔ پھر انہوں نے ایک ہندی گیت سنایا۔ اکھیوں کے جھروکوں سے ۔۔۔ میں نے دیکھا جو سانورے

اس لمحے سے پیشتر یہ گیت سب کے لئے ایک عام سا عشقیہ گیت رہا ہو گا۔ لیکن اُس لمحے وہ گیت وہاں موجود ہر شخص کی اپنے مرشد سے محبت کی باز گشت بن گیا۔ پیار بھرے گیت کا ایک ایک لفظ مرشد کریم کے حضور نذرانہ عقیدت کا احساس بن کر گونجتا رہا۔ سب کو لگا یہ اُن کے اپنے دل کی صدا ہے جو انیلا کی آواز میں اُن کے محبوب کی سماعت تک پہنچ رہی ہے۔۔۔ نیاز صاحب اور کئی لوگوں کے آنسوؤں اُن کے چہروں کو دھوتے رہے۔ حضور کمر کے پیچھے رکھے تکیے پر ٹیک لگائے آنکھیں کسی غیر مرئی نکتے پہ مرتکز کئے سنتے رہے۔

گیت ختم ہوا تو کچھ دیر سناٹا رہا پھر جب مرشد کریم نے تالی بجا کر داد دی تو سب کو جیسے ہوش آگیا اور سبھی نے بھرپور داد دی۔ فضا میں اک عجب سا گداز اک کومل سی لطافت گھل چکی تھی۔ مرید نے اک بار اپنے مراد سے لتا کے حوالے سے کسی کی کہی گئی بات کہ لتا کے گلے میں بھگوان بولتا ہے کہ بابت پوچھا تو انہوں نے رسانیت سے کہا۔ جی ہاں۔۔۔ بھگوان ہی تو بولتا ہے۔ اُس روز مرید کو یہ مشاہدہ ہوا کہ پیار میں جہاں ہر لفظ کچھ زیادہ ہی بامعنی ہو جاتا ہے وہاں اس کی اثر پذیری میں بھی کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

حیرت یہ ہوئی کہ کسی نے مزید کچھ اور سنانے کی فرمائش نہ کی کہ سب اسی گیت اور نغمے کے افسوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ قریشی صاحب نے کھانے پہ مدعو کر کے سب کو اس عالم بے خودی سے باہر نکالا۔

شام کو مراقبہ ہال میں الوداعی نشست میں فرمایا۔ لوح محفوظ میں کسی بندے کا ڈاکٹر بننا نہیں لکھا ہوتا۔ فزکس کیمسٹری وغیرہ سب علم کی درجہ بندی ہے۔ اگر یہ لکھا ہوتا کہ فلاں شخص ڈاکٹر ہی بنے گا تو وہ فزکس نہیں سیکھ سکتا یعنی اس طرح اس کی صلاحیتیں محدود ہو جاتیں۔

نیاز صاحب کے ایک کزن نور حسن جان صاحب نے سوال کیا کہ کیا اوپر جا کر سب لوگ جوان ہو جاتے ہیں؟

فرمایا۔ بچے اوپر جا کر بڑے ہوتے ہیں۔ اُن کی تربیت وہاں ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو یہاں اولاد نہیں ملتی انہیں اُن کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اولاد کو یہاں کس نے کھلایا اور کیا پلایا۔۔ وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا بلکہ اُن کی تربیت میں کن کن باتوں کا خیال رکھا گیا۔۔۔ یہ بات دیکھی جاتی ہے۔۔ بوڑھوں کے فیچر وہاں بھی بوڑھوں جیسے ہی رہتے ہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے یہاں زندگی اچھی طرح بسر کی ہوتی ہے۔۔ اُن کے خدوخال جوانوں جیسے ہی رہتے ہیں۔ یہ بات تو ہم یہاں بھی دیکھتے ہیں کئی لوگ بڑھاپے میں بھی جوان ہی نظر آتے ہیں۔

ہمایوں خان جو ایک پٹواری ہیں انہوں نے قربِ الٰہی اور اپنے اجداد کا سراغ ملنے کی دعا کی درخواست کی تو فرمایا۔ آپ کی پہلی بات کی بابت تو میں دعا کر دوں گا لیکن اس دوسری بات کا کیا مطلب ہوا؟ بھئی آئے ہوں گے کہیں سے۔۔۔اس بات کا پتہ چل بھی گیا تو کیا فائدہ ہو گا؟ان باتوں میں کیا رکھا ہے کہ میں فلاں ہوں۔۔آپ کچھ بن گئے تو لوگ آپ پر فخر کریں گے ورنہ جیسے آپ انہیں (اپنے اجداد کو) بھولے ہوئے ہیں، لوگ آپ کو بھول جائیں گے۔ پھر کئی لوگوں کے نام لے کر کہا۔ لوگ انہیں جانتے ہیں لیکن کسی کو یہ نہیں معلوم کہ آباؤ اجداد کون تھے۔

مرید کو گزشتہ روز کی کہانیوں کے بارے میں کہی گئی بات کے حوالے سے خیال آیا تو اُس نے عالمی ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونے والی اقابلا نامی ایک کہانی کی بابت دریافت کیا کہ کیا وہ کہانی حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے کسی قلمی نام سے لکھی تھی تو فرمایا۔ انہوں نے شیطان کی ڈائری کے نام سے نقاد میں قسط وار لکھا تھا۔ یہ تو شکیل عادل زادہ نے رائٹرز کا ایک پینل بنایا تھا اور انہوں نے مل کر اس قسم کی کہانیاں لکھی تھیں جن میں ایڈونچر، جنسی چٹخارہ اور ماورائی ماحول دکھایا گیا تھا۔ یہ اقابلا وغیرہ سب اسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔

محفل اختتام پذیر ہوئی۔ اگلے روز آپ راولپنڈی تشریف لے گئے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد کتنے ہی روز تک مرید کے اندر اک سناٹا سا چھایا رہا۔ کرنے کا کام کرتا لیکن کسی اور بات کا دھیان تک نہ آتا۔

کیوں نہ آپ کو سلسلے سے خارج کر دیا جائے

روز و شب اپنی رفتار سے گزرتے رہے۔ معمولات زندگی اپنے بہاؤ میں بہتے رہے۔ معلوم ہوا کہ مرشد راولپنڈی سے آزاد کشمیر چلے گئے ہیں۔ پھر اطلاع آئی کہ کراچی میں ہیں، پھر اطلاع آئی کہ انگلینڈ تشریف لے گئے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں کسی بھی اطلاع سے یہ تاثر پیدا نہیں ہو سکا کہ وہ کہیں دور گئے ہیں۔ پھر اطلاع آئی کہ آپ یورپ اور امریکہ کا دورہ کر کے واپس آ گئے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کراچی ہو آئے لیکن پروگرام بن بن کر ٹوٹ جاتا۔ پھر ایک روز اُسے معلوم ہوا کہ آپ لاہور تشریف لا رہے ہیں۔ اُس کا من مچل اُٹھا۔ وہ اگلے روز صبح سویرے لاہور۔۔۔ مراقبہ ہال (جامعہ عظیمیہ) پہنچ گیا۔

جب وہ وہاں پہنچا تو حضور میاں مشتاق صاحب کے ہمراہ مراقبہ ہال کے گیٹ سے باہر آ رہے تھے۔ اُس کو دیکھتے ہی دونوں بازو پھیلا کر یہ کہتے ہوئے گلے لگایا۔ بھئی آپ کو تو واقعی ٹیلی پیتھی آتی ہے۔ میں نے رات ہی آپ کو یاد کیا اور آپ صبح سویرے یہاں پہنچ گئے۔ وہ شفقت اور محبت کے احساس سے شرابور انہیں دیکھتا رہا۔ خیر و عافیت کا پوچھ کر فرمایا۔ آپ نہا دھو لیں سیر سے واپسی پہ ملتے ہیں۔ وہ مودب پیچھے ہٹا۔ آپ نے قدم بڑھایا اور سیر کرنے چل دیئے۔ نہا دھو کر۔۔۔ تازہ دم ہو کر۔۔۔ ناشتہ کر کے۔۔۔ وہاں موجود سلسلے کے بھائیوں سے مل کر۔۔۔۔ ادھر اُدھر کی گپ شپ کرتا رہا۔

حضور سیر سے واپس آکر ناشتہ کر کے، نہا دھو کر، تیار ہو کر، کمرے سے باہر آئے۔ قطار در قطار منتظر بیٹھے لوگوں ملتے ملاتے۔۔ مسئلے مسائل سنتے اور حل تجویز کرتے دوپہر ہو گئی۔ میاں صاحب نے اعلان کیا۔ بس بہت ہو گیا۔ اب آپ حضور کو کچھ آرام کرنے دیں۔ آپ کھانا کھائیں۔ سہ پہر کو دوبارہ نشست ہو گی۔ یہ کہہ کر وہ ابا حضور کو اُٹھا کر لے گئے۔ وہ دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ کرنے وہاں بچھی چٹائیوں میں سے ایک پر لیٹ گیا۔

سہ پہر کو نمازِ عصر کے بعد آپ وہاں لان میں بچھائی گئی ایک چار پائی پہ آکر بیٹھ گئے۔ نماز کے لئے بچھائی گئی چٹائیاں فرشِ محفل ہو گئیں۔ سب اُن کی چار پائی کے گرد نیم دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ جو اس دائرے میں خود سے نہیں بیٹھنا چاہ رہے تھے اُن کو منتظمین نے اس دائرے کا حصہ بنا دیا۔ لوگ باری باری کھسک کر آگے بڑھتے چار پائی کے قریب ہو کر مدعا بیان کرتے۔۔۔ جواب میں حضور نے کچھ کہنا ہوتا تو کہہ دیتے ورنی لکھ کر دے دیتے۔۔ وہ صاحب یا خاتون پیچھے ہٹتیں اور دوسرے صاحب آگے بڑھ کر اپنی کہنے لگتے۔۔ پچیس تیس افراد کے بعد۔۔ انتظامی فرائض پہ معمور صاحب نے۔۔۔ جو حضور کے پیچھے کھڑے تھے۔۔۔ اسے اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھے۔ گھسٹتے ہوئے اُن کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ بھلا اُس کے پاس اُن سے کہنے کو کیا ہے؟ وہ کہے؟ پوچھے تو۔۔۔ کیا پوچھے؟ چار پائی کے قریب پہنچ کر وہ سلام کر کے ڈوبتے سورج اور شفق رنگ آسمان کے پسِ منظر میں مراد کے چہرے پہ پھیلتی اک سنہری سی مسکراہٹ کو دیکھنے میں کچھ ایسا مگن ہو گیا کہ اُسے خبر ہی نہ ہوئی کہ سلام کا جواب دے کر انہوں نے جواباً اُس سے کچھ پوچھا ہے۔ قریب بیٹھے میاں صاحب نے اُس کی محویت کو توڑنے کو ا حضور کا کہا ہوا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔۔ باباجی فرما رہے ہیں کہ پشاور میں سب کیسے ہیں؟ تو وہ چونک کر بولا۔ سب ٹھیک ہیں، آپ کیسے ہیں؟ اس حواس باختگی پہ ممتا بھری مسکان کچھ اور گہری ہو گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مرید نے دریافت کیا۔ حضور کسی شے کو دیکھنے سے کیلوریز خرچ ہوتی ہیں۔۔ تو رنگوں کو دیکھنے پہ بھی تو کیلوریز خرچ ہوتی ہیں تو پھر یہ رنگ صحت اور تندرستی دینے میں کس طرح مدد کرتے ہیں؟

فرمایا۔ رنگوں کو دیکھنے سے بیمار کیلوریز خرچ ہوتی ہیں۔

اختصار بیان، اعجاز بلاغت اور حسِ کلام نے ایک نئی اور نادر ترکیب۔۔ بیمار کیلوریز کے خرچ ہونے۔۔۔ سے صحت و تندرستی حاصل ہونے تک سبھی مراحل کی وضاحت کو درکار ایک طویل تقریر کو حذف کر کے وہاں موجود سبھی لوگوں پہ کرم کیا۔ وہ

جو اس بات میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے وہ اس سائنس پہ کی جانے والی بات کو اپنے لئے غیر متعلق جانتے اور مغرب کی اذان کے انتظار میں بیٹھے لوگوں کا۔۔اس گفتگو سے کچھ سیکھنے کی بجائے الجھنے کا احتمال بھی نہ رہا۔

اُس نے کرومو پیتھی کتاب ی بابت بات کرنا چاہی تو فرمایا۔آپ میاں صاحب سے اس پہ بات کرنے کے لئے باقاعدہ وقت لیں۔اب یہاں محفل میں کتاب کا مسودہ کیا دیکھوں؟

اتنے میں ایک صاحب نے کہا۔میں آپ کے سلسلے میں آنا چاہتا ہوں۔۔۔میرے مرشد مجھے آپ کی کتابیں پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔

اس پر آپ نے فرمایا۔انگریز وٹ از دس،وٹ از دیٹ۔۔کرتے کرتے زبان سیکھ جاتے ہیں۔آپ اپنے مرشد سے سوال پوچھیں۔مثلاً آپ دریافت کریں کہ آپ کو ڈر لگتا ہے؟اگر وہ کہیں ہاں تو پھر پوچھیں الاانا اولیالا خوف۔۔کا کیا مطلب ہوا۔۔۔پھر فرمایا۔۔اللہ رحم کرے لوگ نہ خود کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اور نہ کسی کو سیکھنے دیتے ہیں۔

میاں صاحب سے بات کی تو اگلے روز رات نو بجے کا وقت مقرر ہوا۔رات ساڑھے دس بجے تک مرید اپنے مراد کے قرب سے مسودہ دکھانے کے بہانے سرفراز ہوتا رہا۔اس دوران مسودہ کتاب دیکھا۔۔اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔اور ساتھ میں یہ مشورہ بھی دیا کہ آپ نے جن جن کتب سے استفادہ کیا ہے ان کا حوالہ ضرور دیں ورنہ یہ سرقہ کہلائے گا اور حوالہ دینے سے یہ ریسرچ بن جائے گی۔

پھر اپنی ایک تقریر کا مسودہ دے کر فرمایا۔اس کو کتابچے کی صورت دینا ہے۔جی بہتر ہے۔۔کہتے ہوئے اس نے کاغذ سمیٹے اور شب بخیر کہتا کمرے سے باہر آگیا۔

صبح بعد از نماز فجر مراقبہ سے قبل ارشاد فرمایا۔انداز نشست میں کمر سیدھی رہے تو نیند نہیں آتی۔پھر یا حی یا قیوم کے ورد کا طریقہ تعلیم کرتے ہوئے بتایا کہ ناک سے 'م' کی آواز نکلنے پہ جھنجھناہٹ ہوتی ہے یہ نہیں ہونی چاہئے۔

تربیتی پروگرام کے شرکا سے یہ مراقبہ کروایا کہ وہ یہ تصور کریں کہ وہ ایک روح ہیں اور روح نور ہے۔مراقبے کے بعد دعا فرمائی اور کہا جس طرح میں نے آپ کی تربیت کی آپ بھی اسی طرح اپنے شاگردوں کی تربیت کریں۔

جب حضور سیر کے لئے جارہے تھے تو وہ بھی ہمراہ ہولیا۔کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک سوال نے مرید کو گدگدایا۔حضور یہ تمثلات سے کیا مراد ہے؟

کسی بھی چیز کے بنیادی خاکے کو تمثل کہتے ہیں۔سامنے کھیتوں کے بیچوں بیچ کھڑے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اس درخت کے بنیادی خاکے کو تمثل کہیں گے،وہ خاکہ درخت کے وجود میں آنے کے بعد ختم نہیں ہوا۔ہر چیز مظہر بنتی ہی اُس وقت ہے جب اس کا تخلیقی خاکہ یعنی تمثل موجود ہو۔

پھر رات کو دیئے گئے مسودے کا عنوان پوچھنے پر فرمایا۔آپ کے نزدیک کیا عنوان بہتر رہے گا؟

مرید نے عرض کی۔'پیر صاحب بچوں میں۔۔۔'مناسب لگتا ہے۔

فرمایا۔'بچوں کے پیر صاحب'۔۔۔۔زیادہ مناسب رہے گا۔

فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک سیریز ہو۔۔۔ جس میں مختلف مجالس کا احوال ہو۔ بچوں کے لئے کہانیاں ہوں جو اُن کے پیر صاحب انہیں سنائیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام۔۔۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ۔ پیغمبروں اور اولیا کرام کے بچپن کے قصے۔۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات۔

مرید نے دریافت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کون سا واقعہ جس کو بچے زیادہ دلچسپی سے سنیں گے؟ تو حضرت مریم کا حجرے میں چلہ کش ہونا۔۔ حضرت زکریا علیہ السلام کا اُن کی کفالت اور دیکھ بھال کرنا۔۔ اُن کو کھانا پہنچانا۔۔۔ پھر ایک بار دھیان نہ رہنا۔۔۔ یاد آنے پہ جب جاکر دیکھنا۔۔۔ تو وہاں خوان موجود پانا۔۔۔۔ جس میں طرح طرح کے پھل اور میوہ جات ہونا۔۔۔۔ اس پر حضرت مریم کا کہنا کہ یہ سب اُن کے لئے خدا نے بھیجا ہے۔

فرمایا۔۔ پیر صاحب کے بچپن کے واقعات میں اُن کے شرارتیں کرنے کا ذکر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔ کرتے تو سبھی ہیں۔۔ لیکن ذکر کوئی نہیں کرتا۔

پھر سوال پوچھا۔۔۔ جب ہم کسی راستے پہ پہلی مرتبہ چلتے ہیں تو وہ راستہ بہت طویل محسوس ہوتا۔۔۔ بار بار وقت دیکھتے ہیں۔۔۔۔ لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ مقام کب آئے گا۔۔۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

مرید نے عرض کی یہ سب ہماری توجہ اور احساس کا کھیل ہے۔ ہمارے ذہن میں منزل کی تقع اور انتظار ہماری توجہ کو راستے پہ مبذول رکھتی ہے اس راستے کی طوالت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

یہ جواب نفسیاتی طور پر ہو سکتا ہے کچھ وزن رکھتا ہو لیکن اس وقت مرشد جو بات تعلیم کرنا چاہ رہے تھے وہ کچھ اور ہی تھی۔ انہوں نے مرید کا جواب سن کر اپنی بات دہرائی۔ مرید نے اپنی ہانکی تو فرمایا۔ آپ مرشد سے دو قدم آگے چلیں گے تو آپ کے شاگرد آپ سے چار قدم آگے چلیں گے۔ یاد رکھیں۔ مرشد سے آگے نہیں چلتے۔۔۔ ہمیشہ دائیں طرف چلنا چاہئے۔ بائیں طرف قلب ہوتا ہے۔۔۔ فرشتے اور جنات وغیرہ اسی طرف آکر احکامات لیتے ہیں۔۔ اس لئے مرشد کے بائیں طرف یا آگے چلنا بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے۔

فرمایا۔ آپ نے یہ سُنا ہی ہو گا۔ باادب بانصیب اور بے ادب بے نصیب۔

پھر اس کی وضاحت میں بتایا۔ ایک بار میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے کمرے میں جھانکا تو انہوں نے اظہار ناراضگی فرمایا اور کہا کہ کیوں نہ آپ کو سلسلے سے خارج کر دیا جائے۔ شاید اُن کے چونکنے سے اُن کے کام میں خلل پڑا ہو گا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ معاملہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور پیش ہوا۔ اس غلطی کی پاداش میں میں سوا دو سال تک سلسلے کی رکنیت سے معزول رہا۔

مرید کے کاٹو تو لہو نہیں۔۔۔ وہ شرمندہ اور خفیف ہو کر ساتھ گھسٹتا رہا۔

کچھ دور چلنے کے بعد قدم لیتے ہوئے اپنے پاؤں کو زمین سے اُٹھا کر دکھاتے ہوئے فرمایا۔ یہ اُٹھا ہوا قدم زمانیت ہے۔۔ پھر اُس پاؤں کو زمین پہ ٹکاتے ہوئے فرمایا۔ یہ اسپیس یعنی مکانیت ہے۔

فرمایا۔ آیا کچھ سمجھ میں؟ مرید کے بشرے پہ لکھا تھا۔۔۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی دوبارہ بتا کر دریافت کیا۔ سمجھ آئی؟

مرید نے خشک ہوتے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے عرض۔ جی کوشش کر رہا ہوں۔

فرمایا۔ابھی کوئی کاروبار کی بات ہو تو آپ دومنٹ میں Feasibility بنا کر دکھادیں گے اور اُن باتوں کے لئے ذہن کام نہیں کر رہا۔ وہاں تو ذہن خوب چلتا ہے۔

پھر پاؤں کو ہوا میں لہرا کر بتایا۔ یہ زمانیت ہے۔ پاؤں کو واپسی زمین پہ ٹکا کر فرمایا اور یہ مکانیت ہے۔ دراصل انسان وقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں یعنی وقفوں کو جوڑتا رہتا ہے اگر یہ وقفے حذف ہو جائیں تو اسپیس ختم ہو جاتی ہے۔

حضور تاج الدین باباؒ اولیاؒ دیوار سے اسی لئے تو گزر گئے تھے کہ اُن کے ذہن میں سے یہ وقفے حذف ہو گئے تھے۔ اگر شعوری طور پر وہ کوشش بھی کرتے تو ایسا ہر گز نہ کر سکتے۔۔۔ یہ سب لاشعوری طور پر ہوتا ہے یعنی جب ذہن شعور سے ہٹ جاتا ہے تب ایسا ہوتا ہے۔

اب مرید کے ذہن میں بات کھلنا شروع ہوئی۔ اُس نے تذکرہ غوثیہ میں مذکورہ واقعے کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا۔ بحری جہاز میں سوار ہونے والے بندے نے ناخدا سے کہا۔ مجھے جدہ جانا ہے اور آج ہی پہنچنا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اس میں تو اتنے روز لگیں گے۔ اس پہ اُس مرد خدا نے پوچھا۔۔ اب ہم کہاں ہیں۔۔ پھر کون سی جگہ آئے گی؟ اس کے بعد کون سی۔۔۔ وعلی ھذاالقیاس اور جب سُنا کہ فلاں مقام کے بعد جدہ آئے گا تو کہا۔۔ بس یہاں جہاز روک لو۔۔ منزل آگئی ہے۔ ناخدا نے دیکھا تو واقعتاً جہاز جدہ کی بندرگاہ کی حدود میں موجود تھا۔

اس بات کو سُن کر فرمایا۔ زماں و ماکاں کے قانون سے واقف بندہ ہی اسپیس کو اس طرح حذف کر سکتا ہے۔

اس پر مرید کو حوصلہ ہوا اور اُس نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا بارش میں بھیگے بغیر ناظم آباد آنے کے اس واقعہ کا حوالہ دیا جو آپ کی کتاب تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ میں مذکور ہے تو فرمایا۔ جی ہاں ۔۔ انہوں نے بھی یہی تو کیا تھا۔

پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔ یہ باتیں سیکھنے کے لئے مرشد کا قرب بہت ضروری ہے۔

بعد میں جب ہم گاڑی میں بیٹھے حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کے مزار کی طرف جا رہے تھے تو سامنے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کس طرح اسپیس لپٹ رہی ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے گرد گھما کر دکھاتے ہوئے فرمایا۔ یہ اسپیس کے اس طرح لپٹنے ہی کے باعث تو ہم سفر کر رہے ہیں۔ ڈرائیور کا ذہن اس اسپیس کو لپیٹ رہا ہے۔

حضرت جیؒ کے مزار پر مراقبے کے بعد وہاں دیوار پہ لکھے ہوئے اُن کے مریدین کے ناموں کو پڑھنے کے بعد فرمایا۔ ان میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا نام نہیں ہے۔ اُن کے مریدوں نے بھی اُن کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ نہیں کیا۔

فرمایا۔ مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ اپنے مرشد حضور قلندر بابا اولیاءؒ کو بیعت کروانے میں ساری بات چیت میرے ہی ذریعے ہوئی تھی۔ حضرت جیؒ کو کراچی آنے اور میکلوڈ روڈ کے اُس ہوٹل میں قیام کے دوران حضور قلندر بابا اولیاءؒ کو بیعت کرنے پہ راضی کرنے کے لئے انہوں نے سارا معاملہ میرے ہی ذریعے طے کیا تھا۔

فرمایا۔ حضرت جیؒ اس بات پہ بہت فخر کیا کرتے تھے کہ اُن کے مریدوں میں سے ایک تکوین کا کام کرتا ہے۔ ایک بار حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے کسی نے پوچھا تھا۔ جب آپ تکوین میں تھے تو آپ نے اُن سے بیعت کیسے کی؟ تو انہوں نے فرمایا تھا۔ اس کے لئے ہم نے وردی اتاری تھی۔۔ بعد میں واپس پہن لیا تھا۔

فرمایا۔ سلسلہ چلانے کے لئے ضروری نہ ہوتا تو شاید وہ بیعت بھی نہ ہوتے۔

پھر کہا کہ ایک بار حضرت جیؒ نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا۔ خواجہ صاحب آپ نے سلسلہ چلانا ہے تو کچھ ایسا کرنا کہ جو آگے ہیں وہ اپنے پیچھے والوں کو اوپر کھینچیں اور جو پیچھے ہیں وہ اپنے آگے والے کو اوپر دھکیلیں۔۔ اگر ایسا ہو گیا تو سبھی اوپر پہنچ جائیں گے۔

وہاں سے مجید صاحب کے گھر کے لئے روانہ ہوئے۔ مجید صاحب ہی گاڑی چلا رہے تھے۔ راستے میں منصورہ سے گزرتے ہوئے آپ نے وہاں پہ کسی منصور الرحمان صاحب سے ملنے کی خواہش کی۔ منصورہ میں جماعت اسلامی کے مرکز کے استقبالیہ گیٹ پر معلوم ہوا کہ وہ لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں تو آپ نے کہا۔ جب وہ آجائیں تو انہیں بتادیں کہ کراچی سے خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب اُن سے ملنے آئے تھے۔

مجید صاحب گھر سے پہلے مارکیٹ میں رکے تاکہ مہمانوں کی خاطر مدارت کے لئے گھر جا کر پھر نہ آنا پڑے۔ وہاں سے مجید صاحب کے گھر پہنچے۔ وہ گاڑی کو گیٹ سے اندر داخل کر کے خود اتر کر گھر کے اندر چلے گئے۔ آپ نے تبصرہ کرنے کے انداز میں کہا۔ کرایے کے گھروں میں یہ بڑی دقت ہے کہ سارا سامان ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

مجید صاحب پورچ کی طرف کا دروازہ کھولنے کی بجائے گھر کے عمومی داخلے سے باہر آئے۔۔ پیچھے پیچھے بیگم مجید اور بیٹی حضور کو خوش آمدید کہنے باہر آئیں۔ چائے آنے سے پیشتر بیگم مجید نے اپنے شوہر کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ باباجی۔ آپ ان سے کہیں کہ یہ ہمیں گھر بنا کر دیں۔

اس پہ آپ نے شفقت سے کہا۔ آپ ان سے کہتی رہا کریں۔۔۔اللہ نے چاہا تو ہو ہی جائے گا۔ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔ وہاں چائے پی۔ بیگم مجید نے سیب چھیل کر کاشوں کی صورت میں پیش کئے۔

واپسی پر گاڑی میں فرمایا۔ بزرگ بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ سب اُن سے ایک دوسرے کی شکایت کر کے اپنا اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔ میں کبھی بیوی کے سامنے خاوند کو ڈانٹ دیتا ہوں کبھی خاوند کے سامنے بیوی کو۔ کوئی بڑا اُس کر ڈانٹ دے تو بہت سے گلے دور ہو جاتے ہیں۔

شام کو لان میں نماز کے بعد بیٹھے تو مرید کے بچپن کے دوست پروفیسر عباس مرزا جو اس کے مراد سے ملنے آئے تھے، نے اُن سے دریافت کیا۔

یہ توفیق سے کیا مراد ہے؟

فرمایا۔۔اچھائی برائی۔۔ خیر و شر میں تفریق کرنے کی فہم و ادراک۔ فرمایا اگر اس کا ترجمہ صلاحیت لیا جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ مجھے اللہ نے برائی کی صلاحیت دی اسی لئے میں نے برائی کی۔ وما توفیقی الا باللہ۔۔۔کا مطلب ہے کہ مجھے اللہ کے سوا کوئی اور یہ فہم و ادراک عطا نہیں کر سکتا تھا کہ میں اچھائی کا انتخاب کر سکتا۔

مرید نے عرض کی ایک چیز ہوتی ہے علم کا منتقل ہونا۔۔اور ایک چیز ہوتی ہے طرزِ فکر کا منتقل ہونا۔۔۔پھر ایک بات ذہن کا منتقل ہونا بھی ہے۔۔ان میں کیا فرق ہے؟اور جس کو امام سلسلہ کا ذہن منتقل ہوتا ہے اسے خانوادہ کہتے ہیں۔۔۔اب اگر حضور قلندر باباؒاولیاء کو گیارہ سلاسل کے خانوادہ ہونے کا شرف حاصل ہے تو اس کا کیا مطلب ہوا؟

اس پر الٹا مرید نے پوچھا۔خانوادہ کسے کہتے ہیں؟مرید نے عرض کی۔خانوادہ خاندان سے تعلق رکھنے والے کو کہتے ہیں۔

فرمایا۔ایک آدمی کہیں چلا جاتا ہے۔وہاں جا کر رہتا بستا ہے۔۔شادی کر لیتا ہے۔۔اس کے بچے ہوتے ہیں ایک خاندان بن جاتا ہے۔اس خاندان میں شامل لوگ اس خانوادے کے افراد کہلاتے ہیں۔اسی طرح روحانیت میں بھی ایک فرد اپنا ایک الگ سلسلہ بنا لیتا ہے تو اُس کا ذہن جس جس اولاد کے حصے میں آتا ہے کانوادہ کہلاتا ہے۔جو اولاد باپ کی جتنی زیادہ نقل کرتی ہے وہ اسی قدر سعید کہلاتی ہے۔نقل کرنا تبھی ممکن ہوتا ہے جب بچہ اپنے ذہن کی بجائے باپ کے ذہن سے سوچتا ہے۔

بعض افراد کو اللہ کی طرف ایسا ذہن ودیعت کیا جاتا ہے کہ کئی سلاسل کے بڑوں جیسے ذہن کے مالک ہوتے ہیں اور ان سب سلاسل کے بڑے اُن کو اپنا خانوادہ قرار دیتے ہیں۔

محفل برخاست ہوئی تو وہ عازم پشاور ہوا۔

عرس کے دن آئے تو وہ کراچی پہنچا۔عرس کی تقریبات ختم ہو گئیں تو ایک روز سیر کے بعد جب واپس آکر اپنے کمرے میں داخل ہو رہے تھے تو مرید سے فرمایا۔ڈاکٹر مقصود عظیمی اچھا لگے گا۔مرید نے حیرت سے انہیں دیکھا تو فرمایا۔آپ پی ایچ ڈی کر لیں۔

کمرے میں پاس بٹھا کر فرمایا کہ بھائی جان یا احتشام الحق سے بات کر کے رشید صاحب سے ملیں اور پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹریشن کروا کر جائیں۔ بتایا کہ اس دفعہ عرس پہ ہونے والی ورکشاپ میں رشید صاحب بھی آئے تھے۔ وہ جامعہ کراچی کے فیکلٹی اسلامک سٹیڈیز کے ڈین ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ ہمیں ایسے لوگ دیں جو پی ایچ ڈی کر سکیں۔ کئی روز کی کوشش کے بعد ایک دن اُس نے حضور سے عرض کی کہ رشید صاحب تک رسائی نہیں ہو پا رہی۔

آپ نے فرمایا۔ آپ کوشش کرتے رہیں۔

اگلے روز سلسلے کی ایک بہن نگہت سلیم صاحبہ نے اسے ڈاکٹر عابد سے ملنے کا مشورہ دیا۔ جو کولمبو یونیورسٹی کے پاکستان کیمپس کے انچارج ہیں۔ اس نے حضور سے تذکرہ کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ ہاں کیوں نہیں۔۔ آپ جا کر ملیں۔ دیکھیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ وہ ڈاکٹر عابد سے ملا۔ انہوں نے نہایت حوصلہ افزا بات کی۔ اُس نے واپس آکر حضور کو بتایا تو آپ نے فرمایا۔ آپ کی فیس میں دوں گا۔ آپ فارم بھر کر کل مجھ سے پیسے لے کر جائیں اور رجسٹریشن کروائیں۔

اس نے پچیس سال پہلے پنجاب یونیورسٹی سے جمالیات میں پی ایچ ڈی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن حالات نے مزاحم ہو کر اس کاوش کو کوششِ ناکام بنا دیا تھا۔ آج بن کہے۔۔۔ بن مانگے وہ ڈگری جس کا اُس نے کبھی خواب دیکھا تھا آج اُسے مرشد کریم کی عنایت سے بیٹھے بٹھائے مل رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس قدر عطا پہ شکریہ کہنا اُس کو بہت ہی چھوٹی بات لگ رہی تھی۔ پھر بھی اُس کے پاس کہنے کو یہی ایک لفظ تھا۔ سو اُس نے دل کی گہرائی سے اسے ادا کیا۔ تو فرمایا۔ اگر کوئی بندہ پڑھنا چاہتا ہو تو اللہ اُس کی مدد کرتا ہے۔

اگلے روز عرفان بساطیہ نے اُسے ایک لفافہ لا کر دیا۔ یہ ابا نے دیا ہے۔ لفافے میں فیس کی رقم تھی۔ اس نے جا کر فیس جمع کروائی اور واپس آ کر رسید ابا حضور کو دکھائی۔ رسید میں لکھی رقم آپ کی دی گئی رقم سے کچھ زائد تھی۔ جیب سے زائد رقم نکال کر اُسے دی۔ اس نے پس و پیش کرنے کی کوشش کی اور کہا۔۔ نہیں کوئی بات نہیں۔۔ رہنے دیں تو فرمایا۔ نہیں بھئی۔۔ میں نے کہا تھا کہ یہ فیس میں دوں گا تو آپ کیوں دیں۔

بروج کا مطلب ہے دنیائیں

ایک روز نیاز صاحب نے راولپنڈی سے فون کیا کہ حضور پنڈی مراقبہ ہال تشریف لا رہے ہیں اور پشاور کے تمام دوستوں کو چاہیئے کہ وہ آکر ملیں۔ وہ دوپہر کے بعد پنڈی کے لئے روانہ ہوئے اور شام ڈھلے سواں کیمپ کے نواح میں واقع نو تعمیر مراقبہ ہال پہنچے۔ شہر سے دور جی ٹی روڈ سے تین کلو میٹر ہٹ کر ایک پہاڑی ٹیلے پر وسیع اور پُر فضا مقام پہ بنے مراقبہ ہال کو دیکھ کر اسے بہت اچھا لگا۔ مراقبہ ہال کے باہر کئی ایک گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لیکن کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ شام کی خنکی سردی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔۔۔ایک سکوت اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مراقبہ ہال کے اندر حاضرین سے خطاب ہو رہا تھا۔ موضوع تصورِ شیخ تھا۔ وہ پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔

آپ فرما رہے تھے کہ مرشد کے اندر کام کرنے والی لہریں مرید کو منتقل ہوتی ہیں اور یہ کوئی ایسی اچنبھے کی یا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ہم سردی میں ہیٹر کے سامنے بیٹھتے ہیں تو گرمی کی لہریں ہمارے اندر منتقل ہوتی ہیں۔ گرمی میں جب ہم ایئر کنڈیشن کے سامنے بیٹھتے ہیں تو سردی کی لہریں ہمارے اندر منتقل ہوتی ہیں۔ نئی نئی شادی ہوتی ہے تو شوہر کے ذہن پہ بیوی سوار ہوتی ہے اور بیوی کے ذہن پہ شوہر سوار ہو جاتا اور اس طرح دو اجنبی ایک دوسرے کے ہم دم بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ماں کو بچے کا دھیان رہتا ہے تو بچے کو بھی ماں کا دھیان رہتا ہے اور اس سے بچے میں ماں کا شعور منتقل ہوتا ہے۔

فرمایا کہ جب مرید اپنے مرشد کا تصور کرتا ہے تو مرشد کی طرزِ فکر اور اُس کا ذہن مرید کو منتقل ہوتا ہے۔

لیکچر کے بعد آپ اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو مرید نے آگے بڑھکر سلام کیا۔ آپ آواز سُن کر رک گئے اور معانقہ فرمایا۔ کچھ دیر نظر بھر کر دیکھا پھر فرمایا۔ آپ تو سیٹھ بن گئے ہیں۔ یہ توند بھی نکل رہی ہے۔ وہ ساتھ ساتھ چلتے کمرے تک آیا۔ کمرے میں بیٹھے تو پشاور سے آنے والے دوستوں کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔ اس قافلے کے میر کارواں آپ ہیں؟

مرید نے عرض کی۔ جی نہیں یہ ڈاکٹر جہاں سوز ہیں۔ کسی نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے کہا۔ ان کا نام تو ڈاکٹر غفور ہے۔

اس پہ فرمایا۔ ققنس ایک ایسا پرندہ ہوتا ہے جو پہاڑوں میں اپنا گھونسلہ بناتا ہے۔ جب اُس کی ماں اُسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو وہ ایک ایسی دل سوز آواز نکالتا ہے کہ اُس کو اور اُس کے گھونسلے کو آگ لگ جاتی ہے۔ ویسے اُس کی بیوی بے وفا ہوتی ہے۔ ایک خاتون نے رقعہ دیا۔ پڑھ کر فرمایا۔ تجدید نکاح کر لیں تو دی گئی طلاق غیر موثر ہو جائے گی۔

ایک خاتون نے اپنے بیعت ہونے کے حوالے سے بھائیوں سے ہونے والی کھٹ پٹ کی بابت کچھ کہا تو فرمایا۔ آپ مرشد کو دل میں رکھیں۔ اللہ بھی تو دل ہی میں رہتا ہے۔

مرید نے کسی خواب نامہ کے حوالے سے عرض کی کہ تمام خواب تو اسلام اور مذہب کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اس پہ فرمایا۔ ہر قوم کے خواب الگ ہوتے ہیں۔ بھئی ہم کوئی قوم تھوڑے ہی ہیں۔ ہم تو مردہ ہیں۔ معاش کے علاوہ اور کوئی سوچتا ہی نہیں۔

خالد محمود ماسکو مراقبہ ہال کے انچارج ہیں۔ اُن کے حوالے سے جب آپ کو بتایا کہ وہ لوح و قلم کا روسی زبان میں ترجمہ کروا کر شائع کرنا چاہتے ہیں تو فرمایا۔ آہستہ چلنے والے کو گرنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ تیز چلنے والے ہی گرتے ہیں۔ انہوں نے پانچ دس ہزار کتابیں شائع کر کے بیچ لی ہیں۔۔ انہیں کہیں اب آہستہ چلیں۔ وہاں یہ کتاب نہیں چلے گی۔۔ ہاں کتاب مراقبہ اُٹھے گی۔۔۔ وہ

بھی اس لئے کہ وہاں ہندوؤں نے یوگااور مراقبہ پہ بہت کام کیاہے اس لئے اُمید ہے کہ یہ کتاب کچھ چل جائے گی۔ٹیلی پیتھی بھی اس لئے چلی کیونکہ وہ لوگ پیرا سائیکولوجی کے بہت معتقد ہیں۔حالانکہ ہم نے تو لکھ دیا تھا کہ ہم یہ سائنس اسلامی اصولوں کے مطابق پیش کررہے ہیں تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ اسلام میں اُن سے بہتر نظام موجود ہے۔حالانکہ وہ تو ٹیلی پیتھی کی لہروں سے جہاز اور طیارے تک کنٹرول کررہے ہیں۔

صبح ناشتے سے پہلے ایک لطیفہ سُنایا کہ ایک پیر صاحب کے گھر کے قریب ایک مزدور رہتا تھا۔اُس کی بیوی نے اپنے شوہر کو اُن پیر صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ اُس کو اپنے جیسا بنا دیں تاکہ اور کچھ نہیں تو گھر میں خورد و نوش کا بندوبست تو رہے۔وہ مزدور جاکر پیر صاحب سے ملا۔انہوں نے اُسے کہا کہ اگر تم اس لئے روحانیت سیکھنا چاہتے ہو وہ تمہاری دال روٹی چلتی رہے تو ہم تمہارے گھر بھی راشن بجھوادیا کریں گے یا تم آکر لے جایا کرو۔مزدور نے گھر آکر بیوی سے مشورہ کیا تو اُس نے کہا یہ پیر صاحب تمہیں اپنے جیسا بنانے کی بجائے خیرات پہ ٹرخا رہے ہیں۔آخر وہ کب تک ہمیں کھلائیں گے۔تم ڈٹ جاؤ۔

اب وہ دوبارہ پیر صاحب کے پاس گیا اور اصرار کہ وہ اسے اپنے جیسا بنا دیں پیر صاحب نے اُس کو کچھ مجاہدے وغیرہ کروائے۔۔بندہ پکا نکلا۔۔بھاگا نہیں۔۔پھر ایک روز پیر صاحب نے اُسے اپنا گدھا دے کر کہا۔جاؤ جاکر بڑے پیر صاحب کو سلام کر آؤ۔وہ سفر پہ روانہ ہو گیا۔راستے میں گدھا مر گیا۔۔اُس نے اُس کو پیر صاحب کی نسبت سے مقدس مانتے ہوئے اُس پہ مٹی ڈالنا شروع کر،کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے۔انہیں بتایا کہ مجھے بشارت ہوئی ہے یہاں پہ فلاں نام کے ایک بہت بڑے بزرگ دفن ہیں۔انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ یہاں مٹی ڈال دوں تاکہ لوگ اُن کے جسدِ خاکی پر چلیں پھریں نہیں۔پھر وہاں دیکھتے ہی دیکھتے قبر بنی۔۔۔قبر سے زیارت بنی اور پھر خانقاہ بن گئی۔پیر صاحب بھی شہرہ سُن کر گئے۔اُس نے پیر صاحب کی آؤ بھگت کی۔تواضع کے بعد اپنا

تعارف کروایا کہ بندہ آپ کا وہی غلام ہے جسے آپ نے اپنا گدھا دے کر بڑے پیر صاحب کو سلام کرنے بھیجا تھا۔ آپ کا بخشا ہوا وہ گدھا راستے میں حق کو پیارا ہو گیا۔ اس مزار میں وہی گدھا دفن ہے۔

پیر صاحب سُن کر بہت خوش ہوئے اور گلے سے لگا لیا کہ تم میرے صحیح جانشین ہو۔۔۔ وہاں دلی میں اسی گدھے کی ماں کی قبر پر بیٹھا ہوا ہوں۔

پھر ایک لطیفہ اور سنایا کہ ایک صاحب روحانی سیر میں مصروف تھے اُن کی نظر دوزخ میں ایک مولوی صاحب پہ پڑی۔ حیران کن امر یہ تھا کہ وہاں اُن کے ہمراہ ایک حور بھی تھی۔ وہ حور کے پاس گئے اور پوچھا کہ ان مولوی صاحب نے آخر ایسا کیا کیا کہ انہیں یہاں جہنم میں بھی حور سے نوازا گیا۔ حور نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ مولوی صاحب نے ایسا ویسا کچھ نہیں کیا البتہ مجھ ہی سے ایک گناہ سرزد ہو گیا تھا۔

کمرے سے نکل کر سردیوں کے آغاز کی دھوپ میں بیٹھنے کا قصد فرمایا تو سیاہ چشمہ پہنتے ہوئے کہا۔ میں ذرا یہ پہن لوں تا کہ نظر نہ لگے۔

چند ایک کیمرہ بردار افراد نے آپ کو باہر بیٹھے دیکھا تو وہ پروانہ وار آپ کی طرف لپکے۔ ایک صاحب نے باقاعدہ ریڈی کہہ کر تصویر اتاری۔ تصویر اتروا کو اس دوران تنگ کرنے والی مکھی کے حوالے سے فرمایا۔ اس تصویر میں یہ مکھی بھی آئی ہو گی یا نہیں۔ جب کہا گیا۔ جی ہاں ضرور آئی ہو گی تو فرمایا۔۔ یہ بھی چاہتی ہو گی کہ ابا کے ساتھ میری بھی تصویر ہو۔

الوداع کہہ کر روانہ ہونے لگے تو دریافت کیا۔ عرس پہ ملاقات ہو رہی ہے نا؟

مرید انشاءاللہ کہہ کر عرس پہ کراچی جا پہنچا۔

دریافت کیا۔ کیسے آئے ہیں؟ جب بتایا کہ ٹرین پہ آئے ہیں اور لگاتار چھتیس گھنٹے کا سفر ہے۔۔ تو فرمایا۔ بڑی ہمت کی بات ہے۔۔ اتنا لمبا سفر بندہ تبھی کرتا ہے جسب اس کے دل میں محبت ہو ورنہ تو لوگ اپنے پڑوسی تک یہاں سالوں نہیں جاتے۔

مرید نے عرض کی۔ بندہ وہیں تو جاتا ہے جہاں محبت ملتی ہے۔۔

مسکرا کر خاموش ہو رہے تو مرید نے کہا۔ سلسلہ عالیہ عظیمیہ علمی حلقوں میں ایک منفرد مقام حاصل کر رہا ہے۔

دھیمے سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کیا دوسرے سلاسل میں عالیہ نہیں۔۔۔

عرض کی۔۔۔ جی ہاں کیوں نہیں

فرمایا۔ تو آپ سلسلہ عالیہ قادریہ یا سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کیوں نہیں کہتے۔۔ یہاں بھی سبھی یہی کہتے ہیں۔ میں ٹوکنا تو چاہتا ہوں لیکن سب کے سامنے کہنا مناسب نہیں لگتا تو خاموش ہو رہتا ہوں۔ بھئی آپ صرف سلسلہ عظیمیہ ہی کہا کریں۔

مرید عرض گزار ہوا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ مرشد کی ڈائری کے عنوان سے اپنے مراد کی باتوں کو قلم بند کرے۔

نیم وا آنکھیں کھلیں۔۔ پھر بائیں آنکھ بند کر کے۔۔۔ مرید کو دیکھا۔۔۔ سائیں کی آنکھ کی پتلی اچانک اتنی اوپر چلی گئی کہ آنکھ کی سفیدی کے علاوہ کچھ نہ دکھا۔ ایک لحظہ میں آنکھیں واپس اپنی نارمل حالت میں آ گئیں۔ مسکراتے ہوئے خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا اور اس بات پر بات کرنے کو وقت رکھ لیں۔۔ کل بیٹھ جاتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ میگ والے دوبارہ سلسلہ مضامین شروع کرنے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ مرید نے استجاباً۔ اچھا جی۔۔ کہا۔۔ تو جلدی سے کہا یہ میں نہیں کہتا۔۔ اقبال صاحب نے بتایا ہے۔

فرمایا۔ اگر میں ملنے والے تحائف لوگوں میں بانٹتا نہ رہوں تو یہاں ایک ڈھیر لگ جائے۔ بیٹھنے کی جگہ تک نہ رہے۔ کچھ ساعت توقف کے بعد فرمایا۔ وسائل کی کثرت بھی نہیں ہونی چاہئے۔

پھر ایک بات یہ بتائی۔ ایک صاحب تھے نورالدین علیم۔ انہوں نے کبھی حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کو انگریزی پڑھائی ہوگی۔ خود کو اُن کا استاد کہتے تھے۔ کسی قدر کھسکے ہوئے تھے اور خود کو پریزیڈنٹ آف دی ورلڈ کہتے تھے۔ اُن کو جانے کیا سوجھی۔۔ مجھ سے کہنے لگے۔۔ میں آپ کو اپنا سیکریٹری بنانا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے اجازت لے کر بتاؤں گا۔

کہا۔ عظیم سے میں خود بات کرلوں گا صرف تم تیار ہو جاؤ۔

میں نے کہا۔ میرے ذہن میں ایک بندہ ہے۔۔۔ وہ ٹھیک رہیں گے۔۔ اور پھر میں نے انہیں ایک صاحب سے ملوایا۔ وہ بھی پورے حضرت تھے۔۔ خود کو خدا کہتے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اُن کی باتیں نہیں سنیں۔۔۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں چھپ کر اُن کی باتیں سنتا۔

اس ملاقات کے بعد ایک روز میں اُن دوسرے صاحب سے ملا تو میں نے دریافت کیا کہ علیم صاحب سے آپ کی ملاقات کیسی رہی؟ کہنے لگے عجیب آدمی ہے۔۔میں نے ہی تو اُن کو پریزیڈنٹ بنایا اور وہ مجھی سے کہہ رہے تھے کہ میں اُن کا سیکریٹری بن جاؤں۔یعنی اپنے خدا ہونے کے حوالے سے کہہ رہے تھے۔

پھر ملکی حالات پہ بات کرتے ہوئے جرنل مشرف کو سراہتے ہوئے فرمایا۔فوجی کھاتے ہیں تو کام بھی کرتے ہیں۔۔۔بے نظیر آئی تو آئی پیز IPs سے پیسے لے کر آج بجلی ۷ روپے یونٹ کردی۔۔نواز شریف نے تو ملک ہی بیچ ڈالا تھا۔۔کھاؤ لیکن کام بھی تو کرو۔۔وہ تو صرف کھانے میں لگے ہوئے تھے۔

فرمایا۔آپ اپنی صلاحیتیں استعمال کریں اللہ نے کوئی صلاحیت دی ہے اور آپ اُسے استعمال نہیں کرتے تو یہ نہ صرف ناشکری ہے بلکہ بے ایمانی ہے۔

اگلے روز مرید مراقبہ ہال کے لان میں ٹہل رہا تھا۔آپ سیر سے واپس آ رہے تھے اُس نے سلام کیا تو فرمایا۔باغِ خلد کی سیر ہو رہی ہے؟

غفار صاحب آپ کے قریب ہوئے تو اُن سے فرمایا۔اس بار عید قربان پہ اونٹ بھی لے ائیں۔چند روز پہلے آجائے گا تو بچے کھیلیں گے۔خوش ہوں گے۔

اگلے روز صبح جب غفار صاحب اونٹنی لے کر آئے تو اُسے دیکھنے گئے۔اُس پہ ۹۱۰ لکھا دیکھ کر فرمایا۔اس کا مطلب ہے کہ نو دس نمبر ملیں گئے۔مرید نے جملہ کسا۔۔یہ نہلے پہ دہلا ہے۔اُس کر مسکرائے اور زیرِلب دہرایا۔نہلے پہ دہلا۔

شام کو نشست ہوئی تو فرمایا۔ آج کل مجھے یہ خیال آتا ہے کہ آ کر انسان زندہ رہنا ہی کیوں چاہتا ہے؟

پھر مرید سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ آپ کو کبھی یہ خیال آیا۔ مرید نے اثبات میں جواب دیا تو دریافت کیا کہ پھر آپ کیا سمجھے؟

مرید نے اپنے حاصل فکر کا اظہار کیا۔ آدم کو جو علم عطا ہوا تھا وہ پریکٹیکل کی بجائے تھیوریٹکل تھا۔ اور علم کے ایس کچے پن کی وجہ سے اُن سے سہو ہو گیا۔۔۔ اور وہ شیطان کے بہکاوے میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ انسان اس علم کے تجرباتی پہلو سے محسوساتی حدوں میں واقف اور آگاہ ہو تا کہ شیطان اُس کو پھر کبھی نہ بہکا سکے۔ یعنی یہ سارا انتظام انسان کو عطا کردہ علم کو تجرباتی اور محسوساتی طور پر سمجھنے اور برتنے کے لئے کیا گیا ہے۔ انسان لاکھ زندہ رہنا چاہتا ہو تو بھی اسے مرتا تو پڑتا ہی ہے۔

آپ نے یہ بات سُن کر سوال کیا۔ کیا یہ تجربات جانوروں کو نہیں ہوتے؟ کیا وہ نہیں کھاتے پیتے۔ پھر بات کو مختلف زاویوں سے دہرا کر فرمایا۔۔ نہیں صاحب۔۔۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم زندہ رہنا کیوں چاہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بچوں کے لئے۔۔ تو جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر زندہ رہنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟

مرید نے عرض کی۔۔ تو پھر آپ ہی کچھ روشنی ڈالیں۔

فرمایا۔ اللہ کو پہچاننے کے لئے۔

دیر تک خاموشی رہی۔اس خاموشی میں مرید جانے کیا کیا سوچتا رہا۔سوچوں اور خیالوں کے ان بنتے بگڑتے دائروں سے گزرتے۔۔اس کی نظر مراقبہ ہال میں آستانے کے سامنے دیوار پہ بنی تصویری طغرے پہ جا ٹھہری۔اس پہ لکھا تھا۔زینت دی ہم نے آسمان کو بروج سے اور چھپا دیا ان شیطان مردود سے۔

مرید کو سوال ملا تو اس نے اسے اپنے مراد کے حضور پیش کرتے ہوئے عرض کی۔یہ بروج کیا ہیں؟۔۔۔جن سے آسمان کو زینت دی گئی دیکھنے والوں کے لئے اور چھپا لیا شیطان مردود سے۔۔۔؟

فرمایا۔دنیائیں ہیں۔بروج کا مطلب ہے دنیائیں۔اگر ہمیں یہ دنیائیں نظر نہیں آتیں تو اس کا کیا مطلب ہوا۔۔ہم بھی تو شیطان ہی ہوئے نا۔

فرمایا۔یہ دنیائیں ہمارے لئے سٹور ہاوسز کا کام کرتی ہیں۔وہ جو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے لوح و قلم میں فرمایا ہے کہ مستقل نظام اور غیر مستقل نظام۔۔انہیں مستقل کی بجائے عارضی مستقل سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ بھی مستقل نہیں ہوتے۔۔۔صرف اُن کی عمر کا تعین ہوتا ہے۔غیر مستقل وہ ہوتے ہیں جن کی عمروں کا تعین نہیں ہوتا۔ہم ان لاکھوں کروڑوں دنیاؤں میں بیک وقت موجود ہیں۔وہاں مٹتے ہیں تو یہاں فیڈ ہوتے ہیں۔جیسے گندم کا ایک دانہ مٹی میں مل کر فنا ہوتا ہے اور سترہ سو دانوں کی زندگی کا سبب بنتا ہے۔اگر ایک دانہ نہ مٹے اور فنا نہ ہو تو سترہ سو دانے نہیں بن سکتے۔اسی طرح انسان بھی چھ ارب ہو گیا ہے۔

پھر اس بات کو پروجیکٹر کی مثال سے سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

پروجیکٹر میں ایک تو فلم ہوتی ہے اور دوسرے اس فلم کو سکرین پہ لانے کے لئے روشنی ہوتی ہے۔روشنی فلم پہ پڑتی ہے تو وہاں موجود تصویر ٹوٹتی ہے اور روشنی کی لہروں کے ذریعے سکرین پہ منتقل ہو جاتی ہے۔جوں جوں یہ فلم چلتی ہے۔۔یہ فلم پرانی ہوتی چلی جاتی ہے۔

بچپن اصل میں اس فلم کے نقوش کا تازہ پن ہے اور بڑھاپا اس فلم کے گھس جانے اور پرانا ہونے کو کہتے ہیں۔جوں جوں یہ فلم چلتی ہے۔۔وہاں پہ موجود تصویر ہر لحظہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی ہے۔ وہ تصویر دھندلی ہوتی چلی جاتی ہے۔اس تصویر کا دھندلا بڑھاپے کی صورت میں نظر آتا ہے۔وہاں فلم پہ تصویر ٹوٹتی ہے تو ہمیں یہاں فیڈنگ ہوتی ہے۔۔اس پورے نظام کو چلانے پہ بیس ہزار فرشتے معمور ہیں۔

پھر اپنے ہاتھ کان تک لے جا کر دکھاتے ہوئے کہا۔یہ ایک حرکت تبھی ممکن ہوئی جب بیس ہزار فرشتوں نے یہ پروسس مکمل کیا۔

اس بار عرس اور عید قربان آگے پیچھے تھے۔ عید قربان پہ خوب چہل پہل تھی۔ سلسلے کے ڈیڑھ سو کے لگ بھگ بہن بھائیوں نے قربانی میں حصہ لینے کو مراقبہ ہال میں قربانی کرنا پسند کیا۔پہلے دن قربانی کی گائیں مراقبہ ہال کے اندر ذبح کی گئیں اور دوسرے روز اسکول کے میدان میں۔۔ بائیس تیئس گائے اور بچھڑے ایک اونٹنی اور چند ایک بکرے ذبح ہوئے۔ گوشت کٹتا۔۔تھیلوں میں پیک ہوتا۔۔اور قریب کی بستی کے اُن گھروں کی دہلیز تک لے جایا جاتا جہاں قربانی نہیں ہوئی تھی۔ سوزوکی میں۔۔۔پہلے سے سروے شدہ ہزار بارہ سو گھروں تک قربانی کا گوشت پہنچانے والوں نے واپس آکر ایسے ایسے جذباتی مناظر بیان کئے کہ سننے والوں کی آنکھوں میں پانی امڈ امڈ آیا۔ایاز صاحب نے آکر بتایا کہ جب وہ گوشت بانٹ رہے تھے تو ایک خاتون جذباتی

ہو گئیں اور کہا کہ انہوں نے کتنی ہی مدت بعد گوشت دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ آپ اُن کو دو تھیلے دے دیتے۔ بے کسی اور تشکر کے مناظر کی بات سنتے مرید نے اپنے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ سائے میں بچھی کرسی پہ بیٹھے۔۔۔ کام میں مصروف قصائیوں کو بظاہر گہری نظر سے دیکھتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں کس کس کو دیکھ رہے تھے۔

دوسرے روز قربانی ہوتے دیکھ رہے تھے تو فرمایا کہ میں نے اُن سے کہا کہ قربانی یہاں کریں تو آگے سے بحث کرنے لگے کہ یہاں مٹی ہے۔ میں نے کہا کہ پلاسٹک بچھا کر اوپر چٹائی ڈلوا دیں اور ٹینٹ لگوا دیں تو کہنے لگے قناعت کے نیچے مٹی آئے گی۔۔ اب بتائیں کہاں ہے وہ مٹی۔۔ پھر سر جھٹک کر کہا۔۔۔ نہ جانے بات ماننے میں تامل کیوں کرتے ہیں۔

رات کو حامد صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت پہ جاتے ہوئے مرید نے اپنے مراد کے سامنے اظہار خیال کیا۔ دنیا بھر میں مساجد سے متعلق لوگ عید پر اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ بستی سے اُن کے لئے کھانا آئے گا۔۔ گوشت آئے گا۔۔ اور ایک مسجد ہے یہاں سے پوری بستی کو لنگر کا کھانا اور عید پہ گوشت دیا جاتا ہے۔

بڑے گہرے انداز میں کہا۔ الحمدللہ

مرید اس سے کچھ زیادہ سننے کی طلب میں گویا ہوا۔ اس بار بہت منظم اور سسٹمیٹک انداز میں کام ہوا۔

فرمایا۔ اس بار کا کیا مطلب؟

مرید نے جلدی سے کہا۔۔ میں نے اس بار ہی دیکھا ہے نا۔۔ اس لئے۔۔

فرمایا۔ یہاں تو ہمیشہ سسٹمیٹک کام ہوتا ہے۔

فرمایا۔ یہاں غربت بہت ہے۔

حامد صاحب کے گھر کھانے پہ بتایا کہ پشاور میں ژالہ باری ہوئی ہے۔ فرمایا۔ آپ کے مزے ہیں۔۔ ہر طرح کے موسم دیکھتے ہیں۔۔ یہاں تو اکثر گرمی ہی رہتی ہے۔

کھانے میں تاخیر پہ تبصرہ کیا۔۔ دولہا کا انتظار ہو رہا ہے۔ اتنے میں فرخ اعظم اپنی بیگم شمیمہ کے ہمراہ تشریف لے آئے تو مرید نے کہا۔ لیجیئے دولہا اور دلہن دونوں ہی آ گئے ہیں۔ ایک پھیلتی اور بڑھتی مسکراہٹ نے دونوں کا استقبال کیا۔ کھانے کے دوران زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔

عرس پہ منقبت بحضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کی کیسٹ ریلیز ہوئی۔ رات کو اپنے کمرے میں اس کی بابت بات کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ بہت ہی اچھی کاوش ہے۔ جاوید اللہ دتا نے اس کی موسیقی ترتیب دی ہے۔ بھائی جان و قاری یوسف عظیمی نے دن رات ایک کر کے چار ماہ میں یہ کیسٹ تیار کروائی۔ ستار اور بانسری اصلی استعمال ہونے سے یہ بہت اُٹھ گئی ہے۔ اس کیسٹ کو مشہور گلوکاروں رحیم شاہ وغیرہ کو دینے کو کہتے ہوئے فرمایا اُن سے کہیں کہ وہ بھی ایسا کلام گائیں۔

اس دوران طاہرہ نثار نے بادام پیش کئے تو مسکراتے ہوئے مصرعہ پڑھا

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

فرمایا۔ آج کل میرے کھانے پہ کر کری بہت ہوتی ہے اور کھانے میں وہی بے نمک دال یا سبزی۔ پھر کہا۔ ہر امیر آدمی کی طرح۔

صبح سیر پہ ساتھ لے لیا۔راستے میں مرید سے دریافت کیا۔اللہ نے اتنا بڑا نظام بنایا۔اُس کو چلا بھی رہا ہے۔آخر اس کا اللہ کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟اس میں اللہ کا کیا فائدہ ہے؟

فرمایا۔اللہ الصمد۔۔اللہ تو بے نیاز ہے۔اللہ تعالیٰ اخلاص کے سوا کچھ نہیں۔خلوص سے کام کرنا ہی اللہ کی شان ہے۔اللہ تعالیٰ بہت ہی بڑے ہیں۔

مرید کو اچانک یوں محسوس ہوا گویا اللہ کی بڑائی اور عظمت کا ایک نیا مفہوم اس کو تعلیم کیا گیا ہے۔عظمت اور بڑائی کا بہت گہرا تعلق خلوص اور اخلاص سے ہے۔اُس کے مراد نے اُسے بن کہے خلوص سے کام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے بتا دیا کہ لالچ اور فائدے۔۔سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر کام کرنا چاہیئے۔

مرید نے دعا کی۔۔اللہ اُسے خلوص عطا فرما دے۔

عید کے دوسرے دن گلشن شہباز حیدر آباد مراقبہ ہال میں عید ملن پارٹی رکھی گئی۔پشاور سے آنے والی ٹیم جس کی سربراہی ہمایوں پرویز کر رہے تھے۔چپلی کباب بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔اُن کے مقابلے میں کراچی کی ٹیم گولا کباب بنانے کا اہتمام کر رہی تھی۔نو تعمیر مسجد دکھاتے ہوئے پوچھا۔کیسی بنی ہے؟عرض کیا کہ بہت شاندار۔۔سطح زمین سے بلند ہونے کے باعث اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔۔۔بالکل کراچی کی جامعہ عظیمیہ جیسی ہے۔

مرید نے سلسلے کی تعلیمات کے حوالے سے ویب سائٹ بنانے کی ضرورت کی بات کی تو فرمایا۔آپ اسے بنائیں اور انڈیپینڈنٹ ہو کر کام کریں۔اب آپ بڑے ہو گئے ہیں۔مجھے ڈیپنڈنٹ لوگ یوں بھی پسند نہیں۔۔بھئی جہاں اللہ کا معاملہ آجائے

وہاں ڈیپینڈنٹ ہو جائیں اور جہاں دنیا کا معاملہ ہو وہاں انڈیپینڈنٹ رہیں۔ آپ لوگوں کی زیادہ پرواہ مت کیا کریں۔ اپنے کام سے لگے رہیں۔

لوح و قلم کے انگریزی ترجمے کے حوالے سے فرمایا۔ سب نے مجھے کہا کہ ترجمہ بہت مشکل انگریزی میں کیا گیا ہے۔ ڈکشنری کے بغیر نہیں پڑھا جا سکتا۔ میں نے ان سے کہا۔ انہوں نے مشکل انگریزی میں سہی۔۔ لکھ تو دیا۔۔ اب آپ اسے آسان زبان میں کر دیں۔ کسی نے دس تو کجا ایک صفحہ تک لکھکر نہ دیا۔۔۔ یہی (سلسلے کے لوگ) ایسا کہتے رہے۔۔ انہوں نے (انگریزوں) نے تو ایسا ویسا کچھ نہیں کہا۔۔۔ انہوں نے تو لے کر اسے سالفورڈ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر دیا۔ انہی تراجم کی وجہ سے دوسری زبانوں میں ترجمے ہو رہے ہیں یہ بھی نہ ہوتا تو کیا کر لیتے۔

اس پر مرید نے عرض کی۔ کہ ان باتوں سے محض یہ ہوا کہ دس سال ضائع ہو گئے۔۔ جو تراجم ہوئے وہ چھپنے سے رہ گئے۔

مرید کے گلہ کرنے کا برا مناتے ہوئے فرمایا۔ یہ تو ناشکری ہوئی۔ ابن عربی کی لکھی ہوئی کتابیں اب آٹھ سو سال بعد منظر عام پر آئیں۔۔ آپ کی کتابیں آپ کی زندگی میں چھپ بھی گئیں۔۔ کورس میں بھی شامل ہو گئیں۔۔ بھئی آپ اپنا کام کرتے رہیں۔۔ کچھ دیر سے سہی اس کا سامنے آنا طے ہے۔

فرمایا۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ ایک کتاب پہ ایک لاکھ روپے لگ جاتے ہیں اور کتاب بکتی بھی نہیں۔۔۔ سب ہی مفت میں پڑھنا چاہتے ہیں۔

مرید نے لقمہ دیا۔۔ کتابیں آ تو رہی ہیں۔

رعایت لفظی کا استعمال کرتے ہوئے فرمایا۔آ رہی ہیں تو کیا جا بھی رہی ہیں۔صرف آئیں گی ہی یا جائیں گی بھی

شعور انسانی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

شعور سے ٹکرانے سے بچنا چاہیئے۔سقراط کو زہر کا پیالہ اسی لئے پینا پڑا کہ وہ شعور سے ٹکرا گیا تھا۔شاہ ولی اللہ کا کیا قصور تھا۔انہوں نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ ہی تو کیا تھا۔۔لے کے اُن کے ہاتھ نچوا دیئے گئے۔منصور نے کیا کہا دیا تھا؟لے کے پھانسی پہ ٹانگ دیئے گئے۔یہ سب شعور نے کیا۔اب اگر منصور سمجھدار ہوتے تو کہنے کے بجائے کچھ کام ہی کر جاتے۔

فرمایا۔دراصل منصور میں سکت بھی تو نہ تھی۔انہوں نے رابعہ بصری کے پیالے سے دودھ پی لیا تھا۔اُس سے اُن کی انکھ کھل گئی اور وہ غیب میں دیکھنے لگے۔۔۔اب اگر برداشت اور سکت ہوتی۔۔۔تو وہ جو دیکھتے وہ بیان کرنے میں احتیاط کرتے۔۔وہ لاشعور میں دیکھتے اور بولتے رہے اس سے شعور اکھڑ گیا۔۔اب جو آپ دیکھ رہے ہیں ضروری تو نہیں کہ لوگ بھی وہی دیکھ رہے ہوں اور اُسے برداشت بھی کر لیں۔۔اُن کے شعور تو اس بات سے واقف ہی نہیں۔۔۔وہ تو وہی کریں گے جو ان کا شعور کہے گا۔شعور سے ٹکرانے سے اجتناب ہی کرنا چاہیئے۔۔شعور تو ہر اُس بات سے گھبراتا ہے جو اُسے لاشعور کی طرف لے جاتی ہو۔

فرمایا۔شعور کی اسی روش کی بابت تو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ لکھا ہے کہ ایسے لوگوں کی آزادی ادھوری رہتی ہے۔

پھر ارشاد ہوا کہ عجیب بات ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ طویل عرصے تک زندہ رہے لیکن کھاتا ایسی چیزیں ہیں جن سے عمر گھٹتی ہے۔۔گوشت کھاتا ہے۔۔سری پائے کھاتا ہے۔۔۔اب یہ کلیجی اور گردے کیا ہیں؟انسانی جسممیں فضلے کی صفائی کے اعضاء

ہیں۔۔اوجھڑی کیا ہے؟ کلیجی یعنی جگر میں مضر روشنیاں فلٹر ہوتی ہیں۔۔یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کموڈ یا فلش کو دھو کر اُس میں کھانا کھانے بیٹھ جائیں۔ہماری غذاؤں میں کولسٹرول کی جتنی زیادتی ہوتی ہے۔۔عمر اُسی قدر کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

پھر ایک واقعہ سنایا۔

ہمارے پڑوس میں ایک شیخ صاحب رہتے تھے۔ان کی دو بیویاں تھیں۔وہ رات کو دونوں بیویوں کے درمیان چارپائی بچھائے سیدھے لیٹے رہتے۔۔ایک طرف کروٹ لیتے تو دوسری طرف کی بیوی پیچھے سے کرتا کھینچ کر پوچھتی۔۔کیا میں تیری بہنیا لگتی ہوں۔۔اور جھٹکے سے سیدھے ہو کر لیٹ جاتے۔۔کچھ دیر بعد دوسری طرف کروٹ لیتے تو پہلی ولی پکڑ لیتی۔۔کیا میں تیری میا لگتی ہوں۔۔سیدے لیٹے لیٹے اُن کیکمر تختہ ہو جاتی۔وہ کہا کرتے تھے کہ کسی سے دشمنی لینی ہو تو اُسے قتل مت کرو۔۔اُس کی دوسری شادی کروادو۔

پھر ارشاد ہوا کہ بعض لوگ کام کرتے ہیں تو کام جلد ہو جاتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کچھ چولہے کے پاس جائیں تو آگ بھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

فرمایا۔دراصل اُن کے نسمہ میں اتنی سستی ہوتی ہے کہ جب وہ آگ پہ پانی رکھتے ہیں تو جو پانی دس منٹ میں گرم ہونا ہوتا ہے اُسے پندرہ بیس منٹ لگ جاتے ہیں۔

عرس کی رات اپنی سالانہ تقریر میں علم کی اہمیت اور ضرورت پہ روشنی ڈالنے کے بعد فرمایا۔انسان پیدا ہوتا ہے۔۔تو کہاں سے آتا ہے۔۔۔جہاں سے آتا ہے وہ سب لاشعور ہے۔بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ لاشعور کے قریب ہوتا ہے۔۔جوں جوں بچہ بڑا ہوتا

ہے۔۔توں توں وہ لاشعور سے دور ہوتا جاتا ہے۔۔اگر انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے لاشعور سے قرین ہو جائے تو اُس کو چاہئے کہ وہ اپنے بچپن میں واپس چلا جائے۔آپ تصور نہیں کر سکتے کہ آپ آج سے دس بیس سال بعد کیسے ہوں گے لیکن آپ جب چاہیں یہ بات اپنے ذہن میں اجاگر کر سکتے ہیں کہ آپ آٹھ یا دس سال میں کیسے تھے۔پھر تین چار ہزار افراد کے مجمع کو یہ مراقبہ کروایا کہ وہ سب یہ تصور کریں کہ وہ آٹھ سال کے بچے ہیں۔پانچ دس منٹ مراقبہ کروا کر یہ دریافت کیا کہ آپ کو کچھ نظر آیا؟نصف سے زیادہ افراد نے ہاتھ بلند کر کے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح روزانہ مشق کرنے سے آپ عمر کے پہلے دوسرے سال تک پیچھے جا سکتے ہیں۔جتنا آپ پیچھے جائیں گے اتنا لاشعور کے قریب ہو جائیں گے۔

صبح مراقبے کے بعد ایک صاحب نے دریافت کیا کہ جب مرشد سامنے ہو تو کیا ضروری ہے کہ آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا جائے؟

فرمایا۔یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ کھلی آنکھوں سے مراقبہ نہیں کیا جا سکتا۔اصل میں آنکھیں بند کرنے سے یکسوئی رہتی ہے اس لئے آنکھیں بند کرنے کو کہا جاتا ہے۔اگر کسی کو کھلی آنکھوں سے یکسوئی رہتی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ آنکھیں کھول کر مراقبہ کر لیا جائے۔

اپنے مراد کی قربت میں بیس اکیس دن بتا کر واپس جاتے ہوئے مرید نے سوچا۔مرشد کریم کے قول و فعل میں دنیا اور آخرت کا ایک شاندار امتزاج اور حسین توازن اُن کی پہچان ہے۔دوسری بات اُس نے یہ محسوس کی اس بار حضور زیادہ تر کم گوئی پہ مائل رہے۔حتیٰ کہ محفل میں بھی بیشتر خاموش ہی رہتے۔۔کسی گہری سوچ میں گم۔۔۔اگر کسی نے کچھ پوچھ لیا تو چند ایک الفاظ میں جواب دے کر بات ختم کر دیتے۔

جس برس مرید کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی اُس نے فون کیا تو بات نہ ہو سکی۔۔اس نے فون پہ پیغام چھوڑا اور مرشد کریم کو اس بارے مطلع کرنے کی درخواست کی۔پھر چند ماہ بعد وہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے عرس کی تقریب میں شرکت کے لئے کراچی پہنچا۔مٹھائی لے کر حاضر خدمت ہوا تو بہت دعائیں دیں۔مٹھائی دیکھ کر کہا۔۔اس کے چار چار ٹکڑے کر کے لنگر میں رکھوا دیں۔

مرید نے اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس پہ اپنے سپر وائزر کے طور پر حضور کا نام دکھا کر عرض کی کہ آپ میرے روحانی استاد تو ہیں ہی اس دنیاوی ڈگری کے حوالے سے بھی مجھے آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہو گیا ہے تو مسکرا دیئے اور فرمایا۔میرے مرشد نے مجھے ہر طرح سے اتنا نوازا ہے کہ کوئی کمی نہیں رہی۔پھر کچھ توقف کے بعد ارشاد فرمایا۔استغنا تبھی تو پیدا ہوتا ہے جب کوئی کسر نہ رہ جائے۔

فرمایا۔اس کی ایک نقل یہاں دفتر میں بھی دے دیں۔

مرید نے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری ملنے کی پیشکش کی بابت بتایا تو فرمایا۔اب آپ کیا ڈگریاں ہی لیتے چلے جائیں گے۔۔ پھر کہا۔اچھی بات ہے۔۔آپ کر لیں۔

مرید نے اس ضمن میں موضوع کی بابت راہنمائی کی درخواست کی تو فرمایا۔روحانیت کو سائنسی انداز میں پیش کرنے میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی کتاب لوح و قلم پہ کام ہونا چاہئے۔ویسے روح کی صلاحیتوں کے حوالے سے بھی بہت کام ہونا باقی ہے۔ لوگوں کو روحانیت کا جتنا شغف ہے اتنا روح کے بارے میں جاننے اور اُس سے واقف اور آگاہ ہونے کے بارے میں نہیں ہے۔آج تک کسی کے ذہن میں یہ تک تو واضح نہیں ہے کہ روح ہوتی کیا ہے۔۔سب اپنے ذہن کے مطابق اپنے سمجھنے کو ہی حتمی مانتے ہیں۔

فرمایا۔ یہ کتابیں پڑھ لینا۔۔کتابیں لکھ لینا۔۔ترجمہ کرنا۔۔ یہ مراقبے کرنا روحانیت نہیں ہے؟ اس سے روحانیت کے بارے میں آپ کے علم میں اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن یہ سب روحانیت بہر حال نہیں ہے۔

مرید نے عرض کی۔ حضور تو پھر روحانیت کیا ہے؟

فرمایا۔ روح کا عرفان روحانیت۔۔روح کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔۔روحانیت ہے۔ روح کو سمجھیں۔۔روحانیت کیا ہے اس کو سمجھیں۔

برطانیہ سے آئے ہوئے ایک نو مسلم انگریز عمر شریف ملک سے مترجم کے ذریعے بات ہونا شروع ہوئی۔

فرمایا۔ ان سے کہیں۔۔ کہ یہ بائبل اور قرآن میں ایسی آیات تلاش کریں جو ایک مفہوم کی حامل ہوں۔۔ جیسے بائبل میں ہے کہ God said Light! And there it was اور قرآن میں ہے کہ اللہ نور السمٰوات والارض۔۔اس سے یہ ثابت ہو گا کہ تمام انبیا کرام نے ایک ہی بات فرمائی اور تمام انبیاء آپس میں Brotherhood رکھتے تھے۔۔ یہ فرقے تو ہم انسانوں نے بنا دیئے ہیں۔۔ ہمیں چاہئے کہ ہم انبیاء کے مابین بھائی چارے کو بنیاد بنا کر آپس کے بھائی چارے کو فروغ دیں۔

آپ وہاں کرسمس کا تہوار منائیں تو مسلمانوں کو مدعو کریں، انہیں کیک کھلائیں، شراب نہ پلائیں، شراب کسی نبی نے نہ پی اور نہ پسند کی۔۔۔ اسی طرح عید منائیں تو عسائیوں کو بلائیں۔۔۔ عید میلاد النبی ﷺ پہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بلائیں۔۔ انہیں نعتیں سنائیں۔۔انہیں اپنے نبی ﷺ کے بارے میں بتائیں۔۔انہیں کھانا کھلائیں۔۔ چائے پلاے ئں۔۔ سوفٹ ڈرنک پلائیں۔۔اس سے آپس میں میل جول بڑھے گا۔۔وہ آپ کو جانیں گے آپ انہیں جانیں گے تو دوریاں کم ہو سکیں گی۔

مرید نے عرض کی کہ یہ صاحب شرح لوح و قلم کے ترجمے کی ایڈیٹنگ کر کے دینا چاہتے ہیں اور اس کے لئے مسودے کی نقل مانگ رہے ہیں۔

فرمایاان سے پوچھیں یہ کب تک واپس بھجوادیں گے ؟۔۔۔مرید نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا۔ایک ہفتے میں۔

فرمایا۔ایک مہینے تک بھی آجائے تو غنیمت ہی ہوگا۔

عرس پہ مقالات کا سیشن کا آغاز ہو چکا تھا کہ آپ پنڈال میں تشریف لائے اور نیچے سامعین میں بیٹھ گئے۔احتشام بھائی نے سٹیج پر مدعو کیا تو منع فرمادیا۔انہوں نے چٹ بھجوائی جس پہ لکھا کہ آپ نیچے بیٹھیں گے تو آپ کی توہین ہوگی۔چٹ پڑھ کر فرمایا۔کوئی توہین نہیں ہوگی یہ تو مثال قائم ہوگی کہ مرشد ہو کر بھی سامعین میں بیٹھنا چاہئے۔پھر دریافت کیا۔ہر مقالہ کتنے وقت کا ہے ؟جب بتایا گیا کہ وقت کا تعین نہیں کیا گیا تو سُن کر سر ہلادیا۔

مرید کی باری آئی۔اُس نے اپنا مقالہ پیش کیا۔جب نعت شروع ہوئی تو اُٹھ کر چلے گئے۔بعد میں جب وہ پاس جا کر بیٹھا تو فرمایا۔

بھئی آپ کے مقالے کی بہت تعریف ہو رہی ہے۔

مرید نے عرض کی۔۔آپ نے توجہ فرمادی تو لوگوں نے بھی سُن لیا۔

فرمایا۔نہیں ایسی بات نہیں۔۔جب کوئی سٹیج پہ جا کر کچھ کہتا ہے تو لوگ سنتے ہیں۔۔اچھی بات کہی جائے تو سراہتے بھی ہیں۔

مرید روحانی علوم پہ تحقیقی مقالے کے حوالے سے بات کرنے حاضر ہوا تو فرمایا۔

جی پھر کوئی نئی سو جھی ہے؟

عرض کی۔ روحانی علوم پہ ایک مقالہ تیار کرنے کے حوالے سے سوچ بن رہی ہے۔

فرمایا۔ آپ انبیا کے Brotherhood پہ لکھیں۔۔ اس حوالے سے کام کی بہت ضرورت ہے۔

کتاب محمد الرسول ﷺ اللہ جلد سوم کی بات ہو رہی تھی۔ کسی نے بتایا کہ حامد صاحب کی بیگم گھر میں بچوں کو بٹھا کر اس میں سے کوئی ایک آدھ قصہ اُن کو سناتی ہیں۔ سُن کر پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اس سے بچوں کی تربیت اچھی ہو گی۔ بچوں کی تربیت کے حوالے سے فرمایا۔

میری دادی اماں بچوں کو دوپہر میں سلانا بہت ضروری سمجھتی تھیں اور شام کے بعد بچوں کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا تھا۔ وہ اس بات کا بہت اہتمام کرتی تھیں۔ عصر تا مغرب تک کھیلنے کی اجازت ہوتی تھی۔

کتاب اللہ کے محبوب دکھائی اور کہا کہ طارق صاحب نے کتاب نہیں سونئیر شائع کا ہے۔

کسی نے کہہ دیا کہ بہت پیار سے شائع کیا ہے۔

فرمایا۔ عقیدت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ لے کے دو سو روپے قیمت رکھ دی۔۔ اتنی تو اس کی لاگت ہی ہے۔ سارا آرٹ پیپر اور فور کلر پرنٹنگ ہے۔

فرمایا۔ابھی کہاں۔۔۔اُن کی پھونک اتنی آسانی سے نہیں نکل سکتی۔

مرید نے عرض کی۔افغان قوم سے نہ جانے ایسا کیا قصور سرزد ہوا ہے کہ گزشتہ بیس بائیس برسوں سے اس قدر عتاب کا شکار ہے۔مہاجرت کے دکھ اور غیر ملکی اقوام کا تسلط اور خانہ جنگی۔۔انتہائی جفاکش لیکن غربت اور ابتلا میں گرفتار۔

فرمایا۔قصور کیا ہونا ہے۔۔۔ جھوٹے ہیں۔۔ جھوٹے کہنے میں اتنی شدت تھے کہ مرید لرز کر رہ گیا۔کذب وافترا پہ اتنی سخت پکڑ ہو سکتی ہے۔۔۔ایک سرسراتی ہوئی ٹھنڈی سی لہر ریڑھ کی ہڈی سے گزرتی چلی گئی۔۔اس نے ایک جھرجھری سی لی۔

انچارج بفرزون لائبریری نصرت شاہین نے نجمہ صاحبہ کے گھر پر چائے کا اہتمام کیا تھا۔چائے پہ انہوں نے ابا حضور کے سامنے کیک رکھا جس پہ راقم کی پی ایچ ڈی کے حوالے سے انگریزی میں مبارک باد لکھی ہوئی تھی۔ دیکھ کر فرمایا۔۔ میں یہ Congratulation کا لفظ کبھی بھی درست طور پر ادا نہیں کر سکا۔

نصرت صاحبہ نے پھولوں کے ہار پیش کئے جو مرشد کریم نے مرید کو پہنائے اور دعا دی کہ اللہ آپ کو ترقی اور برکت دے اور کامیاب کرے۔ پھر شاہین کو گجرے پہنانے کو کہا کہ بھئی یہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہیں۔انہیں یہ ڈگری انہی کی وجہ سے ملی ہے۔

مرید نے عرض کی۔یوں محسوس ہو رہا ہے گویا آج میں نے پی ایچ ڈی کی ہے۔

فرمایا۔ابھی تو ان کا سینگ اگا ہے دوسرا اگ رہا ہے۔

پھر ذوالقرنین کا قصہ سنایا کہ اُس نے لوہے کی چادریں گرم کر کے اُن پر پگھلا ہوا تانبہ انڈیل کر سدِ یاجوج بنائی مگر کہا کہ یہ دیوار اسی وقت قائم رہے گی جب تک اللہ اس کو قائم رکھے گا یعنی یہ دیوار مضبوط تو ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ اللہ اس نہ گرا سکے۔

عرفان صاحب نے کہہ دیا۔ یہ دیوار چین ہے؟

سُن کر خاموش ہو گئے اور کہا۔۔ شاید۔۔۔؟

پھر چائے کا اہتمام کرنے پہ نصرت صاحبہ کا شکریہ ادا اور اُٹھ کر سیر چل دیئے۔

نصرت صاحبہ نے بتایا کہ اس دعوت کا اہتمام مرشد کریم نے خود ہی کروایا تھا۔ مرید تشکر و امتنان کی گہری گھٹا میں بھیگ کر رہ گیا۔

اگلے روز ابا حضور خط بنوا رہے تھے مرید جا کر پاس بیٹھ گیا۔ اس دوران فرمایا۔ شیو کرنے والے روزانہ شیو کرتے ہیں۔۔۔ چھوٹی ڈاڑھی والے ہفتے دو ہفتے کے لئے فارغ ہو جاتے ہیں او لمبی ڈاڑھی والے تو مہینے دو مہینے کے لئے فارغ رہتے ہیں۔

خط بنوا کر فارغ ہوئے تو کسی کا نام لے کر فرمایا کہ انہوں نے کہا تھا کہ میری نصیحت ہے کہ کبھی ہونٹ نہ منڈ وانا۔ ہونٹ منڈوانے والے چند روز شیو نہ کریں تو خارش ہوتی ہے اور عجیب سا بھی لگتا ہے۔

پھر اُٹھ کر کمرے میں گئے۔ باہر آئے تو ہاتھ میں سیاہ کپڑا تھا۔ مرید کو دے کر فرمایا۔ یہ سلسلے کی یونیفارم ہے۔ آپ مجھ سے پیسے لے کر سلوائیں۔

پھر پوچھا۔ سلائی کتنی ہے؟ مرید نے عرض کی۔ آپ رہنے دیں۔ میں سلوالوں گا۔

فرمایا۔ اگر میں نے سلائی کے پیسے نہ دیئے تو یہ پڑا رہ جائے گا۔

حامد صاحب نے کہا۔ ساڑھے چار سو روپے۔

فرمایا۔ لو سونے سے گھڑ ونت مہنگی ہوگئی۔ گھڑ ونت یعنی بنائی۔ پھر جا کر کمرے سے پانچ سو کا نوٹ لا کر دے دیا۔

شہرت کے حوالے سے فرمایا۔ اس سے پرائیویسی ختم ہو جاتی ہے۔ بندہ کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔

فرمایا۔ میں نے جنگ کے لئے کالم لکھنا شروع کیے تو میر صاحب سے پوچھا۔ آپ مجھے کیا دیں گے تو انہوں نے کہا۔ آپ کو شہرت ملے گی۔

میں نے کہا۔ کیا میں شہرت کھا کر زندہ رہوں گا۔ میرے بچے شہرت کھائیں گے؟ اجی یہ سب فضول کی باتیں ہیں۔ شہرت ہے۔۔ کھانے کو کچھ نہیں۔۔ آپ خود کیوں صرف شہرت پہ گزارا نہیں کرتے۔

کتب بینی کے ذوق کے بڑھتے فقدان کی بات ہو رہی تھی تو فرمایا۔ لوگ کتابیں پڑھیں یا نہ پڑھیں۔۔ خریدتے ضرور ہیں۔ امیر لوگ اپنے علم کا اظہار کرنے کو گھروں میں لائبریریاں بناتے ہیں اور ہر مصنف کی کتابوں کا پورا پورا سیٹ خرید کر رکھتے ہیں۔ قیمتی اور مہنگی کتب تو وہ ضرور ہی خریدتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ رعب پڑتا ہے۔

عرفان صاحب کے گھر پر رات کھانے کے بعد بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔ عرفان اُٹھ کر گئے اور پار کر کا ایک پین لا کر ابا حضور کو دیا اور کہا کہ آپ یہ قلم میری طرف سے ڈاکٹر صاحب کو دے دیں۔ حضور نے قلم لے کر مرید کو دیتے ہوئے کہا۔ آپ کے کام کی چیز ہے۔

اس بار عرس کے دن لوگوں سے ملاقات کا یہ انداز رہا کہ صبح نماز، مراقبے اور درس کے بعد امی حضور اور مرشد کریم کو مسجد کے اندر ایک تخت پوش پر بٹھا دیا گیا۔ سب قطار بنا کر باری باری گزرتے اور سلام کرتے۔۔ میاں مشتاق صاحب اور نیاز

احمد صاحب سے تبرک کے چنوں کا پیکٹ لیتے۔۔ اور آگے بڑھ جاتے۔ ہاتھ تک ملانے کی ممانعت تھی۔ اگر کسی نے فرطِ کشش الفت سے مغلوب ہو کر کوشش کی بھی تو اُس سے بڑھے ہوئے ہاتھ میں تبرک کا پیکٹ تھما کر اس کو دوسروں کو موقع دینے کی تلقین کے ساتھ آگے بڑھا دیا گیا۔ ہزار بارہ سو عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کو لگام دینے کا سلیقے سے اہتمام کیا گیا تھا۔ جب سب حضرات گزر گئے تو خواتین کی باری ائی اور وہ بھی ایک ایک کر کے سلام کر کے گزرتی رہیں۔

بعض لوگ جن کو مرشد سے قربت کا کچھ زیادہ ہی دعویٰ تھا انہوں نے اس سے اگے بڑھ کر اظہار الفت واپنائیت کرنا چاہا تو انہیں جتا دیا گیا کہ نظم وضبط کے، لئے ڈسپلن کے لئے کسی استثنا کی گنجائش نکالی گئی تو سارا نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ لہذا قدم بڑھاؤ۔۔ اور نظم وضبط برقرار رکھو۔۔ مقررہ حدوں میں رہنا ہی اصل قربت والفت ہے۔

صبح کے درس میں معاشرتی نظام کی اہمیت پہ بات کرتے ہوئے فرمایا۔ پیغمبروں نے انسان کو اچھائی برائی کے تصورات دیئے تاکہ معاشرت کا نظام قائم ہو سکے۔ شروع میں بہن بھائیوں کی آپس میں شادی ہوا کرتی تھی لیکن اُس میں بھی امر ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ ایک بار توام پیدا ہونے والے بھائی بہن کی شادی نہیں ہوتی تھی بلکہ اُن کی شادی کے بعد پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی سے

کی جاتی تھی۔ ہابیل کی بہن۔۔ قابیل کی بہن کی نسبت اتنی خوبرو نہ تھی۔۔ اور قابیل کو ہابیل کی بہن گوارا نہ تھی۔۔۔ اس لئے اُس نے جھگڑا کھڑا کر دیا کہ وہ ہابیل کی بہن کی بجائے اپنی بہن۔۔ جس کی شادی قابیل سے ہونا تھی۔۔ سے شادی کرے گا۔ اس پہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل ہی کر ڈالا۔

انبیاء کرام نے انسان کو یہ شعور دیا کہ اگر وہ معاشرتی اقدار کو اپنائیں گے تو نہ صرف یہ کہ اُن کی یہ دنیا بہتر ہو گی بلکہ اُن کو اپنی اُخروی زندگی کو بہتر بنانے کے بہتر اور زیادہ مواقع ملیں گے۔

فرمایا۔ لوگ روحانیت سیکھنے کے لئے پندرہ منٹ تو دیتے نہیں اور یہاں وقت دیئے بغیر کام بنتا نہیں۔ آپ دنیاوی علوم کے لئے تو سالوں پڑھتے ہیں۔۔ ہم نے ایک بار حساب کیا تو معلوم ہوا کہ چھتیس ہزار گھنٹے پڑھ کر انسان میٹرک کرنے کے بعد، محض اس قابل ہوتا ہے کہ وہ یہ طے کر سکے کہ اب کیا پڑھنا ہے۔

اس کے برعکس یہاں پندرہ منٹ کا مراقبہ کرنا دوبھر لگتا ہے اور اس پہ یہ گلہ بھی رہتا کہ ہم نے کچھ نہیں سیکھا۔ جب آپ باقاعدگی سے مراقبہ نہیں کریں گے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

فرمایا۔ یہ عجیب منطق ہے کہ روحانیت بوڑھے ہی سیکھیں۔۔۔ اگر بوڑھوں نے ہی پڑھنا ہے تو انہیں چاہئے کہ نرسری جماعت میں بھی داخل کئے جائیں۔

آپ کے ملک میں خواندگی کا تناسب ۱۳ فیصد ہے چلیں آپ بیس مان لیں۔۔۔ باقی ۸۰ فی صد میں سے کتنے لوگ ہیں جو بوڑھے ہیں آپ اُن کو تو تعلیم دیتے نہیں اور چلے ہیں بوڑھوں کو روحانیت سکھانے۔۔ بھلا بڈھے طوطے بھی کبھی کچھ سیکھ سکے ہیں۔۔ وہ نرسری کا قاعدہ تو پڑھ نہیں سکتے تو روحانیت کیونکر سیکھیں گے۔

ناشتے میں مالٹے کا جوس پیش کیا گیا تو فرمایا۔

اب ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جوس کی نسبت براہ راست مالٹے کھانا بہتر ہے۔

مرید نے عرض کی۔ شاید اس لئے کہ اس طرح فائبر زیادہ ملتا ہے۔

فرمایا۔ نہیں۔ فائبر تو جوس میں بھی ہوتا ہے۔ جوس میں فارن باڈیز پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اگر جوس پیا بھی جائے تو تازہ جوس پئیں۔

مرید نے کتاب محمد الرسول اللہ ﷺ کے حوالے سے کہا کہ اس نے اس کتاب کو سرسری سا دیکھا ہے اور اسے اس میں حضرت شمعون علیہ السلام اور دانیال علیہ السلام کا تذکرہ نظر نہیں آیا۔

فرمایا۔ حضرت شمعون علیہ السلام کا تذکرہ سموئیل کے نام سے کیا گیا ہے اور حضرت دانیال علیہ السلام کا تذکرہ بھی موجود ہے البتہ فہرست میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔

کسی نے ملاوٹ کی بابت کہا کہ آج کل یہ برائی بہت عام ہو گئی ہے۔

فرمایا۔ آج کل آٹے میں ملتانی مٹی ملاوٹ کر رہے ہیں۔

حامد صاحب نے کہا۔ بھوسی ٹکڑے پیس کر ملاتے ہیں۔

فرمایا۔ بھوسی ٹکڑے تو پھر بھی کھانے کی چیز ہیں۔۔۔۔ یہ تو ملتانی مٹی ملا رہے ہیں۔

فرمایا۔ عجیب بات ہے چکنائی کی زیادتی سے موت واقع ہو جاتی ہے لیکن کبھی کوئی چکنائی کی کمی سے نہیں مرا۔۔ ہاں یہ ہے کہ کمزور ضرور ہوتا ہے۔ کولیسٹرول کی زیادتی سے رگوں میں خون کا بہاؤ رک جاتا ہے۔

مرید نے عرض کی کہ غفار صاحب کا کہنا ہے کہ مکھن میں جامنی رنگ ہوتا ہے جبکہ میرا خیال ہے کہ اس میں سفید رنگ غالب ہوتا ہے اور اس کا مغلوب رنگ زرد ہوتا ہے جیسا کہ گائے کے مکھن میں۔

فرمایا۔جی ہاں۔آپ کا خیال درست ہے۔

مرید نے عرض کی کہ لوگوں میں جامنی رنگ کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ صرف سیکس کے لئے ہے۔۔جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام جسمانی غدودوں کی کارکردگی کی اصلاح کرتا ہے۔

فرمایا۔ بھئی سیکس بھی تو غدودوں ہی سے متعلق ہے۔

پھر ایک یہ بات فرمائی کہ بڑے لوگ عوام سے بہت ڈرتے ہیں۔۔۔عوام ان سے ڈرتی ہے۔سیکیورٹی کے انتظامات لوگوں میں گھلنے ملنے سے پرہیز کے پس پردہ یہی خوف ہی تو ہوتا ہے۔ایک بار ہم کوئٹہ میں ایک صاحب کے یہاں گئے۔بہت وسیع و عریض علاقے میں اُن کا گھر تھا۔پہلے ہم ایک چار دیواری سے گزرے۔۔۔کافی آگے جا کر ایک اور چار دیواری آئی۔اُس کے گیٹ سے گزر کر آگے گئے تو ایک اور چار دیواری ائی اس کے بعد اسل گھر کی عمارت شروع ہوئی۔دروازے اتنے نیچے اور تنگ کہ مجھ سا آدمی بھی پہلو کے بل ہو کر جھک کر ہی اندر داخل ہو سکے۔وہ نواب صاحب ایک کمرے میں جتنے باغیچے میں وقت گزارا کرتے۔وہاں سے اُٹھتے تو اندر کمرے میں چلے جاتے۔اُن کی زندگی کا باہر اتنا چرچا اور اندر اتنی گھٹن۔

زبیر صاحب نے کچھ کہا تو فرمایا۔ایک آدمی ظلم کی باتوں پہ سوچ بچار کرتا ہے تو وہ ظلم کرنے پہ اتر آتا ہے۔ایک آدمی تحقیق اور جستجو کی بابت سوچتا ہے تو اُس کے اندر تحقیق اور جستجو کی باتیں اتر جاتی ہیں۔ایک آدمی اچھی باتیں سوچتا ہے تو اچھا بن جاتا ہے۔۔۔ایک آدمی بری باتیں سوچتا ہے تو وہ برا آدمی کہلاتا ہے۔بھئی جو جیسا سوچتا ہے وہ ویسا ہی تو بن جاتا ہے۔

فرمایا۔ہر آدمی ناک ہاتھ میں لئے پھرتا ہے لیکن ہم نے کبھی کسی کی ناک کٹی ہوئی نہیں دیکھی۔

اپنی والدہ کے حوالے سے ارشاد فرمایا۔ وہ کہا کرتی تھیں اولاد کی محبت نہیں آگ ہوتی ہے۔ ایک اور بات وہ یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ میرا پیٹ تو کراچی میں پڑا ہے۔

محبت کو آگ کہنا۔۔۔ اولاد کو پیٹ کہنا۔۔۔ یہ اردو کو نئے روزمرہ دینے کے برابر ہے

پھر حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے حوالے سے بتایا کہ وہ کیا فرمایا کرتے تھے کہ جائیداد نہیں ہونی چاہئے۔ انہوں نے اپنے لئے جو گھر بنایا۔۔۔ وہ ۲۴۰ گز پہ ہے۔۔۔۔ اُس پہ بھی افسوس ہی کیا کرتے تھے کہ نہیں بنانا چاہئے تھا۔

مرید نے حضور کے کمرے میں جا کر کتاب قوس و قزح آٹو گراف کے لئے پیش کی تو فرمایا۔ میاں صاحب کتاب شائع کرنے میں بہت تیز ہیں۔

مرید نے کمرے میں لگے رنگین شیشوں کو دیکھ کر تبصرہ کیا کہ آپ کے کمرے میں رنگین شیشے لگے دیکھ کر اُسے بہت اچھا لگا۔۔ آپ ایک طرز علاج۔۔ کلر تھراپی کے بانی ہیں۔۔ اور یہاں آپ ہی کے ارد گرد کہیں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئے جس سے معلوم ہو کہ آپ خود بھی اس طرزِ علاج سے استفادہ فرماتے ہیں تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

فرمایا۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ میرے ارد گرد یہ پھول ہیں۔

پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔ رنگوں کے حصول کا بہترین ذریعہ پھول ہی تو ہیں۔

مرید نے سوچا۔ وہ اس قدر مثبت طرزِ فکر خود کیسے حاصل کرے جو کسی بات پہ بھی کسی طور سے منفی سوچ تک پاس پھٹکنے نہ دے۔ اُن کی بات کا ہر انداز اتنا مثبت ہوتا ہے کہ سننے والے کی سوچ کی منفیت اُس کے بہاؤ میں بہہ جاتی ہے۔

جنات کے حوالے سے بات ہوئی تو فرمایا۔ جنات بہت ترقی یافتہ اور شریف مخلوق ہے۔ اُن کو کیا پڑی ہے کہ انسانوں کو ستاتی پھرے۔ یہ اڑن طشتریاں وغیرہ انہی کی ایجاد ہیں۔۔وہ انسانوں سے دو گنا ترقی یافتہ ہیں۔ انہوں نے آسمانوں کو چھان مارا ہے۔۔انسان اس ترقی کا ابھی سوچ بھی نہیں سکتا جس کو وہ زیر کر چکے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کی ترقی تخریبی ترقی نہیں ہے۔

محفل برخاست ہوئی۔ کمرے سے باہر آ کر اُس نے صبح کی تیز ہوتی دھوپ کو کچھ زیادہ ہی روشن محسوس کیا۔ وہ آستانے کے پاس آ کر رکا۔

آج سے کتنے ہی سال پہلے وہ اسی جگہ بار اپنے مراد کے روبرو پیش ہوا تھا۔۔اس تمام عرصے میں وہاں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ خالی میدان میں ایک دو منزلہ عمارت بن گئی تھی۔۔۔مراقبہ ہال کے پہلو میں جامعہ عظیمیہ اور عظمی پبلک سکول بن گئے تھے۔۔۔ وہاں سے یقین اور روشن فکر کی کرنیں اور لہریں پھیل رہی تھیں۔۔۔۔کتنے ہی ذہنوں کی ابیاری ہو رہی تھی اور نہ جانے مزید کتنے اس سے سیراب ہوں گے۔

اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور سوچا خود اُس کے اپنے اندر اس تمام عرصے میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ تبدیلیوں کی فہرست بناتا وہ گھر لوٹ گیا۔ اس نے تبدیلیوں کی فہرست کا عنوان سوچا۔۔۔انشراح اور بالیدگی۔۔۔اس کے اندر ایک گہری طمانیت اور شکر گزاری کی لہر ابھری اور اُس کو بھگوتی چلی گئی۔۔اُس کو شکر الحمدللہ کہنے کے سوا اور کیا سوجھتا۔ سو اُس نے تشکر کے ایک گہرے احساس کے ساتھ کہا۔ شکر الحمدللہ۔